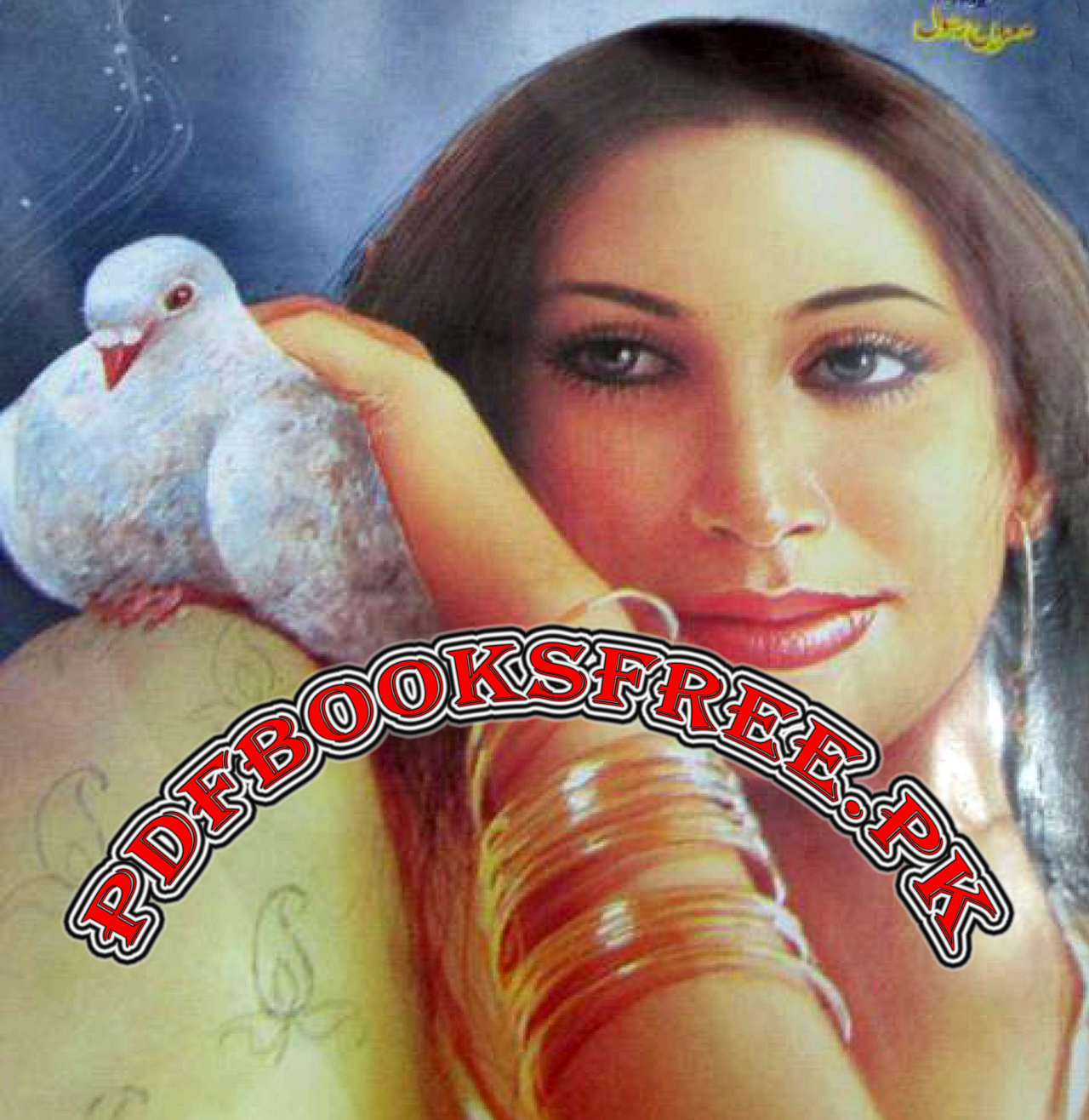


سینس
پیش
اپریل 2015
سینس



PDFBOOKSFREE.PK

حکمت و دانائی کی پکار ایک
بالک سال نظر کا مشاہدہ

جون ایلیا

07

انشائیہ

ایک کے خط

مدیر اعلیٰ

08

سپنس کی مجلس مشاورت و تارمین کی ترجیح و
شیریں باتیں گلے شکوے اور پر خلوص مشورے

الیاس سیتاپوری

16

دماوند عشق

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار
افسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

عذاب ماضی

کاشف زبیر

63

سائنس کی دنیا میں ایک
انتہائی خوفناک سافت کا دلچسپ احوال

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

82

سو دانے جنو

اجنبی رنگت اور مکروہ چہروں والی
شیطان قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

حسن اتفاقات

آرم واحدیت

111

دام فریب میں مبتلا کرنے والے
ایک ساحر کی کار فرمایاں

ملک صفدر حیات

130

فرزندِ روح

انتہائی سادہ فطرت انسانوں
میں چھپی کج روی کی دلخراش روداد

گھاو

ڈاکٹر شیر شاہ سید

153

ایک گھائل روح کے غموں کا منداوا
قدرت کی مہربانیوں کا قصہ

تنویر ریاض

157

بندوبست

گسزور لجات میں سہاروں کے
مستلاشی ایک جوڑے کی جسارت



قارئین

166

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق کے ہم آہنگ



ثمر عباس

169

تغیثات کے عسادی اور خواہشوں کے
ایک غلام کا عبرت اثر صاحب



محی الدین نواب

178

ایک چہرہ کی روپ بھی چھاؤں بھی دھوپ محبت کی
عنایتوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل با سلسلہ



سلیم انور

223

نادیدہ خیال کے نکلنے والے ایک
شعرا کی کامیاب چال



منظر امام

227

بے کل لمحات اور بے اعتبار مہوسوں
کے شکار ایک نا سمجھ کا قصہ



ضیاء تسنیم بلگر

233

ممال و مہمان کو شکرانے والے
ابتداء کے ایک شکر گزار بندے کا احوال



جمال دستی

247

سطح سمندر پر ایک شیطانی
کھیل کی خوفناک پھیل



بابر نعیم

251

بات سے بات جوڑ کر راز کی ست
میں اترنے والی ایک حسینہ کی ذہانت



عظیم احمد

260

عکس در عکس ایک ہی چہرے کے ہزاروں
روپہ..... اور ہر روپہ کی ایک الگ داستان

نجات

بوڑھے قدموں سے چل کر میں بچپن کی طرف گیا۔ انجام کی طرف جاتے ہوئے میں نے آغاز کا رخ کیا۔ میری تھکی ہوئی ہنڈ لیاں، میرے ناقص اور ناہنجار وجود کو بستیوں اور بازاروں میں، کوچوں اور کلبہ احزان میں گھسنتی پھریں۔ میں سودا کی اپنی گلیوں میں چلتے چلتے تھک گیا۔ میں غوغائی اپنے جنگلوں میں چیتے چیتے ہار گیا۔ میں نے راحت کو پکارا اور رنج کمایا۔

میں نے آرام کو آواز دی، آلام میرے حصے میں آیا۔

وہ تاریخ میں نے جس میں پہلا سانس لیا، وہ جغرافیہ میں جس میں عرصہ دراز سے رہتا ہوں، انہوں نے مجھے مایوس کیا، مغموم کیا۔ تاریخ اور جغرافیہ کے حوالے سے میرے چاروں طرف وحشتوں کا بہاؤ ہے اور خبروں کا اندھیاؤ ہے۔ افسوس کہ تاریخ نے حکمت سے ہاتھ اٹھایا۔ صد افسوس کہ جغرافیہ نے دانائی فراموش کی۔

اچھے دنوں کی نوید دینے والے کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟

سب ہی کے دلوں سے خوش امید کی کوچ کر گئی کیا؟

کور چشموں اور بد باطنوں کو، احمقوں اور احمادیوں کو نوشتہ دیوار سنانے والا کوئی نہیں رہا کیا؟

وہ آنکھیں بستیوں سے کوچ کر گئیں کیا جو اس تحریر کو پڑھ سکیں، جسے دانائی نے اپنی انگلیوں سے لکھا اور جسے حکمت نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا؟

لوگو! کیا تمہیں یاد نہیں کہ حکمت زور سے پکارتی ہے اور دانائی اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ وہ راہ میں اونچے مقاموں کی چوٹیوں اور رستوں کے بیچ میں کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھانکوں کے نزدیک شہر کے مدخل کے پاس یعنی دروازوں میں داخل ہونے کی جگہ زور سے پکارتی ہے۔

وہ کہتی ہے ”اے آدمیو! میں تم کو بلاتی ہوں اور بنی آدم کے ساتھ میری بات ہے۔ اے نادانو! دانائی کو سیکھو۔ اے جاہلو! فہمید کو پہچانو۔ سنو! کیونکہ میں بڑی باتیں بولوں گی اور میرے لب درست باتوں کے لیے کھلیں گے کیونکہ میرا منہ حق بیان کرتا ہے اور میرے لب شرارت سے نفرت رکھتے ہیں۔ میرے منہ کی سب باتیں صداقت ہیں، ان میں کچھ ترچھا اور ٹیڑھا نہیں۔ وہ سمجھنے والے کے نزدیک سب کی سب درست ہیں اور علم رکھنے والے کے نزدیک راست ہیں۔ میری تادیب کو قبول کرو نہ کہ چاندی کو اور علم کو کندن پر فوقیت دو کیونکہ حکمت لعلوں سے بہتر ہے اور کوئی دل پسند چیز اس کے برابر نہیں۔

میں حکمت، مشورت کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں علم اور بصیرت رکھتی ہوں۔ ہر غرور اور نخچی اور بد راہی اور ضدی زبان والے منہ سے مجھے نفرت ہے۔ مشورت اور مہارت میرے ساتھ ہیں۔ میں فہمیدہ ہوں۔ توانائی میری ہے۔ سلاطین میرے ذریعے سے مسلط ہیں اور حاکم انصاف سے عدالت کرتے ہیں۔ امرا میرے ذریعے سے امارت کرتے ہیں اور رئیس زمین پر حکمران ہیں۔

میں ان کو پیار کرتی ہوں جو مجھ کو پیار کرتے ہیں اور جو میری تلاش کرتے ہیں وہ مجھے پالیں گے۔ دولت اور عزت اور پائیدار سرمایہ اور اقبال مندی میرے پاس ہیں۔ میرا پھل سونے اور کندن سے بہتر اور میرا حاصل نصیب چاندی سے افضل ہے، میں صداقت کی راہ میں اور عدل کے رستوں کے درمیان چلتی ہوں تاکہ ان کو جو مجھے پیار کرتے ہیں، اچھے مال کے وارث بناؤں اور ان کے خزانے بھر دوں۔

میں ازل سے نصب کی گئی..... قدیم سے..... یعنی اس سے جو مشترکہ زمین بنائی گئی۔ پس اے لوگو! میری سنو..... مبارک ہیں وہ جو میری راہوں کو مانتے ہیں۔ تادیب کو سنو اور دانش مند بنو اور اس سے انکار نہ کرو۔ مبارک ہے وہ انسان جو میری سنا ہے۔ کہاں گئے وہ مبارک انسان جو حکمت کی مشورت سنیں؟ دانائی کے موتی چنیں! میری تاریخ، میرا جغرافیہ کیا بانجھ ہوئے؟ لوگو! دانائی کیوں نہیں سیکھتے؟ کیوں نہیں فہمید کو پہچانتے؟ کہ تمہاری اور میری اور آنے والوں کی نجات اسی میں ہے۔



محترم قارئین
السلام علیکم!

اپریل 2015ء کا پربہار شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آج کل ہر جانب رنگ برنگے کھلتے پھول موسم میں خوشگوار تہذیبی کا احساس دلارہے ہیں۔ انسان کا مزاج بھی موسم کی طرح بدلتا ہے۔ کبھی بہت بوجھل اور کبھی اپنے جوبن پر، جیسے کہ گزشتہ دنوں ورلڈ کپ کے لیے پاکستانی قوم کا جوش قابل دید تھا لیکن ورلڈ کپ کے آغاز میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کی ناقص کارکردگی نے عوام کو مایوس بھی کر دیا مگر اچانک جنوبی افریقا کے خلاف 29 رنز کی برتری سے حاصل ہونے والی فتح نے نہ صرف عوام کو پرجوش کر دیا بلکہ کھلاڑیوں میں بھی ایک ولولہ انگیز مسرت بھری۔ اللہ سے آگے بھی اچھے کی امید ہے۔ اصل چوکے تھے تو آج کل سیاست کے میدان میں لگ رہے ہیں۔ سینٹ کے الیکشن کے دنگل میں اگرچہ حاصل کردہ نشستوں کی تعداد نے مختلف سیاسی پارٹیوں کو نمبر ایک اور دو کی ٹھہرت میں لاکھڑا کیا ہے مگر قابلیت کا یہ ثبوت اگر مثبت کارکردگی سے بھی دیا جائے تو شاید پاکستانی عوام کی تقدیر بدل جائے۔ جس طرح قانون سازی میں انتہاک دکھایا جاتا ہے اسی طرح اس کے نفاذ میں بھی جوش اور ولولہ ہو تو لا قانونیت کی رسم کا بھی خاتمہ ہو جائے اور نظام میں خوشگوار تہذیبی چہرے بدل کر نہیں بلکہ بھترین پالیسیوں کی ترتیب اور نتائج سے آتی ہے۔ معاشی ترقی میں خواتین کی بھرپور شمولیت، فلاحی تنظیموں کا آغاز اور تکمیل تک بہترین نتائج کا یقینی حصول، چیک اینڈ بیلنس کا اصول، تعلیمی نظام کی درستی، نوجوان طبقے کے لیے مثبت سرگرمیوں کے مواقع کی فراہمی دہشت گردی اور معاشرتی نظام کی تباہی سے بچنے کے کتنے آسان اور سودمند طریقے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا اتنا دشوار کیوں ہے۔ اس سوال کا جواب کس کے پاس ہے؟ الیکشن کا رواج اور حاکموں کا رواج جب عوام کی خاطر ہے تو عوام کو سائل... کی جانب دھکیل کر وسائل سے محرومی کیوں؟ اچھا روزگار، بجلی، پانی، گیس کی بحالی، بہترین اور سستی تعلیم اب تو صرف خواب کی سی باتیں لگتی ہیں۔ سیاست دانوں کی خوشحالی اور شہروں کی تباہ حالی کا قصہ اگرچہ پرانا ہے مگر جب تک مرہم نہ رکھا جائے زخم تو ہر ایسی رہے گا۔ اب دیکھتے ہیں یہ مرہم کون، کب اور کیسے رکھتا ہے۔ پلیس کچھ افسردہ چہروں پر مسکراہٹ کھینچنے کی جسارت ہم بھی کرتے ہیں اور اپنایت کے پھول بانٹنے چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✽ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے تشریف لائے ہیں 15 فروری کی صبح ہم بڑے جوش و خروش میں تھے کہ اس دفعہ ہم بھارت کو ہر ادیں گے لیکن رزلٹ وہی جو پہلے ہی گزشتہ ورلڈ کپ میں دیکھ چکے ہیں۔ 15 کی شام کو دل بوجھل ایسا لگتا تھا کہ گل بوٹے ہار پر شرمندہ سے ہیں، ہوا ساکن ہو گئی پرندے بھی اوپر ساکت سے لگتے تھے۔ سڑک بھی خاموش خاموش سی لگتی تھی ایسے میں ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچے۔ سلام کیا تو سامنے والے نے مارچ کا شمارہ اٹھا کر ہمیں دے دیا۔ اس وقت میں شمارے کا ملنا گویا کسی خوشگوار سے احساس کے مانند تھا کہ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔ سرورق کو بہت ہی پیاری اور مشرقی دوشیزہ سے بہت ہی پیارا سجا یا گیا۔ تم کھلائی نہیں ہو تم ہمارے دل میں رہتی ہو۔ جون ایلیا لفظ لفظ موتی بکھیر رہے تھے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں پر ان کی یادیں کبھی نہیں جاتیں۔ میرے ماما بھی 16 فروری کو اس عارضی دنیا سے انتقال فرما کر مستقل دنیا کے باسی ہوئے۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اللہ کی رحمتیں ہوں آپ پر (آمین) آپ کا ادارہ یہ پڑھا آپ نے سچ کہا جو حالات اس حکومت کے چل رہے ہیں وہ مجھ سے بالاتر ہیں۔ ان دہشت گردوں چوروں ڈاکوؤں کا سد باب کیا جائے ورنہ والدین اس طرح تو اپنے بچوں کو بے بسی سے مرنے کے لیے اسکول نہیں بھیجیں گے۔ اپنی محفل میں آئے تو محترم جناب بھائی عبدالجبار رووی انصاری کو بہت ہی اعلیٰ عمدہ اور جامع تبصرہ کرتے پایا۔ صدارت کی مبارک ہو بھائی جان۔ محمد خواجہ کراچی والے بھی بہت عمدہ تبصرہ لے کر حاضر ہوئے۔ محمد قاسم رحمن سب سے پہلے پڑھائی پھر دیگر معروفیت۔ قدرت نیازی صاحب بھی اچھا تبصرہ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ نے کہا اقربا پروری کا الزام لگ جائے تو لگنے دو۔ بقول حبیب جالب۔ ”ہم کو آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں۔“ محمد یوسف سائول بھی اچھا تبصرہ کرتے پائے گئے۔ عبدالغفور خان کون سی خوشی دینے والے ہیں۔ الیکسی بھی ٹائٹس تبصرے کے ساتھ موجود۔ ایم اے فاضل فریدی کو ویکم کرتے ہیں۔ احمد خان توحیدی آپ کرلیس چار شادیاں۔ آپ کو کس نے روکا ہے۔ وسیم احمد خان بھی محفل میں موجود۔ برادر اللہ کا کرم اب ٹھیک ہوں۔ ماریہ خان اینڈ بشری افضل آپ کے مرحومین کو اللہ پاک جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ باقی تمام دستوں کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے درمانہ مشتق پڑھی۔ نظام نے بہت ہی بھیا تک منصوبہ بنایا۔ داؤد کو پھنسانے کے لیے، داؤد اپنے انجام کو پہنچا لیکن ابھی نظام کے ہاتھ میں بھی کچھ آتا نظر نہیں آ رہا۔ فیروز بخت وصی الدین کی سرپرستی میں چلا گیا۔ سودائے جنوں، حق کی راہ میں چلنے والے عابد اور ناصر، لیلیٰ پارٹی زبیدہ اینڈ خالد پارٹی محسن اور بازغہ کا مقابلہ خون کے پیاسے شیطان کے چیلوں یعنی بیودی برادری کے ساتھ جو کسی بھی موقع پر مسلمانوں سے رعایت نہیں برتتے تو مجاہد بھی ان کو خاک چھاتے رہتے ہیں۔ ماروی میں مراد اپنی ماروی کے پاس پہنچ چکا۔ سارے خطرے مول لے کر لگتا تو ایسا ہے ماروی ایک دو قسط کی مہمان ہے پر آگے مصحف کی مرضی۔ کاشف زبیر کی مقابلہ پڑھی۔ میکس نے کیا خوب نبھائی، الیکس کے ساتھ وہ فاتح بن کر بھی اچھا سب کچھ ہار گیا۔ خورید ریاض کی رشتہ میٹھ ولین سے شروع ہونے والی کہانی رے گراہم کی جان لے کر ختم ہوئی۔ مینی نے باپ پر محبوب کو فوقیت دی۔ دیمک، مرزا صاحب کے کیسوں میں سے



آمین فرمے آمین آخر میں غیر حاضر تبصرہ نگاروں کو بہت مس کیا خاص کر بابر عباس، قسیر عباس بابر، آغا فرید احمد خان آف سکھر، جاوید بلوچ، ہمایوں سید، ہارث کچر، شیر علی خان، ماہا ایمان، تصویر العین اور دلنشین بلوچ پلیز آپ سب جلدی انٹری دے دیں۔ معراج انگل اور آنٹی عذرا رسول کو بھائی ذیشان رسول کی شادی بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ معراج انگل کو صحت کامل عطا کرے۔ آمین۔ پلیز آپ اقلیم علیم صاحب سے کہیں کہ اپنا وعدہ پورا کریں ایک سال ہو گیا ہے اب تو کوئی شاہکار دے دیں۔ الیاس سیتا پوری کی دوسری قسط در ماندہ عشق بہت شاندار رہی۔ میرے فیورٹ رائٹر کی شاندار تحریر سودائے جنوں، یہ قسط بھی خوب شاندار رہی۔ آخری میں نائمہ کا زندہ بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ اگلی قسط کا ابھی سے انتظار ہے۔ اگلی قسط میں یہودیوں کو خوب نیست و نابود کرنا ویلڈن بھٹی صاحب۔ سلیم النور کی مختصر تحریر شعبہ باز بس ایک شعبہ بازی ہی لگی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی ایک اور حساس تحریر مجبوری کریم کتنا فرمان اور بے حس بیٹھا تھا۔ دوسری طرف ایک باپ جو انتظار کرتے رہے کہ بیٹا لوٹ آئے گا۔ جب تمام لوگ یہ ملک چھوڑ کر جائیں گے تو اس ملک کا کیا بنے گا۔ ساتھ میں سید صاحب نے 30 سال پہلے کی کراچی کی تصویر دکھا دی۔ نواب انگل کی تحریر ماروی اب کچھ ماورائی چیز بن گئی ہے۔ مرینہ کو ایک بار پھر مراد نے طعینہ لگا دکھا دیا۔ مراد کو ہسکی براؤن کی بیٹی ملی۔ ہسکی براؤن کا بیٹا مارا گیا زبردست ایکشن، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ آخر مراد اپنی ماروی سے ملنے آ گیا پاکستان۔ روح کو منور کرنے والی ضیاء تنسیم بلگرامی کی تحریر باقی باللہ پڑھ کے دل و دماغ کو روحانی سکون ملا۔ میرے لیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی انوکھی تحریر جو روس اور جرمنی کے پس منظر میں لکھی ہوئی تحریر تھی ویلڈن کا شٹی بھائی..... آخری صفحات پر سحر امام جیسے رائٹر کچھ خاص سا اثر نہ کر سکے۔ امجد بیگ صاحب کا یہ کیس واقعی بہت نرالا اور انوکھا تھا۔ مختلف کترنیں بھی بہت زبردست تھیں۔ امید رکھتی ہوں کہ بہت جلد اپنے لیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل کو پڑھیں گے۔

✽ اور ایس احمد خان، نائمہ آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "مارچ کا سہنس آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب کی مہارت کا بھی منہ بولا ثبوت تھا۔ انشائیہ نے بھی آگہی کے درواکے۔ ادارے کے بعد اپنی محفل کے ناموں پر نظر پڑی۔ جس میں سرفہرست عبدالجبار روی نظر آئے تو برابر مبارکباد قبول کریں۔ کچھ دیر بعد شائقین سہنس کچھ مہینوں سے سہنس کے ناموں کی فہرست میں ان نہیں تھا۔ توقع ہے کہ ان کی آرا سے جلد مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔ اندر کے صفحات پر سب سے پہلے ابتدائی کہانی در ماندہ عشق جو کہ مشق رائٹر الیاس سیتا پوری کی تحریر کردہ کہانی ہے، اس نے اپنے سحر میں آخری سطر تک محو کر دیا۔ پھر دوسری کہانی سودائے جنوں وہ بھی انتہائی دلچسپ کہانی ہے۔ وہ بھی آخر سطر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر ماروی ہے وہ بھی اپنا سحر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی کہانی مقابلہ اپنی مثال آپ تھی۔ جس میں آخر تک کتاب سے نظریں نہیں ہٹتیں جس میں جذبوں کا اظہار اور محبت کی گرمی سب ہی کچھ تھا۔ محو و ریاض کی رشتہ نے بھی ساثر کیا۔ دھماکا خیز بھی اچھی رہی۔ شعبہ باز بہتر لگی۔ محفل شعرو سخن اچھے اور معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ (آپ کا شعر ضرور لگتا ہے) مجبوری ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی کہانی بھی یقیناً اچھی لگی کہ اس میں کچھ پیغام ہوتا ہے جو... دل و دماغ کو مجبور کر رکھتا ہے اور عبرت کا سامان بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ روایت، روایت، فلن نہیں روایت آزما نظر آیا۔ اچھا ہوا اگر وہ روایت شکن ہوتا تو قہرے میں جرائم بہت بڑھ جاتے جس کا سد باب مشکل ہو جاتا۔ اچھا ہوا کہ جرم کی سچ کئی کر دی گئی۔ بلا عنوان نے بھی اچھا سا ٹھوڑا جو اس آئر لینڈ نے مفت کی دولت ملنے کے خوابوں کا تانا بانا بنا کر سب مسمار ہو گیا جب وہ دولت کسی اور ہاتھ میں منتقل ہو گئی اور وہ خالی ہاتھ رہ گئی۔ خواب دیکھتے ہوئے چکنا چور ہو گئے۔ خواجہ باقی باللہ ولیوں کی یہ شان ہے کہ وہ دنیا کی حرص و ہوس سے دور رہتے ہیں تو اللہ رب العزت کی نظر میں ان کا مقام اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ ایسے ایمان افروز ولیوں کے حالات و واقعات پڑھ کر دلوں کا سیل صاف ہو جاتا ہے اور اللہ کی وحدانیت کا بندہ اور زیادہ معترف ہو جاتا ہے۔ سایہ مسایہ نے بھی کافی ساثر کیا۔ منظر امام کی کہانی سفر در سفر نے آخری صفحات کی خوب صورت کہانی کا حق ادا کر دیا، بہت اثر انگیز کہانی تھی۔ سچ سچ میں کترنوں نے بھی محکوم کیا۔"

✽ طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان سے شریک محفل ہیں "مارچ کا شمار حسب دستور 19 تاریخ کو ملا۔ انشائیہ کے بعد ملکی حالات کے بارے میں آپ کی تحریر پڑھی۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر رحم فرمائے۔ آمین۔ بزم یاراں میں کرسی صدارت پر عبدالجبار روی انصاری بر اجماع تھے اور پھر تبصرے کی کیا بات..... اس دفعہ بزم میں نئے نام بھی شامل تھے اور سب دوستوں نے اپنے اپنے انداز میں بہت خوب تبصرے کیے..... سب لوں مبارکباد..... تے جی آیاں نوں..... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا چوتھا حصہ بہت خوب رہا۔ فلسطینی مجاہدین کو سلام اللہ تعالیٰ انھیں فتح و نصرت نصیب فرمائے۔ آمین۔ شہدائے قربانیاں انشاء اللہ رنگ لائیں گی۔ ایک ولی کی روداد میں خواجہ باقی باللہ کے بارے میں پڑھ کر ایمان کی کیفیت بہتر ہوئی۔ ماروی پہلے سے بہتر ہو رہی ہے۔ کترنیں بھی خوب رہیں۔ محفل شعرو سخن میں دوستوں کے انتخاب کے کیا کہنے..... بس اتنا پڑھ پایا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعاؤں سے میں ہائیکورٹ سے باعزت بری ہو گیا ہوں۔ سزائے موت ختم ہو گئی ہے الحمد للہ (شکر الحمد للہ۔ مبارک ہو) فروری کے شمارے میں شاہ حسن، مہرین ناز، زرین نیازی صاحبہ اور عبدالجبار روی انصاری سیت و دیگر قارئین کی دعاؤں کا شکریہ۔ خاص طور پر اس مہربان کا جس نے مجھے وظیفہ بھیجا۔ جناب معراج رسول صاحب اور ان کی پوری ٹیم کا بھی شکریہ کہ انہوں نے بھی مجھے دعائیں دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔"

✽ ابرار وارث، سندیلانوالی سے تشریف لائے ہیں "سہنس کا سرورق دیکھ کر دل پہلی بار خوش ہوا۔ شرقی روایات کی پاسداری کا نمونہ کامل و دشیزہ بہت حسین لگی۔ جون ایلیا کی تحریر چچ چچ کر محصوم بچوں کی محصومیت اور ظالموں کے ظلم کو بیان کر رہی تھی..... خطوط میں اپنا نام نہ دیکھ کر کسی بھی خط کو نہ کہیں گا یا ماہا ا جلدی سے اپنی من پسند تحریر "سودائے جنوں" کو پڑھا..... بہت سنسنی خیز قسط..... نائمہ اور عابد شکری سمندر کی بے درم



موجوں سے بچ کر اسرائیلی آبدوز میں جا گھسے اور امید ہے اس آبدوز کو تباہ کر کے ہی دم لیں گے۔ سارہ نے۔ عابد کو دھوکے میں رکھ کر شاید اپنے لوگوں کو بلا لیا تھا۔ بازغہ اور محسن مکمل طور پر خطرے کی زد میں..... پتا نہیں کمانڈوز سے ان کی جان کیسے چھوٹنے گی.....؟ حماد، کمال اور جینی کا دورہ عراق یقیناً دلچسپ ہوگا۔ ماروی کی ہر قسط میں نئی لڑکی مراد ہے اس دفعہ تو حد ہی ہوگئی۔ مراد کے جانی دشمن نیکی کی بیٹی ہی اس پر فدا ہوگئی..... محبوب کے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے لیے مراد ایمان علی کی صورت میں پاکستان آدھکا اور عبداللہ کبڈی کے ساتھ مل کے کامیاب ڈراما کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مرینہ شاید اب کچھ سیدھی ہوئی ہے۔ اصل میں ایمان علی لالچ زن میں اسپتال جا پہنچا، بے چارہ..... آخری صفحات پر مختصر تحریر پڑھنے کو ملی جس کا عنوان تھا سفر در سفر۔ افریقا میں وحشی قبائل کی داستان پڑھی۔ امر کو زبردستی وہاں کا بادشاہ بنایا جا رہا تھا۔ تمنا جی کا کردار عجیب سا لگا۔ منظر امام صاحب نے محی الدین نواب کا طریقہ تحریر اپنایا اس دفعہ..... کاشف زبیر نے بھی بہت پیاری کہانی مقابلہ لکھی۔ روسی اور جرمین جنگ کے پس منظر میں میکس، الیکس اور تالیہ کا کردار پسند آیا..... میکس بے چارے کو شروع سے ہی ان دونوں کی محبت ایک آنکھ نہ بھائی اور آخر کار وہ خود بھی گیا اور دھماکوں میں تالیہ بھی چل بسی۔ شاید مرکر میکس نے مقابلہ جیت لیا تھا..... اس دفعہ کے شمارے میں سب سے زیادہ کہانی جو پسند آئی وہ تھی، سایہ ہمسایہ، بزرگوں کے اس قول کے برخلاف کہ خالی گھروں میں محبت برتی ہے۔ نسیم اور افتخار کے پڑوس نے آباد ہو کر ان کی زندگی برباد کر لی۔ نسیم کو شروع دن سے ہی افتخار کو بتا دینا چاہیے تھا۔ نسیم کی بے بسی پر صحیح معنوں میں بہت دکھ ہوا جب افتخار نے ایاز کو مورد الزام نہ ٹھہراتے ہوئے اپنی ہی بیوی کو گھر سے نکال دیا اور طلاق بھی دے دی۔ ایاز اور عنبرین کا تو کچھ بھی نہ بگڑا تو صرف افتخار اور نسیم کا گھر..... افتخار جیسے لوگوں کے بھی کیا کہنے جو انہوں کو قصور وار اور بیگانوں کو اپنا سمجھ لیتے ہیں نسیم کے آخری فقرے کو ایاز ہی سمجھ سکا لیکن کیا فائدہ..... باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ پلیز طاہر جاوید مغل کی کہانی لے آئیں، چاہے قسط وار یا آخری صفحات پر..... ان کے بغیر کوئی تحریر اچھی نہیں لگتی۔

✽ رمضان پاشا بکشن اقبال، کراچی سے حاضر ہو رہے ہیں "آہا کیسا حسن اتفاق ہے کہ ہمارا محبوب سسٹنس مین ویٹنگن کے دن موصول ہوا، ہم نے بھی محبوبانہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ننھا سا گلہ دستہ لاکر سسٹنس کے اوپر رکھ دیا، لٹچ کے بعد پڑھیں گے۔ اس بار ڈاکٹر صاحب نے سرورق اچھا نہیں بنایا، مردانہ ہاتھ کو کرنٹ لگا دیا، پھول ہونا چاہیے تھا، لگتا ہے ڈاکٹر صاحب ویٹنگن ڈے (یوم محبت) پر ایمان نہیں لائے ہوں گے۔ فہرست بھی عام سی تھی۔ انٹرایو تو ہمیشہ ہی تلخ و ترش ہوتا ہے۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے عبدالجبار روی انصاری صاحب کا طویل و عریض تبصرہ بھلا لگا، مبارکباد۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ موصوف روی بھی اور انصاری بھی۔ جبار صاحب وضاحت فرمائیں اور گی والے گریڈوی بھائی اور کورگی والے خواجہ صاحب کے تبصرے اچھے لگے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب کے خیالات بھی من کو بھائے۔ بشری افضل صاحب کی بہن کی رحلت کی خبر پر بہت دکھ ہوا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ اس بار غیر ملکی کہانیاں سب کی سب اچھی اور معیاری تھیں۔ خاص کر روایت نے بہت متاثر کیا۔ روسی کہانی مقابلہ نے بھی دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ بلا عنوان، اس کا عنوان نیلے پہ دھارا رکھ لینے میں کیا قیامت تھی۔ طبع زاد کہانیوں میں سایہ ہمسایہ اول مجبوری، دوم مان لیتا ہوں۔ اشعار کی محفل میں اسلام آباد والے کرامت علی کراچی والے محمد زریان سلطان اور پشاور کے محمد رمضان اور بہاولپور کے بشیر احمد بھٹی کے اشعار بہت بہت پسند آئے، ان صاحبان کو بے شمار داد دیتا ہوں۔"

✽ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے چلے آ رہے ہیں "شمارہ مارچ تین دن لیٹ 19 فروری کو ملا۔ انٹرایو، جون ایلیا "تم کملاتی نہیں ہو" سارا درد کملانے کا شعر میں پرودیا۔ بٹ سدا بہار لہلہانے والے پھولوں کو جب کملانے سے نکل جڑ سے اکھاڑ دیں تو پھر ہائے کون دیکھے یہ بے بسی دل کی۔ دو تخلص روی اینڈ انصاری تا کس تبصرہ کے ساتھ جلوہ افروز مبارکباد۔ صد صدی۔ دن رات 24 گھنٹے نہیں۔ وقت شمار کر کے 6 گھنٹے روزانہ غور سے پڑھیں۔ 4 دن میں بہ آسانی شمارہ ختم ہو جائے گا۔ بھائی صفحہ معادیہ، ظاہر ہے ہمارے وجود کی شناخت پاکستان سے ہے۔ سلامتی کی دعائیں لازم ہیں۔ تبصرہ دیری گڈ۔ ڈیئر قدرت اللہ نیازی۔ دیکھ لیں اب ماروی مرینہ درشا کے ساتھ میڈیٹا بھی مسلمان ہو کر نکاح پر تیار ہے۔ نواب صاحب چاروں کو مراد کے ساتھ نکاح کی تکمیل ڈال کر آبادی میں اضافہ کریں۔ مجھے تو بزرگوں نے اپنی مرضی سے خاندان میں اتفاق رکھنے کے لیے تین نگیل ڈالی ہیں۔ شرمی حد چوکی کی حسرت باقی ہے۔ برادر یوسف سانول خوشاب تبصرہ گڈ بٹ مقام حیرت خوشاب اور سرگودھا کے کیونکھانے کے باوجود آپ سانولے ہیں۔ طویل وقفے کے بعد دلچسپ تبصرے کے ساتھ اللہ نبی والی سسٹر الہلی کراچی کو سیراب کرنے والی کھری جھیل کا پانی غناخت ختم کرنے کے ورپے نظر آئیں۔ حاضر رہا کریں۔ بیٹا بشری افضل بہاولپور، آپ کی محترم بہن کی رحلت کا قلبی دکھ اللہ رحمت برسا میں۔ پھر میم کے دائرے میں مراد کی چوکی عاشق میڈیٹا کا دیدار کیا تو پتا چلا مراد اور عبداللہ کبڈی تہذیبی روپ سے ماروی کے پاس آکر مراد نے آنکھ مار کر ماروی کو قلبی مسرت کے ساتھ ہاتھوں سے منہ چھپانے کے بعد گھیسرین آنکھوں میں ڈالی اور مزے دار ڈراما زار و قطار رونے کا شروع کر دیا۔ نواب صاحب ہم نکاح کے چھوہاروں کے خنجر ہیں پھر ہر چیز کو کھا جانے والی بیگ صاحب کی دیکھ کا دیدار کیا۔ ٹھیکہ اور شاہد کو سر عام سنگسار کی سزا ملنی چاہیے۔ بیتا پوری صاحب کی در ماندہ عشق بچوں نے بہت پسند کی۔ پہلے سے زیادہ دلچسپ، جاری رکھیں۔ اگلی قسط کے خنجر ہیں۔ ڈاکٹر یعنی صاحب کی سودائے جنوں، اچھی کہانی ہے بٹ ازلی دشمن اسلام اسرائیل کے تذکرے سے جی متلاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی سایہ ہمسایہ اچھی تحریر، نسیم کو اعجاز کے بارے میں افتخار کو پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ شک کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہ تھا بچوں کی پسند میں شادی حرج نہیں ہے۔ محفل شعرو سخن، آپ کا میری پوری چار لائن شائع کرنے پر شکریہ۔ منظر امام صاحب، کیا آپ کی دنیا کی مظلومانی تحریر ختم ہوگئی ہے جو افریقی قبائل کے ساتھ سفر در سفر چل دیے؟ ڈاکٹر امر کو فرزالہ کے بعد دوسری شادی کر لینی چاہیے تھی۔ تمنا جی تو دیوتا بن کر زندگی کے اصل لطف سے محروم ہوگئی۔ ہمیں تو سسٹنس، سرگزشت، جاسوسی، پاکیزہ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ جو افریقی طویل سفر کے بھائے پورا کراچی بھی آج تک نہ دیکھ سکے۔ عبدالمنصور ساگری۔ تبصرہ جامع بٹ دیری گڈ۔ شعر پسند کرنے کا شکریہ احسان سحر، باد یہ خان، ویم احمد خان اچھے تبصرے۔"



نارسیال، سہانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ پیارامحبوب سہنس ڈائجسٹ 17 فروری کو دل پر دھک دے کہ دل میں سا کیا۔ نائل گرل اس بار سوہنی کڑی پنجاب دی سر پر ہلکے نیلے رنگ کا دو پٹا اوڑھ کر اور خوب صورت اداس آنکھیں تھوڑی ترچھی نظر سے دیکھا ہمیں تو دل زپ کر رہ گیا۔ ہماری امیدیں ہم سب کی تیاریاں اتنا انتظار دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ ہم یہ کہیں گے وہ کہیں گے تاریخ بدل کے دکھ دیں گے بتائیں کیا کیا؟ بڑے دلوں کے بعد جب وہ دن آیا انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ہم سب کام کاج چھوڑ کے بیٹھ گئے۔ پہلے کی طرح اس سال بھی ہم تاس مار گئے اور وہ جیت گئے لیکن پھر دل ناداں کو سمجھایا کہ ابھی تو ہم باقی ہے جب۔ ہم شروع ہوئی تو آپ کو کیا بتاؤں کبھی بدن لرز جاتا اور کبھی سنبھل جاتا۔ کبھی خون کی گردش تیز ہو جاتی اور کبھی نارل۔ کبھی ہماری امیدیں گہرے بادلوں میں چھپ جاتیں کبھی سامنے آ جاتیں، دل آہستہ آہستہ ڈوبتا گیا اور ڈوبتا گیا لیکن بڑی تیزی سے اپنے آپ کو سنبھالا کہ اے دل دھڑک دھڑک کے خاموش ہو جا۔ ہم پہلے تھوڑی انڈیا سے جیتے جو اس بار ہم جیتیں آخر وہی ہو جس کا ہمیں ڈر تھا۔ خیر اگلی باری یعنی اگلے بیچ پہ اس لگا بیٹھے کالی آندھی کے ساتھ لیکن پہلے سے بھی بہت پر فارم بری تھی اب تو میں زندگی میں کبھی بھی بیچ نہیں دیکھوں گا۔ کبھی ہماری ٹیم اتنا اچھا کھیلتی ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا برا کھیلتی ہے کہ بیچاری عوام ٹیم کا غصہ اپنے پی وی پر نکالتی ہے۔ اب چلتے ہیں محفل دوستان کی طرف جناب عبدالجبار رومی انصاری کو کرسی صدارت پر بیٹھا پایا مبارک جناب! محمد صفدر معادیہ یہ آپ خود ہی سوچ لو کہ اتنے جلدی ختم کیوں ہو جاتا ہے؟ محمد خواجہ جی جب دل میں ایمان ہو تو حکمران صاحبان اپنی غریب عوام اور اپنے پیارے ملک کی خاطر جان بھی دے دیتے ہیں۔ رضوان عیوبی صاحب اس بار آپ نے گرل کی بہت تعریف کی۔ اکیلی کراچی جی آپ کا بہت شکریہ اور آپ کو نئی زندگی مبارک ہو اپنے نئے سفر کے ساتھ اچھی زندگی کا آغاز کرو۔ رمضان پاشا نے بھی اس بار زیادہ زحمت نہیں کی۔ ایم اے فاضل فریدی خان ہمت مرداں تے مدد خدا؟ وسیم احمد خان بھائی آپ کا میں دل سے شکر گزار ہوں۔ بشری افضل جی اللہ پاک آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ شانہ حسن اور مہرین ناز اس بار آپ دونوں کو سسٹمز کی گاڑی کے پائیدان میں لٹکے ہوئے دیکھا۔ احمد خان توحیدی، مرزا طاہر الدین بیگ، ان سب کے تمبرے اچھے تھے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے میں نے اپنی پسندیدہ کہانی ماروی پڑھی جو مکی الدین نواب صاحب کے قلم سے لکھی گئی اور ایک اچھے انداز میں لکھا ہوا ہے۔ قلم سے مراد تو اپنا ہم شکل ایمان ملی گیا اور لگتا ہے اگلی قسط میں ایمان کو اپنا ڈیڑھ بھی مل جائے۔ مرینہ پاگل کی طرح مراد کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی اس پوری تحریر میں مرینہ کی یادداشت کیوں نہیں گم ہوئی۔ ایک گھنٹے بعد تو یادداشت چلی جانا چاہیے تھی ادھر مراد ایمان علی کے روپ میں کبڈی کے ساتھ پاکستان پہنچ گیا اور مراد کو اپنا دشمن دیکھنے کو بھی مل گیا۔ اگلی تحریر کا بڑی شدت سے انتظار رہے گا۔ ڈاکٹر عبدالرہب بھٹی صاحب کی تحریر سودائے جنوں پڑھی جو ہمارے ایمان کو تازہ کرنے والی ہے تاریخ میں بھی عورتوں کی بہادری کی داستان پڑھی اور سنی اور انشاء اللہ ان مجاہدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ہماری دعا ہے ان کے ساتھ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر سایہ مسایہ پڑھی جو واقعی ہمسائے کے ساتھ سایہ تھا۔ نسیم کو کیا معلوم تھا کہ وہ ان پڑوس ہوں تو اچھا ہے یا فیملی ہوں تو اچھا ہوتا ہے۔ باقی کہانیاں بھی زبردست تھیں۔

در شہوار پیر زادہ، بہاولپور سے رونق افروز ہیں۔ "مارچ کا سہنس ہمیں 19 فروری کو مل گیا۔ سرورق والی سوہنی کڑی اچھی لگی۔ انشاء ہے اور ادارہ یہ بہت سچی آموز ہوتا ہے مگر سرت کے چشمے تو انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ محض خارجی ماحول سرت و شادمانی کا موجب نہیں بن سکتا۔ جس دور میں حکمرانوں نے لوگوں کی غنیمتیں حرام کر دی ہوں ان کے لیوں سے فسی کی آخری رمت تک چھین لی ہو، وہ کیا کریں کس کو اپنا درد سنا میں؟ عبدالجبار رومی بھائی کو منصب صدارت مبارک ہو۔ میں سب بھائیوں اور بہنوں کی شکر گزار ہوں کہ میرے تمبرے کو اس قدر پسند کیا گیا۔ خاص طور پر محفل آپ کے خط کی امپارچ کی۔ جنہوں نے میرا خط فرسٹ پوزیشن پہ شائع کیا۔ محمد صفدر بھائی شکر ہے۔ بشری افضل آبی ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں سودائے جنوں بہت بہترین اسٹوری ہے جو کہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود اس کہانی کا حصہ ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ مرزا امجد بیگ کی دیکھ بہت فصاحت آموز کہانی ہے۔ ٹھیک جیسی عورتیں دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی خراب کر لیتی ہیں۔ ماروی بھی بہت اچھی چارتھی ہے۔ اب دیکھتے ہیں محبوب چاندی کی موجودگی میں مراد اور ماروی کیسے ایک ہوتے ہیں۔ منظر امام صاحب کی سفر در سفر نائٹس اسٹوری ہے بہت زیادہ پسند آئی۔ کوئی بھی سفر بے مقصد نہیں ہوتا کسی نہ کسی کو کچھ مل ہی جاتا ہے۔ کسی کو یادیں تو کسی کو سوچائیں۔ در ماندہ عشق کا تیرا حصہ پڑھ کر اپنی رائے دوں گی ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ویسے اسٹوری دلچسپ ہے۔ مقابلہ اور دھما کا خیز بھی زبردست اسٹوری ہے۔ محفل شعرو سخن میں سب کے اشعار اچھے تھے بالخصوص مہرین ناز اور اعجاز احمد راحیل کے اشعار اچھے لگے۔ مارچ کا شمارہ دل جیت گیا۔" (بہت شکریہ)

مہرین ناز، اعجاز احمد راحیل، حیدر آباد سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ "مارچ 2015ء کا دیدہ زیب شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ نائل ہماری بھرپور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ بہاروں کا یہ مہینا ہمیں عہد ماضی کی یاد دلاتا ہے جب مسلمانوں نے متحد ہو کر خواب اقبال کو حقیقت کا روپ دیا تھا۔ کاش ہم مسلمان پھر سے ایک ہو جائیں۔ انشاء ہے بہت ہی اچھا ہوتا ہے گفتگوں کے اوزان ناپنے کا بیان ان کی دست و ساخت نہیں ہوتی بلکہ اس قلم کی طاقت ہوتی ہے جس سے رقم ہوتے ہیں جون ایلیا از گریٹ۔ اپنی محفل میں آنے سے پہلے ادارہ یہ ہم لازمی پڑھتے ہیں کیونکہ معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ خود کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر ہمیں تھوڑا سا عجیب لگا چلو خیر ہے عبدالجبار رومی برادر کو منصب صدارت کی مبارک باد۔ محمد صفدر معادیہ اینڈ محمد خواجہ بھائی آپ کا حسن نظر ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی بھائی لاہور والا مکان آپ اور بھائی کے لیے خالی کر دیا ہے۔ ایم اے فاضل آفریدی اینڈ احمد خان توحیدی برادر تمبروں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ساگر ٹکڑ بھائی از حد لوازش۔ بشری افضل سسر ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں اللہ آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں جگہ اور آپ سب کو مہر جیل عطا فرمائے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس بیتا چاری کی در ماندہ عشق



کا دوسرا حصہ بعد شوق پڑھا۔ داؤد اپنے عہد کی پاسداری نہ کر سکا۔ فیروز بخت کا کردار ابھی تک قہر و اسرار کے پردے میں چھپا ہوا ہے بہر حال موجودہ قسط بیٹ رسی۔ کاشف زبیر صاحب کا مقابلہ زبردست اسٹوری ہے۔ انسان اگر کرنے پر آجائے تو ایکس کی طرح بہت کچھ کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی صاحب کی بے مثل تحریر سودائے جنوں اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ دشمنان اسلام مسلمانوں کے حوصلوں کو کبھی پست نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر کمال، عابد شکھری، لیلیٰ، زبیرہ قیصری محسن کے کردار بہت پر فیکٹ ہیں۔ انکی تحاریر مدتوں یاد رہتی ہیں۔ تنویر ریاض کی رشتہ مہذب دنیا کے خود غرض رشتوں کی دلدوز کتھا بیٹ رسی۔ مرزا امجد بیگ کی وکالت ہو اور مجرم بچ نکلے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عورت چادر اور چادر دیواری میں ہی اچھی لگتی ہے مگر بعض کھلیے جیسی عاقبت نا اندیش عورتیں اس بات کو نہیں سمجھتیں تو انجام بھی برائی نکلتا ہے۔ ابوضیا اقبال کی دھماکا خیز عمدہ لگی انسان کو اپنی صلاحیتوں اور سوچ کا استعمال مثبت ہی رکھنا چاہیے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ شعبہ باز خود کو عقل مند سمجھنے والے اگلے کی طرح ناکام ہی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی مجبوری ان والدین کا الیہ جو اپنی اولاد کی محبت میں ہر لمحہ جیتے مرتے رہتے ہیں۔ نسل نو شاید ہی اس درد کو سمجھ سکے۔ ماروی میں سمجھ نہیں آ رہی کہ نواب صاحب ہمیں کس طرف لے کر جانا چاہتے ہیں بہر حال گزارے لائق ہے۔ بابر نعیم کی روایت انسان چاہے ہوئے بھی کچھ روایات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیم کا فیصلہ وقت کی مناسبت سے ٹھیک لگا۔ شمس جیل کی بلا عنوان دولت کی ہوس میں جلا انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ خواجہ باقی باللہ کی داستان حیات ایمان کو تازہ کر گئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سایہ ہمایہ اسٹوری آف ملتھ رسی۔ بے شک اچھے مسائے خدا کا قلم ہوتے ہیں۔ اعجاز اور منبرین جیسے وبال جان ہوتے ہیں جو دوسروں کی زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں۔ آخری صفحات پر منظر امام صاحب کی سفر در سفر اپنا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہی۔ یہ درست ہے کہ زندگی اک سفر ہے اور کہیں نہ کہیں پڑاؤ بھی کرنا پڑتا ہے ہر سفر یادوں کے سمندر میں ہمیں دھکیل جاتا ہے ہم یادوں سے کبھی جان نہیں چھڑا سکتے۔ آخر ہماری گزارش ہے ناصر ملک صاحب سے کوئی سلسلہ وار ناول لکھوایا جائے۔

❖ سیف حاجی حسین کاظمی، پارا چنار گاؤں، لوہا کی سے تشریف لارہے ہیں۔ "مارچ کا شمار بہت خوب صورت سرورق اور دلچسپ کہانیوں کے ساتھ ملا۔ ادارے میں آپ کی باتیں ہمیشہ دل کو چھو لیتی ہیں۔ بچے ہماری قوم کا سرمایہ ہیں اور تعلیم اس سرمائے کا زیور اللہ تعالیٰ ان کی ہمیشہ حفاظت کرے اور ملک و فتن مناصری حوصلہ فکری ہوتی رہے (آمین) سب سے پہلے الیاس سیٹا پوری کے قلم سے لکھی گئی داستان و زمانہ عشق پڑھی۔ بہت زبردست تحریر ہے۔ سازشوں نے ہر دور میں ایک الگ ہی داستان رقم کی ہے۔ آخری صفحات پر منظر امام کی تحریر کردہ سفر در سفر تھی۔ کیا خوب لکھا منظر صاحب نے بھی۔ اگرچہ روایتی کہانیوں سے کچھ ہٹ کر تھی۔ پڑھنے کے بعد بھی کافی دیر تک سوچتا رہا۔ ویلڈن منظر امام صاحب۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید تو ہر بار ایک شاہکار اور سبق آموز کہانی لاتے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں آج بھی ہمارے ملک میں بعض جگہوں پر اتنا برا حال ہے۔ کاشف زبیر مقابلہ بھی کیا زبردست تحریر ہے۔ انسان اگر کوشش کرے تو حسب مناسبت ناکج حاصل کر سکتا ہے۔ خواجہ باقی باللہ، ضیا نسیم بلگرامی کی تحریر پڑھی۔ اللہ کے نیک بندوں کے حالات سے آگاہی کا بہترین سلسلہ ہے۔ بابر نعیم کی روایت نے اچھا سبق دیا۔ ظلم کو مٹانے کا اچھا طریقہ ہے۔ کتر نہیں بھی مزہ دے جاتی ہیں جبکہ محفل شعرو سخن کا اپنا الگ انداز ہے۔ سودائے جنوں اور ماروی اپنی اپنی ڈگر پر چل رہی ہیں۔ ایک بہت تیز رفتار ہے اور دوسری آہستہ روی کا شکار، بہر حال دونوں ہی دلچسپ رہیں۔ اگلے شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے نا..... اللہ سسٹم کی ساری ٹیم کو خوش رکھے (آمین)"

❖ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور سے محفل میں شریک ہیں۔ "مکھنی بھانے کو بنن پہ انگلی رکھی تو جیسے اٹھانا ہی بھول گئے اور خوب صورت دو شیزہ بھی جیسے اپنا میک اپ اچھوڑ کر آ موجود ہوئی۔ جیسے سے نہیں نقش کا بھل زدہ آنکھیں نا معلوم سی مسکراہٹ سے لڑکی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ لہرست پر نظر ڈال کے جون ایلیا کی گہری باتوں میں کھو گئے" تم کلائی نہیں ہو، تم بھلا کیسے مرجھا سکتی ہو۔ دل میں..... ہمارے دل میں کھلی ہوئی ہو پر کیا کریں موت سے کس کو رستگاری ہے۔ جون ایلیا کی فلم سے معمور سو گوار تحریر ایک معصوم بچی کے لیے تو نوحہ کناں تھی۔ جو ہمیں پشاور کے معصوم شہدا کی یاد دلا گئی۔ یہ تو معصوم طلبہ کی بات ہے اور پھر پاک وطن میں شکار پور، پشاور، لاہور اور اسلام آباد میں ہونے والی دہشت گردی نے کتنی ہی زندگیاں گل کر دیں۔ اللہ رحم فرمائے۔ ٹھیک ہی کہا ہے کہ اگر ماضی سے ہمیں بچنے والے عہد سے سبق سیکھا ہوتا تو ہمارے ملک کا یہ حال نہ ہوتا مگر یہاں ہر دور کے ارباب اختیار ایسے کہ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، بس ایسے واقعات پر کمیشن بٹھا کے وعدے وعید کیے جاتے ہیں اور بات ختم، دوسری طرف ورلڈ کپ کی تیاریاں زور و شور سے ہوئیں بہت امیدیں لگائیں مگر کرکٹ ٹیم کی مایوس کن کارکردگی سے شروع میں ہی کرکٹ شائقین کو دھچکا لگا اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی محفل میں اپنا خط پہلے نمبر پر دیکھ کر میں تو خوشی سے نہال ہو گیا۔ انتظار تھا کہ ہم بھی اسٹیج پر براجمان ہوں گے تو یہ بھی فروری کے شمارے میں عزت افزائی حاصل ہوئی۔ اس کے لیے میں ادارہ وقار کین کا دل و جان سے ممنون ہوں۔ جس طرح شمارہ جلدی ختم ہونے کا ٹم ہوتا ہے ویسے اس کا انتظار بھی سرور کیے رہتا ہے پھر مندر معاویہ بھائی ٹم کیسا؟ محمد خواجہ صاحب یہ امیدیں کب ختم ہوتی ہیں بس تھے سال پہ سال آتا ہے گزر جاتا ہے اور ہم ترقی کی راہ ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ رضوان خولی آپ کے سرورق کے بارے میں منفرد نا یاب الفاظ دیکھ کے دل کر رہا تھا سب جمع کر کے شاعری میں پرودیں۔ جی قدرت اللہ نیازی اس رشتے کی بنا پر ہی ہم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ سسٹم کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ ہی ہے جو ہم ایک دوسرے سے واقف حال رہتے ہیں۔ ہاں جی الٹی راز بھی آخر کب تک راز رہے اور پھر وقت کہاں ہوتا ہے وقت تو کالنا پڑتا ہے۔ آپ کو شادی مبارک ہوئی، احمد خان توحیدی تبرہ پسند کرنے کا شکر ہے۔ ماریہ خان ویکم آپ کا دیوانہ وار مطالعہ بھی قابل رشک ہے۔ اور یس احمد، فاضل فریدی، طاہر الدین



اور وہیم احمد خان کے تبرے بھی اچھے تھے۔ سحر یہ نقاری، طاہرہ گلزار، زرین لادی اور انجم کمال۔ ساتھ میں ہارٹ سچر، نقیبہ عباس، ہارون جہرس، زویا اعجاز کی محسوس ہوئی۔ شاعری میں مہرین ناز، مدحت اور طاہر الدین بیگ کے اشعار بہت اچھے تھے۔ کہانیوں کا آغاز در ماندہ عشق سے کیا۔ اپنی ہونٹیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کا کام کیا۔ نظام کی اپنی بیویوں سے مل کر دواؤں کی دولت تنہا نے کی سازش بھی ناکام رہی تو دوسری طرف داؤد جو مروتوں سے بھرا تھا انہی کے چنگل میں پھنس گیا مگر اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول نہ کر سکے اور اپنے پندار کے ساتھ نرجس اور کینچہ کو بھی لے ڈوبا اور ان سے شادی کرنا پڑی مگر نظام اور سحر یہ کی سازش سے موت سے ہٹنا ہوا، ہاں فیروز بخت کے لیے دو تہائی کی وصیت کر گیا اور نظام خالی ہاتھ متاثرہ گیا۔ جس کو سحر انور دی کہتے ہو وہ کسی شے کی تلاش کا مقصد سفر ہے اور اس تلاش میں شوق کی آگ مشتعل ہے جس میں اذیتوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ ہیں اللہ کے ولیوں کی دلوں کو مسکور کرنے والی باتیں۔ جن کی کہانی میں جا میں تو اصل زندگی کو بھٹکنے کا موقع ملتا ہے۔ خواجہ باقی باللہ کے حالات زندگی بھی متاثر کن تھے۔ نماز قضا کرتی ہے نیک اعمال کا اور یہ کہ نمازی اپنا محاسبہ کر لے۔ ساری دنیا کی خاک چھانتے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما مراد علی خود کو پار سارکھ کے بھی کرتا آ رہا تھا۔ اسرائیل میں مرینہ سے آکھ پجوری کھیلنے لکل گیا اور اپنے ہم شکل ایمان علی کو اس کے حسن کے قصے سنا کے پیچھے لگا دیا۔ دوسری طرف عبداللہ کبڈی کے روپ میں مراد ماروی کے سامنے تھا اور ماروی شش و پنج میں اس کے مراد ہونے کا خود کو یقین دلار ہی تھی، عجیب و غریب اور دلچسپ روداد کے ساتھ کبھی کبھی تو ذہن ہی الجھ جاتا ہے کہ محی الدین نواب کی ماروی آخر ہے کیا چیز..... اے..... اے ایک منٹ رکھو۔ تم کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ اتنی جلدی کیا ہے تمہیں..... ہا ہا ابوبصیر اقبال کی عجیب و دھماکا خیز کہانی تھی۔ جذبہ انیسیت ہی محبت کی پہلی سیڑھی ہے اور انیسیت اثر پذیر کی عمل سے پھونکتی ہے اور یہی کچھ بازو اور محسن بھی خود میں محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف کمال برقع پوش عورت کی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ تیسرے سین میں عابد شکری شپ میں یہودیوں سے نبرد آزما ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے جنوں میں دشمنوں سے برسر پیکار ہے اور سودائے جنوں کی تصویر بنا ہوا ہے۔ دیکھو عبدالرب بھٹی اس جنوں کو کیسے کامیابی سے ہٹا کر کرتے ہیں۔ ہم بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ سچ اور جھوٹ اچھائی اور برائی کے ساتھ جھس اور سہنس سے بھر پور کہانیاں بہت کچھ سکھا جاتی ہیں جن میں برائی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو وہ اچھائی اور سچائی اپنے قدم بجاتی سرخرو نظر آتی ہے۔

مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے چلے آ رہے ہیں "تم کملائی نہیں ہو! بہت خوب لکھا بہت خوب آپ کے خطوط میں انصاری صاحب لکھی اور مادیہ خان کے ساتھ احسان سحر خوب رہے۔ تاریخ کے جھروکے کے ساتھ پڑھتے ہیں تو تاریخ میں کم ہو جاتے ہیں۔ در ماندہ عشق سبک رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ اب دیکھیں کہاں وہی اینڈ ہو۔ منظر نامہ صاحب سحر در سحر لے کر آئے اور اپنے قلم کا خوب ہی جادو دکھایا بہت زبردست۔ منظر صاحب کاش منظر صاحب کسی طرح کھینچ کر تھامی کو بھی پاکستان لے کر آ جاتے تو کام کی کہانی ہوتی ویسے کمال کی تو اب بھی ہے۔ بہت ہی منظر اور دلچسپ سہنس فل۔ مرزا بیگ صاحب کی دیر تک بھی کیا خوب کیس اور کس طرح آپ نے سلجھایا۔ پولیس والوں کی نفسیات آپ سے اچھی کون جان سکتا ہے۔ خالد، شکیلہ اور عزت..... حذر دار کیس مختصر۔ شکیلہ کے ماضی کے کرتوت آپ نے تو کمال کر دیا۔ ایک بیگ کی طرف سے دوسرے بیگ صاحب کو سیلیوٹ۔"

احسان سحر، میانوالی سے تشریف لائے ہیں "انسان کی زندگی میں باتیں اور کام کبھی ختم نہیں ہوتے۔ باتیں بھی ہمارے لیے ضروری ہیں اور کام بھی۔ انہی کاموں میں سے ایک کام میرا..... بلکہ سب کا سہنس پڑھنا بھی ہے اور باتوں میں کاغذ اور قلم کے ذریعے مخاطب ہونا ہے۔ سہنس ڈائجسٹ کا تازہ شمار 20 فروری کو لاہور سے واپس آتے ہوئے خرید۔ پیار کرنے اور بھاننے میں جس طرح فرق ہے..... اسی طرح دوران سفر اور کمرے میں بند ہو کر مطالعہ کرنے میں بھی کافی فرق ہے۔ بہر حال وقت گزر جاتا ہے اور ہم نے گھر آتے ہی دوبارہ سے مکمل اطمینان سے صنف نازک کو غور سے دیکھا..... اوہ مطلب ناٹل کو دیکھا وہ بھی اکیلے میں..... نیلے رنگ کے لباس میں ترجمہی نظر سے دیکھنا، ہائے کیا نام دوں اسے.....؟ ہلکی ہلکی مسکراہٹ جو صرف خاص نظر سے ہی نظر آتی تھی..... اور یہ خاص نظر خوش قسمتی سے ہمارے وجود کا حصہ ہے، آگے بڑھے..... محفل خوش رنگ..... بلکہ رنگ برنگ محفل کی طرف رخ کرنے سے پہلے تو ہوا سا آج کے جون ایلیا سے مل لیا جائے اور پڑھیں کہ آج کا جون ایلیا کون سا نو پک لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ آج کے جون ایلیا کا کہنے کا مقصد راز تھا اور راز ظاہر نہیں کیے جاتے۔ ادارے والے خاص کر ہماری پیاری خاتون خطوط امپراج سمجھ گئی ہوں گی اور سمجھ گئی ہوں گی تو تو ہوا سا مسکرا بھی دو نا پلیز..... ہمیشہ خوش رہو جی۔ تو جون ایلیا صاحب کہہ رہے تھے مر جھاگئے ہمارے گلشن کے پھول..... جو آنے والی خوشبو کے امین تھے۔ ان ننھے پھولوں کے لیے دل سے دعائیں ہر دم ہی نکلیں گی۔ محفل یاراں کی طرف کا مزن ہوئے جہاں مختلف علاقوں کے لوگ اپنے علم اور سمجھ کے مطابق بوتلیاں مارتے نظروں کے سامنے آتے اور جاتے رہے۔ کیوں نہ اب ہم بھی اس محفل کا حصہ بن جاتے اور کچھ کہنے سے پہلے جاسوسی ڈائجسٹ کے نئے سلسلے کے بارے میں جو سہنس رکھا گیا سہنس کی محفل میں تو ہم اپنے ننھے ذہن کو استعمال کرتے ہوئے رائٹر کا نام بتاتے ہیں وہ ہے جناب کاشف زبیر صاحب۔ آگے اللہ خیر ہی کرے۔ گڑ کھا کے۔ پہلے نمبر پر جناب عبدالجبار رومی براجمان تھے۔ مبارک ہو جناب۔ در ماندہ عشق اپنے خوب صورت انداز کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے بڑھنے ہی دو..... میٹھی اور اچھی چیزیں جتنی زیادہ ہوں کم ہی لگتی ہیں۔ مقابلہ، الیکس کی طویل جدوجہد کامیاب تو رہی پر ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ بعض کامیابیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جو کامیابیاں لگتی ہی نہیں یعنی خوشی میں بھی غم کا ساں ہوتا ہے۔ دل جو ان ہو تو ہر چیز ہی ٹھکری ٹھکری ہی لگتی ہے۔ سودائے جنوں، کافی ٹھکرتی جا رہی ہے۔ ہر ایک مشکل اور جان لیوا امتحانات سے گزر رہا ہے۔ کامیابی کافی دور کھڑی کسی الہز و شیزہ کی طرح اکھیلیاں ہی کر رہی ہے۔ رشتہ، کافی بور اور نا سمجھ آنے والی اسٹوری رہی۔ معاف کرنا سوچو رنگ اور مرزا امجد بیگ کے زہر لے لے اور دلچسپی سے بھر پور مجلسوں نے ذہن کو کافی سرور کیے رکھا۔ ہم بھی بیچ میں ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔ دھماکا خیز مختصر مگر حیران کن تحریر تھی۔ اختتام پر یہ پڑھ کر فیسی پا کر نکل آئی اور وہ بھی ہنسنے لگی..... اے کہاں بھاگے جا رہے ہو..... اتنی جلدی کیا ہے۔ باطل تھا کیا وہ..... بے شک بزدل تھا۔ شعبہ ہاڑ کی بازیاں بھی چھائی رہیں۔ لٹلے بے چارہ..... آخری صفحات کو بھی جلدی جلدی پڑھا کیونکہ آخری صفحات کو ہم پہلے سے ہی پڑھ لیتے



ہیں تاکہ دل نہ چلے اور..... جو بل چکا وہی بہت ہے۔ دشمنوں کے درمیان رہ کر اخلاقیات کا درس بھی ملتا رہا۔ واقعی حیران کروینے والے واقعات امر کو پیش آتے رہے۔ بے پروائی کی انتہا جتنی ہمارے پاست دان کر رہے ہیں، اتنی تو جنگل میں بھی نہیں ملتی۔ مجبوری، پروریس جانے والے ماں باپ کی طرف سے اکثر غافل ہو جاتے ہیں، باہر کی رنگینیوں میں رنگ کر والدین جیسے مقدس رشتے کو بھلا دیتا آج کل کی بے خبر نسل میں کوئی بڑا کام نہیں رہا۔"

محمد زریان سلطان، اردو بازار کراچی سے محفل کی رونق بڑھانے چلے آ رہے ہیں۔ مارچ کا شمار اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ پڑھا، مزہ آیا۔ تاریخی کہانی کا تسلسل اور سوائے جنوں کا بے باک انداز دل کو بھاتا ہے۔ ماروی البتہ ذرا الٹی چل رہی ہے۔ ہمارا خط جن جن دوستوں نے سراہا، ہم ان کے دل سے شکر گزار ہیں۔ یہی آپ کی محبت اور اس محفل کا اصل رنگ ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑا ہوا ہے۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کو ضرور لائیں یا کوئی سلسلہ شروع کروائیں۔ پلیز۔"

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے چلے آ رہے ہیں "سرورق مارچ کے مہینے کی مناسبت سے گندی حسینہ سے مزین تھا۔ پس منظر میں احسان عمر پڑوسیوں کی ڈور بتل بھا کر بھاگنے کی کوشش میں نظر آئے۔ جون ایلیا کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہیں گے کہ کسی بھی چیز کا درست استعمال ہی اسے سامتی بناتا ہے۔ ادارہ معاشرتی شکایات کا ترجمان رہا پٹرول کی قیمتیں نصف ہونے کے باوجود کرایہ وہی ہے ٹرانسپورٹر معمرات کا کہنا بھی درست لگتا ہے کہ ہمیں تو آتا، وال، چاول، مہینی، پکلی قیتوں پر ہی مل رہا ہے تو کرایہ کیسے کم کر دیں۔ عبدالبہار رومی کرسی صدارت پر براجمان تھے مبارک کاں بھی اور گزشتہ شمارہ سال کا دوسرا شمارہ تھا پہلا نہیں۔ محمد صفر محادیہ اسرورق حسینہ خانیوال کے 4 حسین نوجوانوں کو محفل میں دیکھ کر شاید حیران ہو رہی ہے اور تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ محمد قاسم رحمان اول و دماغ کا مجموعہ جانا اچھی علامت نہیں دل تو چلو مجموعہ جانے دماغ کا مجموعہ جانا ٹھیک نہیں۔ ایلیا! انٹل تو ایک کھلا راز ہے اور صدارت صرف اچھے نام سے نہیں جامع تبرے سے ملا کرتی ہے۔ رمضان پاشا! انکساری اچھی چیز ہے مگر اس قدر عاجزانہ اظہار وہ بھی خواتین کے سامنے انہیں شیر کرنے کے مترادف ہے اس لیے ہتھ ڈرا ہوا لائیں۔ مرزا طاہر الدین بیگ! لفظ کاش بتا ہی بعد کے لیے ہے تو زائدہ کے منہ سے پہلے کیسے ادا ہوتا۔ کاش تو سناج کے بعد ہی بولا جاتا ہے۔ ماریہ خان! تاریخی کہانی کے لیے تو صفحات مخصوص ہیں تاریخی تیروں کے لیے نہیں۔ تمام شہداء اور آپ کے کڑو کی مغفرت کی دعا ہے۔ اسما عبدالغفار انصاری آخری پڑھتے ہوئے آکھ میں آنسو آ جانا تو روزمرہ کی بات ہے مزہ ہے کہ انسان روزمرہ معاملات میں بھی حساسیت برقرار رکھے۔ بشری افضل! آپ کی مشیرہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ احسان عمر! آپ کے تبرے میں ایک مصنف کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے الیاس بیٹا پوری کی تاریخی کہانی در ماندہ عشق پڑھی۔ شادی کے نام سے بھی دور بھاگنے والے داؤد کو 2 شادیاں کرنی پڑیں۔ نظام نے دولت کی ہوس میں جو کھیل کھیلنا بہت گھٹا نہ تھا۔ مرزا امجد بیگ کی دیکھ بھی در ماندہ عشق کی طرح دولت کی ہوس میں مکر وہ کھیل کھیلنے والوں کا قصہ عبرت تھا۔ نظام بھائی کی جگہ یہاں شاہد بھائی اپنے مکر وہ کردار کے ساتھ موجود تھے۔ انجام کار ذلت مقدر بنی۔ سوائے جنوں پہلی قسط سے ہی تیز رفتار اور پراثر جاری ہے۔ آزادی کے متوالے ہر دنیاوی رشتے اور مفاد کو بھول کر صرف وطن کی خاطر سر پر کفن باندھے مہیوئی طاقتوں سے نبرد آزما نظر آئے۔ ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ ماروی میں نواب صاحب بہتری لانے کی جو کوشش کر رہے ہیں اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ دو ایمان ملی دشمنوں کو یقیناً پکڑانے میں کامیاب رہے ہیں۔ مراد فرہادی تیور جتا جا رہا ہے۔ آخری صفحات پر منظر امام کی سفر در سفر میں سوائے جنگل کے کچھ بھی فطری نظریں آیا۔ تہاچی کی قربانی امر کو ایس مہذب دنیا میں لے آئی۔ تہاچی کا یہ جذبہ قابل تحسین رہا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی مجبوری نے بے پناہ متاثر کیا۔ اولاد کے لیے ہر قربانی دینے والے والدین بڑھاپے میں کیسے تہوارہ جاتے ہیں جیسے ان کا کردار اب ختم ہو چلا ہو۔ دھماکا خیز میں میکا گونی آخر کار دھماکا خیز بنا نظر آیا۔ جب آخر میں اس نے بتایا کہ ہم ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے تو مقابل کی دوڑ نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔"

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لے سے تبرہ کر رہے ہیں "اس بار سسٹن 22 کو ملا۔ اتنی کتر نہیں ارسال کیں۔ چلو اس بار ہماری بھی سنی گئی۔ سچ کہوں تو اس بار دونوں قسط دار کہانیوں میں کوئی خاص مزہ نہیں تھا۔ ماروی محب ڈگر پر چل پڑی ہے۔ خواجہ باقی باللہ کا قصہ اچھا لگا۔ سفر در سفر میں منظر امام نے افریقی ماحول اور دم و رواج سے آشنائی کروادی۔ جون ایلیا "تم کھلائی نہیں ہو" اذیت کے نئے پہلوؤں سے آشنا کروا گئے۔ عبدالبہار رومی انصاری بڑے خوب صورت انداز میں تبرے کرتے ہوئے نظر آئے۔ محمد خواجہ بھی قوم کی ترقی کے طالب نظر آئے۔ تاہم یہ سب تب ہی ممکن ہے جب ارباب اختیار کوئی توجہ کریں۔ رضوان تنولی اگر سرورق کی حسینہ سچ میں اگر کوئی زندہ لڑکی ہوتی تو آپ پر فدا ہو جاتی۔ ماریہ خان کیسے کیسے تاریخی خطوط؟ بہر حال خوش آمدید۔ احسان عمر! آپ کو سسٹن نام پر ہی مل جاتا ہے کیا بات ہے آپ کی۔ اچھا تبرہ تھا۔ سفیان آفاقی کی وقایہ پر تہ دل سے ان کے ہمسایگان کے فم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ انگارے کے مصنف میرے خیال میں ہمارے محبوب مصنف جناب طاہر جاوید مغل صاحب ہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل ہو سکے۔
دکم احمد خان، خانہال، امتیاز احمد، بہاولپور، نور الدین، سا لکوٹ، شادیہ کمال، کراچی، مجاہد علی، حیدر آباد، محمد انور، میانوالی، خواجہ اظہار، فیصل آباد، نور اللہ، حفیظ، آدم، مہرباب احمد، ملک، گلستان، جوہر، کراچی، طاہرہ تبیس، اسلام آباد، یاسمین بانو، لاہور

درماندہ عشق

ایسا سیتا پوری

تیسرا اور آخری حصہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دنیا میں سب سے مضبوط اور مخلص رشتہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا بنایا ہے... اس حقیقت کا ادراک ہر اس شخص کو بہ خوبی ہوگا جس کے سر پر یہ سایہ موجود نہیں، والدین... جو اپنی اولاد کو زمانے کی تپتی دھوپ اور راہ میں بچھے کانٹوں سے بچا کر اپنی شفقت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں، بس یہی دکھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنتا جا رہا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا جنہیں اس پر ظلم ڈھاتے وقت نہ تو انسانیت کا سبق یاد رہتا ہے اور نہ ہی عذاب الہی کا خوف... تاریخ گواہ ہے کہ ایسے کتنے ہی کرداروں نے اپنی تمام مائیگی کو اپنی ایسی طاقت بنا لیا جس سے نہ صرف زمینی مملکتیں بلکہ دل کی دنیا بھی تسخیر کر لی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی داستان رقم کرنے نکلا تھا جس کا ہر لفظ ایک الگ ہی معنی میں ملبوس تھا۔ جس کے ہر موڑ پر تحیر و اسرار پوشیدہ تھے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بھید بھری شخصیت نے ایک اور ہی روپ دھار لیا جس کے باعث تاریخ نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا کیونکہ... اس کی زندگی کے نشیب و فراز سب سے جدا تھے۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اشواقات

ملا مت کی بو چھاڑ ہو جائے گی لیکن نظام اس داؤ کو استعمال کرنے کی تدبیریں برابر سوچ رہا تھا۔ کیفیہ نے شازیہ کو فیروز بخت سے قریب کرنا شروع کر دیا کیونکہ اب وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر فیروز بخت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی تھی۔ وحی احمد دور بیٹھا کیفیہ کے ارادے سے باخبر، اسے ناکام کر دینے کی تدبیریں کر رہا تھا اور فیروز بخت کو سارہ سے وابستہ کر دینے کے چکر میں تھا۔ فیروز بخت چند ماہ تو ان دونوں کے ارادوں کی سنگینی اور نزاکت کا اندازہ نہیں لگا سکا لیکن پھر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کے سامنے ایک نیا محاذ کھل چکا ہے۔ فیروز بخت کے سامنے شازیہ بھی تھی اور سارہ بھی۔ دونوں ہی خوب صورت تھیں لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ کس کو قبول کرے اور کس کو مسترد کر دے۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ اور قسمت کے نشیب و فراز نے اس

اب فیروز بخت خود کو آزاد اور خود مختار محسوس کرنے لگا تھا۔ احساس محرومی اور قسمت کی بے اعتمادی کے نتیجے میں جو مایوسی اور قنوطیت اس کے دل و دماغ میں سایا گئی تھی، اب وہ بادل کے عارضی سائے کی طرح دور ہو رہی تھی اور اس کی جگہ اعتماد پیدا ہو رہا تھا۔ اسے داؤد کی موت کے غم سے زیادہ داؤد کے دو تہائی ورثے کی حصولیابی کی خوشی تھی۔ کیفیہ اور زجس اس خوش فہمی میں جلتا تھیں کہ فیروز بخت ان کے خلاف نہیں جائے گا اور اس نادان نو عمر لڑکے کو... بے وقوف بنا کر عیش و عشرت میں گزر بسر کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ کیفیہ کی لڑکی شازیہ بلوغت کی منزل میں تھی اور یہ نظام کی بیٹی تھی لیکن وہ اس کا اعلان نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ یہ اعلان کر دے کہ شازیہ اس کی بیٹی ہے اور کیفیہ اس کی بیوی رہ چکی ہے تو اس پر ہر طرف سے لعنت



کو دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ سمجھ دار کر دیا تھا۔
کیفیہ کی ناراضی کا یہ مطلب تھا کہ اس کی گھریلو زندگی اور
گھر کا سکون برباد ہو جائے گا اور سائرہ کو رد کر دینے کا
مطلب تھا کہ وہ اپنی کاروباری دنیا میں مصیبتوں اور
پریشانیوں کو دعوت دے۔۔۔

وہ بھی کبھی سورت بندر بھی جاتا اور وہاں اپنے
کاروبار کی نگرانی اور فروغ کے لیے عملاً حصہ لیتا۔ اس
دوران اس میں خدا ترسی اور رحم دلی عروج کو پہنچ گئی تھی۔ وہ
حاجت مندوں اور ناداروں کی بڑی فراخ دلانہ مدد کرتا اور
آہستہ آہستہ اس کا اتنا شہرہ ہوا کہ اس کے پاس دور دور سے
اہل احتیاج آنے لگے۔ وہ ہفتے میں ایک بار احمد آباد کے
مضافات میں چلا جاتا اور وہاں ناداروں اور غریبوں کی خفیہ
مدد کرتا رہتا۔ اس نے ان کی فہرستیں تیار کر لی تھیں اور ان کو
جو بھی مدد دی جاتی براہ راست دی جاتی تھی۔

اس طرح کئی سال بیت گئے اور کمزور فیروز بخت
ایک طاقتور جوان ملک التجار کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔
تاجروں میں احمد بھی اس کو اسی حیثیت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ
فیروز بخت کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ اب ستار کو
فیروز بخت کی خدمت میں ایک خاص عزت حاصل تھی۔
کاروباری حویلی کے جملہ فشی، اہلکار، گماشتے اور کارندے
فیروز بخت کے تابع فرمان ہو چکے تھے۔ نظام بدستور ایک
معمولی گماشتہ تھا۔ کیفیہ اور نرجس کی ہدایات کے پیش نظر
فیروز بخت اس سے ہر وقت چوکنہ اور ہوشیار رہتا مگر نظام
ابھی تک جوڑ توڑ میں مشغول تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش
میں تھا جب وہ مفید مطلب کیفیہ، نرجس یا فیروز بخت پر ایک
بھر پور وار کر سکے لیکن وہ موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

فیروز بخت ہر سال داؤد کی یاد مناتا اور خیرات اور
صدقات کے دریا بہا دیتا۔ دو تین سال تک تو کیفیہ اور نرجس
نے اس کو بے تحاشا خیرات اور صدقات سے روکنے کی
کوشش کی لیکن وہ دونوں اس کو اس سے باز نہیں رکھ سکیں۔
داؤد کا ربیع الثانی کی پانچ تاریخ کو انتقال ہوا تھا اور کافی
عرے بعد اس سال پانچ ربیع الثانی مارچ کے آخری ہفتے
میں پڑی تھی۔ موسم بہار میں درختوں نے پرانا لباس اتار کر
نیا زیب تن کر لیا تھا۔ وہ اس یادگار تاریخ کا بڑی بے چینی
سے انتظار کر رہا تھا۔ اس دن اس نے شاندار اور مزے دار
کھانے پکوائے۔ حویلی کے باہر شامیانوں کا جنگل کھڑا
کر دیا گیا اور شہر بھر کے حاجت مندوں کو مطلع کر دیا گیا کہ
شامیانوں کے نیچے مہمانوں کی طرح آکر بیٹھ جائیں اور کسی

سے بھی کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

عزیزوں، رشتے داروں اور دوسرے معزز مہمانوں
کا حویلی کے اندر ہی انتظام کر دیا گیا تھا۔ ان مہمانوں میں
سعدیہ اور نظام بھی شامل تھے۔ سعدیہ نے ایک مدت
بعد فیروز بخت کو دیکھا تو اس کے دلکش خدو خال اور حسین
روپ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔

پانچ ربیع الثانی کو صبح ہی سے دیکھیں چڑھ گئیں اور
شامیانوں کے بغلی میدان میں دیکوں کے نیچے سے دھواں
اٹھنے لگا۔ دوپہر کو ناداروں اور غریبوں کو پیٹ بھر کا کھانا
کھلایا گیا اور انہیں شام کے کھانے کے لیے بھی روک لیا
گیا۔ غریبوں کے مزے آ گئے تھے۔

ستار نے فیروز بخت کو بلا کر یہ دلچسپ منظر دکھایا کہ
دیکھو بھوکے اور نادار کس طرح اضطراب، اضطراب اور بے
صبرے پن میں محفلوں کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیتے
ہیں۔ فیروز بخت، داؤد کے سوگ میں افسردہ واداس چہرہ
لیے شامیانوں کے قریب ایک موٹے رے کے پاس
کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگا۔

کھانے کے بعد فیروز بخت نے نقدی کی تقسیم شروع
کردی۔ اس تقسیم پر جگہ جگہ جھگڑے شروع ہو گئے اور
ناداروں کی حرص و ہوا میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ اسی عالم میں
ایک نوجوان خوب صورت لڑکی اس کے روبرو آکھڑی ہوئی
اور بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔ ”نوجوان
تاجر! خدا تجھے دونوں جہاں میں سرخرو کرے۔ کچھ مجھ پر
بھی کرم ہو جائے۔“

لڑکی کی آواز میں جو کھنک اور کشش تھی، اس نے فیروز
بخت کو کہیں کا نہ رکھا۔ اس نے لڑکی کو بے اختیار دیکھا اور اس
کے مسکراتے چہرے اور شوخ و شریر آنکھوں میں معلوم نہیں کیا
کچھ تھا کہ فیروز بخت سب کچھ بھلا بیٹھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ
وہ ناداروں اور غریبوں میں داؤد مرحوم کے نام پر نقد رقم تقسیم
کر رہا ہے۔ لڑکی نے فیروز بخت کو اپنی طرف کھٹکتی باندھے
دیکھتے جو محسوس کیا تو شوخ لہجے میں کہا۔ ”نوجوان تاجر! تو کہاں
گم ہو گیا؟ اپنا کام کر اور میرا پلو بھر دے۔“

فیروز بخت چونک کر ہوش میں آ گیا۔ اپنے آس پاس
موجود حاجت مندوں کی پروا کیے بغیر لڑکی سے
پوچھا۔ ”لڑکی! کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تو کون ہے؟“
”کیوں نہیں۔“ لڑکی شوخی اور شرارت پر آمادہ
تھی۔ ”کیا تجھ کو نظر نہیں آ رہا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور اگر
میں یہ فرض بھی کر لوں کہ تو اندھا ہے تب بھی تو نے میری

آواز تو ضرور سنی ہوگی اور میری آواز سے تجھے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں ایک لڑکی ہوں۔“

فیروز بخت نے کھسکا کر جواب دیا۔ ”نہ تو میں اندھا ہوں اور نہ ہی بہرا۔ میں تجھے دیکھ بھی رہا ہوں اور تیری آواز بھی سن لی ہے اور میں یہ بات پورے یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تو نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اسی لیے میں تجھ سے تیرا تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک بڑے میاں نے اپنے پیچھے موجود حاجت مندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”برخوردار! یہ تم مخیری کر رہے ہو یا عشق و محبت۔ ہم سب کو دے دلا کر رخصت کرو۔ اس کے بعد اس چھوکری سے اطمینان کے ساتھ معاشرۂ لڑاؤ۔“

فیروز بخت پانی پانی ہو گیا۔ لڑکی سے کہا۔ ”لڑکی! میں تجھے یوں نہیں جانے دوں گا۔ کیا تو اجازت دے گی کہ میں ان سب کو دے دلا کر اطمینان سے تجھ سے باتیں کروں؟“

لڑکی نے کئی بار بڑی بڑی پلکیں جھپکائیں اور فس کر کہا۔ ”تو مجھ سے کس قسم کی باتیں کرے گا؟ اور مجھے یہاں کتنی دیر رکنا ہوگا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”بمشکل نصف ساعت۔“

فیروز بخت بڑی تیزی سے رقوم تقسیم کرتا رہا اور نصف ساعت میں اس کام سے فارغ ہو گیا۔ حاجت مندوں اور ناداروں کے چلے جانے کے بعد شامیانے اجڑ گئے۔ ہر طرف سکوت اور سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی ایک شامیانے کے نیچے دری پر بیٹھی فیروز بخت کا انتظار کر رہی تھی۔ فیروز بخت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہا۔ ”بھدا میں تو تیرا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چکی تھی لیکن یہ تو نے کیا کیا کہ.....“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”لڑکی، تیرا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”فرخندہ..... مگر تو نے میرا نام کیوں پوچھا؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! تو مجھ پر اعتبار کر میں کوئی غلط نو جوان نہیں ہوں۔“

”میں کیا جانوں تو صحیح نو جوان ہے یا غلط کیونکہ میں تجھ سے ذرا بھی واقف نہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ تو کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر تجھ میں یہ بات تو اچھی نہیں کہ نو جوان لڑکیوں کو نذیریوں کی طرح دیکھنے لگتا ہے۔“

فیروز بخت نے پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”مجھے حیرت ہے کہ یہ اسم باسکی تجھے کہاں سے عطا ہوا۔ بہر حال اب

مجھے یہ بتا کہ کہاں سے آئی ہے اور کیا چاہتی ہے؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”سادہ لوح تاجر! تو ان چکروں میں خواجواہ پڑ رہا ہے۔ جس طرح تو نے دوسروں کو دے دلا کر رخصت کر دیا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی کر اور مجھے اپنے گھر جانے دے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! میں نے تجھے روکا ہی کب ہے۔ میں نے ناداروں، حاجت مندوں اور بیواؤں کی ایک فہرست بنا رکھی ہے اس لیے میں ہر وقت اس فہرست میں اضافے کے لیے بے چین رہتا ہوں۔“

فرخندہ نے نیکی نظروں سے فیروز بخت کو گھورا، بولی۔ ”تو اس فہرست میں میرا نام بھی لکھ لے لیکن یہ میرا دعویٰ ہے کہ تو میرے گھر تک نہیں پہنچ سکے گا کیونکہ جن کھنڈرات میں، میں ٹھہری ہوئی ہوں وہاں تک میری یا کسی اور کی مدد کے بغیر پہنچنا مشکل ہے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میں تیری پناہ گاہ تک پہنچنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہوں لیکن پہلے چند سوالوں کے جوابات تو دے دے۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”پوچھ، کیا پوچھتا ہے؟“

فیروز بخت نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ تاجر وصی احمد آ گیا۔ وہ دوری سے کہتا ہوا آیا۔ ”فیروز بخت! تو یہاں ہے۔ میں تو تجھے بہت دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔ یہاں تو کیا کر رہا ہے؟“

وصی احمد نے یہاں جو منظر دیکھا تو دل پر چوٹ سی لگی۔ دونوں کی نظروں میں جو کچھ تھا، وصی احمد نے بھی پڑھ لیا۔ فرخندہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”لڑکی تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟“

فیروز بخت گھبرا گیا، اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کو روپوں سے بھر دیا اور فرخندہ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”سردست یہ لے جا، میں نے تیرا نام بھی فہرست میں شامل کر لیا ہے اور آئندہ تجھے زحمت نہیں کرنا پڑے گی، میں خود ہی بھجوا دیا کروں گا۔“

فرخندہ بھی وصی احمد سے گھبرا گئی۔ روپوں کا رومال قبضے میں کیا اور رات کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گئی۔

فرخندہ چلی گئی لیکن فیروز بخت اور وصی احمد دونوں ہی کو ابھن میں ڈال گئی۔ فیروز بخت کو فرخندہ کے خلیعے نقوش اور دلکش خدو خال شکار کر چکے تھے۔ وصی احمد کی چالاک اور معاملہ فہم نظروں نے فیروز بخت کے ان احساسات اور جذبات کو خوب سمجھ لیا تھا جن میں وہ جکلا ہو چکا تھا۔ اس نے

سائرہ کو تجھ سے وابستہ کر دینا چاہتا تھا لیکن اگر تو نے اس بھکارن کے بارے میں سب کچھ بتانے سے گریز کیا تو میں مجبوراً اپنا فیصلہ بدل دوں گا اور سائرہ کے لیے کسی اور کا انتخاب کر لوں گا۔“

فیروز بخت نے خاموشی اختیار کی اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وحی احمد کو اور زیادہ غصہ آ گیا۔ وہ بھی غصے میں پاؤں پٹختا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

☆☆☆

فرخندہ کا چھوڑا ہوا اثاثہ وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس رات تو وہ اچھی طرح سو بھی نہ سکا۔ ساری رات ٹوٹ ٹوٹ کر نیند آتی رہی۔ صبح اٹھا تو اداس اداس تھا۔ وہ ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے کاروباری حویلی بھی نہیں گیا۔ نرجس اور کیفیہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ فیروز بخت مرحوم داؤد کے سوگ میں ملول اور افسردہ ہو گیا ہے۔ فیروز بخت نے اپنے دکھ کو ہر کسی سے چھپائے رکھا۔ بار بار اندر سے کوئی اکساتا اور مجبور کرتا کہ فرخندہ کو تلاش کر لیکن جب بھی تلاش کے ارادے سے اٹھنا چاہتا تو یہ سوچ کر رک جاتا کہ کہاں تلاش کرے، اس کا تو کوئی پتا ہی نہیں۔ پھر اچانک یاد آیا کہ اس نے اپنے مسکن کے ساتھ کھنڈرات کا ذکر کیا تھا لیکن اس مبہم پتے و نشان کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ احمد آباد کے مضافات سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ وہ ان کھنڈرات کا کسی سے ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس راز کے افشا سے ڈرتا تھا۔

دوسرے دن وہ پھر کاروباری حویلی نہیں گیا۔ تیسرے دن قرار جو آیا تو وہ بادل ناخواستہ اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ اپنے اہل گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ لوہار کو اس نے لال لال لوہے کو گھن سے ضربیں لگاتے دیکھا۔ لوہار کا لڑکا سنسی سے آگ جیسے لوہے کو دبائے ادھر ادھر حرکت دے رہا تھا اور باپ گھن چلا رہا تھا۔ لوہار کی دکان سے ذرا آگے کہہار کی دکان تھی اور کہہار اپنے چاک پر برتن بنانے میں مشغول تھا۔ فیروز بخت ان کی دل جمعی اور اطمینان پر رشک کرنے لگا اور اس نے سوچا۔ ”اے کاش یہ سکون اور یہ اطمینان مجھے بھی ملا ہوتا۔“

قریب کے بازار میں بڑی چہل چہل بھی اور لوگوں کے شور و غل اور چلتے پھرنے کی آوازوں سے پورا بازار گونج رہا تھا مگر وہ فرخندہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا کاروباری حویلی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

بازار کے بعد امرا کے مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور

فیروز بخت اور فرخندہ دونوں ہی کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے جذبات محسوس کیے تھے۔ وہ بڑے تکلف وہ تھے اور ان کی موجودگی میں اس کی لڑکی سائرہ کا مستقبل تاریک ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بمشکل فیروز بخت سے پوچھا۔ ”فیروز بخت! یہ لڑکی کون تھی؟“

فیروز بخت نے گم سم لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا۔“ وحی احمد نے غیر مطمئن لہجے میں پوچھا۔ ”اگر تم اسے جانتے نہیں تو تم نے اس سے یہ کیوں کہا کہ آئندہ اسے زحمت نہیں کرنا پڑے گی، بلکہ تم خود ہی بھجوا دیا کرو گے؟“ پھر پوچھا۔ ”وہ کہاں رہتی ہے؟“

”میں یہ بھی نہیں جانتا۔“ وحی احمد نے ترش لہجے میں کہا۔ ”فیروز بخت! جھوٹ تم بول رہے ہو اور شرمندگی میں محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم یہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں رہتی ہے تو تم نے یہ وعدہ کیوں کر لیا کہ آئندہ زحمت نہیں کرنی پڑے گی تم خود بھجوا دیا کرو گے؟“

فیروز بخت نے جواب نہیں دیا بلکہ وہ دونوں ایک ایسے کمرے میں بیٹھ گئے جہاں سے ان کی آواز دوسروں تک نہ پہنچ سکے۔ کچھ دیر تک دونوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر وحی احمد نے بات چیت کی ابتدا کر دی اور فیروز بخت سے کہا۔ ”ہاں فیروز بخت! میں چاہتا ہوں آج تم سے کچھ دیر باتیں کر لوں۔ وہ باتیں اتنی اہم اور ضروری ہیں کہ اب میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”جو باتیں آپ کریں گے میں جانتا ہوں۔ آپ یہی کہیں گے نا کہ میں سائرہ سے جلد از جلد شادی کر لوں۔“

وحی احمد نے کہا۔ ”ہاں، میں یہی کہتا ہوں کہ اب اپنا وقت نہ برباد کر۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گا۔“

وحی احمد نے کہا۔ ”جو کچھ اس وقت تم کہہ رہے ہو، اس کو میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا جب تم اس فقیرنی سے باتیں کر رہے تھے اور اگر میرا اندازہ درست ہے تو تم اس کو کافی دنوں سے جانتے ہو اور یہ تمہاری پہلی ملاقات نہیں تھی۔“

فیروز بخت نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”آپ نے جو کچھ کہا میں نے سن لیا۔“

”جھوٹ، سرتاپا جھوٹ۔“ وحی احمد اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ”فیروز بخت! میں نے تیری سرپرستی کی ہے اور تجھ پر میری مہربانی کی یہ انتہا تھی کہ میں اپنی بیٹی

یہاں نسبتاً سکون تھا۔ بڑی بڑی حویلیوں کے پھانک پر کئی کئی خدمت گار اور پہرے دار چار پائیوں پر براجمان خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اس نے یہیں ایک عظیم الشان حویلی سے فرخندہ کو نکلے ہوئے دیکھ لیا۔ حویلی سے وہ تنہا نکل گئی۔ فیروز بخت کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اس نے تیزی سے گھوڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔ گھوڑا اس کے قریب جو پہنچا تو فرخندہ نے وحشی ہرنی کی طرح بچ کر ایک طرف نکل جانا چاہا لیکن فیروز بخت نے ادھر بھی پیچھا کیا اور فرخندہ کے سامنے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روک دیا۔ فرخندہ بڑے غصے میں تھی، بولی۔ ”اے شخص! تو یہ کس قسم کی حرکت کر رہا ہے؟“

فیروز بخت بے اختیار گھوڑے سے کودا اور فرخندہ کے سامنے جا کھڑا ہوا، بولا۔ ”یہ میں ہوں فرخندہ! بخت میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تجھے ایک بار پھر پالیا۔“ فرخندہ نے شوخی سے اس کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر بولی۔ ”واللہ اگر اس وقت تو نہ ہوتا تو میں جو بھی ہوتا اس کی چاند ماری ضرور کر دیتی۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! اس وقت میں تم سے تمہارا پتا معلوم کر کے رہوں گا۔“ فرخندہ نے کہا۔ ”یہیں کھڑے کھڑے کیا باتیں کروں اور تیرے سوالات کے کیا جواب دوں؟ کہیں بیٹھ کر باتیں کر چل کے۔“

فیروز بخت نے لحوں میں فیصلہ کر لیا۔ ”کیا تو مجھے اپنے گھر لے چلے گی؟“

فرخندہ نے بڑی بے مروتی سے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تجھے اپنے گھر ہرگز نہ لے جاؤں گی۔“

فیروز بخت ایک پام کے سائے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”فرخندہ! سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تجھ سے کیا کہوں؟“

فرخندہ نے شرارت سے کہا۔ ”جو کچھ کہنا ہے، اس میں شرمنا کیسا؟“

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے فرخندہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن فرخندہ نے ہاتھ کھینچ کر پیچھے کر لیا، بولی۔ ”بری بات، کوئی دیکھ لے گا۔“

فیروز بخت ڈر کر ہاتھ کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس قسم کی باتیں کرے۔

فرخندہ نے ہنس کر اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ”اس دن میں پوری رات سوئی تھوڑی، بس ٹوٹ ٹوٹ کر نیند آتی رہی، معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟“

فیروز بخت نے ہمت کر کے جواب دیا۔ ”فرخندہ

بچ! یہی میرا بھی حال تھا اور میں آج تک یہی سوچ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟“

فرخندہ نے پوچھا۔ ”میں نے کئی بار تیری حویلی میں آنے کا ارادہ کیا لیکن میں اس شخص سے ڈر گئی جو اس دن بھی مجھے اس طرح گھور رہا تھا گویا اس کا بس چلے تو میرا کام تمام کر دے۔“

فیروز بخت نے بات بنائی۔ ”فرخندہ! وہ میرے چچا ہیں اور انہوں نے نہایت صغیر سنی سے مجھے پالا ہے۔ اس لیے میں ان کا احترام کرتا ہوں اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”جب تو اپنے چچا سے اتنا ہی خوفزدہ رہتا ہے تو کوئی اور چیز تو تیرے بس کی ہے ہی نہیں جس کو دیکھ کر میں یہ سمجھوں کہ تو آگے بڑھنے کی روح اپنے سینے میں چھپائے رکھتا ہے۔“

فیروز بخت نے ہمت کر کے فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن وہ اداس بہت تھی۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ”ہاں، اب بتا تو مجھ سے کتراتی کیوں ہے؟“

فرخندہ نے کہا۔ ”دیکھ نو جوان! عقل مند وہی ہے جو ہر کام کے مال پر نظر رکھے۔ کبھی تو نے اس پر بھی غور کیا کہ ہم دونوں کا معاشرے میں کوئی جوڑ نہیں۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”فرخندہ! تو شاید نہیں جانتی کہ میں خود بھی ایک معمولی گھرانے کا فرد ہوں۔ میرے ماں باپ بڑی کمپرسی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور میں لوگوں کے رحم و کرم پر پرورش پاتا رہا۔“

فرخندہ نے اس کی روداد پر یقین نہیں کیا، سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”تو کسی بھی خاندان کا ہو، مجھے اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ تو اپنے حالات، ماحول اور معاشرے کو سامنے رکھ کر یہ سوچ کہ تیرا مجھ سے ربط و ضبط رکھنا کہاں تک مناسب اور مفید ہے؟“

فیروز بخت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”فرخندہ! میں واقعی ایک بد نصیب انسان ہوں۔ یہ ظاہر تو کتنی سریع الحصول نظر آتی ہے لیکن میرے لیے تو بھی عزیز معرے کم نہیں۔“ اس کا دل بھر آیا اور وہ چپکے چپکے رونے لگا۔

فرخندہ اسے روتے ہوئے دیکھتی رہی پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ قہقہہ مار کر ہنس دی۔ ”کیا بچوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس طرح تو عورتیں بھی نہیں روتیں۔“ فیروز بخت نے کوئی جواب دیے بغیر فرخندہ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ روتا رہا۔

فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ گھوڑے نے اپنے سامنے گھاس کا ایک جنگل جو دیکھا تو

چپ چاپ اس میں گھس کر سم مارنے لگا۔ فرخندہ گھوڑے کی حرکت دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت سے لطف اندوز ہو رہی تھی جو ابھی آیا نہیں تھا۔ وہ باغ کے مالک کو فیروز بخت سے لڑتے جھگڑتے دیکھ رہی تھی۔ فیروز بخت، فرخندہ کے خیال میں گم تھا، اس فرخندہ کے خیال میں جو اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

فرخندہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اک ذرا ٹھہرنا، میں ابھی آئی ورنہ میرا باپ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آجائے گا اور تجھے دیکھ کر بلاوجہ برہم ہوگا اور میں اس سے بہت ڈرتی ہوں۔“

فیروز بخت نے مجبوراً اجازت دے دی، بولا۔ ”لیکن فرخندہ واپس ضرور آنا ورنہ میں تجھے تلاش کرتا ہوا کسی بھی دن تیرے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”نوجوان تاجر! تو ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اس طرح میں بدنام ہو جاؤں گی اور تو میرے باپ یا بھائیوں کے ہاتھوں پٹ سکتا ہے۔“

فیروز بخت نے سخی سے کہا۔ ”فرخندہ! میں ملک التجار ہوں، میں تیرے باپ اور بھائیوں کو مالامال کر دوں گا۔“ فرخندہ زور سے ہنس دی۔ ”ہمیں تیری دولت نہیں چاہیے تو میرے باپ اور بھائیوں سے واقف ہی نہیں، تب ہی تو ایسی باتیں کر رہا ہے۔“

یہ کہتے کہتے فرخندہ باغ کے دروازے کی طرف چل دی، اس کی چال میں گھبراہٹ اور عجلت تھی۔ فیروز بخت نے باغ کے صدر دروازے کی طرف دیکھا تو ایک پست قامت شخص کو باغ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی نظریں فرخندہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دور ہی سے آواز دی۔ ”فرخندہ! تو کہاں چلی گئی تھی۔ میں بڑی دیر سے تجھے تلاش کر رہا ہوں۔“ فرخندہ نے اس کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آئی بابا، آ رہی ہوں۔“

فیروز بخت سمجھ گیا کہ یہ پست قامت گنجا فرخندہ کا باپ ہے۔ اس کی ہمت نہیں پڑی کہ اس سے ملتا۔ فرخندہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے جاتے کئی بار مڑ کر فیروز بخت کی طرف دیکھا بھی لیکن واپس نہیں آئی۔ چونکہ جانے سے پہلے فرخندہ نے واپس آنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لیے وہ وہیں بیٹھ کر فرخندہ کا انتظار کرنے لگا۔

اتنے میں باغبان آگیا اور اس نے گھوڑے کی بے راہ روی پر فیروز بخت کو سخت شرمندہ کرنا چاہا لیکن وہ شرمندہ ہونے کو تیار ہی نہیں تھا۔ باغبان نے تجویز پیش کی۔ ”جناب

والا! تیرے گھوڑے نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ یا تو میرا نقصان بھر دے یا پھر میرے ساتھ قاضی کے پاس چل اور وہ جو فیصلہ کر دے، اس پر ہم دونوں عمل کریں گے۔“

فیروز بخت نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں کہیں بھی تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ شاید تو مجھ سے واقف نہیں ہے۔ میں ملک التجار داد و مرحوم کا بیٹا فیروز بخت ہوں۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے گھوڑے نے تیرے باغ کو نقصان پہنچایا ہے تو میں اس کا نقصان ادا کرنے پر تیار ہوں۔“

باغبان نے حیرت سے کہا۔ ”تو، گویا ملک التجار فیروز بخت تو ہی ہے؟“

فیروز بخت نے باغبان کو پانچ اشرفیاں دیں اور درخواست کی۔ ”میں یہاں کچھ دیر اور ٹھہروں گا۔“

باغبان نے اشرفیاں تو اپنی جیب میں رکھ لیں، ہنستے ہوئے کہا۔ ”شاید تو اس لڑکی کا یہاں انتظار کرے گا جو ذرا دیر پہلے اپنے باپ کے ساتھ چلی گئی ہے۔“

فیروز بخت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ”ہاں، خدا تیرا بھلا کرے، میں اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“

باغبان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ لڑکی اب نہیں آئے گی۔“

”کیوں کیوں، وہ واپس کیوں نہیں آئے گی؟“

باغبان مسلسل ہنستے جا رہا تھا۔ ”جناب! اس نے جاتے جاتے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں یہ خبر ضرور پہنچا دوں اور اس نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ تجھ سے تیرے گھوڑے کے نقصان کا ہرجانہ طلب کروں۔ تو یہ ہرجانہ فوراً ہی ادا کرے گا چنانچہ اس کی دونوں ہی باتیں پوری ہو چکی ہیں۔“

فیروز بخت کو فرخندہ پر بڑا غصہ آیا کہ اول تو وہ اس کو دھوکا دے کر چلی گئی اور دوسری شرارت یہ کہ باغبان کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ وہ دل شکستہ بادل ناخواستہ اٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی کاروباری حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں سنگ احمر کی بنی ہوئی وہ حویلی پھر نظر آئی جہاں سے فرخندہ نکلی تھی۔ وہ دیوانہ وار اس حویلی کی طرف بڑھا اور اس کے صدر دروازے میں بیٹھے ہوئے دربانوں سے پوچھا۔ ”دوستو! کیا تم یہ بتاؤ گے کہ اس حویلی میں کون رہتا ہے؟“

دربانوں نے اسے ذرا غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی، ایک نے جواب دیا۔ ”اس میں سلطنت دہلی کا نائب رہتا ہے لیکن ان دنوں اس میں نائب کا خاندان ٹھہرا ہوا ہے اور خود نائب دہلی گیا ہوا ہے۔“

فیروز بخت کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق فرخندہ اسی نائب کی بیٹی یا بیٹی ہو سکتی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔ ”اس میں فرخندہ بھی رہتی ہے؟“ ایک دربان نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ”فرخندہ..... یہ نام تو آج میں پہلی بار سن رہا ہوں۔“ دوسرے دربان نے بد مزاجی سے کہا۔ ”لیکن تو ہے کون اور شرفاء کی بہو بیٹیوں کے نام کیوں لے رہا ہے؟“ تیسرے دربان نے دوسرے کے کان میں کہا۔ ”کیا تو اس نوجوان کو نہیں جانتا؟ یہ ملک التجار داؤد مرحوم کا محنتی فیروز بخت ہے۔“

دونوں دربانوں کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ وہ خوشامد پر اتر آئے۔ پہلے نے کہا۔ ”نوجوان ملک التجار! ہم شرمندہ ہیں کہ تجھے پہچان نہ سکے لیکن پھر بھی ہمارے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے تو نے ہم سے بات تو کی۔“ دوسرے نے پوچھا۔ ”اس کا کوئی ثبوت کہ یہ نوجوان ہی ملک التجار کا بیٹا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اپنا تعارف میں نے تو نہیں کروایا اور یہ کہ اس کا ثبوت میں دوں بھی کیوں؟ میں نے تم لوگوں سے ایک بات پوچھی تھی اگر اس کا جواب مل جائے تو خوب ورنہ کوئی شکایت نہیں۔“

لیکن تینوں دربانوں نے ٹال دیا۔ ایک نے بقیہ دونوں کی نمائندگی کی، بولا۔ ”مرحوم تجار کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ شرفاء کے مردوں کے بجائے ان کی عورتوں کے پتے معلوم کرے۔“

فیروز بخت واقعی شرمندہ ہو چکا تھا۔ کوئی اور بات کے بغیر وہ اپنی کاروباری حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

کاروباری حویلی میں اس کے ملازمین نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں ستار بھی موجود تھا۔ فیروز بخت نے لوگوں کی پرسش پر اپنے دل پر بڑا بوجھ محسوس کیا اور پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ کارندے، گماشتے، ہرکارے اور منشیوں نے فیروز بخت کو سنبھالے رکھا اور خود بھی رونے لگے۔

اب فیروز بخت نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ احمرین حویلی میں فرخندہ کو کس طرح تلاش کیا جائے؟ یہ سوچ سوچ کر اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ شام سے ذرا پہلے وحی احمد آ گیا اور فیروز بخت کو بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب گیا اور پوچھا۔ ”آج تم آگئے؟ خوب خوب میں تو تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تمہارا گھر پر بھی انتظار ہو رہا ہے۔ سائرہ بہت

بے چین ہے اور تمہیں کئی بار پوچھ چکی ہے۔ ہم سب کو تمہاری صحت کی طرف سے بڑی فکر تھی۔“ فیروز بخت نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں اور سائرہ سے کہہ دیجیے کہ میں دو چار دن میں ضرور آؤں گا۔“

وحی احمد نے اکھڑے اکھڑے لہجے سے دل کی کدورت محسوس کر لی۔ اس لیے کچھ دیر بیٹھ کر خاموشی سے چلا گیا۔

فیروز بخت کا کاروباری حویلی میں ذرا بھی دل نہ لگا اور وہ وہاں سے اٹھ کر ایک بار پھر احمرین حویلی کے سامنے پہنچ گیا لیکن اب وہ تنہا نہیں تھا۔ ستار اس کے ساتھ تھا۔ حویلی کے سامنے تینوں دربان اس وقت بھی موجود تھے۔ انہوں نے فیروز بخت کے گھوڑے سے پہچان لیا کہ ملک التجار کا بیٹا پھر آ گیا ہے۔ ستار سوچ رہا تھا کہ فیروز بخت اس حویلی کے پاس رک کیوں گیا؟

فیروز بخت حویلی سے ذرا دور کھڑے ہو کر ستار سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ستار نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”میرے آقا! آپ یہاں رک کیوں گئے؟ کیا یہاں کسی سے ملنا ہے؟“

فیروز بخت نے گول مول جواب دے کر پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ فیروز بخت کو امید تھی کہ جس طرح ایک بار پہلے فرخندہ اچانک حویلی سے نکلی تھی، اسی طرح دوبارہ بھی نکل سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد دربانوں میں سے ایک دربان فیروز بخت کے پاس آیا اور پوچھا۔ ”ملک التجار! داؤد کے بیٹے تو اس حویلی کے در پر دوبارہ آیا ہے اور اس سے پہلے تو نے کسی لڑکی کا نام بھی لیا تھا۔ کیا پوچھ سکتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟“

فیروز بخت ابھی نا تجربہ کار تھا، گھبرا گیا، بولا۔ ”میں ایک ایسے آدمی کو تلاش کر رہا ہوں جو مجھ سے ادھار مال لے آیا ہے۔ میں اس کا نام تو بھول گیا لیکن اس لڑکی کا نام یاد رہ گیا۔ وہ بار بار اپنی لڑکی کا فرخندہ نام لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میری حویلی کا رنگ سرخ ہے اور اسے عام طور پر لوگ احمرین حویلی کہتے ہیں۔“

دربان نے شاید اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، بولا۔ ”بہر حال میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ نائب السلطنت کی حویلی ہے۔ اس میں فرخندہ نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔ اپنے گاہک کو کہیں اور تلاش کر اور آئندہ اس طرف مت آنا۔“

فیروز بخت نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ ستار، فرخندہ نام کی کسی لڑکی کو اپنے حافطے میں تلاش کرنے لگا۔ کئی دن گزر گئے مگر فرخندہ کا کہیں پتا نہ چلا۔ فیروز بخت چپ چپ اور چڑچڑا رہے لگا۔ جب گھنٹن زیادہ بڑھی اور ضبط برداشت کا یارا نہ رہا تو اس نے ہراز کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ یہ سعادت بھی ستار کے حصے میں آئی۔ اس نے فرخندہ کی بابت ستار کو وہ سب بتا دیا جو جانتا تھا۔ ستار دنگ رہ گیا، بولا۔ ”لیکن میرے آقا! آپ نے داؤد مرحوم سے شادی نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا پھر یہ کس چکر میں پڑ گئے؟“ فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ستار! میرے غم خوار، میرے ہمدرد، فی الحال تو میں اس سے ملنے اور اس سے ربط و ضبط بڑھانے کی خواہش رکھتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی تو خیر ورنہ اس کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔“ ستار نے کہا۔ ”لیکن آپ ایسا نہیں کر سکیں گے کیونکہ تاجروسی احمد اور بی بی کیفیہ اس کی سختی سے مخالفت کر پیں گی اور ان دونوں کی مرضی کے خلاف آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

فیروز بخت نے غصے میں کہا۔ ”ستار! میں نے تجھ پر احسان کیے ہیں ان کا خیال کر اور مجھے فضول مشورے نہ دے۔ اگر فرخندہ کا پتا چل سکتا ہے تو چلا ورنہ خاموش رہ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔“

ستار نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میں آپ کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں اور اللہ نے چاہا تو فرخندہ کا پتا آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”پھر جا اور احمد آباد کے باہر کوئی کنڈرات والی حویلی ہو تو مجھے اس سے مطلع کر۔“ ستار فرخندہ کی تلاش میں اسی وقت چلا گیا۔

سہ پہر کو بے چینی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ وہ فرخندہ کی تلاش میں تنہا نکل کھڑا ہوا۔ وہ پورے احمد آباد میں گھومتا پھرتا رہا لیکن فرخندہ کا کہیں پتا نہ تھا۔

ان دنوں احمد آباد کے مضافات سے کپڑوں کے تھان آئے چلے جا رہے تھے۔ یہ تھان مشرق وسطیٰ کے شہروں میں بھیجے جانے والے تھے۔ اس کام کی نگرانی فیروز بخت خود کر رہا تھا کیونکہ وہ اپنی ساکھ کو نہیں پہچانا چاہتا تھا۔

کپڑوں کے تھان نیل گاڑیوں پر لدے ہوئے تھے اور پندرہ نیل گاڑیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے فیروز بخت ان کے لیے جگہ بنانے لگا جو نیل گاڑی سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ اس کا گاڑی بان ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا

اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ گاڑی بان نے قریب آ کر دریافت کیا۔ ”ملک التجار داؤد کا بیٹا فیروز بخت کہاں ہے؟“ فیروز بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بد قسمی سے وہ میں ہی ہوں۔“

گاڑی بان نے خیریت پوچھی اور کہا۔ ”میری نیل گاڑی کے سائے میں ایک لڑکی آپ سے ملنے کی درخواست کر رہی ہے۔“

فیروز بخت نے سوچا کہ مجھ سے کون لڑکی ملنے آ سکتی ہے لیکن ساتھ ہی فرخندہ کا بھی خیال آ رہا تھا۔ وہ دھڑکتے دل اور لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی بان کے ساتھ اس کی نیل گاڑی تک پہنچ گیا۔ وہاں فرخندہ نیل گاڑی کے نیچے چادر بچھائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوشی سے پھولے نہ کائے۔

فرخندہ نے شوخی سے کہا۔ ”کیوں جی، یہ اچھا واسطہ بڑا ہے کہ تیرے پاس میں تو آ جاتی ہوں مگر تو ایک بار بھی نہیں آیا۔“

فیروز بخت نیل گاڑی کے نیچے جھک گیا۔ ”واہ ایک تو، تو اپنا پتا نہ بتائے اور اس پر میرے نہ آنے کی شکایت بھی کرے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

فرخندہ نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ دور کھڑا جھانک کیوں رہا ہے؟ میرے پاس آ کیوں نہیں جاتا؟“ فیروز بخت نے حیرت سے پوچھا۔ ”تیرے پاس آ جاؤں؟ یعنی نیل گاڑی کے نیچے؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں، نیل گاڑی کے نیچے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”یہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے؟“ فرخندہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”کیوں؟ کیا یہ اتنی بری جگہ ہے، میں جو بیٹھی ہوں۔ اگر یہ کوئی بری جگہ ہے اور تو یہاں نہیں آ سکتا تو میں فوراً ہی چلی جاؤں گی اور پھر بھی نہ آؤں گی۔“

لیکن فیروز بخت کے لیے یہ بڑی تکلف دہ شرط تھی۔ نیل گاڑیاں کاروباری حویلی کے سامنے کھڑی تھیں اور اس کا کاروباری عملہ برابر آ، جا رہا تھا۔ دو منشی ان گاڑیوں کے پاس ہی موجود تھے۔ فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! میں نہیں جانتا کہ یہ تو مذاق میں کہہ رہی ہے یا سنجیدگی سے..... اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ معاشرے میں تیرا اور تیرے خاندان کا کیا مقام ہے لیکن میں خود ملک التجار داؤد کا بیٹا ہوں اور اگر میں تیرے کہنے پر نیل گاڑی کے نیچے تیرے

پاس بیٹھ جاؤں گا تو میں اپنے کاروباری عملے اور دوسرے افراد کی نظر میں ذلیل و خوار ہو جاؤں گا اس لیے اگر تو اپنی یہ شرط واپس لے لے اور بیل گاڑی کے نیچے سے نکل کر باہر آ جا تو میں تیرا شکر یہ ادا کروں گا۔“

فرخندہ برامان گئی اور گاڑی کے نیچے ہی سے جواب دیا۔ ”تب پھر اے ملک التجار کے بیٹے! تو واپس جا، میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ میری طبیعت میں عاجزی ہے، استغنا ہے، عجز ہے، خاکساری ہے اور تیرے مزاج میں کبر ہے، تفاخر ہے، انایت ہے پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ کس طرح چل سکیں گے۔ تیرا راستہ دوسرا ہے، میرا دوسرا۔“

فیروز بخت نے سوچا لڑکی نادان بھی ہے اور سرکش بھی۔ اگر ایک بار روٹھ کر چلی گئی تو پھر کبھی نہیں مانے گی چنانچہ کچھ مزید سوچے بغیر بیل گاڑی کے نیچے چلا گیا اور فرخندہ کے پاس جا بیٹھا۔ گال پر ہلکی سی چپت رسید کر دی، بولا۔ ”اب تو خوش ہوئی تو؟“

فرخندہ نے منہ بتائے رکھا۔ ”خوش کیا خاک ہوں گی۔ اگر تو تامل اور پھر پھر کے بغیر ہی میری بات مان لیتا تو میں بہت خوش ہوتی لیکن تو نے بدرجہ مجبوری، خوف زدہ ہو کر میری بات مانی ہے اس لیے میں خوش نہیں ہوئی۔“

فیروز بخت نے محسوس کیا کہ گاڑی کے باہر اس کو تلاش کیا جا رہا ہے، گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فرخندہ! میں نے تیرا کہا پورا کر دیا اور تیری بات مان لی۔ اب تو بھی میری بات مان لے اور میرے ساتھ باہر نکل چل۔ دیکھ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔“

فرخندہ نے سختی سے جواب دیا۔ ”میں یہیں بیٹھوں گی تو چاہے تو باہر چلا جا۔“

فیروز بخت کا جی چاہا کہ باہر چلا جائے لیکن اس ڈرنے اسے روک دیا کہ فرخندہ ناراض ہو کر ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔

اتنے میں ستار کی آواز سنائی دی۔ ”میرے آقا! آپ کہاں چلے گئے؟“

فرخندہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرگوشی میں بولی۔ ”بولنا مت، دیکھنا ہے وہ تجھے تلاش کر پاتا ہے یا نہیں؟“

پھر ایک منشی کی آواز سنائی دی۔ ”مالک! آپ کہاں ہیں؟ یہ تھان گودام میں رکھے جائیں گے یا سورت بندر جانے والے تھانوں میں شامل کر دیے جائیں گے؟“

فرخندہ نے پھر منع کیا۔ ”خبردار بولنا مت، جواب نہ دینا۔ دیکھنا ہے کہ یہ تجھے کہاں تلاش کرتے ہیں؟“

فیروز بخت پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، ستار تلاش کرتا ہوا ان کی بیل گاڑی کے پاس آ گیا اور پھر معلوم نہیں کس کی نشان دہی پر یا خود ہی دیکھ لیا۔ بیل گاڑی کے نیچے جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے آقا! تو آپ یہاں موجود ہیں مگر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

فرخندہ کو بڑی ہنسی آرہی تھی، فیروز بخت نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ستار سے کہا۔ ”تو باہر کھڑا کیا کر رہا ہے تو بھی یہیں ہمارے پاس آ جا۔“

ستار نے کچھ پس و پیش کیا اور پھر خود بھی ان دونوں کے پاس چلا گیا۔ اب فیروز بخت کو ذرا سکون ملا لیکن یہ سکون زیادہ دیر کے لیے نہیں ملا تھا۔ اب فیروز بخت کو منشی تلاش کرتا پھر رہا تھا اور آخر کار وہ بھی وہیں پہنچ گیا جہاں یہ تینوں جیسے بیٹھے تھے۔

منشی نے یہ تماشا جو دیکھا تو اس کا اپنی آنکھوں کا اعتبار ہی جاتا رہا۔ وہ اس کو فریب نظر سمجھ کر خاموش ہو جانا چاہتا تھا کہ فیروز بخت نے منشی کو آواز دی۔ ”منشی! یہیں میرے پاس آ جا۔“

منشی نے آنکھیں پھاڑ کر خوشامدانہ انداز میں پوچھا۔ ”یہ آپ وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”بس یونہی بیٹھ گیا۔ میں نے کہہ تو دیا کہ تو بھی آ جا۔“

لیکن فیروز بخت نے منشی سے جو کچھ کہا تھا، وہ جواب میں کچھ کہے بغیر ہی حویلی میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد پورے عملے کو بھیج دیا۔ یہ سب بیل گاڑی کے نیچے کا تماشا دیکھ کر بہت محفوظ ہوئے۔ فیروز بخت نے فرخندہ سے کہا۔ ”فرخندہ! مجھ پر رحم کر۔ اب مزید ذلت سے بچا۔“

فرخندہ نے برامان کر کہا۔ ”تو عزت ذلت کا خیال تیرے دل میں اب بھی موجود ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”فرخندہ! یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ میں اسی ماحول اور معاشرے کا ایک فرد ہوں۔ جہاں آدمی کے لیے عزت اور ذلت کے پیمانے موجود ہیں پھر میں خود کو ان سے الگ کس طرح کر سکتا ہوں۔“

فرخندہ نے اور برامانا، بولی۔ ”تب پھر چلا جا، یہاں میرے پاس کیوں بیٹھا ہے؟“

فیروز بخت خاموش رہا۔ آخر ایک منشی نے بیٹھ کر بات چیت شروع کر دی۔ ”مالک! آپ کب تک یہاں بیٹھیں گے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں یہاں ضروری باتیں کر رہا ہوں۔ بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

فیروز بخت نے فرخندہ سے کہا۔ ”فرخندہ! یا تو باتیں کر یا پھر ہنسی خوشی باہر نکلنے کی اجازت دے دے۔“
فرخندہ بے اختیار ہنس دی، بولی۔ ”میں تو تیرا امتحان لے رہی تھی، تو اس میں کامیاب ہوا۔“

کامیابی کے مژدہ نے فیروز بخت کو نہال کر دیا پوچھا۔ ”تب پھر میں باہر نکل سکتا ہوں؟“

”بالکل۔“ فرخندہ نے جواب دیا۔ ”اب میں بھی باہر نکلتی ہوں اور تیری حویلی میں بیٹھ کر تجھ سے باتیں کروں گی۔“

فرخندہ، فیروز بخت اور ستار تینوں باہر نکل آئے۔ فیروز بخت ہمت سے کام لے رہا تھا مگر پھر بھی اپنے عملے

سے نظریں ملاتے ہوئے شرمارہا تھا۔ وہ فرخندہ کو حویلی کے اندر لے گیا۔ ستار اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے

فرخندہ کو پہلی بار دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس کا اعتراف کر رہا تھا کہ فیروز بخت نے فرخندہ کو خواہ مخواہ پسند نہیں کیا

ہے۔ وہ تو اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا ستار نے سوچا تھا۔ فیروز بخت، فرخندہ کو اپنے خاص کمرے میں لے

گیا۔ کبھی اس کمرے میں داؤد بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے ستار کو حکم دیا کہ جب تک میں فرخندہ سے باتیں کروں، کسی کو

کمرے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ میرمنشی نے آگے بڑھ کر دریافت کیا۔ ”جناب والا!

تیل گاڑیوں پر رکھے ہوئے تھانوں کا کیا ہوگا؟“ فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”انہیں حویلی کے گودام

میں رکھوا دیا جائے۔“ حکم دے کر فیروز بخت، فرخندہ کی طرف مڑا۔ اسے

دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔ ”فرخندہ! میرے سر بڑی ذمے داریاں ہیں، تو نے اس کی ہلکی سی جھلک تو دیکھ ہی لی۔“

فرخندہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں تیری باتوں سے مرعوب نہیں ہو سکتی۔ تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! آج میں تجھ کو اس وقت تک روکے رکھوں گا جب تک تو اپنا تفصیلی تعارف نہ

کر دے گی اور اگر اپنی مرضی سے تجھ سے ملنا چاہوں تو کہاں ملوں؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”کہیں بھی نہیں۔ میں خود جو آجاتی ہوں۔“

فیروز بخت بے بس تھا۔ فرخندہ اس کی چلنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ فرخندہ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ چھیڑنے کی خاطر بولی۔ ”نو جوان تاجر! اب میں تجھ

سے نہیں مل سکوں گی۔ ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہے۔“

فیروز بخت گھبرا کر ہوش میں آ گیا۔ وہ فرخندہ کی طرف کھسکا لیکن فرخندہ اس سے دور ہٹ گئی۔ فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! کیا تو نے وہ تڑپ اور کک نہیں محسوس کی جو تیرے لیے مجھ میں پیدا ہو چکی ہے؟“

فرخندہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”نو جوان تاجر! میں اتنی گاڑھی اور گہری باتیں نہیں سمجھتی۔ مجھ سے

سیدھی سادی باتیں کر۔“ فیروز بخت نے پوچھا۔ ”اگر یہ بات ہے تو اس کا یہ

مطلب ہے کہ میں اپنا وقت برباد کر رہا ہوں، اپنی عزت گنوار ہا ہوں اور یہ جو کچھ بھی ہے ایک طرف ہے مگر تو کیوں

مجھ سے ملنے آتی ہے؟“ فرخندہ نے جواب دیا۔ ”تیری دولت کی وجہ سے۔ تو

ذرا رحم دل بھی ہے۔ میں ایک غریب گھرانے کی لڑکی تجھ سے کچھ نہ کچھ مانگنے آجاتی ہوں۔“

فیروز بخت نے غصے میں پوچھا۔ ”اور یہ جو میں تیری خاطر بے عزتی اور ذلت برداشت کر رہا ہوں، کبھی سوچا کہ

ایسا کیوں ہے؟“ اچانک ستار نے دروازے پر دستک دی اور فیروز

بخت کو مطلع کیا۔ ”تاجر وصی احمد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اس سے کہہ دے پھر

کسی وقت آجائے۔ اس وقت میں نہیں ملوں گا۔“ ستار نے مزید کہا۔ ”بڑے آقا مرحوم کی بیوہ کیفیہ بھی

تشریف فرما ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس خبر نے فیروز بخت کو پریشان کر دیا۔ جواب

دیا۔ ”ان سے کہہ دے، میں ابھی ملاقات کرتا ہوں۔“ لیکن اس جواب سے پہلے ہی کیفیہ کمرے میں داخل

ہو گئی اور آتے ہی فرخندہ کی گدی پکڑ لی۔ ”تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟“

فیروز بخت کو بھی کیفیہ پر غصہ آ گیا، بولا۔ ”آپ یہ کیا کر رہی ہیں، اس کی گدی تو چھوڑ دیجیے۔“

کیفیہ نے فرخندہ کو کئی جھٹکے دیے اور پھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔ ”میں اس کو چھوڑوں گی، اس ذلیل

پچھل پیری کو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں تو اسے ہلاک کر دوں گی۔ آخر یہ خود کو بچھتی کیا ہے؟“

فرخندہ نے فیروز بخت کو اشارے سے منع کیا۔ ”تو مت بول، خاموش رہ اور تماشا دیکھ۔“

اس نے کیفیہ سے پوچھا۔ ”میری گدی شرافت سے چھوڑ دے ورنہ میں خود چھڑالوں گی۔“

ہے، کچھ جانتا ہے کہ یہ کون ہے؟ اگر نہیں جانتا تو مجھ سے پوچھ۔ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

فرخندہ نے ہنس کر وحی احمد کی طرف دیکھا۔ فیروز بخت سے بولی۔ ”یہ میرا واقف کار کہاں سے آگیا، میں تو اسے نہیں جانتی۔“

فیروز بخت نے اصرار کیا۔ ”میں کہتا ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

تاجروسی احمد نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک اس بازاری لڑکی کی بابت وہ سب کچھ نہیں بتاؤں گا جو میں جان چکا ہوں۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”میری بابت تو کیا بتائے گا، میں خود بتا دوں گی، کیا تو مجھے مجھ سے زیادہ جانتا ہے؟“

فیروز بخت نے تاجروسی احمد کو تنبیہ کی۔ ”او خبیث تاجر! خبردار جو تو نے فرخندہ کو بازاری یا کچھ اور کہا۔“

وحی احمد نے کہا۔ ”میں اس کے منہ پر کہتا ہوں کہ یہ بھکارن ہے۔ اس کا خاندان در پوزہ گری کرتا ہے۔ اس کا باپ بھکاری ہے اور ان سب کی گزر بسر بھیک پر ہے۔“

فیروز بخت مشتعل ہو کر وحی احمد پر جھپٹا لیکن دونوں کے بیچ فرخندہ آگئی۔ فیروز بخت سے کہا۔ ”خواتنواہ ہاتھ پائی سے کیا حاصل؟ تاجروسی نے جو کچھ کہا، میں اس کو جھٹلاؤں گی نہیں، کیونکہ میں واقعی بھکارن ہوں اور میں خاندانی بھکارن ہوں۔ میرا باپ بھی بھکاری ہے اور میرے خیال میں بھکاری ہونا کوئی عیب کی بات تو نہیں۔ جس طرح تاجر ہونا کوئی عیب میں داخل نہیں۔ آخر پیٹھے پر کوئی اعتراض ہی کیوں کرے؟“

فرخندہ کی باتوں نے فیروز بخت کو چکر میں ڈال دیا، اس کا دل ڈوبنے لگا، آہستہ سے پوچھا۔ ”فرخندہ! تو نے جو کچھ کہا یہ سچ ہے یا مذاق میں کہہ رہی تھی؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں مذاق نہیں کرتی اور جھوٹ بھی نہیں بولتی۔“

تاجروسی کو اپنی حیثیت اور فیروز بخت کی خجالت پر ہنسی آگئی۔ باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”فیروز بخت! اس وقت تو میں جا رہا ہوں کیونکہ میں تجھے شرمندہ نہیں دیکھ سکتا پھر کسی وقت ملوں گا۔“

فیروز بخت نے فرخندہ پر اچھتی سی نظر ڈالی۔ ”تو تو واقعی بھکارن ہے، تو جھوٹ نہیں بولتی؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں بھکارن ہوں اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتی۔“

کیفیہ نے ایک جھٹکا دیا۔ ”میں تو تیرا خون پی جاؤں گی۔“

فرخندہ نے ایک سخت جھٹکا دیا تو کیفیہ لڑکھڑاتی ہوئی فیروز بخت پر جاگری۔ فرخندہ نے کہا۔ ”ہم دونوں کی طاقت میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے مجھ پر اپنی طاقت کا رعب ہرگز نہ ڈالنا۔“

کیفیہ نے دہائی دی۔ ”اس جاہل لڑکی نے مجھے ذلیل کر دیا اس سے خدا سمجھے۔“

فرخندہ نے فیروز بخت سے بگڑ کر کہا۔ ”میں نے تیری تڑپ اور کک دیکھ لی۔ میں سمجھتی تھی کہ تو میرا عاشق ہے لیکن تو تو میرا تماشا کی لکھا۔ یہ عورت تیری کون ہے؟“

فیروز بخت کو بڑا قلق ہوا کہ بات بگڑ گئی اور اس انکشاف نے تو اس کو کہیں زیادہ پریشان کر دیا کہ فرخندہ اس کی جملہ کیفیات سے اچھی طرح واقف تھی۔

فرخندہ نے درستی سے پوچھا۔ ”یہ عورت تیری کون ہے، بتاتا کیوں نہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”یہ ملک التجار داؤد مرحوم کی بیوہ ہے اس طرح یہ میری ماں بھی ہے۔“

کیفیہ نے بھی یہی سوال کیا۔ ”اور فیروز بخت! میں پوچھتی ہوں کہ یہ چڑیل کون ہے؟“

فیروز بخت نے درستی سے کہا۔ ”دیکھیے آپ ایسی زبان میں بات نہ کیجیے جس سے فرخندہ کی بے عزتی ہو کیونکہ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔“

کیفیہ نے پوچھا۔ ”تو اس کی کیوں عزت کرتا ہے؟“

فیروز بخت کے بجائے فرخندہ نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ یہ مجھ سے محبت کرتا ہے، عشق کرتا ہے اور عشق کرنا کوئی گناہ نہیں، کوئی جرم نہیں۔“

کیفیہ اچھل پڑی، جیسے پھوٹنے ڈنک مار دیا ہو۔

فیروز بخت کو خوشی ہوئی کہ فرخندہ تو غضب کی واقف کار نکلی۔ اس نے کیفیہ کو سمجھایا۔ ”دیکھیے، آپ خاموشی اختیار کیجیے اور معاملے کو طویل نہ دیجیے کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے۔ اگر کسی کی بے عزتی کی جائے گی تو جوابی حملے سے وہ بھی بے عزتی کر سکتا ہے۔“

کیفیہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نکلنے ہی تاجروسی احمد داخل ہو گیا۔ اسے فیروز بخت نے ڈانٹ دیا۔ ”تم یہاں کیا لینے آگئے؟ جاؤ باہر، کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ جب تک میں خود نہ بلاؤں اندر مت آنا۔“

تاجروسی احمد نے فرخندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لڑکی، جس کی خاطر تو ہم سب کو ذلیل کر رہا

فیروز بخت نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”افسوس فرخندہ کہ تو نے اپنی بابت پہلے کچھ بھی نہیں بتایا۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں مناسب موقع کی تلاش میں تھی اور پھر جیسے ہی موقع ملا، میں نے اپنی بابت صاف صاف بتا دیا۔“

فیروز بخت کا سر جھکا رہا تھا، اسے اپنے سامنے کی ہر شے گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے گرتے گرتے دیوار کا سہارا لیا اور زمین پر بیٹھ گیا، بولا۔ ”فرخندہ! مجھے اب بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔“

فیروز بخت کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ زمین پر لیٹ گیا۔ اس کی نظروں تلے اندھیرا پھیل چکا تھا۔

☆☆☆

ستار اس کو بے ہوش دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ وہ طبیب کی تلاش میں نکل گیا۔ منشی، اہلکار، گماشتے، ہر کارے اور دوسرے ملازمین نے فیروز بخت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ فرخندہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے جا چکی تھی۔ ستار طبیب کو لے کر داخل ہوا مگر اس سے پہلے ہی فیروز بخت کو ہوش آچکا تھا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی سوال کیا۔ ”کیا وہ چلی گئی؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”ہاں میرے آقا..... وہ چلی گئی۔“

فیروز بخت نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ شام ہوئی اور شام سے رات ہو گئی مگر فیروز بخت کا رویہ حویلی میں ہی پڑا رہا۔ عملے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن ستار اس کے پاس ہی رکا رہا۔ فیروز بخت اپنے آپ اور دوسروں سے بہت شرمندہ تھا۔ ستار اس کی غم گساری کر رہا تھا۔ رات کو دریافت کیا۔ ”کیا آج آپ گھر نہیں چلیں گے؟“

فیروز بخت نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ”ستار! میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہا۔“

ستار نے ڈھارس بندھائی۔ ”آپ ناحق شرمندہ ہوتے ہیں۔ آپ نے فرخندہ کو لاعلمی میں چاہا تھا لیکن اب جبکہ اس کی حقیقت کھل چکی ہے تو اسے دھتکار دیں گے اور اس کی مجال نہیں جو آپ سے بات تک کر سکے۔“

فیروز بخت نے تصور میں فرخندہ کو اپنے روبرو کھڑا کیا اور اسے جھڑکنے کی کوشش کی لیکن ایک دم اس کی حالت غیر ہو گئی اور فرخندہ کے رعب حسن اور دل میں موجود فرط عشق نے اسے بے بس کر دیا۔

ستار کہہ رہا تھا۔ ”بھکارن کا حسن ہی ایسا ہے کہ آپ کیا کوئی بھی اسے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ آپ

مجبور تھے۔“

فیروز بخت نے لاشعوری میں جواب دیا۔ ”میں تھا نہیں ہوں۔“

ستار نے پھر ہمت بندھائی۔ ”میرے آقا! اک ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اب فرخندہ جیسے ہی سامنے آئے، آپ منہ پھیر کر اسے جھڑک دیجیے گا۔ یہ کام اتنی پھرتی اور جوش سے انجام دیجیے کہ کوئی دوسرا جذبہ ابھر ہی نہ سکے۔“

لیکن فیروز بخت اچھی طرح جانتا تھا یہ ساری کہنے کی باتیں ہیں ورنہ فرخندہ کے سامنے اس قسم کی اداکاری ناممکن ہے۔

وہ کئی دن تک کاروباری حویلی میں رہا۔ کیفیہ کو جب یہ خبر ملی کہ فیروز بخت بہت شرمندہ ہے تو بہت خوش ہوئی اور اس نے فیروز بخت کو کھلا بھیجا کہ صبح کا بھولا اگر شام کو آجائے تو اس کو بھولا نہیں کہنا چاہیے۔

تاجروسی احمد بھی فیروز بخت کی ندامت سے بہت خوش تھا۔ فیروز بخت نے نکل سے کہا۔ ”کوئی فقیر ہے، کوئی راہی ہے، کوئی رعایا ہے، کوئی تاجر ہے تو کوئی بھکاری ہے سبھی انسان آدم کی اولاد۔ ہمیں کسی کو ذلیل نہیں سمجھنا چاہیے۔“

وسمی احمد چونک پڑا۔ اس نے سمجھ لیا کہ فیروز بخت کے دل میں فرخندہ کے عشق کی آگ ابھی پوری طرح بجھی نہیں ہے۔ چنگاریاں اب بھی موجود ہیں چنانچہ اس نے بحث نہیں کی اور غیر متعلق باتیں کرنے لگا۔

شام کو کیفیہ اسے لینے کے لیے پہنچ گئی اور تسلی دلا سے دے کر اپنے ساتھ لے گئی۔ کیفیہ نے زجس کو فیروز بخت کے پاس چھوڑا اور خود شازیہ کے پاس چلی گئی۔ اس نے شازیہ کو سمجھایا۔

”شازیہ! فیروز بخت تیرا ہے اور ہم سب کی یہی خواہش ہے کہ تو اس سے وابستہ ہو کر خوش و خرم زندگی گزارے لیکن مشکل یہ ہے کہ فیروز بخت پر دوسری طرف سے بھی کمندیں پڑ رہی ہیں۔ میری کوشش تو یہی ہے کہ دوسرے ناکام رہیں لیکن تنہا میری کوشش سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اب تجھے فعال ہو جانا چاہیے اور پوری ہوشیاری اور چالاکی سے یہ کوشش کر کہ فیروز بخت تیرا ہی ہو جائے۔“

شازیہ نے اپنی ماں کی باتوں کا کچھ کچھ مفہوم سمجھ لیا۔ مختصر جواب دیا۔ ”آپ جو کہیں، کرنے کو تیار ہوں۔“

کیفیہ نے کہا۔ ”میں آرام کرنے کے بہانے اسے پانچ سات دن کے لیے روک لوں گی۔ ان پانچ سات دنوں میں تو اس کے اتنی قریب ہو جائے گی کہ وہ تجھے اپنی

ضرورت محسوس کرنے لگے کیونکہ یہ میرا تجربہ ہے کہ مرد بھولا ہوتا ہے اور غلطی، احتیاط اور رکھ رکھاؤ سے اپنا سب کچھ دے کر اسے اسیر کیا جاسکتا ہے۔“

شازیہ اپنی ماں کی باتوں کا پورا مفہوم سمجھ نہ سکی، بولی۔ ”آپ مجھے بتا دیجیے کہ مجھے کیا کرنا ہے، میں اسی پر عمل کروں گی۔“

کیفیہ نے مختصراً جواب دیا۔ ”میں نے بتا تو دیا غلطی، احتیاط اور رکھ رکھاؤ سے اپنا سب کچھ فیروز کے حوالے کر دے۔“ شازیہ اس دور رس اور معنی خیز نصیحت کو سمجھ نہ سکی۔

اسی دن رات کو شازیہ، فیروز بخت کے حوالے کر دی گئی اور کیفیہ نے فیروز بخت کو کہہ دیا۔ ”میں جانتی ہوں کہ آج کل تو بہت پریشان ہے، اس حویلی اور ہم سب کا تو واحد سہارا ہے۔ نصیب دشمنان اگر تجھے کچھ ہو گیا تو ہم سب تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے ملازموں اور خدمت گاروں پر نہیں چھوڑیں گے۔ ہم سب مل جل کر تیری خدمت کریں گے۔ اب تو ہفتہ عشرہ آرام کرے گا اور کاروباری حویلی نہیں جائے گا۔“

فیروز بخت نے کوئی جواب نہ دیا اور شازیہ کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا۔

☆☆☆

فیروز بخت کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ شازیہ اس کے پاس موجود تھی اور وہ فرخندہ کے تصور میں آنکھیں بند کر کے خاموش پڑا ہوا تھا۔ شازیہ اس کی سرد مہری اور بے التفاتی سے بیزار اور عاجز تھی۔

وہ فیروز بخت کے قریب دوسری مسہری پر ادنگہ رہی تھی۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ اس عالم میں کیفیہ جائزہ لینے پہنچ گئی۔ اس نے شازیہ کو ادنگہتے جو دیکھا تو آگ بگولہ ہو گئی۔ غصے میں دھکا دے کر گرادیا۔ بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔ ”یہ تو نہیں تیری قسمت ادنگہ رہی ہے۔ کیا میں نے تجھے یہاں ادنگہنے کے لیے بھیجا ہے؟“

شازیہ کی نیند اڑ گئی اور جواب دیا۔ ”پھر میں اور کیا کروں؟ یہ شخص تو بس آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ کوئی بات نہیں کرتا۔ میں اگر اسے مخاطب بھی کرتی ہوں تو ہوں ہاں کر کے رہ جاتا ہے۔“

کیفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔ ”اے بد قسمت لڑکی! اس پر تو ایک بھکارن کا عشق سوار ہے۔ اس عشق کو روچ کر کرنا تیرا کام ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ اسے تو بس کسی

بھی طرح اپنے قابو میں کر لے۔“

شازیہ کو دوبارہ اس کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ فیروز بخت اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور اس طرح بنا پڑا رہا گویا سویا ہوا ہے۔

کیفیہ کے واپس جاتے ہی شازیہ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور فیروز بخت کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑی فیروز بخت کو گھورتی رہی پھر آہستہ آہستہ فیروز بخت پر جھکی اور جھنجھوڑنے کے انداز میں دونوں ہاتھ بڑھائے مگر تکلفاً پھر کھینچ لیے۔ فیروز بخت گوشہ چشم سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ شازیہ نے ہمت کر کے ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ فیروز بخت نے آنکھیں کھول دیں۔ شازیہ نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ”شازیہ! خیریت تو ہے؟“

شازیہ نے جواب دیا۔ ”میں دیکھ رہی تھی آپ کو بخار تو نہیں۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”مجھے بخار نہیں ہے۔ میں اچھا بھلا ہوں۔ تم آرام کرو سو جاؤ، پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

شازیہ نے کہا۔ ”کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنی مسہری پر جا کر سو جاؤ۔“

شازیہ کو اس کی بے مہری پر غصہ آ گیا اور تیزی سے اپنی مسہری پر گر کر سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ فیروز بخت اس کو اچھا ضرور لگتا تھا لیکن وہ گر کر، خوشامد کر کے اسے اپنی طرف راغب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دن میں سارا بھی آ گیا اور وہ فیروز بخت کی دل جوئی اور غم گساری کرنے لگا۔ اس نے فیروز کو مشورہ دیا کہ یوں گھر میں بیکار پڑے رہنے سے طبیعت اور زیادہ پریشان ہو جائے گی اس لیے سیر و تفریح کا وقت ضرور نکالنا چاہیے لیکن کیفیہ نے اسے نہیں ٹھنکے دیا۔

اس طرح پورا ہفتہ گزر گیا اور شازیہ صرف اتنی سی کامیابی حاصل کر سکی کہ فیروز بخت اس سے باتیں کرنے لگا۔ شازیہ اور کیفیہ کے لیے یہی بہت کچھ تھا کیونکہ اس میں کامیابی کا امکان تو پایا جاتا تھا۔ اس دوران اس نے ایک بار بھی فرخندہ کا نام نہیں لیا تھا۔ سارا محتاط تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ احتیاط اور شرم و ندامت کی راکھ تلے دبی ہوئی چنگاری کو فرخندہ کا نام لے کر کرید ا جائے۔

ستار نے فیروز بخت کو مشورہ دیا کہ وہ چند ماہ کے لیے

سورت بندر چلا جائے تاکہ ماحول ہی بدل جائے اور فرخندہ کا خیال بھی دل سے نکل جائے۔ اب اس کی حالت معمول کے مطابق تھی۔ اس لیے فیروز بخت نے ستار کا مشورہ قبول کر لیا اور سفر کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ کیفیہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اس سفر میں شازیہ، فیروز بخت کے ساتھ رہے گی۔ فیروز بخت کو اس فیصلے سے اختلاف تھا لیکن وہ بھی شازیہ کو قبول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وصی احمد کو سفر کا علم ہوا تو وہ بھی تیار ہو گیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ فیروز بخت ابھی نادان ہے اس لیے تجارت کے میدان میں اس کی راہنمائی کی بہت ضرورت ہے۔ اس نے فیروز بخت کے ساتھ جانے کا اعلان کر دیا اور یہ کہ اس سفر میں اس کے ساتھ اس کی بیٹی سائرہ بھی جائے گی۔ جب یہ خبر کیفیہ کو ملی تو اس نے دانت پیس کر شازیہ سے کہا۔

”شازیہ! خبردار جو تو نے اس خبیث تاجر کی بیٹی کو فیروز بخت کے قریب آنے دیا۔“ اور پھر ستار کو خاص طور پر ہدایت کی۔ ”اور تیرا فرض ہے کہ کسی بھی طرح وصی احمد کو فیروز بخت سے دور رکھ۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو تجھے مالا مال کر دیا جائے گا۔“

دوسری طرف تاجر وصی احمد، ستار کو سمجھا رہا تھا کہ اگر اس نے وصی احمد کا ساتھ دیا تو نہ صرف یہ کہ اسے مالا مال کر دیا جائے گا بلکہ چھوٹی موٹی تجارت بھی کروادی جائے گی۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ستار، فیروز بخت کو رسول آباد کے مزار پر لے گیا اور فیروز بخت سے کہا۔ ”میرے آقا! میں آپ کے اندر بپا کشف کی آہٹیں صاف سن رہا ہوں اور اگر میں یہ کہوں کہ وہ بھکارن اس وقت بھی آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہے تو غلط نہ ہوگا۔“

فیروز بخت نے ناگواری سے کہا۔ ”افسوس کہ ابھی تک میں نے تجھے اپنا ہمدرد و غم گسار سمجھا لیکن تو بھی دوسروں سے کچھ مختلف نہیں نکلا۔“

ستار نے اپنی عزت اور اعتماد کو خاک میں ملتے دیکھا تو چپ ہو گیا۔ فیروز بخت نے مزار شریف پر فاتحہ پڑھی اور بڑی رقت سے دعا مانگی۔

”حضرت! میں نہیں جانتا کہ اس وقت آپ کے روحانی تصرف کی وسعت اور دائرۂ اثر کی حد کہاں تک ہے۔ اگر آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کیجیے کہ لوگوں کے دلوں میں احرام انسانیت پیدا ہو جائے۔ معاشرتی معیار اور پیمانے وہ نہ رہیں جو اب تک رائج رہے ہیں۔ انسانوں کو طبقات میں نہ تقسیم کیا جائے۔ آپ خدا سے کہیے

کہ لوگ فرخندہ کو بھکارن نہ کہیں اور اسے ذلیل نہ سمجھیں۔“ لیکن ستار یہ دعا مانگ رہا تھا۔ ”حضرت شاہ عالم! میرے آقا کو چوپہ میں گرنے سے بچا لیجیے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر آقا تباہ و برباد ہو جائے گا اور میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔“ ادھر سے فارغ ہو کر ستار نے احمد آباد سے تین کوس دور پتوہ آباد کی راہ لی اور فیروز بخت سے کہا۔ ”میرے آقا! جب آپ نے حضرت شاہ عالم بخاری کے مزار پر حاضری دی ہے تو ان کے والد کے مزار کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔“ فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں تو تیرے ساتھ نکل کھڑا ہوا ہوں جہاں چاہے لے چل۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“

سرسبز، لہلہاتے کھیتوں اور سایہ دار درختوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دونوں پتوہ آباد جا رہے تھے پھر یہ دونوں ایک خوشنما باغ میں داخل ہو گئے۔ باغ سے نکلے تو شاہ عالم بخاری کے والد شاہ قطب عالم بخاری کا روضہ نظر آنے لگا۔ یہ دونوں درگاہ میں داخل ہو گئے۔ روضے پر ایک لمبا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس پردے میں لکڑی، لوہا اور پتھر بھی شامل تھے۔ ستار نے اس پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے آقا! آپ تو یہاں پہلی بار تشریف لائے ہیں لیکن میں کئی بار آچکا ہوں۔ یہ پردہ جو ہمیں نظر آ رہا ہے بڑا کراماتی پردہ ہے۔ اس کے لیے یہ مشہور ہے کہ جو شخص بھی اس پردے پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگتا ہے، اپنے مقصد کی حصولیابی میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس پردے پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگیے، ضرور پوری ہوگی۔“

فیروز بخت کا دل بھر آیا۔ اس نے مزار کے چاروں طرف گھوم پھر کر پہلے تو اس کی زیارت کی۔ اس کے بعد فاتحہ پڑھی اور پھر پردے پر ہاتھ رکھ کر رقت سے دعا مانگی۔ ”حضرت! جو کچھ میں آپ کے بیٹے کے مزار پر کہہ آیا ہوں، وہی کچھ آپ سے بھی کہوں گا۔ جو کچھ میں نے آپ کے بیٹے کے توسط سے مانگا تھا، وہی آپ کے توسط سے بھی چاہتا ہوں۔“

اس کا گداز دل بری طرح رو رہا تھا۔ گلا رندھ رہا تھا اور اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اس نے پردے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دعا مانگی۔ ”قطب عالم! عشق الہی میں آپ نے بھی اپنے دل کو جلایا ہوگا اور اس عجیب و غریب لذت کا مزہ آپ نے بھی چکھا ہوگا جو عاشقوں کی قسمت رہا ہے۔ آج کل وہی لذت میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ عشق کا وہی مزہ میں بھی چکھ رہا ہوں۔ دنیا دہو مجھے ور غلا رہے ہیں اور

اس سٹی میں ہیں کہ میں ان جیسا کورا کاغذ بن جاؤں لیکن میں اپنے اس سرمایہ کیف و نسیاط سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ آپ خدا سے سفارش کیجیے کہ اس نے میرے دل میں عشق کا جو شعلہ موجزن کیا ہے، اس میں اور شدت پیدا ہو جائے۔ میں اس آگ میں جل جانا چاہتا ہوں کیونکہ یہ موت زندگی سے زیادہ قیمتی اور لذیذ ہے۔ فرخندہ کو بھکارن کہہ کر لوگ مجھے شرمسار کرنا چاہتے ہیں، آپ خدا سے دعا کیجیے کہ وہ میرے دل کو اتنی ہمت اور قوت برداشت دے کہ لوگوں کے طنز و طعن کا میرے دل پر کوئی اثر نہ ہو۔“

ستار، فیروز بخت کی آنکھوں سے جاری آنسو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ ندامت کے آنسو ہیں اور اس کے آقا نے یقیناً فرخندہ سے نجات حاصل کرنے کی دعا مانگی ہوگی۔

جب فیروز بخت نے پردے کو چھوڑا تو ستار نے ہاتھ رکھ دیا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اس کا آقا راہِ راست پر آجائے اور دونوں میں سے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑے جس سے خود اسے فائدہ پہنچ سکے۔

ستار نے درخواست کی۔ ”میرے آقا! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے کیونکہ شام ہو چکی ہے اور ابھی ہمیں تین کوس کا فاصلہ طے کرنا ہے۔“

فیروز بخت نے یہاں کچھ ایسی طمانیت محسوس کی کہ اٹھنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اس نے ستار کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں۔ ستار کچھ دیر اپنے جواب کا خنجر رہا۔ اس کے بعد کھسیانے پن سے روکنے کے درود پوار دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ ستار نے کہا۔ ”اگر ہم اس وقت چلیں گے تو کم از کم ایک ساعت تو لگ ہی جائے گی حویلی تک پہنچنے میں۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ستار! اگر تو گھر جانے کے لیے بے چین ہے تو چلا جا، میں ابھی یہیں رکوں گا۔“

مزار کے خدمت گار نے مزار کے اوپر لنگی ہوئی دس شاخہ شمع جلائی اور چاروں طرف دیواروں کی طاقتوں میں بجے ہوئے چراغوں کو روشن کیا۔ ان سب کی روشنی میں مزار کا یہ حصہ دن کی طرح چمکنے لگا۔ خدمت گار نے واپس جاتے جاتے ان دونوں سے پوچھا ”سجادہ نشین نے دریافت فرمایا ہے کہ کیا تم دونوں پر دسکی ہو اور رات یہیں بسر کرو گے؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”نہیں، ہم دونوں چلے جائیں گے۔“

لیکن فیروز بخت نے کہا۔ ”لیکن شاید میں نہ جاؤں

کیونکہ میں یہاں سکون محسوس کر رہا ہوں۔“

ستار نے عرض کیا۔ ”میرے آقا! یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ تو یہیں رہیں اور میں گھر چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

خدمت گار نے کہا۔ ”تب پھر میں سجادہ نشین سے کہہ کر آپ دونوں کی شب ب سری کا انتظام کرتا ہوں۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”تو سجادہ نشین سے جا کر کہہ دے کہ میں یہ رات حضرت قطب عالم کے قدموں میں گزاروں گا اس لیے میری شب ب سری کا کہیں اور بندوبست نہ کیا جائے۔“

خدمت گار چلا گیا اور ستار نے اپنے طور پر یہ محسوس کیا کہ فیروز بخت کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مایوسی اور غم نے اس پر غلبہ کر رکھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد خدمت گار واپس آ گیا اور اعلان کیا۔ ”آپ دونوں رات کو یہاں نہیں رہ سکتے۔ خانقاہ میں سونے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ ہاں اس وقت تک یہیں رہیں جب تک ارادت مند آ جا رہے ہیں اور درگاہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔“

ستار نے کہا۔ ”میرے آقا! یوں تو مجھے آپ کے پاس بلکہ ساتھ ہی رہنا چاہیے لیکن مجھے حویلی والوں کا بھی خیال ہے۔ ہم دونوں کچھ کہے سے بغیر یہاں آگئے ہیں، اس حالت میں اگر ہم رات بھی یہیں گزاریں گے تو حویلی والوں کو بڑی تشویش ہوگی۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تبھی تو میں تجھ سے کہتا ہوں کہ حویلی چلا جا اور ان سب کو بتا دے کہ آج رات میں واپس نہیں آؤں گا۔“

ستار کا اندازہ بتاتا تھا کہ وہ رکنا تو نہیں چاہتا لیکن جبراً روکا جائے تو رک جائے گا لیکن فیروز بخت نے اس کو نہیں روکا اور حویلی بھیج دیا۔ مزار پر آنے جانے والوں کا تانا بندا ہوا تھا۔ فیروز بخت ایک کونے میں لیٹ گیا۔

نصف رات سے چند ساعت پہلے درگاہ میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا ہجوم داخل ہوا۔ وہ سب مزار کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے اور زیر لب دعا مانگی۔ ”عزت و آبرو تیرے ہی ہاتھ میں ہے، ہمیں آزمائشوں سے بچالے۔“

اس ہجوم میں اس نے فرخندہ کو بھی دیکھا۔ وہ بھی ان سب کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر مزار کے سرہانے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر فیروز بخت لیٹا ہوا تھا۔ فیروز بخت نے اسے پہچان لیا تھا لیکن فرخندہ نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ فیروز بخت نے اپنے کان اس کی باتوں

پر لگا دیے۔ وہ بڑی رقت سے قطب عالم بخاری سے کہہ رہی تھی۔ ”ادب میں دراز ہم سب کے حال سے باخبر بزرگ! خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ملک التجار کے دل میں جگہ بنالی ہے لیکن میرے بھکاری ہونے سے معاملہ بگڑ گیا ہے۔ آپ اس کے دل میں یہ بٹھا دیجیے کہ اپنے آبائی پٹے کے بارے میں جو میرے احساسات ہیں، وہی درست ہیں۔ میرا محبوب ان سے اتفاق کرے کیونکہ میں نہ تو اپنے محبوب کو حاصل کرنے پر قادر ہوں اور نہ اپنے آبائی پٹے کو ترک کرنے کی قدرت رکھتی ہوں۔ اب میں اس سے خود نہیں ملوں گی، اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔“

فیروز بخت نے فرخندہ کی آواز میں غم کی لرزش محسوس کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بے ساختہ آواز دی۔ ”فرخندہ! تیری دعا قبول ہوئی۔ میں حاضر ہوں۔“

فرخندہ نے گھبرا کر پیچھے جو دیکھا تو فیروز بخت کو اپنے سامنے پا کر پھولی نہ سما کی پھر بھی اپنی اصل حالت کو چھپا گئی اور منہ پھیر کر جواب دیا۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تیری طرح میں بھی یہاں تیری تلاش میں آیا تھا اور بالآخر تجھے پایا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔“

فرخندہ نے ناراضی سے جواب دیا۔ ”لیکن میں تجھ سے ذرا بھی خوش نہیں، میں تجھ سے ناراض ہوں۔ تو نے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”عجب الٹی بات کر رہی ہے تو؟ پتے نشان کے بغیر میں کس طرح تیرے پاس پہنچ جاتا؟“

فرخندہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”میں تیری چاہت اور عشق کو آزما رہی تھی۔ عاشق تو اپنے عشق اور طلب کے زور سے خدا تک پہنچ جاتے ہیں لیکن تو کیسا عاشق ہے کہ تو مجھے نہ تلاش کر سکا۔“

ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر فرخندہ کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں میں سے دو ان دونوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک تو وہی پستہ قامت گنجا تھا جس کو فرخندہ نے اپنا باپ کہا تھا۔ دوسرا بوڑھا تھا لیکن پستہ قامت یہ بھی تھا۔

پستہ قامت گنجنے نے فیروز بخت کو گھور کر دیکھا اور فرخندہ سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے فرخندہ؟ تو کس سے باتیں کر رہی ہے؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”بابا، یہ وہی ملک التجار کا بیٹا ہے جس کا میں غائبانہ ذکر کر چکی ہوں۔“ اس کے بعد فیروز بخت سے کہا۔ ”اور اے نوجوان تاجر! یہ مخاطب میرا باپ

ہے۔“ پھر دوسرے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ میرا دادا ہے۔“

فیروز بخت کھڑا ہو گیا۔ فرخندہ کے باپ نے دل میں بیوست ہو جانے والی نظروں سے فیروز بخت کو دیکھا اور اپنی بیٹی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہتا ہے؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں کہتا۔ میں اسے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔“

دادا نے فوراً تائید کر دی۔ ”پھر سوچ کس بات کی، لے چل گھر..... مہمان نوازی تو اسوۂ حسنہ میں سے ہے۔“

فیروز بخت ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ فرخندہ سے کہا۔ ”کیا تیرے گھر چلنا ضروری ہے؟“

فرخندہ نے بے غرضی سے جواب دیا۔ ”تیری مرضی، چلتا ہے تو چل ورنہ بھاری پتھر کی طرح یہیں پڑا رہے۔“

بابا نے بیٹی کو نصیحت کی۔ ”کیا میں نے تجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ جس دنیا سے یہ نوجوان تعلق رکھتا ہے، وہاں طبقاتی اونچ نیچ بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں بڑا تاجر چھوٹے تاجر کو خاطر میں نہیں لاتا جبکہ ہم جس ماحول اور معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں اس قسم کی درجہ بندیاں نہیں ہیں۔“

دادا زور سے ہنسنے لگا۔ ”فرخندہ! یہ تیری پہلی غلطی نہیں ہے، تجھ سے پہلے بھی بعض دوسری لڑکیوں نے ایسی ہی غلطیاں کی تھیں اور میں جانتا ہوں کہ بعد میں ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ تو یہ کیا تاجر تجار کے چکر میں پڑی ہے، یہ بوئے وفا سے محروم لوگ کیا جانیں عشق کیا ہے اور محبت کے کہتے ہیں۔“

فرخندہ نے رحم طلب نظروں سے فیروز بخت کی طرف دیکھا۔

اتنی دیر میں فرخندہ کا باپ اور دادا دونوں ہی وہاں سے چلے گئے۔ فرخندہ نے فیروز بخت سے درخواست کی۔ ”نوجوان تاجر! مجھے اپنے بزرگوں کی نظر میں خوار نہ کر اور مجھے میزبانی کا شرف بخش۔ خدا کے لیے میرے ساتھ میرے گھر کو چل، وہاں ہم سب اپنے مستقبل پر غور بھی کر لیں گے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”چل میں تیرے ساتھ چلوں گا اور دیکھوں گا کہ تو اپنے مستقبل پر کس طرح غور کرتی ہے۔“

اس نے فرخندہ کے ساتھ چلنے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن ان کے ساتھ جانے میں عار محسوس کر رہا تھا۔

وہ فرخندہ کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ اہلی گھوڑا رانوں تلے دبا تھا۔ فرخندہ اور اس کے رشتے دار ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ لوگ کھیتوں کی منڈیروں کو پار کرتے ہوئے ایک ویرانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کھنڈرات کی افراط تھی۔ فیروز بخت کو خوف یا لالچ نام کو نہ تھا۔ وہ محض فرخندہ کی خاطر ان کے گھر چلا گیا تھا۔

فرخندہ کے گھر والوں نے فیروز بخت کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے کھانے کا انتظام کیا لیکن فیروز بخت نے کھانے سے انکار کر دیا۔ ایک نیم تباہ کمرے میں اس کی شب ببری کا انتظام کر دیا گیا۔ سونے سے ذرا پہلے فرخندہ کے باپ نے فیروز بخت کی مزاج پرسی کی اور کہا۔ ”رات کو جس چیز کی بھی ضرورت محسوس ہو، بلا تکلف کسی سے بھی طلب کی جاسکتی ہے۔“ باپ جانے لگا تو فیروز بخت کے پاس بیٹھی ہوئی اپنی بیٹی سے پوچھا۔ ”تو کیا یہیں بیٹھی رہے گی، چل میرے ساتھ چل۔“

اس نے باپ سے کہا کہ کچھ دیر بعد آجائے گی۔ وہ چلا گیا تو فرخندہ نے بات کرنے کی خاطر کہا۔ ”میں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ اب تجھ سے میری ملاقات بھی نہ ہوگی۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”ایسا کیوں سوچ لیا تھا؟“ فرخندہ نے جواب دیا۔ ”اس دن بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ تیرے معاشرے کے لوگ انسانوں کی دل آزاریاں بہت کرتے ہیں۔“

فیروز بخت نے فرخندہ کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی اور بڑی احتیاط سے سوال کیا۔ ”فرخندہ! میں تجھ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں تو ان کے جواب دینا گوارا بھی کرے گی یا نہیں؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں تیرے ہر سوال کا جواب دوں گی تو فکر نہ کر۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! کیا تجھے اپنے حسن کا اندازہ ہے؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”نوجوان تاجر! کوئی کام کی بات کر۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”خدا نے تجھے دولت حسن سے مالا مال کیا ہے اور اس دولت کی موجودگی میں تیرا بھیک مانگنا بہت معیوب لگتا ہے۔ کیا تو اس سے تائب نہیں ہو سکتی؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں کتنی بار تجھے یقین دلاؤں کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ جس طرح تیرا پیشہ تجارت ہے، میں اپنے خاندانی پیشے کو کیونکر چھوڑ دوں؟“

فیروز بخت نے ذرا سختی سے کہا۔ ”میں تیری یہ دلیل نہیں مان سکتا کیونکہ بھیک مانگنا پیشہ نہیں ہو سکتا۔“ فرخندہ نے جواب دیا۔ ”یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے اس خاندانی پیشے سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی اور کو اپنے خاندانی پیشے سے ہو سکتی ہے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”جبکہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ تجھے خدا نے دولت حسن سے مالا مال کیا ہے۔ حسن کے اس شاہکار کو بھکاریوں کی بستی کے بجائے ملک التجار کی حویلی میں رہنا چاہیے۔“

فرخندہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس قسم کی باتیں نہ کرو نوجوان تاجر۔ اگر میرے کسی عزیز نے تیری یہ بات سن لی تو مصیبت آجائے گی اور تجھے اسی وقت یہاں سے چلتا کر دیا جائے گا اور میں نہیں چاہتی کہ تجھے کسی بے عزتی یا خواری سے واسطہ پڑے۔“

فیروز بخت ڈر گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسی ویسی کسی بات سے فرخندہ کے گھر والوں سے ان بن ہو گئی تو پھر وہ کبھی فرخندہ سے مل بھی نہ سکے گا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

نصف شب کے بعد مشرقی افق سے چاند نے اپنا چہرہ نکالا، سونے کی پیلی پیلی نکلیا آسمان میں چمکی ہوئی تھی۔ فیروز بخت کی نظریں چاند پر تنک کر رہ گئیں۔ فرخندہ اس کی محویت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پھر کہا۔ ”بخت! مجھے تو، تو انتہائی بد ذوق معلوم ہوتا ہے۔“

فیروز بخت نے گھبرا کر پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”وہ اس طرح کہ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے تو نے میرے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے اور میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ میں بھی کچھ ہوں لیکن اب میں نے تجھے چاند کی طرف ٹٹلی لگائے جو دیکھا تو بہت افسوس ہوا کیونکہ تو نے میرے حسن کو نظر انداز کر دیا اور چاند کی کہن سالہ بڑھیا میں دلچسپی لینے لگا۔“

فیروز بخت شرما گیا۔ ”یہ بات نہیں ہے فرخندہ۔ میں تو چاند میں شعراء کے اس روایتی حسن کو تلاش کر رہا تھا جس کے ذکر سے مشرقی شاعری بھری پڑی ہے لیکن مجھے چاند میں یہ حسن نہیں نظر آیا۔ اگر میں شاعر ہوتا تو صرف تیرے حسن کی تعریفیں کرتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آج کی رات میں بستر کے بجائے تیرے ساتھ سیر و تفریح میں گزار دوں؟“

فرخندہ نے کہا۔ ”افسوس کہ میں اپنے باپ کی

کروں گا۔“

فرخندہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں اس کا خیال رکھوں گی۔“

فیروز بخت نے فرخندہ کے باپ کو شکر گزار نظروں سے دیکھا اور پھر فرخندہ کے ساتھ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف نکل گیا جو شاہ قطب عالم بخاری کے مزار تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس رات فرخندہ اور فیروز بخت عشق کی سرشاریوں میں ڈوبے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بھی پگڈنڈیوں پر چلتے اور کبھی ان راہوں پر بھاگنے اور دوڑنے لگتے جو ایک طرف تو احمد آباد تک لے جاتی تھیں اور دوسری طرف مالوے کو چلی گئی تھیں بھاگنے دوڑنے کے بعد وہ ایک پتھیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ فرخندہ نے کہا۔ ”اگر تجھے یہ یقین دلایا جائے کہ اس پتھیل پر ایک خطرناک راکشش رہتا ہے تو تیرا خوف سے برا حال ہو جائے گا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں راکشش سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر راکشش تجھے نظر بھر کے دیکھ لے تو اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے اور ساری شرارتیں بھول جائے۔“

فرخندہ نے شوخی سے کہا۔ ”تو میرے حسن کی تعریف کا کوئی موقع بھی ضائع نہیں جانے دیتا۔“

فیروز بخت نے اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔ ”غالباً اس حد تک تو مجھے اجازت ہوگی ہی اور تیرے باپ سے عہد شکنی کا مرتکب نہیں ٹھہروں گا۔“

فیروز بخت نے آنکھیں بند کر لیں۔ فرحت، تازگی، سرشاری اور کیف و سرور، انبساط غرض وہ کون سی لذت تھی جو فرخندہ کے شانے کے لمس سے اسے نہیں مل رہی تھی۔ فرخندہ خود بھی بہت خوش تھی اور چاہتی تھی کہ یہ لمحات ابدی اور دائمی ہو جائیں۔ دونوں پتھیل کے تنے سے لگے ایک دوسرے کا سہارا لیے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ صبح اس وقت دونوں کی آنکھ کھلی جب برہم دیو کے ایک پیجاری نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھتے رہنے کے بعد بیدار کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”ہوگا کیا، کچھ بھی نہیں۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”تو اپنے باپ کو کیا جواب دے گی؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں نے کوئی بد عہدی تو کی نہیں پھر خوف کس بات کا؟“

اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں نکال سکتی۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”کیا اجازت مل سکتی ہے؟“

فرخندہ نے کہا۔ ”میں کہہ کر دیکھتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر فرخندہ اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ فیروز بخت ڈرا کہ شاید بات بگڑ گئی اور فرخندہ کا باپ ڈانٹنے پھٹکارنے آ گیا ہے۔ احتیاطاً بولا۔ ”مجھے تو اس بستر پر ہی بڑا مزہ آرہا ہے، یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش ہی نہیں۔“

فرخندہ نے تعجب سے کہا۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہا ہے تو۔“

میرا باپ سو رہا تھا، میں اسے جگا کر تیرے پاس لائی ہوں اور اب تو ایسی باتیں کر رہا ہے، آخر یہ کیوں؟“

فرخندہ کے باپ نے نرمی سے کہا۔ ”اگر تم دونوں چاندنی رات میں گھوم پھر کر لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تو نے فرخندہ کی بابت کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے یعنی کوئی ایسا فیصلہ جس سے تم دونوں مل جل کر زندگی بسر کرو، تو تم دونوں کے ساتھ گھومنے پھرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں..... اور اگر تو فرخندہ کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے اور یہ سب وقتی اور ہنگامی ہے تو بھی میں تم دونوں کو آج کی رات گھومنے پھرنے کی اجازت دے دوں گا مگر اس کے ساتھ ہی میری یہ شرط ہوگی کہ تو آئندہ فرخندہ سے نہیں ملے گا۔ آج کی رات گھومنے پھرنے کی اجازت اس لیے دے رہا ہوں کہ مہمان نوازی کا تقاضا بھی یہی ہے۔“

فرخندہ کے باپ کی باتوں نے فیروز بخت کا حوصلہ بڑھا دیا۔ بڑے جوش سے جواب دیا۔ ”محترم بزرگ! فرخندہ کے معاملے میں اگر میں سنجیدہ نہ ہوتا تو آج کی رات اس بستی میں نہ ہوتا۔ میں ملک التجار ہوں اور ملک التجار کا اس بستی میں شب بسر کرنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ آپ کو اس کا صحیح اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔“

فرخندہ کے باپ نے جھپٹے ہوئے جواب دیا۔ ”تیرا ملک التجار ہونا میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔“

فرخندہ نے آہستہ سے فیروز بخت کا پاؤں دبایا، بولی۔ ”ہم کن باتوں میں الجھ گئے۔“ پھر باپ سے پوچھا۔ ”تو بابا، آپ نے مجھے اجازت دے دی گویا؟“

باپ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”ہاں دے دی اجازت لیکن ایک بات تو خود بھی اس نوجوان تاجر کے ذہن نشین کرادے کہ رات کے سٹائے یا تنہائی میں یہ حد سے تجاوز نہیں کرے گا اگر ایسا ہوا تو میں تم دونوں کو معاف نہیں

فیروز بخت نے کہا۔ ”تب پھر تو جانے اگر مجھ سے پوچھ کچھ ہوئی تو میں ساری ذمے داری تجھ پر ڈال دوں گا۔“
فرخندہ نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“
یہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے فرخندہ کا بابا اپنے باپ کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ ان دونوں نے انہیں دور سے دیکھ لیا تھا تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس آگئے اور فرخندہ کے باپ نے دونوں ہی سے سوال کیا۔ ”یہ ساری رات کہاں غائب رہے تم دونوں؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”بابا گھوم پھر کر میں بہت تھک گئی تھی اس لیے ایک پتیل کی جڑ میں تنے سے ٹیک لگا کر ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے سہارے ایک تہائی رات سوتے رہے۔“

فرخندہ کے باپ اور دادا نے ان دونوں کو غور سے دیکھ کر ان کے جھوٹ سچ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔
یہ چاروں اپنے مسکن میں واپس پہنچے۔ یہاں پہنچ کر فیروز بخت کو یاد آیا کہ شاہ قطب عالم کے مزار پر اسے تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ اس نے فرخندہ کے باپ سے واپس جانے کی اجازت طلب کی۔

فرخندہ کے باپ نے کہا۔ ”نوجوان! تجھے جانے کی جلدی کیوں ہے؟ تھوڑی دیر رک جا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں ذرا دیر کیا سارا دن رک سکتا ہوں لیکن شاہ قطب عالم کے مزار پر مجھے تلاش کیا جا رہا ہوگا اور جب میں وہاں نہیں ملوں گا تو وہ سب بہت پریشان ہوں گے۔“

فرخندہ نے آہستہ سے فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”دوبارہ تو آؤ گے؟“

”ضرور آؤں گا، اب میں کہاں جاؤں گا؟“

فرخندہ کے دادا نے فیروز بخت سے کہا۔ ”آنا اور ضرور آنا مگر اب یہ سوچ کر آنا کہ فرخندہ کو حاصل کر لینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تو سمجھ بیٹھا ہے۔ یہ تجارت نہیں ہے کہ مال و دولت کی فراوانی سے جو چاہا خرید لیا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں فرخندہ کو ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا۔“

دادا نے طنز یہ کہا۔ ”ہاتھ کنٹن کو آرسی کیا، یہ بھی دیکھ لوں گا۔“

فیروز بخت اور فرخندہ نے ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور جدا ہو گئے۔ فیروز بخت بھاگتا ہوا

قطب عالم کے مزار پر جا پہنچا۔ وہاں ستار اس سے پہلے ہی پہنچا ہوا تھا۔ ”میرے آقا! آپ کہاں چلے گئے تھے، آپ کو یہاں نہ پا کر میں تو بہت پریشان ہو رہا تھا۔“
فیروز بخت نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”میں ذرا ہوا خوری کو چلا گیا تھا۔“

ستار نے کہا۔ ”لیکن سجادہ نشین نے تو مجھے یہ بتایا ہے کہ آپ بھکاریوں کے ساتھ رات ہی کہیں چلے گئے تھے۔“
فیروز بخت نے گھبرا کر کہا۔ ”سجادہ نشین کیا میری چوکیداری کرتا رہا ہے؟“

ستار نے کہا۔ ”میرے آقا! سجادہ نشین کی بات کا تو خود میں نے بھی یقین نہیں کیا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ آپ بھکاریوں کے ساتھ تشریف لے گئے ہیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔“
فیروز بخت اور ستار ایک ساتھ اپنے گھر احمد آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

فیروز بخت کا سارا کاروبار، عملے کے لوگ چلا رہے تھے اور وہ فرخندہ کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ کیفیہ اس کی نیم دیوانگی کو تشویش سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار شازیہ پر سختی کرتی اور کہتی کہ ایک ایسا نوجوان تیرے قابو میں نہیں آ رہا جو ہر وقت تجھ سے قریب رہ سکتا ہے۔ شازیہ بے بسی سے جواب دیتی۔ ”فیروز بخت حد درجہ سرد مہر ہے۔ اس کا دل پتھر کا ہے اور چٹان پر محبت کا بیج ڈال کر اس کے نمو اور نشوونما کی امید کرنا سراسر حماقت ہے۔“

تاجروسی احمد بھی مایوس اور شرمندہ تھا۔ وہ اپنی بیٹی سائرہ سے ناراض تھا کہ وہ بھی فیروز بخت کا شکار نہیں کر سکی تھی۔ فیروز بخت فرخندہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن خوفزدہ تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو نظام، نرجس، کیفیہ اور سائرہ کا باپ تاجروسی احمد سب مل کر اس کے خلاف محاذ آرائی کریں گے۔

ستار نے عرض کیا۔ ”میرے آقا! منصوبے کے مطابق ہمیں سورت چلے جانا چاہیے۔ اب تامل کس بات کا؟“

فیروز بخت بدرجہ مجبوری بولا۔ ”لیکن ہم دونوں سورت کتنے دن کے لیے جائیں گے؟ اور کتنی بات تو یہ ہے کہ پچھلے دنوں میں سورت میں بڑی پریشانیاں اٹھا چکا ہوں اس لیے اب وہاں کے نام سے ہی وحشت شروع ہو جاتی ہے۔“

ستار نے مایوسی سے پوچھا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ سورت نہیں جائیں گے؟“

فیروز بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نہ کریں تو؟“

ناظم نے جواب دیا۔ ”جناب! میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ اگر ایک بار کوئی دوسرا تاجر ہمارے مقابلے پر آگیا تب پھر وہ بار بار ہمارے مقابلے پر آتا رہے گا اور یہ خطرہ پیدا ہو جائے گا کہ آئندہ وہی ملک التجار بن جائے اور ہم ثانوی حیثیت اختیار کر جائیں۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”اگر ہم ملک التجار نہ بھی رہیں اور کوئی دوسرا تاجر یہ مرتبہ حاصل کر لے تو اس سے ہمیں کیا نقصان پہنچے گا؟“

ناظم اعلیٰ حیرت سے فیروز بخت کی صورت دیکھنے لگا۔ ستار نے چٹکی بھری کہ اس قسم کی باتیں مت کیجیے۔

لیکن فیروز بخت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مزید کہا۔ ”صاحبان! میں کچھ بھی سہی مگر حریص نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کاروبار کو مختصر اور محدود کر دینا چاہیے کیونکہ اس طرح ہماری مصروفیت میں کمی واقع ہو جائے گی اور ہم سب چین و سکون کے ساتھ زندہ رہ سکیں گے۔“

ناظم اعلیٰ نے افسوس سے کہا۔ ”میرے چھوٹے آقا! پست بہتی سے تو دنیا کا کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔“

ستار نے اپنے طور پر کہا۔ ”ناظم اعلیٰ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے طور پر معاملہ کر لیں۔ رہ گئی میرے آقا کی منظوری تو یہ میں بعد میں دلوادوں گا۔“

ناظم اعلیٰ، ستار کو ایک طرف لے گیا اور پوچھا۔ ”تیرا اپنے چھوٹے آقا سے کیا رشتہ ہے؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”میں اپنے اس آقا کا خدمت گزار ہوں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

ناظم اعلیٰ نے کہا۔ ”اپنے آقا سے زیادہ ہوشیار تو، تو خود ہے۔ احمد آباد واپس جا کر آقا اور داؤد مرحوم کی بیوہ کیفیہ سے میری طرف سے عرض کر دینا کہ انہیں اپنے مرحوم شوہر کی حیثیت اور مقام کو برقرار رکھتا ہے تو اس نا تجربہ کار نوجوان کی جگہ کسی اور کو ملک التجار بنائیں کیونکہ یہ بے پروا اور قانع نوجوان ذرا سا بھی کاروباری مزاج نہیں رکھتا۔“

ستار نے جواب دیا۔ ”میں یہ بات اپنے مرحوم آقا کی بیوہ سے نہیں کر سکتا۔“

فیروز بخت نے دور ہی سے آواز دی۔ ”یہ تم دونوں عورتوں کی طرح کھسک پھسک کر رہے ہو؟“

دونوں گھبرا کر فیروز بخت کے پاس واپس آئے۔ فیروز بخت نے ناظم اعلیٰ کو حکم دیا۔ ”ولندیزی جہاز کا سودا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لی الحال کاروبار کو محدود

حولی میں کیفیہ اور وحسی احمد کی طرف سے زبردست دباؤ پڑا کہ وہ شاز یہ یا سارہ سے شادی کر لے لیکن فیروز بخت نے انکار کر دیا۔ فیروز بخت لاشعوری طور پر فرخندہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گھنٹوں فرخندہ کے مسئلے پر غور کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے فرخندہ سے خفیہ شادی کر لینا چاہیے اور اس شادی کا اعلان کسی مناسب موقع پر اٹھار کھنا چاہیے۔

اسی دوران سورت سے اطلاع آئی کہ ایک ولندیزی جہاز خام ریشم، تانبا اور ہاتھی کے دانت لے کر آیا ہوا ہے چنانچہ اس کے نمائندوں نے پرزور خواہش کی کہ فیروز بخت کچھ دنوں کے لیے سورت آجائے۔ ادھر ستار کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ چند ماہ سورت چلا جائے۔ چنانچہ جب سورت سے اس کا بلاوا آیا تو فیروز بخت کو یہی شبہ گزرا کہ یہ بلاوا ستار کے اشارے پر آیا ہے۔

فیروز بخت، ستار اور دوسرے کارندے سورت روانہ ہو گئے۔ فیروز بخت نے یہ سفر بڑی بے دلی سے کیا تھا۔ ستار کو قلق تھا کہ اگر اس جمود کو توڑا نہ گیا تو فیروز بخت کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا اور شاید کچھ مدت بھی نہ گزرے کہ فیروز بخت کی جگہ کوئی نیا ملک التجار پیدا ہو جائے۔

سورت کے کاروباری ناظم اعلیٰ نے ولندیزی سامان کی اہمیت پر ایک چھوٹی سی تقریر کی اور فیروز بخت کو بتایا کہ خام ریشم اعلیٰ سے، تانبا فرانس سے اور ہاتھی کے دانت افریقا سے لائے گئے ہیں اس لیے ان چیزوں کے بلند معیار پر شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا اور ان کی ہندوستان میں بڑی مانگ ہے اس لیے پورے جہاز کا سودا کر لیا جائے۔

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”پورے جہاز کی مالیت کیا ہوگی؟“

ناظم نے جواب دیا۔ ”پانچ لاکھ روپے۔“

فیروز بخت نے حیرت سے پوچھا۔ ”اس جہاز کے مال کا ہمارے علاوہ بھی کوئی خریدار ہے؟“

ناظم کو ہنسی آگئی، بولا۔ ”شاید آپ کو اپنی اہمیت اور قدرو قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہے ورنہ یہ سوال نہ کرتے۔“

فیروز بخت نے اصرار کیا۔ ”میں اپنے سوال کا جواب مانگ رہا ہوں؟“

ناظم نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”میرے چھوٹے آقا! آپ ملک التجار ہیں اور ملک التجار کی موجودگی میں کوئی دوسرا تاجر ولندیزی جہاز کا معاملہ کس طرح کر سکتا ہے؟ کسی کو اپنی شامت تھوڑی بیلوانی ہے۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”اگر ہم ولندیزی جہاز کا سودا

رکھا جائے۔“
ناظم اعلیٰ نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے مگر اس کے نتائج دور رس معزز لکھیں گے کیونکہ ولندیزی جہاز کسی اور تاجر سے معاملہ کرے گا اور کاروباری دنیا میں ہماری حیثیت ثانوی ہو کر رہ جائے گی۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا، میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔“ ناظم اعلیٰ منہ لٹکا کر چلا گیا۔
رات کو ستار نے فیروز بخت سے کہا۔ ”میرے آقا! اپنا فیصلہ بدل لیں کیونکہ یہ فیصلہ آپ کی ساکھ کو مجروح کر دے گا۔“

”ستار! تو نہیں جانتا کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟“ فیروز بخت نے پوچھا۔

ستار نے کہا۔ ”نہیں، میں نہیں جانتا۔“
فیروز بخت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور فرخندہ کے تصور میں چلا گیا، بولا۔ ”ستار! میں یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر ولندیزی جہاز کا سودا کر لیا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں جہاز پر موجود سامان کو اترا کر تجارتی گودام میں رکھواؤں اور اس کو منڈیوں میں پہنچاؤں۔ اس کام کے لیے بڑا وقت درکار ہوگا اور افسوس کہ میرے پاس سورت کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔“
ستار نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ کے پاس وقت ہی وقت ہے آقا۔ احمد آباد میں واپس جانا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا سورت میں ٹھہر کر درپیش مسائل اور معاملات کا نمٹانا۔“
فیروز بخت نے سختی سے جواب دیا۔ ”میں نے ایک بار جو فیصلہ کر لیا سو کر لیا۔“

ستار نے کہا۔ ”میرے آقا! آپ یقین کیجئے اس کے معز نتائج بہت جلد رونما ہونا شروع ہو جائیں گے۔“
”مثلاً کون سے برے نتائج، کوئی مثال؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! کیا آپ نے ناظم اعلیٰ کے چہرے پر اچانک چھا جانے والی اس خفگی اور اذیت کو نہیں محسوس کیا جو آپ کے منفی حکم کے بعد نمودار ہو گئی تھی۔“
فیروز بخت نے کہا۔ ”نہیں، میں نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی۔“

ستار نے بدستور عاجزی سے عرض کیا۔ ”لیکن میں نے یہ اذیت اور خفگی صریحاً محسوس کر لی تھی اور اس کا یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ ناظم اعلیٰ آپ کے خلاف سازشیں کرے گا اور اس سے آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور آپ کے مخالف فائدہ اٹھا جائیں گے۔“

فیروز بخت نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”اندیشہ ہائے دور و دراز۔ وہم شک محض بدظنی۔ ستار تو یاد رکھ ایسا نہیں ہوگا۔“
فیروز بخت نے اس کی ایک نہ مانی اور چوتھے دن احمد آباد کی واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

دوران سفر اس پر جنون سا طاری ہو چکا تھا۔ وہ فرخندہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس سے شادی اور پرست از دواجی زندگی کی لذتوں کا لمس محسوس کرتا رہا۔ اسے بڑا ملال تھا کہ اس نے بوقت سفر فرخندہ سے ملاقات نہیں کی اور نہ ہی اسے یہ اطلاع دی کہ وہ سورت جا رہا ہے۔ وہ یہ سوچ کر لرز جاتا کہ اگر فرخندہ اس سے ناراض ہو گئی اور اس سے ملنا گوارا نہ کیا تو وہ فرخندہ کو کس طرح منائے گا۔

دوسری طرف ستار کو یہ شبہ تھا کہ ناظم اعلیٰ نے جو بات اس سے کی تھی اور اس نے انکار کر دیا تھا وہی بات ان دونوں منشیوں سے ضرور کی ہوگی جو اس سفر میں اس کے ساتھ چل رہے تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اس کا یہ خیال درست نکلا تو احمد آباد میں داخل ہوتے ہی محلاتی سازشوں کا شکار ہو جائے گا۔

☆☆☆

وہ نہایت افسردگی اور مردہ دلی سے احمد آباد میں داخل ہو گیا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اپنی حویلی کے بجائے سیدھا فرخندہ کے پاس چلا جائے۔

کیفیہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”کیا ولندیزی جہاز کا سودا ہو گیا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں نے حکمایہ کہہ دیا ہے کہ اس جہاز کا سودا نہیں کیا جائے گا۔“
”کیوں، کوئی سبب؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ مجھے سورت پسند نہیں، میں وہاں زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتا۔“
کیفیہ نے ناگواری سے کہا۔ ”کاروبار کی خاطر تجھے سورت میں رک جانا چاہیے تھا۔“

فیروز بخت نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”ایک جان ہزار آزار۔ میں کاروبار کی خاطر اتنا نہیں کر سکتا۔ آخر روپوں پیسوں کا مصرف کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت کس کے لیے پیدا کی جائے۔ دولت اور مال و زر کی ہوس وہ شاہراہ ہے جس سے جملہ شیطانی راستوں کی ابتدا ہو جاتی ہے۔“

کیفیہ نے چونک کر پوچھا۔ ”تو مال و زر کی بابت تیرے یہ خیالات ہیں؟“
”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں تو، توکل اور

قامت کا قائل ہوں اور میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا ہے کہ حرم و طمع سے ہمیشہ دور رہوں گا۔“

کیفیہ نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی لیکن وہ اس تبدیلی کا سبب جاننے کے لیے بے چین ہو گئی۔ فیروز بخت اس کی بیٹی شازیہ کی پرہیزگاری کے بغیر معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ اسے حویلی اور کاروبار سے بھی کوئی خاص انس نہیں نظر آ رہا تھا۔

دوسری طرف تاجر وصی احمد سورت چلا گیا اور ولندیزی جہاز کے سامان کا سودا کر لیا۔ اس نے سورت میں داؤد مرحوم کے کاروباری عملے کو ترغیب و تحریص دے کر اپنے پاس لگا لیا۔ ناظم اعلیٰ نے فیروز بخت اور کیفیہ کو ایک تفصیلی خط لکھ کر مطلع کر دیا کہ اب وہ سورت میں ان کے کاروباری فرائض اور حقوق سے دستبردار ہو چکا ہے اس لیے اس کا استعفا منظور کیا جائے، اس استعفی کے ساتھ ہی دوسرے اہم اور قیمتی اہل کاروں اور کارندوں کے استعفی بھی موصول ہو گئے۔ فیروز بخت کی حویلی اور کاروباری کونٹھ میں زلزلہ آ گیا۔ وصی احمد نے احمد آباد میں بھی جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ کیفیہ پریشان ہو گئی اور اس نے فیروز بخت کو تحکمانہ مشورہ دیا کہ وصی احمد کی محاذ آرائی کا مقابلہ کرے اور اگر وہ خود کو مقابلے کا اہل نہیں پاتا تو پھر چپ چاپ کونے میں بیٹھ جائے اور کیفیہ کو اجازت دے کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کے کاروبار کو نہ صرف زندہ رکھے بلکہ ترقی بھی دے۔

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”کیا آپ وصی احمد سے جیت سکیں گی؟“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، اس میں مشکل کی کیا بات ہے؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”آپ کو اجازت ہے لیکن میری ناقص رائے میں آپ مقابلہ اس طرح کریں کہ وصی احمد اور آپ کے درمیان حسد اور انتقام کے جذبے نہ پیدا ہو جائیں۔ محاذ آرائی صاف ستھری ہو۔“

کیفیہ نے برا سامنہ بتایا۔ ”وصی احمد نے جو کچھ کیا ہے وہ صاف ستھرا نہیں ہے۔ اس کا جواب بھی اس کے حملے کے مطابق دیا جائے گا۔“

فیروز بخت سامنے سے ہٹ گیا۔

نظام بہت دنوں سے موقع کی تلاش میں تھا۔ اب موقع مناسب دیکھ کر آگے بڑھا اور کیفیہ کی دل جوئی کرنے لگا۔

فیروز بخت کا اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ وہ فرخندہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر فرخندہ اسے بھولی نہ ہوگی تو ناراض ضرور ہوگی چنانچہ وہ

ہمت کر کے قطب عالم بخاری کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بہانے پتوہ آباد چلا گیا۔

فرخندہ، فیروز بخت کے بغیر بہت بے چین تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسے فیروز بخت کی سرد مہری پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ وہ پمپل کی جڑ میں بیٹھ کر آنے جانے والوں میں فیروز بخت کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ اس کے انتظار میں بڑی طمانیت اور سکون تھا کیونکہ وہ اپنے عشق کا چہ چا نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی اور فکر مندی نے سینے میں گھٹن پیدا کر دی اور فرخندہ کو بخار آ گیا۔ اس کا پستہ قامت گنجا باپ بیٹی کی ذہنی اور قلبی اذیت سے آگاہ تھا۔ اس نے جلے کئے لہجے میں فرخندہ کو سمجھایا۔ ”فرخندہ! میں یک طرفہ معاملے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر وہ تجھے بھول گیا ہے تو، تو بھی خاموشی اختیار کر۔ اس خاموش آگ میں جلنے سے حاصل؟“

فرخندہ نے باپ کی بات انہی میں اڑادی۔ ”بابا، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ آپ کا شبہ سراسر غلط ہے۔ میں کسی کی محبت میں جلنے کے بجائے جلانے کی قائل ہوں۔ میرے دل پر فیروز بخت کی بے اعتنائی یا بے وفائی کا ذرہ برابر اثر نہیں۔“

ایک دن اس نے دوپہر سے ذرا پہلے خلاف توقع فیروز بخت کو پمپل کے درخت کی طرف آتے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کئی بار اپنے دیکھے کی تصدیق کی اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ آنے والا فیروز بخت ہی ہے تو بیزاری سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

فیروز بخت کا گھوڑا پمپل کے سائے میں رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹاپوں کی آہٹ پر فرخندہ اس کی طرف ضرور دیکھے گی لیکن وہ بدستور منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ فیروز بخت گھوڑے سے اتر کر فرخندہ کے پاس جا کھڑا ہوا پھر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ فرخندہ نے اسے سرسری نظر سے دیکھ کر پھر منہ پھیر لیا۔

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا تو ناراض ہے مجھ سے؟“

فرخندہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ذرا دور کھسک کر بولی۔ ”میں تجھے نہیں جانتی، مجھ سے دور رہ۔“

فیروز بخت کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ”فرخندہ! اس ناراضی کا سبب؟“

فرخندہ نے بدستور ناراضی سے جواب دیا۔ ”میں تجھ سے نہیں بولتی، تو واپس چلا جا۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! میں واقعی اس کا گناہ

گار ہوں کہ تجھے اپنے سورت جانے کے منصوبے سے مطلع نہیں کیا۔ میں اچانک ایک ضروری کاروباری مقصد سے سورت چلا گیا تھا لیکن تجھے نہ بتانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں اپنا کام بھی انجام نہ دے سکا اور چند غلطیاں کر کے اپنا ایک زبردست کاروباری رقیب بھی پیدا کر لیا۔“

فرخندہ میں ذرا سی تبدیلی ہوئی، بولی۔ ”تو، تو احمد آباد میں نہیں تھا ان دنوں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یہاں نہیں تھا۔ سورت چلا گیا تھا۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”پھر بھی تجھے بتا کر جانا چاہیے تھا۔ تو اس اذیت اور کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا جس سے میں دوچار رہی ہوں۔ میرا بابا بھی تجھ سے بدظن ہو گیا ہے کیونکہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے اور میری اداسی سے میرا باپ بھی اداس ہو جاتا ہے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! تو اس ایثار کا اندازہ نہیں لگا سکتی جو میں تیری خاطر کر رہا ہوں۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں ایثار کا تو اندازہ کرنے سے رہی لیکن اب تجھے ایک قطعی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے۔“

فیروز بخت نے افسوس سے کہا۔ ”میں کیا چاہتا ہوں یہ عجیب سوال کیا تو نے۔ یعنی ابھی تک تجھے یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟“

فرخندہ نے اپنے سامنے گھٹنوں سے اپنے باپ کو آتے دیکھا تو گھبرا کر گھڑی ہو گئی، بولی۔ ”دیکھ میرا باپ آ رہا ہے۔ وہ تجھے میرے پاس دیکھ کر خوش نہیں ہوگا اس لیے تو ذرا دور ہٹ جا۔“

فیروز بخت نے گھوم کر دیکھا۔ فرخندہ کا باپ تیز تیز قدموں سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس نے فرخندہ سے کہا۔ ”میں تجھے یہ مشورہ دوں گا کہ میرے معاملے میں کسی بحث مباحثے سے بچتی رہ اور اپنی طرف سے کسی سے بھی وعدے وعید ہرگز نہ کر۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں تو خاموش رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے صرف تیری فکر ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تجھ سے جس قسم کی باتیں ہونے والی ہیں اس میں بڑے بڑوں کو پسینا آ جاتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ تو بھی لرز جائے گا۔“

فرخندہ کا باپ ان دونوں کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے فیروز بخت کو بیزار نظروں سے دیکھتے ہوئے فرخندہ سے سوال کیا۔ ”تو یہاں کیا کر رہی ہے اور اسے اپنے پاس

کیوں بیٹھنے دیا؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”بابا میں نے قطعی فیصلے کے لیے کہا تھا اور یہ تیار ہے اور کہتا ہے کہ میں ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں۔“

باپ نے خشکی نظروں سے فیروز بخت کو دیکھا اور کرخت لہجے میں کہا۔ ”تب پھر میرے ساتھ چل تا کہ تو خود بھی جان جائے کہ فرخندہ تیرے لیے کتنی سربلحہ حصول ہے یا مشکل الحصول۔“

فرخندہ نے فیروز بخت کو نظروں ہی نظروں میں حکم دیا۔ ”اٹھ اور ہمارے ساتھ چل۔“

یہ تینوں ایک ساتھ چل پڑے۔ فیروز بخت نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور دھڑکتے دل سے ان دونوں کے ساتھ چلتا رہا اور سوچتا رہا کہ معلوم نہیں اسے اس وقت کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔

☆☆☆

فیروز بخت کو فرخندہ کی برادری نے بڑی عزت و احترام سے قبول کیا۔ فرخندہ کے باپ نے اسی وقت ایک ہنگامی بنچایت بلالی۔ جس میں برادری کے گیارہ بڑوں نے فیروز بخت کو اپنے پاس بٹھا کر آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ فرخندہ کا دادا سرخ بنادیا گیا۔ سرخ کے مقابل فیروز بخت بیٹھا تھا اور چبوترے کے سامنے نیچے برادری کے مرد عورتیں اور بچے جمع تھے۔ فرخندہ کو بلا کر فیروز بخت کے پاس بٹھا دیا گیا۔

سرخ نے فیروز بخت کی طرف جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”نوجوان تاجر! فرخندہ اور تیرے معاشقے کی داستان برادری میں تعجب اور تجسس سے سنی جاتی رہی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو اس ملک کا بڑا تاجر ہے لیکن معاشرے میں جتنا بڑا اور غیر معمولی تو ہے اتنی ہی بڑی فرخندہ بھی ہے کیونکہ فرخندہ جس برادری سے تعلق رکھتی ہے اس کا ماضی میں راجا بھوج کے سرکاری بھکاریوں سے سلسلہ ملتا ہے۔ بعد میں اس خاندان کے سربراہ آدرہ لوگ مسلمان ہو گئے اور اسی خانوادے سے فرخندہ کا بھی تعلق ہے۔ ہم لوگ در یوزہ گری نہیں کرتے بلکہ شاہوں، مہاراجوں اور امراء کے دروں سے وابستہ لوگ ہیں اور ہمارے ماہانے، سالانے اور ہفتے مقرر ہیں اور ہم لوگ اپنے مقررہ وقت پر جا کر اپنا حق حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارا تعلق بھکاریوں کے معزز ترین گھرانے سے ہے۔“ فیروز بخت نے کوئی جواب نہ دیا۔

سرخ نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ”کیا میں بنچایت

کی کارروائی شروع کر دوں؟“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں شروع کر دیجیے، میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔“
سرخ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور برادری والوں کو مخاطب کیا۔ ”بچو! اور میری برادری کے لوگو! میرا خیال ہے کہ اس وقت ہم سب جس کام سے یہاں جمع ہوئے ہیں اس سے یہاں کا ہر شخص واقف ہے۔“
کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ ”ہاں ہم سب واقف ہیں۔“

سرخ نے فیروز بخت کو حکم دیا۔ ”تو اپنی جگہ پر کھڑا ہو جا۔“
فیروز بخت کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے فیروز بخت کو بڑے اشتیاق سے دیکھا۔

سرخ نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ نو جوان تاجر فرخندہ سے عشق کرتا ہے اور شاید فرخندہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اب میں تم سب کی موجودگی میں اس نو جوان سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ فرخندہ کے معاملے میں سنجیدہ ہے؟“
فیروز بخت نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”یہاں مجھے کیا کہنا ہے؟“

سرخ نے جواب دیا۔ ”صرف یہ کہ جو کچھ بھی تجھ سے کہا جائے اس کا ہاں یا نہیں میں جواب دیتا رہوں۔“ اس کے بعد سرخ نے ایک بار پھر بچوں اور برادری والوں کو مخاطب کیا۔ ”جب ان دونوں کی طمان عشق نے شہرہ پکڑا تو بچوں کو ان دونوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنا پڑا۔“
پھر فیروز بخت سے پوچھا۔ ”تو اپنے ارادے میں ثابت قدم اور مستقبل پر نظریں جمائے رکھ۔ کسی دن بھی یہ تعلق مستقل اور دائمی ہو جائے گا۔ کیا تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اسے اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔“ برادری نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔
فرخندہ کے دادا نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ”ہو سکتا ہے کہ یہ تاجر خود کو معزز اور اعلیٰ دارفہ سمجھ رہا ہو لیکن ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا کیونکہ ہم خود بھی کسی معمولی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ تاجر تو بہت مل جائیں گے لیکن ہم جیسے کہیں نہیں ملیں گے۔“ اس کے بعد اس نے فرخندہ کو آواز دی اور کہا۔ ”تو یہاں ہمارے پاس آ جا۔“
فرخندہ چہرے پر دادا کے پاس پہنچ گئی۔ دادا نے اسے فیروز بخت کے قدموں میں بٹھا دیا اور کہا۔ ”اب میں

فرخندہ سے پوچھتا ہوں کہ وہ ہم سب کو بتائے کہ وہ فیروز بخت سے محبت کرتی ہے اور اس نے اپنے محبوب کو اچھی طرح پرکھ اور سمجھ لیا ہے۔“

فرخندہ کھڑی ہو گئی اور جواب دیا۔ ”بہر حال میں اس نو جوان سے محبت کرتی ہوں لیکن اس کو پرکھوں گی شادی کے بعد۔“

دادا نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ”کیا تو فرخندہ کی خاطر اس کی برادری کی مقرر کردہ شرائط کو قبول کرنے کو تیار ہے؟“
فیروز بخت نے فرخندہ کی طرف اور فرخندہ نے فیروز بخت کی طرف دیکھا، فرخندہ نے آہستہ سے کہا۔ ”کہہ دے ہاں، برادری کی شرائط مجھے سنے بغیر ہی منظور ہیں۔“
فیروز بخت نے یہ جواب دہرا دیا اور ایک بار پھر تالیوں سے فضا گونج گئی۔

دادا نے مزید کہا۔ ”اور یہ بتا کہ تیری نظر میں تیرا حسب نسب زیادہ قیمتی ہے یا فرخندہ؟“
اس نے پھر وہی جواب دیا۔ ”فرخندہ۔“
دادا نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔ ”فیروز بخت! تو یہ بات تو جانتا ہی ہوگا کہ جب کوئی شخص ایک دھرم سے دوسرے دھرم میں داخل ہوتا ہے اور کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے کا اختیار کرتا ہے تو اس کو نئے مذہب کے اصول و ضوابط بتائے جاتے ہیں اور اس سے چند عہد و میمان کیے جاتے ہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے۔“

دادا نے اپنا فیصلہ سنادیا۔ ”اس طرح ہماری برادری کا بھی یہ اصول ہے کہ یہ اس وقت تک کسی شخص کو اپنی برادری میں داخل نہیں کرتی جب تک کہ وہ سال بھر بھیک مانگ کر نہ دکھائے لیکن چونکہ تیرا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے اس لیے تجھے چھ ماہ کی چھوٹ دے دی جائے گی اور تو اگر فرخندہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی خاطر چھ ماہ تک بھیک مانگے گا اور جب تو اس امتحان میں پاس ہو جائے گا تو فرخندہ تجھ سے وابستہ کر دی جائے گی۔“

فیروز بخت کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پریشانی میں کہا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے؟“
اب کسی شخص نے زبان کھولی۔ ”اگر تو فرخندہ سے محبت کرتا ہے تو تجھے اس آزمائش سے بہر حال گزرنا پڑے گا۔“
فرخندہ نے اس کا ہاتھ دھپایا۔ ”فیروز بخت! یہ تو کیا کہہ رہا ہے..... کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں تجھ سے محبت کرتا ہوں فرخندہ لیکن میں بھیک نہیں مانگ سکتا۔“
فرخندہ کے دادا نے بچوں کو مخاطب کیا۔ ”بچو! نوجوان آزمائش سے گزرے بغیر فرخندہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

بچوں نے بیک آواز میں کہا۔ ”پھر یہ رشتہ بھی نہیں ہو سکتا۔“

فرخندہ نے اپنے دادا سے کہا۔ ”دادا! فیصلے میں عجلت سے کام نہ لو۔“ بچوں کی طرف منہ کر کے درخواست کی۔ ”فیروز بخت کو سوچنے کا موقع دیا جائے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ فیروز بخت مجھ سے محبت کرنے کے باوجود اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں قبول کر سکتا۔“

دادا نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ”کیا تو فرخندہ کے خیال سے متفق ہے؟“

فیروز بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فرخندہ نے عاجزی سے درخواست کی۔ ”فیروز بخت! میری خاطر تو ہاں کر لے۔ خدا کے لیے اس وقت تو دادا اور برادری کے بچوں کو مایوس نہ کر۔ ورنہ یہ لوگ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیں گے۔“

فیروز بخت نے عاجز و جبر کی شکار فرخندہ کو دیکھا تو اس کا دل لرز گیا، بولا۔ ”تو مجھے قہرِ خدا مت میں گراتی رہی ہے۔ میری زندگی کا یہ سب سے زیادہ بھیاںک اور شرمناک گڑھا ہے جس میں مجھے گرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔“

فرخندہ نے مایوسی سے پوچھا۔ ”تو کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، میرا خدا شاہد ہے کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ تجھے چاہتا ہوں۔ میں کس طرح اپنے اس دعوے کا یقین دلاؤں؟“

فرخندہ نے کہا۔ ”اس طرح کر یا تو، تو فوراً ہی ہاں کر دے اور اگر ہاں نہیں کرتا تو کچھ مہلت ہی مانگ لے تاکہ تو غور و فکر اور مجھ سے مشورے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔“

فیروز بخت نے فرخندہ کے دادا اور بچوں سے ایک ساتھ کہا۔ ”صحابان! میں آپ کا اتنا بڑا فیصلہ سوچے سمجھے بغیر نہیں مان سکتا۔ آپ لوگ ایک ہفتہ سوچنے کی مہلت دیجیے تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔“

دادا نے بچوں سے پوچھا۔ ”اس مہلت کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟“
بچوں نے جواب دیا۔ ”ہم سے پوچھنے کے بجائے

یہ سوال فرخندہ سے کیا جائے تو بہتر ہے۔“

لیکن فرخندہ نے سوال کرنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔ ”میرا خیال ہے فیروز بخت کو سوچنے کے لیے سات دن دے دیے جائیں، میں اسے راضی کر لوں گی۔“

چنانچہ دادا نے بھی اعلان کر دیا۔ ”نوجوان تاجرا تجھے سوچنے کے لیے سات دن دے دیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ تو ان سات دنوں میں کوئی فیصلہ کر لے گا۔“

فیروز بخت نے فرخندہ کی طرف دیکھا، فرخندہ نے جلدی سے کہا۔ ”ہاں، مجھے یقین ہے کہ یہ سات دنوں میں کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کر لے گا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو میں خود بھی اسے خدا حافظ کہہ دوں گی۔“

دادا نے بچوں کی اتفاق رائے سے اعلان کر دیا۔

”نوجوان تاجر کو سوچنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے لیے موقع ہے کہ یا تو چھ ماہ کی درپوزہ گری کے بعد فرخندہ کو حاصل کر لے ورنہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے۔“

فیروز بخت ہنچایت کے فیصلے سے اداس ہو گیا تھا اور ان سب میں خود کو بالکل اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فرخندہ کو دور ہی سے مطلع کر دیا۔ ”میں واپس جا رہا ہوں۔“ فرخندہ باپ کو چھوڑ کر اس کے پاس آگئی۔ ”فیروز بخت! آج تو مسلسل دل دکھا رہا ہے، کیا بات ہے کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتا؟ کیا تو سات دنوں کی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھائے گا؟“

فیروز بخت نے بے دلی سے کہا۔ ”اگر تیری ہنچایت نے سنگدلی سے کام لیا تو میں پسپائی اختیار کر لوں گا۔“

فرخندہ نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔ ”تب پھر تو اس وقت چلا جا، میں تجھ سے بات نہیں کروں گی۔“

فیروز بخت، فرخندہ کی خفگی سے ڈر گیا۔ ”فرخندہ! میں تجھے اداس بھی نہیں دیکھ سکتا لیکن تیری ہنچایت کو مجھے اس بے ہودہ آزمائش میں بھی نہیں ڈالنا چاہیے۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”میں یہاں تجھ سے کوئی بات نہ کروں گی، تو میرے ساتھ پتھیل کے سائے تک چل خوب باتیں کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے تو بہتر ہے۔“

فیروز بخت نے اختلاف نہیں کیا اور وہ دونوں پتھیل کے درخت کی طرف چل دیے۔

فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور گرم صم چلتے ہوئے پتھیل کے سائے تلے پہنچ گیا پھر گھوڑے کو یوں ہی چھوڑ کر دونوں درخت کی جڑ میں بیٹھ گئے۔ دونوں ہی خاموش رہے۔ آخر فیروز بخت نے اجازت طلب کی،

بولی۔ ”فرخندہ! میں جانا چاہتا ہوں۔“
 فرخندہ نے بیزاری سے کہا۔ ”تو میں نے تجھے روکا
 کب ہے؟ جا اور شوق سے جا۔“
 فیروز بخت واپس جانے کے لیے مڑا تو فرخندہ نے آواز
 دی۔ ”بخت! اتنی بے حسی بھی اچھی نہیں، میری بات تو سن۔“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تو بات تو کرتی نہیں پھر
 میں بیکار بیٹھ کر کیا کروں؟“
 وہ واپس آگیا۔ فرخندہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کر سوال کیا۔ ”جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے مجھے یہیں بتاتا جا۔
 میں تیرے انتظار کی کوفت سے بچنا چاہتی ہوں۔“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تجھے شرمندہ ہونے کی
 کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب بھی تجھ سے محبت کرتا ہوں
 لیکن بھیک مانگ کر تجھے حاصل کرنا، بہت دشوار شرط ہے۔“
 فرخندہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”لیکن ملتے رہنا۔ رہا
 بھکاری ہونے کا سوال تو یہ تیرے لیے یوں شرمناک ہے کہ
 تو ایک تاجر ہے اور چونکہ تجھے کوئی پریشانی بھی نہیں اٹھانا
 پڑی اس لیے تو کتر رہا ہے۔“
 فیروز بخت نے کہا۔ ”ایک یہ بات بھی ہے لیکن میں
 اپنی حقیر سے ڈر رہا ہوں۔“

معاملہ بگڑ چکا تھا، ان دونوں نے بڑی کوشش کی کہ
 خوشی اور مفاہمت کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوں
 لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ کافی دیر ایک دوسرے کے سامنے رہ کر
 بھی دونوں اکھڑے اکھڑے، چپ چپ رہے۔ آخر فیروز
 بخت نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور فرخندہ سے
 کہا۔ ”میں اجازت چاہتا ہوں۔“

فرخندہ نے گم صدم لہجے میں جواب دیا۔ ”جب تو جانا
 ہی چاہتا ہے تو بعد شوق جا، میں تجھے نہیں روکوں گی لیکن تو یہ
 بتا کہ تو اپنے فیصلے سے ہمیں مطلع کرے گا یا نہیں؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میں واپس آؤں گا اور ضرور
 آؤں گا اور تیری پچایت کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دوں گا۔“
 فرخندہ نے جبراً خوش دلی سے کہا۔ ”تب پھر جانا، فی
 امان اللہ..... خدا تجھے خوش اور تادیر سلامت رکھے۔“

فیروز بخت احمد آباد واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی
 فرخندہ کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھی کپکپاتی رہی
 اور جب تک فیروز بخت نظر آیا، دیکھتی رہی لیکن وہ جیسے ہی
 نظروں سے اوجھل ہوا وہ زار و قطار رونے لگی۔ شہل کی جڑ
 میں لیٹ گئی۔

فیروز بخت اپنی حویلی میں واپس پہنچا تو ہر شخص کو

بیگانہ، اجنبی اجنبی سا محسوس کیا۔ کیفیہ نے اسے نظر انداز
 کر دیا۔ شازیہ نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ نرجس نے اسے
 ایک نظر دیکھا اور اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اشارے
 سے فیروز بخت کو اپنے پاس بلایا۔ فیروز بخت، نرجس کے
 کمرے میں چلا گیا۔ نرجس نے کمرے کو اندر سے بند کر لیا
 اور سرگوشی کے انداز میں فیروز بخت سے مخاطب ہوئی۔
 ”فیروز بخت! میں پوچھتی ہوں تو یہ آج کل ہے کس چکر میں؟
 تو کھویا کھویا گم صدم کیوں رہتا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں، اول تو یہ کہ
 میں نہ تو کھویا کھویا رہتا ہوں اور نہ ہی گم صدم۔ لوگوں کو میری
 بابت کچھ شبہات ہو گئے ہیں جو جلد ہی دور ہو جائیں گے۔“
 نرجس نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھ میں تجھے مشورہ دوں
 گی کہ تو کیفیہ سے نہ الجھ۔ شازیہ سے شادی کر کے کیفیہ کے
 دل کو اپنی منگی میں لے لے، ورنہ پچھتائے گا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے
 کہ میں شازیہ سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ لوگ مجھے خواہ مخواہ
 پھانس رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان سے کس
 طرح بچھا چھڑاؤں؟“

نرجس نے پوچھا۔ ”لیکن تو شازیہ سے شادی کیوں
 نہیں کرنا چاہتا؟“

فیروز بخت نے سیدھا سا جواب دیا۔ ”شازیہ مجھے
 اچھی نہیں لگتی۔“

نرجس نے پوچھا۔ ”پھر تو کس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“
 ”ابھی میں خود بھی نہیں جانتا۔“

”تو جانتا ہے اور خوب جانتا ہے، مثل مشہور ہے کہ جس
 درخت کا بکل ہوتا ہے وہیں لگتا ہے۔ تیرا نسب نامہ بھی کچھ دیر
 ہی لگتا ہے ورنہ شازیہ اس بھکارن سے لاکھ درجے بہتر ہے۔“

فیروز بخت نسب نامے کے طعنے سے چڑ گیا۔ نرجس
 کے پاس سے اٹھ گیا لیکن نرجس نے اس کا راستہ روک لیا،
 بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تو فرار کا عادی ہے لیکن میری
 آخری بات سنا جا، اگر تو نے ہم سب کا کہنا نہ مانا تو، تو یہ سمجھ
 لے کہ عنقریب ایک ایسا انقلاب رونما ہونے والا ہے جس
 میں کچھ بھی نہ رہے گا اور تو اپنے کیے پر پچھتائے گا۔“

لیکن فیروز بخت جواب دیے بغیر چلا گیا۔

وہ تجارتی حویلی میں پہنچ گیا، وہاں ستار منہ لٹکائے
 بیٹھا تھا۔ عملے نے سلام کیا لیکن اس میں گرم جوشی نہیں تھی۔
 جب وہ اپنے کمرائے خاص میں جا کر بیٹھ گیا تو ستار بھی وہیں
 پہنچ گیا، بولا۔ ”میرے آقا! میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ

کچھ ہونے والا ہے۔“

فیروز بخت نے نہایت مبرجھل سے اپنی حالت برقرار رکھی بے پردائی سے پوچھا۔ ”کیا ہونے والا ہے؟“

”میں نہیں جانتا لیکن کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔“

میرمنشی نے فیروز بخت سے خوشامدانہ دریافت کیا۔

”میرے آقا! آپ کاروبار میں پوری دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، اس لیے ہمارا کاروبار خسارے میں جا رہا ہے۔ خدا کے لیے اس پر پوری توجہ دیں ورنہ مجھے یقین ہے کہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ قسمت برگشتہ ہے اور آسمان الٹی چال چل رہا ہے۔“

فیروز بخت نے سختی سے پوچھا۔ ”آخر بات کیا ہے، قسمت برگشتہ کیوں ہے اور آسمان الٹی چال کیوں چل رہا ہے؟“

میرمنشی نے عرض کیا۔ ”میرے آقا! آپ اپنی نہ تجربے کاری اور نوعمری کی وجہ سے میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں ورنہ جو کچھ میں کہہ چکا ہوں، اتنا ہی کافی ہے۔“

فیروز بخت نے کافی دیر سوچنے میں وقت گزار دیا۔

”منشی جی! جس کام پر میرا دل آمادہ نہیں ہوتا، میں نہیں کرتا۔“

میرمنشی بھی جھک مارنے کے لیے آیا تھا اور جھک مار کر چلا گیا۔

کارندوں نے مطلع کیا۔ ”سورت میں ایک جنگ (جہتی جہاز) آیا ہوا ہے۔ وہ ملا بار کے ساحل کو رومنڈل سے کالی مرجع لایا ہے، اس کا معاملہ کر لیجیے۔“

فیروز بخت ہنسا۔ ”ہش، میں کالی مرجع لے کر کیا کروں گا؟“

ایک منشی نے جواب دیا۔ ”اس مال کی مغربیوں میں بڑی کھپت ہے۔ جنگ جہاز جس پر کالی مرجع بار ہے وہ یہاں سے واپس چلا جانا چاہتا ہے اگر اسے واپس نہ جانا ہوتا تو وہ اپنے مال کو کسی مغربی ملک میں لے جا کر بیچ دیتا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میرمنشی سے کہو کہ وہ سورت کے ناظم اعلیٰ کے نام خریداری کا اجازت نامہ تحریر کر دے۔ میں اس پر دستخط کر دوں گا۔ دوسری بات یہ کہ اجازت نامے میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ اس مال کو کسی مغربی کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔“

کارندے چلے گئے لیکن ذرا دیر بعد میرمنشی خود آگیا اور عاجزی سے عرض کیا۔ ”میرے آقا! اس ناچیز کی رائے میں آپ چند دنوں کے لیے خود سورت تشریف لے جائیں اور یہ کام اپنے سامنے انجام دلوائیں کیونکہ یہ کوئی معمولی سودا نہیں ہے۔“

فیروز بخت کو فرخندہ کا خیال آ رہا تھا لیکن معلوم نہیں کیا سوچ کر جواب دیا۔ ”اچھا، سفر کی تیاری کی جائے۔ میں کل سے پرسوں تک سورت روانہ ہو جاؤں گا۔“

کاروباری حویلی کا ہر چہرہ بشاش ہو گیا۔ ستار نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور آہستہ سے کہا۔ ”اگر آپ نے مثبت فیصلہ نہ کیا ہوتا تو اس کا بہت برا نتیجہ نکلتا اور آپ کے حریف جانے آپ کے خلاف کون سی چال چل جاتے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ستار! میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے کاروبار کو ترقی دوں گا اور سستی اور غفلت کو خیر باد کہہ دوں گا۔“

ستار نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”آمین، ثم آمین۔“

اس کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور بڑی دیر تک فرخندہ سے جنگ کرتا رہا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ وہ فرخندہ کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دے لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ ہر بار دل یہی مشورہ دیتا کہ معاملے کو التوا میں ڈال کر وقت کا انتظار کر..... ممکن ہے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔

وہ فرخندہ سے ایک ہفتے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن اب سورت جانے کے بعد وعدے کے مطابق فرخندہ سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی سورت روانگی سے فرخندہ کو مطلع کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ خود فرخندہ کے پاس جا بھی نہیں سکتا تھا۔ سوچا ستار کو بھیج دیا جائے لیکن دوسرے ہی لمحے رسوائی کے خوف نے اس ارادے سے باز رکھا۔

دوسرے دن وہ اپنی حویلی سے نکلا تو خاصا پریشان تھا کیونکہ ابھی تک کوئی ایسی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی جس سے وہ فرخندہ کو اپنی سورت روانگی سے مطلع کر دیتا۔ باہر نسیم سحر کے جھونکوں میں شامل کیف و سرور نے اس کے رگ دے میں فرخندہ کے عشق کی لہریں دوڑا دیں۔ سوچی ہوئی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور سورت جانے کے چنان چیسے ارادے میں شکاف پڑ گیا۔ ستار اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کا رخ پتوہ آباد کی طرف کر دیا۔ ستار نے پوچھا۔ ”میرے آقا! آپ کے گھوڑے نے اپنا رخ بدل دیا ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، رخ گھوڑے نے نہیں خود میں نے بدلا ہے۔“

ستار نے حیرت سے پوچھا۔ ”گستاخی معاف، ادھر آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں پتوہ آباد جا رہا

ہوں، شاہ قطب عالم بخاری کے مزار پر..... میں ان سے اپنی کامیابی کی دعا مانگوں گا۔“
ستار نے خوش ہو کر عرض کیا۔ ”تب پھر میں بھی چلوں گا آپ کے ساتھ۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”نہیں، میں وہاں تنہا جاؤں گا۔ تو کاروباری حویلی پہنچ۔ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔“
وہ دونوں یہاں سے جدا ہو گئے۔ ستار اپنی راہ چلا اور فیروز بخت پتہ آباد روانہ ہو گیا۔

آبادی کو پیچھے چھوڑتا ہوا جب وہ اس چھوٹی سی کچی سڑک پر پہنچا جو سیدھی قطب عالم بخاری کے مزار تک جاتی تھی تو اس نے کپاس کے پودوں کی آڑ سے ایک جوڑے کو نکلنے ہوئے دیکھا۔ ایک شوخ و شریر لڑکی اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑے احمد آباد کی طرف جارہی تھی۔ لڑکی کے جسم پر سرخ لباس تھا اور نوجوان نے ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ نیلے رنگ میں سے نوجوان کا سرخ و سفید رنگ پھوٹ رہا تھا۔ اسے لڑکی پر کچھ شبہ گزرا۔ وہ گھوڑے کو بھگا کر ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا، ٹاپوں کی آواز پر دونوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

فیروز کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بے اختیار گھوڑے سے کود پڑا۔ ”فرخندہ! یہ تو ہے۔“ پھر نوجوان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

فرخندہ سکتے میں رہ گئی پھر ہوش میں آ کر بولی۔ ”ہاں، یہ میں ہوں، کیوں کیا بات ہے؟“

اس نے پھر وہی سوال کیا۔ ”یہ کون ہے؟“
فرخندہ نے جواب دیا۔ ”یہ میرے چچا کا بیٹا علی ہے اور میں نے تیری جگہ اسے دے دی ہے۔“

فیروز بخت کانپ گیا، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور گلا خشک ہو گیا۔ ”بے مشکل پوچھا۔“ اور میرا کیا بنے گا؟“
فرخندہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں کیا جانوں..... یہ تو اپنے دل سے پوچھ جو تجھے ڈالواں ڈول کے ہوئے ہے۔“

فیروز بخت نے درخواست کی۔ ”فرخندہ! تو اس کا ہاتھ چھوڑ دے، اس سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں بار بار ہاتھ پکڑنے اور چھوڑنے کی عادی نہیں ہوں۔“

فیروز بخت نے عاجزی سے کہا۔ ”اس وقت میں حسب وعدہ تیرے ہی پاس آ رہا تھا لیکن تو یہاں راستے میں ہی مل گئی۔“

فرخندہ نے بے دلی سے پوچھا۔ ”تو نے کیا فیصلہ کیا؟“
فیروز بخت نے انک انک کر جواب دیا۔ ”مجھے تیری خاطر تیری برادری اور تیرے بچوں کی شرط منظور ہے۔ میں تیری خاطر فرخندہ..... صرف تیری خاطر ہر کایہ جام پی لوں گا۔“ پھر شرما کر آہستہ سے کہا۔ ”میں چھ ماہ تک بھیک مانگنے کے لیے تیار ہوں۔“

فرخندہ نے فرط جوش سے پوچھا۔ ”سچ؟“
فیروز بخت نے نیم مدھوشی میں جواب دیا۔ ”سچ..... مگر خدا کے لیے فرخندہ اب اس کا ہاتھ چھوڑ دے۔“

فرخندہ نے اپنے چچا کے بیٹے علی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ”پھر کب اپنی اس آزمائش سے گزرے گا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ٹھیک آٹھویں دن..... آج سے سات دن بعد۔“

علی ہکا بکا ان دونوں کی صورتیں دیکھنے لگا۔ فیروز بخت کو اس کی موجودگی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ ناگواری سے فرخندہ سے کہا۔ ”فرخندہ! اس کو تو چلا کر دے ورنہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں گا۔“

فرخندہ زور سے ہنسنے لگی بولی۔ ”یہ تو میرے ساتھ ہی واپس جائے گا۔“

فیروز بخت نے عاجزی سے کہا۔ ”میری خاطر فرخندہ..... صرف میری خاطر۔ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔“

فرخندہ نے علی کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ فیروز بخت حسد کی آگ میں جلنے لگا۔

فرخندہ نے کہا۔ ”بخت! علی سے نہ ڈرو۔ اب جبکہ تو نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تو میری برادری کی شرائط مان کر مجھے حاصل کر لینے پر آمادہ ہے تو میں بھی اصل بات کو راز کیوں رہنے دوں۔“ پھر ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”علی سے مت ڈر کیونکہ یہ شادی شدہ ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بچہ بھی ہے۔“

فیروز بخت نے حیرت سے پوچھا۔ ”پھر تو نے ایسی بات کیوں کی تھی؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”میں اسے ساتھ لے کر تیرے پاس آ رہی تھی کیونکہ میں تیرے تذبذب سے بہت پریشان تھی۔ خوب سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں علی کو ساتھ لے کر تیرے پاس پہنچوں اور تیرے دل میں موجود آتشِ عشق کو رقابت کی ہوا سے بھڑکا دوں۔ میں خوب

تین چیزوں کا غلبہ

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ امت مسلمہ شریعت پر اس وقت تک ثابت قدم رہے گی جب تک تین چیزیں غالب نہ آجائیں۔ 1۔ علم اٹھالیا جائے گا۔ 2۔ ناجائز بچوں کی کثرت ہونے لگے۔ 3۔ مقارون کا غلبہ ہو جائے۔ لوگوں نے پوچھا۔ ”یا رسول اللہ (ﷺ) مقارون سے کیا مراد ہے؟“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ ”وہ لوگ جو آخری زمانہ میں ہوں گے اور ان کی باہمی ملاقات (سلام کے بجائے) ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر کے ہوا کرے گی۔“ (مسند احمد بن حنبل)

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ،
نیو سینٹرل جیل ملتان

معلوم ہو جائے تو اچھا ہے۔“

فیروز بخت اپنی سورت روائگی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس سے فرخندہ شک و شبہ میں پڑ سکتی تھی۔ جواب دیا۔ ”امکان تو یہی ہے کہ میں اس آزمائش سے پانچ سات دنوں کے بعد گزرنا شروع کر دوں لیکن میرے سامنے میری کاروباری اور غیر کاروباری مصروفیات بھی ہیں۔ اگر میں ان میں الجھ کر تاخیر سے دو چار ہو جاؤں تو تو کسی شک و شبہ میں تو نہیں پڑے گی؟“

فرخندہ کھٹک گئی۔ ”میں تیرا مطلب نہیں سمجھی۔“

فیروز بخت ہنس دیا۔ ”تو نے پھر شبہ کیا۔ مجھ پر کاروباری اور غیر کاروباری ذمے داریوں کا بوجھ ہے۔ اسے چھ ماہ کے لیے دوسروں کے کاندھوں پر رکھنا ہے اور ان کاندھوں کے انتخاب میں مجھے کچھ وقت تو دینا ہی پڑے گا۔“ فرخندہ نے دکھ سے کہا۔ ”لیکن وقت کا تعین تو ہونا چاہیے۔“ فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”وقت کا تعین دشوار ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ میں ادھر سے مطمئن ہوتے ہی تیرے پاس آ جاؤں گا۔“

فرخندہ نے افسردگی سے کہا۔ ”اپنی مجبوریاں تو خود ہی سمجھ سکتا ہے لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل منتشر ہے اور اس کو کسی بات کا تعین نہیں آتا۔ اگر تو نے پسپائی اختیار کی تو میرا کیا بنے گا۔ میں کیا کروں گی؟“

جانتی تھی کہ میرے اس عمل سے تیرا تذبذب دور ہو جائے گا اور جس فیصلے پر تو مہینوں نہ پہنچ سکتا، اس طرح کھنٹوں میں پہنچ جائے گا۔ چنانچہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔“

علی منہ لٹکائے کھڑا تھا اور فیروز بخت کو اپنی عاجلانہ شکست کا صدمہ تھا۔ فیروز بخت نے کھسکا کر کہا۔ ”فرخندہ! اگر تو یہ سب نہ کرتی تب بھی میں نے وہی فیصلہ کر لیا تھا جس کا میں نے ابھی ابھی اعلان کیا ہے۔ تجھے اس طرح جلاتا نہیں چاہیے تھا۔“

فرخندہ نے فیروز بخت کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اس کو ایک برگد کے نیچے کھڑا کر کے موٹی سی شاخ سے باندھ دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی، بولی۔ ”تو بھی یہیں آ جا۔“ اور علی سے کہا۔ ”تیرا جی چاہے تو میرے ساتھ بیٹھ جا ورنہ واپس چلا جا۔“

علی نے جواب دیا۔ ”فرخندہ! تو اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکی ہے، اب میرا یہاں کیا کام۔ شاید مجھے چلے جانا چاہیے۔“

”تیری خوشی۔“ فرخندہ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

فرخندہ اور فیروز بخت زمانے کی فکروں سے بے نیاز مسائل حاضرہ سے بے فکر اور وقت کی پروا کیے بغیر باتوں میں کھو گئے۔

فرخندہ نے کہا۔ ”میں یہی سمجھ رہی تھی کہ تو میری برادری کی شرط پوری نہیں کر سکے گا۔“

فیروز بخت کے ہونٹوں پر خلیفہ ساجیم نمودار ہو کر غائب ہو گیا۔ ”کیوں؟ کیا تجھے میری محبت کا یقین نہیں ہے؟“ فرخندہ نے جواب دیا۔ ”یقین تو ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ تو میری خاطر چھ ماہ تک در یوزہ گری بھی کر سکتا ہے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! میں خوب جانتا ہوں کہ تجھ سے شادی کر کے مجھے کئی محاذوں پر جنگ لڑنی پڑے گی لیکن میں نے تیری خاطر سب کچھ گزرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔“ فرخندہ نے منہ بتایا۔ ”میری خاطر، گویا تو مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے۔“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ میں تیری حصولیابی کی خاطر جو کچھ بھی کروں گا اسے لیے اور اپنی روح کی تسکین کی خاطر کروں گا۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”تیرے فیصلے سے میں برادری کو مطلع کر دوں گی مگر اس پر عمل درآمد کب سے ہوگا، یہ بھی

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”علی جیسے کسی نو جوان کو تلاش کر لیتا۔“

فرخندہ تڑپ مئی، تلملا کر کھڑی ہو گئی۔ ”بخت! معلوم نہیں کیوں میں اس وقت تک تیرے وعدے پر اعتبار نہیں کروں گی جب تک کہ تو اس پر پوری طرح عمل نہیں کرے گا۔“

فرخندہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ فیروز بخت نے کہا۔ ”میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تجھ سے یہ عہد کر رہا ہوں کہ میں تیری خاطر، صرف تیری خاطر چھ ماہ کی در پوزہ گری جیسا شرمناک کام کروں گا۔ اگر اپنے اس عہد کے سلسلے میں رتی بھر بھی میرے دل میں کھوٹ ہوتا تو میں یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ عہد نہ کرتا۔“

فرخندہ پسپا ہو گئی۔ ”مجھے تجھ پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ بہر حال میں انتظار کروں گی۔“

فیروز بخت نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”شکریہ کہ تو نے مجھ پر اعتبار کیا۔ اب تجھ سے ایک گزارش اور کروں گا کہ یہ انتظار کی گھڑیاں چونکہ موت سے زیادہ سخت ہوتی ہیں اس لیے اگر شدید لکھوں میں توقع سے زیادہ طوالت آ جائے تو، تو میری طرف سے دل برداشتہ یا مایوس بالکل نہیں ہوگی اور اس پر یقین رکھے گی کہ تیرا عاشق فیروز بخت اپنی زندگی میں تجھے مایوس نہیں کرے گا۔“

اس کے بعد ان دونوں نے آہستہ آہستہ سرکوشی جیسے انداز میں بڑی پیاری پیاری باتیں کیں۔ ان باتوں سے ان دونوں کی ایک ایک ادا اور ایک ایک بات سے ان کے دلوں میں کیف و سرور کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں کئی گھنٹے پر کیف باتیں کرتے رہے۔ آخر فرخندہ نے اس کو ہوش دلایا کہ باتوں میں بہت زیادہ وقت گزر چکا ہے اور ہمیں واپس جانا چاہیے۔

فیروز بخت نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اری ہنگی یہ بات کس سے سن کر آئی ہے کہ وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وقت ٹھہر چکا ہے اور جب تک ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے بدن کی خوشبو اور باتوں میں رس اور کیف محسوس کر رہے ہیں وقت ٹھہرا رہے گا۔“

فرخندہ نے ہنس کر کہا۔ ”یہ ساری شاعرانہ باتیں ہیں، مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ شادی کے بعد کوئی ایسی ونکی بات تو نہ ہوگی..... مجھ پر پابندیاں تو نہیں لگ جائیں گی؟“

فرخندہ نے کہا۔ ”اس کا کوئی امکان تو نہیں ہے۔ ہاں اگر تیرے گھر والے ہی تیرا ذکر بری طرح کریں، تیرا معاشرتی محاصرہ کریں اور عدم تعاون کی روش اختیار کریں تو ان حالات میں تو کیا کرے گا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”یہ میرا مسئلہ ہے۔ ان کا میں مقابلہ کروں گا اور میں تجھ سے درخواست کروں گا کہ تو یہ مست سوچ۔“

باتیں کرتے کرتے ان دونوں کی نظریں اچانک شاہراہ پر چلی گئیں جو احمد آباد سے پتوہ آباد تک چلی آرہی تھی۔ ایک گھوڑا گاڑی ان کی طرف بھاگی آرہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں فیروز بخت کا دل اندیشوں سے دھڑکنے لگا۔

فرخندہ نے کہا۔ ”اس راہ پر گاڑی میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔“

فیروز بخت کی نظریں گاڑی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ بے خیالی میں جواب دیا۔ ”گاڑی بان شناسا معلوم ہوتا ہے۔“

اتنے میں گاڑی ان دونوں کے قریب برگد تلے آ کر رک گئی۔ گاڑی بان کی جگہ سے ستار اتر اتر اور ڈرتے ڈرتے شرمندگی سے کہا۔ ”میرے آقا! آپ کے علاوہ میں حویلی کی دونوں بیگمات کے احکام ماننے پر بھی مجبور ہوں۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”تو یہاں کیوں آ گیا؟“

لیکن ستار کے جواب سے پہلے گاڑی کے اندر سے کیفیہ نمودار ہوئی اور بے پردہ ان دونوں کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ اس نے فرخندہ کو بڑے غور سے دیکھا اور طنزاً کہا۔ ”تو یہ ہے وہ بھکارن جس نے تیرے ہوش و حواس اور عقل و خرد کو سلب کر لیا ہے۔“ پھر ستار کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میرا اندازہ کتنا درست تھا۔ کیا میں نے تجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ فیروز بخت قطب عالم بخاری کے مزار پر نہیں اس بھکارن کی بارگاہ میں ہوگا۔“

فرخندہ نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ”یہ عورت کون ہے؟“

فیروز بخت کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل رہا تھا، کہیں دور سے جواب دیا۔ ”میری ماں۔“

کیفیہ نے فرخندہ سے کہا۔ ”میں تجھے دیکھنے، تجھ سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے بڑی بے چین تھی..... آخر میں نے تجھے پایا۔“

فرخندہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھی..... وہ کیوں؟ خیریت؟“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”لڑکی! تو اتنی بھولی تو نہیں ہو سکتی جتنی نظر آرہی ہے۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”عورت! نہ تو میں بھولی ہوں اور نہ ہی بھولی نظر آتی ہوں۔ جو بات کہتا ہے صاف صاف کسی تمہید کے بغیر کہہ دے۔“

کیفیہ نے فیروز بخت کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سے میرا کیا رشتہ ہے، یہ تو تجھے معلوم ہی ہو گیا؟“

”ہاں، معلوم ہو گیا اور کچھ؟“

کیفیہ نے ترشی سے کہا۔ ”اور کچھ یہ کہ تو اس سے بالا ہی بالا اپنے معاملات نہیں طے کر سکتی۔ اگر تو نے یہ خطرناک کام کیا تو اس کے برے نتائج بھی بھگتے گی کیونکہ میں ان معاملات کو تسلیم ہی نہیں کروں گی۔“

فرخندہ نے فیروز بخت سے کہا۔ ”بخت! یہ عورت کیا کہہ رہی ہے، ذرا اس کا مطلب تو سمجھا مجھے۔“

فیروز بخت نے کیفیہ سے کہا۔ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ خاموش رہیں اور دخل نہ دیں۔“

کیفیہ نے گرج کر جواب دیا۔ ”جب تک میں موجود ہوں تیرا کوئی ذاتی معاملہ ہو ہی نہیں سکتا۔“ پھر غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اسی وقت چل میرے ساتھ۔“

فیروز بخت نے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن نہ چھڑا سکا کیونکہ زور آوری میں کیفیہ کے ہاتھ کو تکلیف پہنچ سکتی تھی۔ وہ فیروز بخت کو گاڑی تک پہنچ کر لے گئی۔ فرخندہ حسرت و یاس اور غصے میں یہ منظر دیکھتی رہی۔ کیفیہ نے دور ہی سے فرخندہ کو حکم دیا۔ ”لڑکی! اپنے گھر واپس جا اور خبردار جواب بھی اس سے ملنے کی کوشش کی۔“

فیروز بخت نے ایک بار پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور غصے میں کہا۔ ”میرا ہاتھ تو چھوڑے، یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ میں فرخندہ سے چند باتیں کر کے واپس آتا ہوں۔“

کیفیہ نے خنجر نکال لیا، بولی۔ ”فیروز بخت! مجھ سے ضد نہ کر اور میں حویلی سے یہ عہد کر کے نکلی ہوں کہ اگر تو نے یا کسی اور نے میرے معاملات میں دخل دیا تو میں اسے ٹھکانے لگا دوں گی۔ اس لیے تو خاموش ہو جا۔“

فیروز بخت خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کیفیہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس نے ستار کو حکم دیا۔ ”حویلی واپس چل، جلد از جلد۔“

لیکن ستار تو فرخندہ کو سمجھانے میں مشغول تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تو نے بھی کس نو جوان کا انتخاب کیا ہے؟ کیا تیری برادری میں کوئی خوب صورت نو جوان نہیں ہے؟“

فرخندہ کٹ گئی، بولی۔ ”تو ملازم ہے تو ملازم ہی جیسی بات کر۔“

ستار نے جواب دیا۔ ”میں تو اپنی حیثیت اور اہلیت سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن تو بھی اپنی حیثیت کو ہر وقت اپنے ذہن میں رکھ اور سوچ کہ کیا تو نے جو انتخاب کیا ہے وہ درست ہے؟“

فرخندہ کا دل بھر آیا۔ وہ برگد کی جڑ میں پھیلتی چلی گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ ستار اپنی گاڑی کی طرف بھاگا اور بھاگتے بھاگتے کہا۔ ”لڑکی! میری طرف سے بے فکر رہ لیکن میں نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے اس لیے نمک حرامی نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد کسی ایک کو بھی بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ بڑی دیر کے بعد فیروز بخت نے گاڑی کے اندر سے جھانکا اور فرخندہ کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔

فرخندہ نیم مد ہوشی میں ان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ ان حالات میں فیروز بخت اپنا وعدہ پورا کرے گا یا نہیں؟

☆☆☆

حویلی میں اترنے کے بعد کیفیہ نے فیروز بخت سے کہا۔ ”میں تجھے کہاں سے لائی ہوں اس کا میں کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہتی لیکن یہ بات میں تجھ سے ضرور پوچھوں گی کہ تیرا اس لڑکی سے کیا چکر چل رہا ہے؟“

فیروز بخت نے ہمت کر کے جواب دیا۔ ”میں آپ کو ایک بالہم تنبیہ کر رہا ہوں کہ آپ اس میں مداخلت نہ کریں۔ میں نے فرخندہ سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے اور میں بدعہدی نہیں کروں گا۔“

کیفیہ نے طنز اُپوچھا۔ ”اور شازیہ، یہ کس سے شادی کرے گی؟ اس کا کیا ہوگا؟“

”میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا ہوگا۔ اس کی شادی ہو سکتی ہے۔ شازیہ کی شادی کر دیجیے۔“

”مگر کس سے..... اس کی شادی کس سے کر دوں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں کیا بتاؤں؟“

کیفیہ نے غصے میں کہا۔ ”اے نو جوان! کان کھول کر سن لے، تیری شادی شازیہ ہی سے ہوگی۔ اگر تو نے شازیہ کے علاوہ کسی اور حسین مگر اعلیٰ حسب نسب کی حامل لڑکی کو دیکھا اور پسند کیا ہوتا تو میں کوئی اعتراض نہ کرتی لیکن کچھ بھی ہو، میں اس بھکارن کو نہیں برداشت کر سکتی۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر میں فرخندہ سے شادی نہ کر سکا

تو میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔ یہ میرا عہد ہے اور میں اس عہد پر پورا اتر کر دکھاؤں گا۔“

کبھی نے یہ حور جو دیکھے تو نری سے کہا۔ ”اتنی جلدی کوئی قدم نہ اٹھا..... جا، ٹھنڈے دل سے پہلے غور کر لے۔ میں اس وقت تجھ سے کوئی بات نہ کروں گی۔“

فیروز بخت حویلی میں نہیں رکا، باہر نکل گیا۔ حویلی کے چائیک پر علی اس کے گھوڑے پر سوار دربانوں سے کچھ پوچھ رہا تھا لیکن اس کی جیسے ہی فیروز بخت پر نظر پڑی، بولا۔ ”تیرا یہ گھوڑا وہیں رہ گیا تھا۔ فرخندہ نے واپس بھیجا ہے۔“

فیروز بخت نے گھوڑا لے لیا اور بولا۔ ”شریف نوجوان امیری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا اور کہہ دینا کہ آج جو کچھ پیش آیا ہے، اس سے مایوس نہ ہو اور ہمت نہ ہارے۔ ہو گا وہی جو فرخندہ چاہے گی۔“

علی نے گھوڑے سے اتر کر گھوڑا فیروز بخت کے حوالے کر دیا۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ”تو واپس کس طرح جائے گا؟“

علی نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ میرا بھائی بھی آیا ہے۔ میں اس کے گھوڑے پر بیٹھ کر واپس چلا جاؤں گا۔“

اب فیروز بخت کو ستار کی تلاش تھی۔ ستار کچھ دیر بعد ہاتھ آیا۔ فیروز بخت نے افسوس سے کہا۔ ”ستار! افسوس کہ آج تک میرے دل میں تیرا جو مقام تھا تو وہاں فارغ نہ رہ سکا۔“

ستار نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میں مجبور تھا۔ بے بس اور عاجز..... مجھے ساتھ چلنے پر مجبور کیا گیا اس لیے میں چلا گیا۔“

فیروز بخت نے بدستور غصے میں کہا۔ ”کوئی بھی بہانہ کر سکتا تھا..... تو اس کو ٹال سکتا تھا۔“

ستار نے سر جھکا لیا۔ ”اگر میں خطا کار ہوں تو سزا دیجیے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں تجھے کیا سزا دوں گا۔ اگر تو میرے لیے قلعے ہے تو بتا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

ستار نے نظریں چراہیں۔ ”اگر آپ مجھے اپنا قلعہ اور ہمدرد سمجھتے ہیں تو میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ اس بھکارن کو بھلا دیں۔ اس سے قطع تعلق کر لیں کیونکہ اسی میں ہماری بہتری ہے۔“

فیروز بخت نے بے چینی سے جواب دیا۔ ”ناممکن، میں تیرا یہ مشورہ نہیں مان سکتا۔ آخر فرخندہ میں برائی کیا ہے؟“

ستار نظریں نہیں ملاتا رہا تھا۔ ”اس میں برائی یہ ہے کہ وہ بھکارن ہے اور آپ ملک التجار مرحوم داؤد کے معینی، منہ بولے بیٹے۔ قتل میں ناٹ کا بوند۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”انسان کی اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس سے خود اس کی نسل نفرت کرنے لگے۔ میں نے کسی شیر کو نہیں دیکھا جو دوسرے شیروں کو کمتر سمجھے۔ میں نے بلی کو بلی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا۔ نسلی مساوات ہر کہیں مل جاتی ہے لیکن اگر نہیں ملتی تو انسانوں میں۔“

ستار کے پاس ایک ہی مختصر جواب تھا۔ ”وہ بھکارن آپ کے لائق نہیں ہے۔ آپ منصوبے کے مطابق میرے ساتھ سورت چلیے اور وہاں کو بخش کیجیے کہ بھکارن آپ کے دل سے نکل جائے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”لیکن میں اسے بھلا نہیں سکتا۔ تو مجھے منفی مشورہ کیوں دے رہا ہے حالانکہ میں نے مثبت مانگا تھا۔“

ستار نے خوشامد کی۔ ”میرے آقا! آپ نہیں سمجھ رہے کہ تقدیر آپ کے خلاف جاری ہے اور زمانہ ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ یہ سب آپ کو نہیں معلوم لیکن میں یہ باتیں محسوس کر رہا ہوں۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”آپ اپنے کاروبار میں دلچسپی لیجیے اور سورت چلے چلیے اور وہاں جہاز کا معاملہ کیجیے اور سورت کے انتظامی امور کو مضبوط کر کے واپس آجائیے۔ اگر آپ نے میرے مشورے پر عمل کیا تو میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ آپ زندگی کا ہر معرکہ سر کر لیں گے اور ہر محاذ پر سرخرو رہیں گے۔“

فیروز بخت سوچتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے ستار کا مشورہ مان لینا چاہیے اور سورت چلے جانا چاہیے۔

وہ فرخندہ کو مطلع کیے بغیر سورت روانہ ہو گیا کیونکہ فرخندہ کی طرف سے اسے یقین تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کر سکتی اور وہ اس کا انتظار کرے گی۔

وہ سورت پہنچا تو سر طرف افراتفری دیکھی۔ اس کا کاروباری عملہ انتشار اور بد نظمی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے ناظم اعلیٰ نے تاجروسی احمد کے پاس نوکری کر لی تھی اور اب وہ سورت کے کاروباری حلقوں میں سب سے بڑا آدمی بن چکا تھا۔ وہ جس چینی جہاز کے سامان کا سودا کرنے آیا تھا، اس کو بھی دسی احمد خرید چکا تھا۔

فیروز بخت نے ستار کے ذریعے اپنے سابقہ ناظم اعلیٰ کو بلوایا اور اسے خاصا لالچ دیا کہ وہ اپنی سابقہ جگہ سنبھال لے تو اسے پہلے سے زیادہ مراعات دی جائیں گی لیکن ناظم اعلیٰ نے اس کی پیشکش کو ہنسی میں اڑا دیا، بولا۔ ”جناب! آپ نے دیر کر دی۔ اب تو نقشہ ہی بدل چکا ہے اور اگر میں

یہ کہوں کے حالات اور وقت آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں تو غلط بات نہیں ہوگی۔“

اسے یاد آیا کہ یہی بات احمد آباد میں تھوڑے دنوں پہلے ستار نے بھی کہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تو میری پیشکش پر ٹھنڈے دل سے غور کر میں تیرے جواب کا انتظار کروں گا۔“

ناظم اعلیٰ نے جواب دیا۔ ”انتظار کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جو جواب میں نے آج دیا ہے، وہ کل بھی دوں گا اور یہی جواب کل کے بعد بھی ملتا رہے گا۔“

فیروز بخت جب بالکل مایوس ہو گیا تو اسے غصہ آ گیا، بولا۔ ”اگر تو اپنی ضد پر قائم ہے تو قائم رہ..... میں بھی تیرے غرور کو اگر خاک میں نہ ملا دوں تو فیروز بخت نام نہیں۔“

فیروز بخت نے اپنے سورت کے عملے ہی میں سے ایک شخص کو ناظم اعلیٰ بنا دیا اور اسے اختیار دیا کہ وہ یہاں کے ہر کاروباری محاذ پر ویسی احمد اور ناظم اعلیٰ کا مقابلہ کرے۔

لیکن سابقہ ناظم اعلیٰ کہیں زیادہ تجربہ کار انسان تھا۔ اس نے فیروز بخت اور اس کے عملے کو ہر ہر قدم پر شکست دی اور اس کے کچھ اور آدمی توڑ لیے۔ اس جھگڑے میں فیروز بخت کو چھ ماہ لگ گئے۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا فیروز بخت کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ کاروباری نامکامیوں کے ساتھ ساتھ اسے فرخندہ کی طرف سے بھی شک و شبہ اور مایوسی پیدا ہو رہی تھی۔ جب وہ تنہائی میں فرخندہ کے احساسات پر غور کرتا تو بڑی کوفت ہوتی اور دل لرز جاتا۔ اس کو ڈرتھا کہ کہیں فرخندہ نے مایوس ہو کر اپنا فیصلہ ہی نہ بدل دیا ہو۔

سورت میں پریشانیوں اور نامکامیوں نے فیروز بخت کو پڑمردہ کر دیا اور اس نے ستار سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ سورت میں ایک دن بھی نہیں ٹھہرے گا لیکن ستار برابر یہی سمجھا رہا تھا۔ ”میرے آقا! ہمت سے کام لیجیے، حوصلہ رکھیے۔ نامکامیاں اور مایوسیاں کوئی چیز نہیں، ہمت مرداں بد خدا۔“

لیکن وہ ہمت ہار چکا تھا۔ وہ ستار کے مشورے کو نہیں پشت ڈالتا ہوا احمد آباد روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک منزل پر جب وہ رات کو سویا ہوا تھا، اس نے خواب میں داؤد مرحوم کو اداس اور افسردہ اپنے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ فیروز بخت سے شکایتا کہہ رہا تھا۔ ”فیروز بخت! تو نے عشق کے چکر میں میرے کاروبار کو تباہ و برباد کر دیا۔ کیا تو نے مجھ سے شادی نہ کرنے کا عہد نہیں کیا تھا؟“

ابھی وہ داؤد کو جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ اس کی

آنکھ کھل گئی۔ سرہانے ایک دیار روشن تھا، اس سے ذرا قافلے پر ستار خراٹے لے رہا تھا۔ باہر کہیں دور سے کتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ آہستہ سے بستر چھوڑ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ باہر تاجروں اور مسافروں کے خیمے دور تک پھلتے چلے گئے تھے۔ قافلے کے طلائیہ گرد یا تو خیموں کے چاروں طرف گھوم پھر رہے تھے یا پھر خیموں کے چاروں طرف آگ روشن کیے رات گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر اپنے خیمے کے در پر اندھیرے میں کھڑا داؤد کی بابت سوچتا رہا۔ اسے خواب سے یہ بات تو معلوم ہو گئی تھی کہ داؤد کی روح اس سے خوش نہیں ہے۔ وہ دوبارہ خیمے میں داخل ہو گیا اور دیے کی کمزور روشنی میں داؤد کو تلاش کرنے لگا۔ اس کا دل بار بار یہی سمجھا رہا تھا کہ داؤد مرحوم کی روح اسی خیمے میں اس کے آس پاس کہیں موجود ہے۔ اس نے داؤد کو خیمے میں موجود فرض کر کے جواب دیا۔ ”اگر آپ نے شادی نہ کی ہوتی تو میں بھی اس سے دور رہتا لیکن آپ خود سوچیں کہ شادی کے بعد آپ نے مجھے بھی شادی کی اجازت دے دی تھی۔“

اسے معلوم نہیں کیوں وہ رہ کر داؤد مرحوم پر غصہ آ رہا تھا پھر اچانک اسے یوں محسوس ہوا گویا داؤد مرحوم کی شعلہ بار آنکھیں اسے غصے سے گھور رہی ہیں۔ اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا۔ ”آپ کا کاروبار، دولت، جائیداد اور آپ کی بیویاں اور ان کے متعلقین میرے حق میں مصیبت ثابت ہو رہے ہیں۔ میں ان سے عاجز آچکا ہوں۔ میں اکتایا ہوا ہوں۔ مجھے بخرے، لوگوں کی چالاکیاں، اندیشے اور خدشے ان باتوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں کیا کروں آخر..... میں کیا کروں؟“

اس کی باتوں سے ستار کی آنکھ بھی کھل گئی۔ پوچھا۔ ”میرے آقا! کیا آپ جاگ رہے ہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں جاگ رہا ہوں۔ کیوں کوئی خاص بات؟“

ستار نے کہا۔ ”میرے آقا! میں نے اپنے بڑے آقا کو ابھی ابھی خواب میں اپنے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے ستار تو اپنے آقا کو سمجھا کہ وہ بھکارن کے عشق میں میری زندگی بھر کی محنتوں کو کیوں ضائع کرنے پر تل گیا ہے۔“

فیروز بخت نے منہ بنا کر سختی سے پوچھا۔ ”میں مرحوم کی جائیداد اور دولت کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ مرحوم نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے؟“

ستار اپنا بستر چھوڑ کر فیروز بخت کے پاس چلا گیا۔ ”میرے آقا! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بڑے آقا مرحوم کی روح اس وقت اس خیمے میں موجود ہے۔“ اس کے بعد اس نے گویا مرحوم آقا کو مخاطب کیا۔ ”آقائے مرحوم! کیا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے کاروبار، مال و زر، دولت اور جائیداد پر دوسروں کا تصرف اور اختیار بڑھ گیا ہے اور ان سب کی یہ کوشش ہے کہ وہ فیروز بخت کو ان سب سے محروم کر دیں، آپ فیروز بخت کی مدد کیجیے۔“

فیروز بخت نے مسکرا کر کہا۔ ”تیرے مرحوم آقا کی روح میری کیا مدد کرے گی بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ داؤد نے مجھے مایا جال میں پھنسا کر کوئی سزا دی ہے۔ میں اس مایا جال کو توڑ دوں گا۔ ستار! تو فکر نہ کر، میں اس جال میں زیادہ دنوں اسیر نہیں رہوں گا۔“

ستار نے دعائیہ انداز میں آمین کہا۔

دوسرے روز علی الصباح قافلے کے ساتھ فیروز بخت اور ستار احمد آباد روانہ ہو گئے۔ منشی اور اہل کار کو احمد آباد ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ کئی دن بعد سرخ کھریلوں کی چھتیں نظر آنے لگیں اور یہ لوگ احمد آباد میں داخل ہو گئے۔ اب فیروز بخت کا فیصلہ بدل چکا تھا۔ اس نے ستار کو بطور خاص سمجھایا۔ ”ستار! میں تیرے ساتھ حویلی نہیں جاؤں گا میں کہیں اور جاؤں گا۔ تو میری عدم موجودگی میں حویلی والوں کو میری طرف سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرے گا۔“

ستار نے پوچھا۔ ”میرے آقا! اس وقت آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ستار! میں اب تجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں گا۔ مجھے ہواؤں میں فرخندہ کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ اب میں سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا کیونکہ میں کئی محاذوں پر شکست اٹھانے کے بعد اپنے آپ میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا کہ فرخندہ والے محاذ پر بھی ناکام رہوں۔“

ستار لا جواب ہو گیا۔ ”خدا حافظ میرے آقا۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے مگر مصائب اور بد قسمتی کا کوندا لپک رہا ہے اور اس سے ایسا لگتا ہے کہ طوفان کہیں قریب ہی موجود ہے اور کسی وقت اچانک ظاہر ہو سکتا ہے۔“

فیروز بخت نے ستار کی پوری بات نہیں سنی اور اپنے گھوڑے کو پتوہ آباد کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔ وہ بھکاریوں کی بستی سے پہلے ہی گھوڑے سے اتر پڑا اور لگام پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ عورتوں اور بچوں نے اپنے درمیان اس اجنبی کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور ذرا سی دیر میں یہ خبر جنگل

کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ فرخندہ کا چاہنے والا مہینوں غائب رہنے کے بعد اچانک آ گیا ہے۔ ایک بڑے میاں لاشی ٹھیکے ہوئے فیروز بخت کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور جھریوں والا چہرہ اوپر اٹھا کر چند ہی آنکھوں سے فیروز بخت کو دیکھا اور حقارت سے پوچھا۔ ”تو آ گیا؟“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”فرخندہ کہاں ہے؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”وہ یہاں نہیں ہے۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”وہ کہاں چلی گئی؟“

بڑے میاں نے نفرت سے کہا۔ ”تیرے سوالوں کے جواب میرے پاس نہیں ہیں۔ تو برادری کے سرخیجے سے مل لے، وہی تیرے سوالوں کے جواب دے سکے گا۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”پھر اپنی برادری کے سرخیجے ہی کے پاس لے چل مجھے۔“

بڑے میاں نے ایک لڑکے کو پاس بلا کر حکم دیا۔ ”اسے سرخیجے کے پاس پہنچا دے۔“

لڑکے نے فیروز بخت کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کے لیے کہا۔ ایک دروازے پر پہنچ کر فیروز بخت نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ یہ بوڑھا برادری کا سرخیجے اور فرخندہ کا دادا ہے۔ لڑکے نے کہا۔ ”اپنا گھوڑا یہیں کسی درخت سے باندھ دے اور اندر آ جا۔“

فیروز بخت نے گھوڑے کو اٹلی کے درخت سے باندھ دیا اور خاموشی سے بوڑھے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ یہ مکان باہر سے جتنا بوسیدہ اور شکستہ نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی صاف ستھرا اور شاندار تھا۔ بوڑھے نے اس کو جس کمرے میں بٹھایا تھا وہ نہایت آراستہ تھا۔ فرش پر نہایت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا اور طاقتوں میں چاندی کے برتن رکھے ہوئے تھے اور چھت سے چند بالشت نیچے چاروں طرف دیواروں پر تیل بوتلوں کی پٹیاں تھیں۔

ایک گوشے میں ایک چوڑی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر درزی اور سفید چادر بچھی ہوئی تھی جو اتنی صاف تھی کہ داغ دھبے کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ کہیں ذرا سی ٹھکن تک نہیں تھی۔ چوکی پر طشت نما مونج کی بڑی بڑی ڈلیوں میں پھل رکھے تھے اور ایک طشت میں خشک میوہ بھی سجا ہوا تھا۔ ایک دوسری چوکی کے بالمقابل گوشے میں قالین کے اوپر گلابی رنگ کا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ یہیں چھوٹے بڑے گاؤں کے بھی رکھے تھے۔ فیروز بخت یہاں کے ٹھاٹھاٹ دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ اس کے ہوش و حواس بجا نہ رہے۔ بوڑھے نے اس کی بدحواسی اور حیرت سے بڑا حفاظ اٹھایا بولا۔ ”ادھر

ہوں۔ وہ جو حکم دے گی میں تعمیل کروں گا۔“
بوڑھے نے بیزاری سے کہا۔ ”تم دونوں نے کیا عہد کر رکھا ہے میں نہیں جانتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تو نے برادری اور بچوں کے سامنے جو وعدہ کیا تھا، اس سے منحرف ہو گیا۔“

”یہ بات نہیں ہے، اگر ایسی کوئی بات تھی تو، تو اس وقت مجھے اس کمرے میں بیٹھا ہونا دیکھتا۔“
بوڑھے نے کہا۔ ”تجھے کیا معلوم کہ غریب فرخندہ کو تیری مفقود انجبری نے کتنا پریشان کر رکھا تھا۔ وہ تیری طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تھی اور اس مایوسی میں مالوے چلی گئی۔ اس کا باپ اس کے ساتھ ہے۔ وہ تین چار مہینے مالوے میں رہ کر واپس آئے گی۔“

فیروز بخت کا دل ڈوبنے لگا۔ ”کہیں وہ مالوے میں کسی نوجوان سے شادی تو نہیں کرے گی؟“
بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میں ممکن ہے۔“
فیروز بخت نے پوچھا۔ ”یہ تین چار ماہ کی مدت کب ختم ہوگی؟“

دادا نے جواب دیا۔ ”کب کی ختم ہو چکی۔ اب تو ان دونوں کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔“

فیروز بخت نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے؟
بوڑھے نے نہایت فاخرانہ شان سے کہا۔ ”جب تو اچانک غائب ہو گیا اور مہینوں تیری کوئی خبر نہ ملی تو ہم سب اسی نتیجے پر پہنچے کہ تو در یوزہ گری سے بھاگ نکلا ہے حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہماری برادری کے لوگ ننگے بھوکے نہیں ہیں۔ ہمارا آبائی پیشہ ہی در یوزہ گری ہے پھر ہم لوگ اپنے آبائی پیشے کو کس طرح ترقی دیتے رہے ہیں۔ آج ہم لوگ بھی اپنے پیشے کے اعتبار سے معزز لوگ ہیں۔ اس لیے تجھے یا کسی اور کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ خود کو بڑا اور اعلیٰ وارفع سمجھ کر ہمیں حقیر اور ذلیل سمجھے۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”تو ہی بتا اب میں کیا کروں؟“
بہر حال یہ بات میں تیرے علم میں بھی لا رہا ہوں کہ اب میں تیری اور تیری برادری کی عائد کی ہوئی آزمائش سے گزرنے کے لیے اور ہر کام کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہوں۔“

بوڑھے نے پھل فیروز بخت کی طرف رکھ دیے اور کہا۔ ”انہیں بھی تو کھا۔ تو کھاتا کیوں نہیں؟“
فیروز بخت نے تکلفاً ایک سیب اٹھا لیا اور بچوں کی طرح دانت سے کاٹ کر کھانے لگا۔ منہ چلاتے ہوئے ذرا سی کراہیت بھی ہوئی کہ وہ بجیک کی کمائی کا پھل کھا رہا ہے

فیروز بخت نے کھیا کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔
بوڑھا ایک گاؤں کے سہارے بیٹھ چکا تھا۔ اس کے پاس ہی فیروز بخت بھی بیٹھ گیا۔
بوڑھے نے کہا۔ ”شاید تو اس کمرے میں آ کر حیرت زدہ رہ گیا ہے؟“

”بے شک۔“ فیروز بخت نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اس وقت میں فرخندہ کے دادا کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے تو یہ کراچی مغل بادشاہ یا گجرات کے کسی فرماں روا کا نظر آتا ہے حالانکہ یہ مکان باہر سے نہایت شکستہ اور بوسیدہ ہے۔“

بوڑھے نے پھلوں کی ڈلیاں اور طشت اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ ”انہیں کھاتا بھی جا اور باتیں بھی کرتا رہ۔“
فیروز بخت نے معذرت کی۔ ”شکریہ، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ فرخندہ کہاں ہے؟“
بوڑھے نے جواب دیا۔ ”اب فرخندہ کی بات نہ کر تو جوان تاجر۔“

فیروز بخت کا دل بیٹھنے لگا۔ ”کیوں؟ وہ کہیں چلی گئی یا پھر اس کی کسی اور سے.....“

بوڑھے نے بات کاٹ دی۔ ”بس بس، میں نے کہہ جو دیا کہ اب فرخندہ کی بات ہی نہ کر۔ وقت گیا بات گئی۔“
فیروز بخت نے کہا۔ ”تو فرخندہ کا دادا ہے اور تو ہم دونوں کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہے کہ میں نے برادری اور بچوں کے سامنے اس کی عائد کردہ شرط پر پورا اترنے کا وعدہ کیا تھا اور وعدہ کر کے ایک دم چھ سات ماہ کے لیے غائب ہو گیا اور تیری نظر میں میرا یہی قصور ہے جس کی سزا میں تو مجھ سے بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ میں فرخندہ کی بات ہی نہ کروں۔“

بوڑھے نے نفرت سے کہا۔ ”کیا یہ قصور میری نفرت کے لیے کافی نہیں ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”بے شک کافی ہے لیکن میں نے فرخندہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میں بتائے بغیر ہی کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جاؤں تو وہ پریشان نہ ہو چنانچہ میں اپنی کاروباری مصروفیات میں ایسا سمجھا کہ چھ سات ماہ کے لیے احمد آباد ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب میں آ گیا ہوں اور فرخندہ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اب بھی مجھے بھولی نہیں ہے اور میرے عہد و پیمان پر تکیہ کیے ہوئے ہے تو میں ہر آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار

لیکن اپنی اس کراہیت کو یہ سوچ کر دبا گیا کہ اگر بوڑھے نے اسے محسوس کر لیا تو اسی وقت اسے چلتا کر دے گا۔

بوڑھا اسے تنہا چھوڑ کر اندر چلا گیا اور دوبارہ جب واپس آیا تو فرخندہ اس کے ساتھ تھی۔ فرخندہ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر فیروز بخت شیشا گیا۔ احتراماً کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”فرخندہ! تو کہاں تھی؟“

فرخندہ کا چہرہ سست گیا تھا اور ایک نظر میں یہ پتا چل گیا کہ وہ بیمار ہے۔ اس نے پھسکی اور افسردہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”خوب، یہ سوال تو مجھے کرنا تھا کہ تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟“

بوڑھے نے فرخندہ سے کہا۔ ”فرخندہ! تو اس چالاک اور فریبی نوجوان سے باتیں کر، میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔۔۔۔۔ اور ہاں باتوں کے دوران اس کو سب بتا دینا۔ میں نے تیرے لیے مالوے کے ایک امیر زادے کو پسند کر لیا ہے، جو تیری خاطر ایک سال تک بھیک مانگنے کو تیار ہے۔“

بوڑھا چلا گیا۔ فرخندہ نے کہا۔ ”بخت! تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟ سچ بات تو یہ ہے کہ برادری کے دوسرے لوگوں کی طرح میں خود بھی مایوس ہو گئی تھی۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”جب میں نے تجھے یہ بتا دیا تھا کہ اگر کچھ عرصے کے لیے بغیر بتائے کہیں چلا جاؤں تو، تو گھبرائے گی نہیں کیونکہ میں تجھے سے محبت کرتا ہوں اور تیری برادری کی عائد کردہ آزمائش سے گزر کر تجھ کو حاصل ضرور کروں گا۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”مجھے یاد پڑتا ہے کہ تو نے یہ بات کہی ضرور تھی لیکن مجھے یاد نہیں رہی۔“

فیروز بخت نے کسی قدر خوش ہو کر کہا۔ ”اگر میری یہ بات تجھے یاد نہیں رہی تو اس کی تمام ذمے داری کس کے سر ہوگی؟ میں تو بے قصور ٹھہرا۔“

فرخندہ روہانسی ہو گئی۔ ”ساری ذمے داریاں مجھ پر ڈال دے۔ ماں، بابا، دادا، برادری کے بیچ اور پوری برادری ہر کوئی مجھ ہی کو ذمے دار ٹھہراتا ہے۔ تو آیا ہے تو، تو بھی مجھ ہی کو مورد الزام قرار دے رہا ہے۔“

فیروز بخت نے کسی قسم کی پروا کیے بغیر اپنے رومال سے فرخندہ کے آنسو پونچھنے شروع کر دیے۔ ”اگر تو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنی کوتاہی کی ذمے داری قبول کر لوں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

فرخندہ نے بھیجی بھیجی آنکھوں سے فیروز بخت کو دیکھا۔ ”اب تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ چھ ماہ کی آزمائش سے کامیاب گزر کر تجھے حاصل کر لوں لیکن ابھی ابھی تیرے دادا کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مالوے کا کوئی امیر زادہ بھی تیرا طلب گار ہے اور وہ ایک سال کی آزمائش سے گزرنے کو تیار ہے۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”پھر اب تو کیا کہتا ہے؟“

فیروز بخت نے مایوسی سے کہا۔ ”پھر یہ کہ اگر بات بالکل ہی ختم ہے تو میرا یہاں مزید رکنا بیکار ہے۔ میں فوراً ہی واپس چلا جاؤں گا لیکن اگر کوئی گنجائش ہے اور مالوے کے امیر زادے پر مجھے ترجیح دی جاسکتی ہے تو میں خود بھی اس امیر زادے کی طرح چھ ماہ کے بجائے ایک سال تک بھیک مانگنے کو تیار ہوں۔“

فرخندہ فرط جذبات میں اس سے چٹ گئی۔ ”کیا سچ؟ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو خواب نہیں دیکھ رہی۔ میں فیروز بخت تیرے سینے سے لگا کھڑا ہوں اور تجھے یہ یقین دلانا ہوں کہ میں تیری خاطر آگ کے سمندر کو بھی عبور کر سکتا ہوں۔“

فرخندہ کا سر فیروز بخت کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ ”یہ وعدہ کر کے جب تو اپنی حویلی واپس جائے گا تو پھر واپسی کب تک ہوگی؟“

فیروز بخت نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ”اب میں حویلی نہیں جاؤں گا۔ میں آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔“

فرخندہ اور جوش میں آ گئی۔ ”اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تو مجھے واقعی چاہتا ہے اور حاصل کر لے گا۔“

مالوے کا امیر زادہ کانٹے کی طرح فیروز بخت کے دل میں چبھ رہا تھا بولا۔ ”پھر اس امیر زادے کا کیا ہے گا؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”کچھ بھی نہیں، میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں صاف صاف کہہ دوں گی کہ مجھے وہ امیر زادہ پسند نہیں آیا۔“

کچھ دیر بعد فرخندہ کا دادا واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ فرخندہ کا باپ بھی تھا اور اس کی ماں بھی۔ ماں نے فیروز بخت کو تیز اور بے مروت نظروں سے دیکھا۔ فرخندہ سے پوچھا۔ ”یہ ابھی تک تیرے پاس ہی موجود ہے۔ اسے چلتا کیوں نہیں کر دیا؟“

فرخندہ نے تینوں کو مخاطب کیا۔ ”میرے بزرگو! اس وقت میں بہت خوش ہوں اور اس خوشی کی وجہ یہ ہے کہ فیروز

بخت سے کہا۔ ”نوجوان! تو خوش قسمت انسان ہے جس کو فرخندہ جیسی وفا شعار اور محبت کرنے والی لڑکی ملے گی۔ سن، میں فرخندہ کو جو نصیحت کر رہا ہوں اس سے تو بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“ فرخندہ اپنے دادا کی چالاکی پر مسکرا دی۔

دادا نے کہا۔ ”فرخندہ! استقلال اور وفاداری ساری زندگی یہی دو اوصاف انسان کے کام آتے ہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ جو فیصلہ بھی کرے خوب سوچ سمجھ کر کرے اور جب کوئی فیصلہ کر چکے تو اس پر استقلال اور وفاداری سے قائم رہے۔۔۔۔۔ نفع نقصان کی پروا کیے بغیر۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ اللہ نے چاہا تو اب میں خود کو شرمندہ اور آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

دادا یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ ”تب پھر میری بھی یہی دعا ہے کہ تم دونوں ہمیشہ خوش و خرم رہو۔“

☆☆☆

رات کو دونوں بستی سے ذرا دور ایک کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گئے۔ دونوں نے باری باری کنوئیں میں جھانک کر دیکھا اور بچوں کی طرح زور زور سے ہنسنے لگے لیکن فرخندہ نے محسوس کیا کہ فیروز بخت کی ہنسی میں بے ساختگی نہیں ہے۔ اس میں کوئی سوچ کوئی فکر بھی شامل ہے۔ پوچھا۔ ”بخت! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے تو اس وقت کہیں اور ہے؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! اس وقت ہم دونوں تنہا ہیں، یہاں کوئی تیرا نہیں ہے۔ میں تیری برادری کے پیٹھے پر تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

فرخندہ نے فکر و تشویش سے فیروز بخت کو دیکھا۔ ”میری برادری کے پیٹھے پر؟ کر باتیں میں بہت شوق سے کروں گی۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”باتیں کرنے سے پہلے میں تجھے یہ یقین دلانا ہوں کہ میں نے تجھ سے... تیرے دادا اور برادری سے جو عہد کیا ہے اس پر کل سے عمل درآمد شروع ہو جائے گا لیکن ایفائے عہد سے پہلے میں اپنے ضمیر اور اپنی انا کی تسکین کے لیے چند وضاحتیں چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تو یا تیری برادری کا کوئی دانا مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔“

فرخندہ نے بے مبرے پن سے کہا۔ ”دیر نہ کر جو کچھ کہنا ہے جلد از جلد کہہ ڈال۔۔۔۔۔ میرے مبر و محل کا امتحان نہ لے۔“

فیروز بخت نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ ”تیری برادری اپنے بھیک مانگنے کے پیٹھے پر نازاں کیوں رہتی ہے؟ بھیک مانگنے کو اگر پیشوں میں شمار کر لیا جائے تب بھی اس کے معزز

بخت نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ مالوے کے امیر زادے کی طرح یہ بھی ایک سال تک بھیک مانگے گا۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ اگر یہ اس شرط پر پورا اترتا تو میں اس سے شادی کر لوں گی اور اس شادی پر برادری کا کوئی شخص بھی اعتراض نہیں کرے گا۔“

ماں نے غصے میں کہا۔ ”اس کی باتوں پر تو یقین کرے تو کرے میں یقین نہیں کر سکتی۔ اس لیے اب مزید وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں ہے۔ مالوے کا امیر زادہ اس کے مقابلے میں ہر لحاظ سے موزوں ہے۔“

دادا نے کہا۔ ”فرخندہ! میں تیرا دادا ہی نہیں اپنی برادری کا سرخیج بھی ہوں اس لیے تیرے لیے میرا غلغلہ نہ مشورہ یہ ہے کہ اپنے شوہر کے انتخاب میں تو عجلت اور جذبات سے کام نہ لے۔“

فرخندہ نے سختی سے کہا۔ ”معاملہ میرا ہے اس لیے فیصلہ بھی میں ہی کروں گی۔ افسوس کہ میں بخت پر کسی بادشاہ کو بھی ترجیح نہیں دے سکتی۔“

فیروز بخت نے فرط جوش میں فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”فرخندہ! میں تیرا شکر گزار ہی نہیں، احسان مند بھی ہوں کہ تو نے بادشاہ تک پر مجھے ترجیح دے دی ہے۔“

فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”توکل ہی سے اپنا کام شروع کر دے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں تجھے مایوس یا شرمندہ نہیں کروں گا۔“

دادا نے فرخندہ کی ماں اور باپ کو حکم دیا۔ ”اب تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں فیروز بخت کی حمایت کروں گا۔ میں اس نوجوان میں شرافت اور خوئے وفاداری کی بومحسوس کر رہا ہوں۔“ اس کے بعد دادا نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ ”اور اب تم دونوں بھی میری بات ذرا غور سے سنو۔“

دونوں ہمت تن گوش ہو گئے۔

دادا نے کہنا شروع کیا۔ ”ملک التجار داؤد کے بیٹے! دنیا کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ تم دونوں نے آپس میں جو بھی عہد کیا ہو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن میں۔۔۔۔۔“

فرخندہ نے دادا کی بات کاٹ دی۔ ”دادا آپ بخت کو نصیحتیں نہ کیجیے کیونکہ یہ سردست ہمارا مہمان ہے۔ آپ جو کچھ کہنا چاہیں مجھے کہہ لیں۔ میں اپنے مہمان کی دل آزاری نہیں ہونے دوں گی۔“

دادا کو ہنسی آگئی۔ ”شریر لڑکی، چل میں تیری خوشی میں اس تاجر زادے کو کوئی نصیحت نہیں کروں گا۔“ پھر فیروز

ہونے میں تو شبہ باقی رہے گا۔“

فرخندہ نے آہستہ سے ہنکاری بھری اور کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو اب بھی پس و پیش اور تذبذب کا شکار ہے، یعنی میں اب بھی تیرے عہد پر یقین نہیں کر سکتی۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تجھ سے جو کہہ دیا کہ میں اپنے عہد پر کل ہی سے عمل شروع کر دوں گا لیکن اس سے پہلے اگر ممکن ہو تو میرے ضمیر اور انا کو مطمئن کر دیا جائے۔ اس طرح میں اپنی آزمائش سے نہایت فاتحانہ شان سے گزر جاؤں گا ورنہ ایک کانٹا سا چبھتا رہے گا۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”شاید تجھے معلوم نہیں کہ پیشہ حبیب اللہ ہوتا ہے۔ شاید تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میری برادری کا پیشہ اپنے تقدس کے اعتبار سے دنیا کے تمام پیشوں سے افضل ہے۔ اس پیشے میں جھوٹ، عیاری اور مکاری شامل نہیں۔ پھر یہی وہ پیشہ ہے جو پانڈو نے اپنے بارہ سالہ بن باس میں اختیار کر لیا تھا اور یہی وہ پیشہ ہے جس کو گوتم بدھ نے اختیار کیا تھا اور اس کے پھر نہایت فخر اور شان سے خود کو بھکشو کہا کرتے تھے۔ اتنے بڑے لوگ بھکشو بن کر حقیر تو نہیں ہو گئے تھے۔ جب ان کی بڑائی اور عظمت میں شبہ نہیں کیا جاتا تو میری برادری کس طرح حقیر اور ذلیل ہو سکتی ہے۔“

فیروز بخت لا جواب ہو گیا۔ کچھ سکوت کے بعد کہا۔ ”اچھا فرخندہ! میں تجھ سے ایک رعایت چاہتا ہوں۔“

”وہ کیا؟ اگر ممکن ہوئی تو ضرور دی جائے گی۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میں احمد آباد میں بھیک نہیں مانگ سکتا، اس کام کے لیے مجھے کہیں اور بھیج دیا جائے۔“

فرخندہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یہ کوئی خاص بات نہیں۔ تو جہاں بھی جائے گا، تنہا نہیں جائے گا۔ تیرے ساتھ برادری کے چند اور لوگ بھی جائیں گے تاکہ وہ بھیک مانگنے کے آداب سکھا سکیں۔ تو ہماری تربیت کے بغیر یہ کام نہیں کر سکتا۔“

وہ دونوں رات کے اندھیرے میں بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے کیونکہ وہ دونوں خوب جانتے تھے کہ اس رات کے بعد وہ دونوں ایک سال کے لیے جدا ہو جائیں گے۔

دوسرے دن صبح فیروز بخت بھکاری برادری کے دو آدمیوں کے ساتھ مالوے روانہ کر دیا گیا۔ انہی دونوں سے فیروز بخت کو یہ گر کی بات معلوم ہوئی کہ وہ عام بھکاریوں سے ذرا مختلف لوگ ہیں۔ یہ ہمیشہ امراء تجارت اور

نوابوں کو بھیک کے لیے پسند کرتے تھے۔ کسی بھی طرح جوڑ توڑ کر کے خاص خاص امراء اور دوسرے اہل مال و زر کو اپنا مربی اور گاہک بنا لیتے تھے اور وہاں اپنے لیے سالانہ یا ماہانہ ایک رقم مخصوص کر دیتے تھے۔ ان کا کام بس اتنا ہوتا تھا کہ وقت مقررہ پر ان دروں پر پہنچ کر اپنا حصہ حاصل کر لیں۔ اس طرح انہیں بھیک میں نہ صرف خاصا مال و زر مل جاتا تھا بلکہ دوسری چیزیں بھی ہاتھ آ جاتی تھیں۔ کپڑے، برتن، کھل اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء، اناج، پھل، خشک میوہ اور معلوم نہیں کیا کیا۔ یہ بھکاری جب اپنا دورہ مکمل کر کے اپنی برادری میں لوٹے پھندے واپس آتے تھے تو بڑا جشن منایا جاتا تھا۔

فیروز بخت کو راستے بھر بڑی شرم دامن گیر رہی اور وہ حوصلہ شکنی میں مبتلا رہا۔ جس قافلے میں وہ سفر کر رہا تھا، اس میں چند صراف اور سوداگر بھی تھے۔ فیروز بخت کے ایک ساتھی نے اس سے کہا۔ ”موقع اچھا ہے تو اسی وقت سے بسم اللہ کر دے۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”میں ان سے کس طرح بھیک مانگوں گا؟“

ساتھی نے جواب دیا۔ ”تو انسانی سرشت کے چند نکتے ذہن نشین کر لے، ان کی روشنی میں تو کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھے گا۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”کون سے نکتے مثلاً؟“

ساتھی نے جواب دیا۔ ”انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے۔ یہ دوسروں کے ساتھ جو مہربانیاں، نوازشیں یا سلوک کرتا ہے تو اس وقت جب اس کو اپنی انا یا بیجانی

کیفیت کو سکون پہنچانا ہوتا ہے، آدمی میں ایک جذبہ ہوتا ہے رحم اور ہمدردی کا۔ اگر تو ہٹا کٹا بن کے کسی سے بھیک مانگے گا تو تجھے جھڑک دیا جائے گا۔ تجھے گالیاں دی جائیں گی،

لعت ملامت کی جائے گی کیونکہ صحت مند آدمی کے بھیک مانگنے سے آدمی میں اس کا جذبہ رحم بیدار نہیں ہوتا لیکن اگر

یہی ہٹا کٹا اور صحت مند انسان کسی بھی طرح خود کو بیمار، مفلوج، اپاہج یا معذور ثابت کر کے بھیک مانگے گا تو اپنے

مقابل انسان میں جذبہ رحم اور ہمدردی بیدار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دینے والا ایسے بھکاری کو جو کچھ بھی

دیتا ہے اپنی بیجانی اور انتشاری کیفیت کو تسکین پہنچانے کی خاطر دیتا ہے جس سے انسان کی خود غرضی کا پتا چلتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انسان میں حد درجہ انانیت ہوتی ہے، اس انانیت اور خود پسندی یا خود پرستی کی تسخیر خوشامد سے ہوتی

ہے۔ خود پسندی اور انانیت کو خوشامد سے تسکین پہنچا کر مطلب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بس یہی دو موٹی موٹی حقیقتیں ہیں جو ہمارے پیشے کی اساس ہیں۔ بہترین بھکاری بہترین ذہن کا حامل ہوتا ہے۔“

فیروز بخت کو ابھی تک ان بھکاریوں کی عقل کا اتنا بڑا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

بھکاری ساٹھی فیروز بخت کی حیرت اور پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، بولا۔ ”ایک بات اور..... شرم و حیا نام کی کمزوریوں سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لینا اور جس دریا دل شخص سے کوئی مطالبہ کیا جائے جب تک مطلب حاصل نہ ہو جائے۔ سمجھنا نہ چھوڑا جائے کیونکہ مستقل مزاجی کے بغیر ذہانت کچھ بھی نہیں۔“

ان ہدایات اور نصیحتوں پر عمل کر کے فیروز بخت نے وہ کامیابی حاصل کی جس سے وہ ابھی تک محروم تھا۔ شروع شروع میں تو وہ خاصا پریشان اور بدحواس رہا لیکن رفتہ رفتہ اپنی اس پریشانی پر قابو پالیا اور اس نے جس شکار کا انتخاب کیا، اسے اپنی مدد پر آمادہ کر لیا، مال و زر ہن کی طرح برسنے لگے۔

دوسری طرف فیروز بخت کی مفقود تجربی سب کو پریشان کر رہی تھی۔ جب ستار نے حویلی والوں کو یہ بتایا کہ فیروز بخت راستے ہی سے الگ ہو گیا تھا اور یہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ چند دنوں بعد خود بخود حویلی چلا آئے گا تو اس پر پہلے دن تو کسی کو بھی نہ حیرت ہوئی نہ پریشانی لیکن جب ایک ہفتہ گزر گیا تو ہر کسی کو فکروں نے گھیر لیا۔

کیفیت کو شبہ تھا کہ فیروز بخت کے ساتھ کسی نے شرارت کی ہے۔ ستار جانتا تھا کہ فیروز بخت، فرخندہ کے پاس گیا ہے لیکن وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟ یہ بڑا پریشان کن سوال تھا جو اسے ہلکان کر رہا تھا۔ آخر ایک دن وہ کسی کو بتائے بغیر فرخندہ کے پاس چلا گیا۔ فرخندہ نے بڑی خوش اخلاقی سے ستار کی پذیرائی کی اور پوچھا۔ ”تو یہاں کسی خاص کام سے آیا ہے؟“

ستار نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر فیروز بخت کو تلاش کیا لیکن جب وہ کہیں نظر نہ آیا تو فرخندہ سے پوچھا۔ ”میرا آقا فیروز بخت کہیں نظر نہیں آتا، وہ کہاں چلا گیا؟“

فرخندہ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ”پتا نہیں کہاں چلا گیا، وہ میرے پاس آیا ضرور تھا لیکن دوسرے ہی دن میرے پاس سے چلا گیا۔“

ستار کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا، بولا۔ ”اس

شریف انسان کا پتا ضرور چلنا چاہیے ورنہ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ خدا نہ کرے مجھے یہ شبہ ہے کہ میرے آقا کے دشمن بہت ہیں اور کبھی چالاک ہیں۔ کہیں ان میں سے کسی شری نے میرے آقا کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا دیا ہو۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”جا اپنے آقا کی تلاش جاری رکھ اور دوبارہ میرے پاس مت آنا۔“ ستار منہ لٹکا کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

فیروز بخت نے ایک سال تک وہ ہتھکنڈے استعمال کیے کہ مال و زر کا ڈھیر لگا دیا اور اس نے ایک سال میں ایک لاکھ روپے کمال لیے۔

ایک سال گزار کر وہ فرخندہ کے پاس واپس پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ جو کچھ لایا تھا، اس سے برادری کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے فیروز بخت کو اپنی آنکھوں کا تارا بتالیا۔ فرخندہ، فیروز بخت کی باتوں اور طور طریق سے یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اب فیروز بخت کے پاس شرم و حیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

فیروز بخت نے فرخندہ سے پوچھا۔ ”فرخندہ! حویلی سے مجھے پوچھتا ہوا کوئی آیا تو نہیں تھا؟“

فرخندہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جیسے میرا آقا کہنے والا آیا تھا۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ فیروز بخت میرے پاس آیا تو تھا لیکن دوسرے ہی دن واپس چلا گیا تھا۔“

فیروز بخت نے مسکرا کر کہا۔ ”بہت خوب، بہت خوب۔“

فرخندہ کا دادا، باپ، ماں اور پوری برادری فیروز بخت سے بہت خوش تھی۔ دادا نے شاپاش کہی اور پھر پوچھا۔ ”نوجوان تاجر! تو ہماری آزمائش پر پورا اترتا۔ اب فرخندہ تیری ہے، تو جب کہے شادی کر دی جائے گی۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ فرخندہ کی خاطر کیا اور میں اس مشکل ترین آزمائش سے فرخندہ کی محبت ہی کے سہارے گزرا ہوں، اس لیے یہ سوال فضول اور مضحکہ خیز ہے کہ فرخندہ کی شادی کب کی جائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ابھی، اسی وقت اور اسی لمحے۔“

دادا ہنسنے لگا۔ ”اسی لمحے تو نہیں، اس ہفتے فرخندہ تیرے حوالے کر دی جائے گی۔“

رات کو چاند پوری آب و تاب سے طلوع ہوا۔ وہ دونوں چاندنی رات سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنی محبت کی یادگار پر ہر اس جگہ گئے جہاں جہاں وہ دونوں ایک

سال پہلے آئے گئے تھے۔

چوتھے دن فرخندہ کی شادی کر دی گئی۔ پوری برادری میں بڑی خوش منائی گئی۔ شادی کی پہلی رات فرخندہ نے اس کی آغوش میں ذرا سی آنکھ کھولی اور کہا۔ ”فیروز بخت! آج میں بہت خوش ہوں۔ اب میں ملک التجار فیروز بخت کی بیوی ہوں۔ اب میں حویلی میں رہوں گی۔ عظیم الشان حویلی میں۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”جب تو ملک التجار کی بیوی بن جائیگی اور اس میں غرور و انبساط محسوس کرتی بھی تو مجھ سے ایک سال تک بھیک خواہو متگو اڈالی..... تو سال بھر پہلے ہی ملک التجار کی بیوی بن سکتی تھی۔“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں برادری کے کسی فیصلے کو کسی طرح نہیں بدل سکتی تھی۔ یہ آزمائش برادری کا فیصلہ تھا اور یہ طے تھا کہ اگر تو نے یہ آزمائش مرحلہ طے نہ کیا ہوتا تو اب تک میری شادی کسی اور سے ہو چکی ہوتی۔“

شادی کے تیسرے دن فرخندہ کے مجبور کرنے پر فیروز بخت اپنی حویلی کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔ وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔ دوری سے اپنی حویلی کی جھلک دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ حویلی کے پھاٹک پر اپنے گھوڑے سے اترتا تو اس کا خیال تھا کہ حویلی کے دربان اسے دیکھتے ہی دوڑے دوڑے اس کے پاس آئیں گے اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے حویلی کے اندر داخل ہوں گے پھر یکایک حویلی کے اندر پھل سچ جائے گی اور حویلی کا ہر فرد اور ہر شخص والہانہ اور بے تابانہ بھاگا بھاگا اس کے پاس آئے گا اور اس کی مستود التجری کی داستان سننے پر مصر ہوگا..... لیکن یہ ساری فکر اور ساری خوش فہمی اس وقت دور ہو گئی جب دو اجنبی چہروں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔ ”اے شخص! تو کون ہے..... کہاں سے آیا ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے؟“

فیروز بخت کو بڑا غصہ آیا، بولا۔ ”اگر یہی سوال میں تم دونوں سے کروں کہ تم دونوں کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور مجھ سے یہ فضول سوال کیوں کر رہے ہو تو تم دونوں کیا جواب دو گے؟“

دونوں اجنبیوں نے ایک دوسرے کو فکر و تشویش سے دیکھا اور ایک نے جواب دیا۔ ”حالانکہ تیرا سوال فضول اور بیکار ہے لیکن پھر بھی اس کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہم دونوں اس حویلی کے دربان ہیں۔“

فیروز بخت نے ان دونوں کو ذرا غور سے دیکھا۔ یہ بالکل نئے چہرے تھے۔ ”پرانی دربان کہاں چلے گئے؟“ اس نے دونوں دربانوں سے پوچھا۔ ”تم دونوں یہاں کب سے دربانی کا فرض ادا کر رہے ہو؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”تقریباً آٹھ نو ماہ سے۔“ فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”اس حویلی کا مالک کون ہے؟ اس میں کون رہتا ہے؟“

دربان نے جواب دیا۔ ”ملک التجار وصی احمد۔“ فیروز بخت چکرا گیا۔ اسی وقت ایک طرف سے ستار نمودار ہوا اور آتے ہی فیروز بخت سے چٹ گیا۔ ”میرے آقا آپ آگئے؟ آپ چلے کہاں گئے تھے؟ بخدا میں نے آپ کو معلوم نہیں کہاں کہاں تلاش کیا اور ادھر چند ماہ سے میں آپ کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔“

فیروز بخت کا دل بھر آیا۔ ستار کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”ستار! میں کہاں چلا گیا تھا، یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے پھر بھی فرصت میں سناؤں گا۔ تو یہ بتا کہ وصی احمد ملک التجار کس طرح ہو گیا اور یہ حویلی اس کے قبضے میں کس طرح چلی گئی؟“

ستار نے دونوں دربانوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میں اندر آپ کی آمد کی اطلاع کر دوں، اس کے بعد آپ سے باتیں کروں گا۔“

دونوں دربان ان دونوں کی باتیں حیرت و استعجاب سے سن رہے تھے۔ ستار اند چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور فیروز بخت کو اندر لیے چلا گیا۔ وہاں کیفیہ اور نرجس نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دونوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی لیکن فیروز بخت نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”میں اس وقت تک تم لوگوں کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ وصی احمد ملک التجار کب سے بن گیا اور تم لوگوں کی موجودگی میں وہ اس حویلی کا مالک کس طرح ہو گیا؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”جب تو یہاں آئے بغیر احمد آباد سے آتے ہوئے راستے ہی سے کہیں غائب ہو گیا تھا تو ہم سب نے کئی دن تک حیرا بڑی بے چینی سے انتظار کیا پھر تلاش بھی کروایا لیکن تیرا کہیں کوئی پتہ نہ چلا۔ حیرا کشدگی کی خبر عام ہوئی تو ہمارے حاسدوں نے سراٹھایا اور ہمیں بے یار و مددگار سمجھ کر مال و دولت پر قبضے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اس وقت ہم دونوں نے صلاح و مشورہ کر کے ایک ایسی تدبیر سوچی جس پر عمل کر کے ہم نے اپنے سارے حاسدوں کو شرمندہ اور خیران کر دیا اور وہ تدبیر یہ تھی کہ ہم

دولوں نے تاجروسی احمد سے شادی کر لی۔ اس طرح تاجر وسی احمد ہم دولوں کا شوہر بھی بن گیا اور ملک التجار بھی۔ اس طرح وہ اس حویلی کا بھی مالک ہو گیا۔

فیروز بخت نے جھکے جھکے لہجے میں پوچھا۔ ”میری عدم موجودگی میں آخر وہ کون سا حاسد اور بداندیش تھا جس نے اس حویلی، کاروبار اور مال و زر پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”نظام..... اور اگر وسی احمد درمیان میں نہ آ جاتا تو نظام اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔“

فیروز بخت نے انہوں سے کہا۔ ”تم لوگوں نے وہی سب کچھ کر ڈالا جو اس سے پہلے داؤد مرحوم نے کیا تھا اور اب میں نے تم دولوں کی بابت یہ رائے قائم کر لی ہے کہ اگر تم دولوں مرد ہو تیں تو یا تو کامیاب تاجر ہو تیں اور اگر تاجر نہ ہو تیں تو کسی دربار میں جوڑ توڑ کرنے والی کامیاب سازشی ہو تیں۔“

نرجس نے جواب دیا۔ ”ہم دولوں مجبور تھے اور اگر ایسا نہ کرتے تو آج یہ حویلی شاید نظام کے قبضے میں جا چکی ہوتی۔“

فیروز بخت نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”بہر حال تم دولوں نے چالاکی اور غلت میں مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔ اس حویلی میں اب میری کیا حیثیت ہو گی؟“

نرجس نے کہا۔ ”اگر تو بتائے بغیر اتنے طویل عرصے تک لاپتہ نہ ہو جاتا تو کچھ نہ ہوتا، اب رہی یہ بات کہ اس حویلی میں تیری کیا حیثیت ہو گی تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ شام کو وسی احمد ہی اس کا کوئی جواب دے سکے گا۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”وسی احمد کے آنے تک میں یہاں رہ سکتا ہوں یا نہیں؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”ضرور رہ، یہاں رہنے سے تجھے کون منع کر سکتا ہے۔“

فیروز بخت اپنی ہی حویلی میں مہمان کی طرح رک گیا۔ ستارے شام تک یہی سمجھا تا رہا کہ وسی احمد، نرجس اور کیفیہ تعلق اور متحد ہو کر یہی کوشش کریں گے کہ آپ کو بالکل بے دخل کر دیا جائے لیکن آپ کا یہ فرض ہے کہ کسی طور بے دخل نہ ہوں۔ اگر آپ کسی مزاحمت کے بغیر بے دخل ہو گئے تو آپ کا مستقبل کیا ہو گا؟ آپ کریں گے کیا؟“

اب فیروز بخت کو اس حویلی اور کاروبار وغیرہ سے بس اتنی ہی دلچسپی رہ گئی تھی کہ فرخندہ اس حویلی میں رہنا چاہتی تھی اور خود ملک التجار کی بیوی کہلانے میں خوشی محسوس کر رہی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا اور وسی احمد سے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ستارے کو جواب دیا۔ ”ستارا

میں مزاحمت کروں گا لیکن اس معرکے میں مجبوری یہ ہے کہ کیفیہ اور نرجس نے بغلی گھونسا رسید کر دیا ہے اور ان دولوں کی وجہ سے وسی احمد ناقابل شکست ہو گیا ہے۔“

ستارے کو بڑا قلق تھا اور وہ اپنی بے بسی پر ہاتھ مل رہا تھا۔ شام کو وسی احمد بھی آ گیا۔ وہ فیروز بخت کو حویلی میں غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ حقارت سے پوچھا۔ ”اسے حویلی میں کس نے داخل ہونے دیا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اپنی حویلی میں داخلے کے لیے میں اجازت کس سے لیتا۔ ہاں تو نے جو چالاکی کی ہے اس کی میں داد دیتا ہوں لیکن اب ہم دولوں کی بہتری اسی میں ہے کہ اس حویلی میں ہم دولوں مل جل کر رہیں۔“

وسی احمد، نرجس اور کیفیہ پر گرم ہو گیا۔ ”تم دولوں نے میری اجازت کے بغیر اسے اندر کیوں آنے دیا؟“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ لڑنے جھگڑنے کے بجائے مفاہمت کر لی جائے۔ میں شازیہ کی اس سے شادی کر دوں گی اور یہ حسب سابق کاروباری امور میں دلچسپی لینے لگے گا۔ آخر یہ بھی تو ہمارے کاروبار اور مال و زر میں حصے دار ہے۔“

وسی احمد غصے میں ٹپکنے لگا۔ ”بکواس، ایک بھکاری سے تو اپنی بیٹی کی شادی کس طرح کر دے گی؟ یہ بھکاری ہے۔ یہ وہ فیروز بخت نہیں ہے جسے ملک التجار داؤد مرحوم نے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ یہ دوسرا فیروز بخت ہے۔ بھکارن فرخندہ کا شوہر، مالوہ اور اس کے مضامقات میں ایک سال تک بھیک مانگنے والا فیروز بخت بھکاری۔“

وسی احمد کے اس انکشاف نے ہر ایک کو چونکا دیا۔ فوری طور پر کسی کی بھی سمجھ میں پوری بات نہیں آئی۔ فیروز بخت، وسی احمد کی باخبری پر حیران رہ گیا اور تردید یا تصدیق میں ایک لفظ بھی نہ ادا کر سکا۔

وسی احمد نے اسے مہینچوڑا۔ ”تو خاموش کیوں ہو گیا؟“ پھر نرجس، کیفیہ اور ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یوں کیوں نہیں؟ ان سب کو اپنی ساری روداد ستا کیوں نہیں دیتا؟ تو ایک سال تک لا پتا رہا، یہ لوگ اس ایک سال کی روداد بڑی توجہ سے سنیں گے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو پچھلے ایک سال کی داستان ہم میں سے کسی کو بھی نہیں سنائے گا..... لیکن تو مت شرم۔ میں نے تیرے پیچھے اپنے چند آدمی سائے کی طرح لگا دیے تھے۔ انہوں نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جس کے اظہار اور بیان پر تو بالکل قادر نہیں ہے۔“

کیفہ نے وحی احمد سے کہا۔ ”آپ نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے، ذرا دوبارہ تو بیان فرمائیے۔“
وحی احمد نے فیروز بخت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”کیوں جناب! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“
فیروز بخت بدستور خاموش رہا۔ وحی احمد نے اندازہ لگایا کہ فیروز بخت ہار مان چکا ہے اور ایک آدھ زوردار حملہ کر کے اس کو چاروں شانے چت کیا جاسکتا ہے۔ وحی احمد نے کیفہ سے پوچھا۔ ”کیا تو اب بھی اپنی بیٹی کی شادی کی شادی اس بدنام اور رسوائے زمانہ نوجوان سے کر دینا چاہتی ہے؟ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بھی میں اس رشتے کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس پر غور کر کے اپنا وقت ضائع کروں۔“
وحی احمد نے مزید کہا۔ ”حویلی والو! ابھی ابھی میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں حقیقت ہے سچائی ہے۔ اس لیے میری باتوں پر غور کرنا تم سب کی ذمہ داری ہے۔“ پھر فیروز بخت سے پوچھا۔ ”کیوں جناب، بھکاری صاحب! کیا سارا کچا چٹھایا بیان کر دوں؟“

فیروز بخت نے خود ہی بیان کر دیا۔ ”اب جبکہ میری زندگی کا پچھلا سال اہانتوں، ذلتوں اور خوار یوں میں گزر چکا ہے اگر میں خود ہی ان کا ذکر کروں تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔“
کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ فیروز بخت نے اپنی داستان عشق اور در یوزہ گری سنا ڈالی اور آخر میں یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اب اس کی فرخندہ سے شادی بھی ہو چکی ہے۔

کیفہ نے غضب ناک ہو کر دریافت کیا۔ ”تو، تو شادی بھی کر چکا۔ تو نے ایک سال تک بھیک مانگ کر ان کی شرط بھی پوری کر دی۔“

ستار کو اس داستان کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں تھا کیونکہ وہ فیروز بخت اور فرخندہ کی محبت کی شدت سے کسی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”اے کاش، خدایا! یہ جو کچھ میں نے سنا ہے غلط ہو۔“

کیفہ رونے لگی۔ ”افسوس کہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اپنی شادی کی شادی تجھ سے کر کے تیری عزت اور مرتبے میں چار چاند لگا دوں گی لیکن تو، تو انتہا کا بد قسمت نکلا۔“

وحی احمد نے سختی سے کہا۔ ”برخوردار! میں ملک التجار ہوں۔ اس وقت تو یہاں سے چلا جاؤ ورنہ میں دربانوں کی مدد سے تجھے دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔“

فیروز بخت اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نہیں جاؤں گا

کیونکہ اس کا روپار اور اس سے متعلق مال و زر کا سب سے بڑا حق دار میں ہوں۔ داؤد مرحوم نے مجھے اپنی ہر چیز کے دو تہائی کا حق دار بنایا تھا۔“

وحی احمد نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”کہاں کا حصہ، کہاں کا حق..... تو فوراً ہی دفعان ہو جا یہاں سے ورنہ میں تجھے قتل بھی کر داسکتا ہوں۔“

ستار نے فیروز بخت کی خوشامد کی۔ ”میرے آقا! ان سب کا کہا مان لیجیے اور یہاں سے چلے جائیے۔“

فیروز بخت کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ستار اس کے ساتھ تھا۔ حویلی کے پھانک پر گھوڑا اس کے حوالے کر دیا گیا اور فیروز بخت اس پر سوار ہو کر پتوہ آباد روانہ ہو گیا۔ اس وقت اسے یہ ملال نہیں تھا کہ اسے حویلی، کاروبار، مال و زر اور جائیداد سب کچھ اس سے چھیننا چاہتا ہے بلکہ صرف یہ ملال تھا کہ اب فرخندہ کی وہ سب سے بڑی خواہش بھی پوری نہ ہو سکے گی۔ ایک یہ کہ اب وہ ایک شاندار حویلی میں نہ رہ سکے گی اور دوسری یہ کہ اب وہ ملک التجار کی بیوی نہیں کہلائے گی۔

جب وہ قریب قریب پتوہ آباد میں داخل ہو گیا تو اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ایک نامعلوم شخص اپنے گھوڑے کو بھگائے لیے چلا آ رہا تھا۔ جب وہ بالکل قریب آ گیا تو فیروز بخت نے اسے پہچان لیا۔ یہ تو اپنا نظام تھا۔

نظام نے آواز دی۔ ”فیروز بخت! رک جا۔ میں تیری مدد کو آیا ہوں۔“

فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ ”نظام! تو میری کیا مدد کرے گا؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی ستار کی زبانی تیرے ساتھ وحی احمد کی زیادتی کا حال معلوم ہوا۔ تو اس شاطر کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اگر تو میرے مشوروں پر عمل کرے تو میں وحی احمد کو وہ مزہ چکھا سکتا ہوں کہ زندگی بھر یاد رکھے گا کہ کس سے پالا پڑا تھا۔“

فیروز بخت، نظام کی چالاکیوں اور خود غرضیوں سے اچھی طرح واقف تھا، بولا۔ ”پہلے میں غور کر لوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

اس جواب سے نظام کو بڑی مایوسی ہوئی، پوچھا۔ ”تب پھر کب دو گے جواب؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”دو تین دن بعد۔“
”کہاں ملو گے؟“

”تیرے پاس میں خود ہی آ جاؤں گا۔“ نظام منہ بنا کر چلا گیا۔

فیروز بخت کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ وہ فرخندہ کو ساری باتیں کس طرح بتائے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ اپنے اندرونی کرب اور ذہنی مایوسی کو فرخندہ سے چھپائے رکھے لیکن فرخندہ نے اس کے اداس چہرے کو بڑی آسانی سے محسوس کر لیا، پوچھا۔ ”سارا دن حویلی میں کیا کرتے رہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب دنگ رہ گئے اور پھر اتنی خوشیاں منائیں کہ اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔“

فرخندہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ ”شادی کی بابت بتا دیا؟“

”ہاں بتا دیا، اس خبر نے ان سب کو اور زیادہ خوش کر دیا۔ وہ سب شکایت کر رہے تھے کہ اپنے ساتھ دلہن کو کیوں نہیں لائے۔“

فرخندہ نے پوچھا۔ ”ان لوگوں نے یہ نہیں پوچھا کہ تو نے کہاں اور کس سے شادی کی ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں، انہوں نے یہ سوال بھی کیا تھا۔“

”پھر تو نے کیا جواب دیا؟“

فیروز بخت نے زبردستی خوشی کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”فرخندہ! میں نے سوچا کہ اب کوئی بات راز نہیں رہے گی اس لیے سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہیے چنانچہ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ ایک بات بھی نہیں چھپائی۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”تب تو ان سب کے چہرے اتر گئے ہوں گے؟“

”نہیں تو، وہ سب تو اس سے بھی بہت خوش ہوئے اور کہا کہ انہیں تو میری خوشی عزیز ہے۔ میں کہیں بھی شادی کرنا وہ خوش ہوتے۔“

فرخندہ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو کل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی اور اب اس حویلی میں رہوں گی۔ میں بہت خوش ہوں کہ اب میں ملک التجار کی بیوی کہلاؤں گی۔“

اب اس کی اندرونی پریشانی اور ذہنی کرب اس کے چہرے پر بھی نمودار ہوا، بولا۔ ”نہیں، میں کل وہاں نہیں جاؤں گا پھر کسی دن لے چلوں گا۔“

فرخندہ تو پہلے ہی کھنکی ہوئی تھی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ فیروز بخت کے معاملات بگڑ گئے ہیں اور یہ کہ وہ جھوٹ

بول رہا ہے، پوچھا۔ ”پھر میں تیرے ساتھ حویلی میں کب چلوں گی؟“

فیروز بخت نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”فرخندہ! فضول کے سوال جواب سے مجھے تنگ نہ کر۔ میں خود جس دن مناسب سمجھوں گا تجھے حویلی میں لے جاؤں گا۔ آخر حویلی میں جانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“

فیروز بخت پوری رات جاگتا رہا۔ رات کی تاریکی، سنائے اور تنہائی نے اسے بہت زیادہ فکر مند کر دیا تھا اور وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ فرخندہ کو حویلی میں کس طرح لے جائے گا اور اگر نہیں لے جاسکے گا تو اس کا سبب کیا بتائے گا؟

دوسرے دن دوپہر کے بعد فیروز بخت کو تلاش کرتا ہوا ستار بھکاریوں کی بستی میں پہنچ گیا اور فیروز بخت کو مشورہ دیا کہ وہ نظام سے گٹھ جوڑ کر کے وصی احمد کا مقابلہ کرے لیکن اس وقت برادری کے سربراہ اور فرخندہ کے دادا کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ برادری کے بچوں کو اپنے آدمیوں کا انتخاب کرنا تھا جو بھیک مانگنے کے سالانہ دوروں پر مالوہ، برہانپور، گجرات اور اجمیر بھیجے جانے والے تھے۔ اس مجلس میں اسے یہ خوشخبری سنائی گئی کہ بچوں نے با اتفاق رائے اسے بھی اپنی مجلس عاملہ کا رکن بنایا ہے۔ چند گھنٹوں کی مشاورت کے بعد چار چار چھ افراد پر مشتمل چار جماعتیں تیار کر لی گئیں۔ اس موقع پر فیروز بخت نے برادری کے سربراہ سے درخواست کی۔ ”میں برادری کے سربراہ اور بچوں سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ ایک سال کے لیے مجھے ایک موقع اور دیں تاکہ میں اپنے اس نئے خاندان میں زیادہ لائق اور موثر شمار کیا جاؤں۔“

دادا نے پوچھا۔ ”تیری حویلی اور کاروبار کا کیا ہوگا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اس برادری میں شامل ہو جانے کے بعد میرے رشتے داروں نے بغاوت کر دی ہے اور اگر میں ان کی بغاوت کو کچلنا چاہوں تو مجھے کئی خطرے مول لینا ہوں گے۔ پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ میں قتل کیا جاسکتا ہوں۔ دوسرا یہ کہ میری موجودہ حیثیت کا علم ہر شخص کو ہو چکا ہے اس لیے وہ تمام حضرات مجھے میرے خاندان سے نکال چکے ہیں جنہیں میں ہمیشہ اپنا عزیز اور رشتے دار سمجھتا رہا ہوں۔“

دادا نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

فیروز بخت نے اپنی صفائی میں مزید کہا۔ ”اور پھر یہ کہ جب میں اس برادری کا ایک فرد بن چکا ہوں، مجھے دو

گھوڑوں کی سواری نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک میں نے بھیک نہیں مانگی تھی اس کی افادیت اور گہرائی سے واقف نہیں تھا لیکن اب میں پختہ ہو چکا ہوں اور شاید میں اس برادری کے لیے بہت زیادہ سودمند ثابت ہوں گا۔“

دادا نے کہا۔ ”تیری مرضی، پہلے تو مالوہ گیا تھا اب برہانپور چلا جا۔“

فیروز بخت نے خوشی میں جواب دیا۔ ”میں اپنے موجودہ پیشے کی افادیت اور تقدیس سے واقف ہو چکا ہوں اس لیے اس پیشے سے مستعفی وابستگی کو کسی دوسرے پیشے پر ترجیح دوں گا۔“

بچوں نے فرط خوشی میں نعرہ ہائے تحسین بلند کیے اور تالیاں بجا کیں۔ دادا نے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے پہل تو نے ہمارے آبائی پیشے کو کتنی بری نظر سے دیکھا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ہمارے آبائی پیشے کی تقدیس اور فضیلت تجھ پر ظاہر اور ثابت ہو کر رہے گی اور مجھے خوشی ہے کہ وہ دن ایک سال کے اندر ہی آگیا۔“

بچوں کے فیصلے کے بعد سات دنوں کے اندر اندر ہر کھڑی کو اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جانا تھا۔ اس بار فیروز بخت کو برہانپور جانا تھا۔ اس نے ہر ہانپور جانے سے دو دن پہلے نظام سے ملاقات کی۔ نظام اسے دیکھتے ہی بٹاش ہو گیا کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ فیروز بخت سے مل کر وصی احمد کے خلاف جو جنگ کرے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک جیت ضرور ہوگی جس سے نظام کا اپنا مستقبل سنور جائے گا لیکن جب فیروز بخت نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ وصی احمد سے نہیں لڑے گا اور اپنے حق سے دستبردار ہو رہا ہے تو نظام حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”پھر تو زندگی کس طرح گزارے گا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نظام! میں نے اب جو پیشہ اختیار کیا ہے، وہ داؤد مرحوم اور وصی احمد وغیرہ کے پیشوں سے بدرجہ بہتر ہے۔ میرے اس پیشے میں دوسرے پیشوں کی طرح جان نہیں کھپانا پڑتی اور پھر یہ کہ میں جو کچھ کمادوں گا، وہ سب میرا ہی ہوگا اور اس میں کوئی اور شخص دعویدار نہیں بن سکے گا۔“

نظام کی رال کھینچنے لگی۔ ”فیروز بخت! میں خود بھی بہت پریشان ہوں، مجھے بھی اپنے پیشے میں شامل کر لے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں اپنے پیشے میں تجھے شریک تو کر سکتا ہوں لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ تو کم ظرف انسان ہے اور جب تک تو ان حالات کا شکار نہ ہو جائے جو کسی بھی شخص کو اس پیشے کی طرف مائل کر سکے تو ادھر نہیں آئے گا۔“

نظام نے کہا۔ ”آخر اس پیشے کا نام کیا ہے؟ تو کس پیشے کا ذکر کر رہا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”بھیک..... میری طرح، گوتم بدھ اور اس کے پیروؤں کی طرح تو بھی بھکشوبن جا اور پھر اس پیشے کی افادیت کے مزے لوٹ۔ کم محنت زیادہ دولت، مزے ہی مزے ہیں۔“

نظام کوشہ گزرا کہ فیروز بخت غالباً پاگل ہو گیا ہے اور یہ پاگل پن وصی احمد، کیفیہ، نرجس اور ان سے متعلق لوگوں کی زیادتی اور نا انصافی کی وجہ سے طاری ہوا ہے۔

فیروز بخت نے جواب کا انتظار کیے بغیر واپس جاتے ہوئے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں، اللہ نے چاہا تو ایک سال بعد ملاقات ہوگی۔ اس ایک سال میں تو کسی نہ کسی نتیجے پر ضرور پہنچ جائے گا۔“

فیروز بخت اپنی برادری میں واپس پہنچا اور دو دن بعد وہ کلڑی کے ساتھ برہانپور چلا گیا۔

فیروز بخت سے پوری برادری بہت خوش تھی کیونکہ اس نے برادری کے آبائی پیشے کی عظمت اور تقدیس کا عملاً اقرار کیا تھا لیکن فرخندہ بہت اداس اور مایوس تھی کیونکہ اب اسے اچھی طرح یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ بھی فیروز بخت کی حویلی نہیں جاسکے گی اور یہ کہ کوئی اسے ملک التجاری بیوی بھی نہیں کہے گا۔

ان غموں نے اس کے دل پر بوجھ رکھ دیا تھا چنانچہ فیروز بخت کی موجودگی میں تو وہ خاموش رہی لیکن اس کے جاتے ہی فرخندہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ برادری کے لوگ یہ سمجھے کہ فرخندہ اپنے شوہر کی عارضی جدائی پر رورہی ہے لیکن وہ اپنی اندرونی کیفیات اور غموں کی وجہ سے زار و نزار ہو رہی تھی۔ برادری کے لوگوں نے بڑی فراخ دلی سے فرخندہ کو صبر کی تلقین کی۔ فرخندہ نے اس وقت تو دکھاوے کا صبر کر لیا لیکن بعد میں جب تنہائی میسر آئی تو بستر میں منہ چھپا کر خوب خوب روئی۔

آئین اکبری، ابوالفضل۔ دربار اکبری، مولانا محمد حسین آزاد۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر جیلانی۔

ہند کی معاشی حالت اول، ڈبلیو ایچ مورلینڈ۔ معاشی حالات اکبر تا اورنگ زیب، ڈبلیو ایچ مورلینڈ



اکثر و بیشتر عقل کے ایسے مظاہرے بھی ہوتے ہیں کہ اپنے ہی فعل پر عقل خود بھی دنگ رہ جاتی ہوگی... ایسا ہی ایک کارنامہ اس نے بھی انجام دیا جو بہ ظاہر دنیاوی علوم کا ایک کرشمہ تھا لیکن اس کے رونما ہونے پر اس کرشمہ ساز کو بھی پچھتاؤں نے گھیر لیا... اس کے بعد وہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا... کیونکہ خلائی سفر کے شوق اور ایک مبہم عکس کے تعاقب میں اس کا دامن ہر خوشی سے خالی ہو چکا تھا۔

عذابِ ماضی

کاشفِ زیر



سفر پر روانہ کرتا۔ چند گھنٹے پہلے ایک شعل آخری مسافر اور سامان خلائی اسٹیشن پر لائی تھی جسے مددگار کے ساتھ جانا تھا جو پہلے ہی خلائی اسٹیشن پر موجود تھا۔ اس عملے کا کمانڈر فلپس تقریباً پچاس برس کا مضبوط جسم است اور سپاٹ چہرے والا

زمین کے مدار میں گردش کرتے بین الاقوامی خلائی اسٹیشن پر زیر تعمیر خلائی جہاز مددگار اپنے آخری مراحل میں تھا۔ اس کے مختلف حصے کا مہابی سے جوڑ کر انہیں ٹیسٹ کر لیا گیا تھا اور اب انجن کی آزمائش تھی جو اس خلائی جہاز کو طویل

”اس کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں۔“ میک گادر نے اعتراض کیا۔

”میکا... ایک خفیہ مشن تھا، اس کے بارے میں عام طور سے بہت کم لوگوں کو علم ہے۔“ مارک نے کہا۔ ”جب میکا نیپچون کے پاس پہنچا اور اس نے سیارے کے گرد مدار بنایا تو چند گھنٹوں بعد اس کا رابطہ زمین سے ختم ہو گیا۔“

”ختم ہو گیا۔“ کریگ نے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے میکا تباہ ہو گیا۔“

”نہیں، میکا اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کا سسٹم ہمارے سگنل وصول کر رہا ہے لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں دیا جا رہا۔“

”اس کا عملہ؟“ ریڈ نے سوال کیا۔

”اس کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔“

”تب کیسے پتا چلے گا کہ جہاز اور اس کے عملے پر کیا گزری؟“

”یہی جاننے کے لیے ہم اس طرف جا رہے ہیں۔“ مارک نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے اتنا جاننا کافی ہے اب ہمیں تیاری کرنی ہے کیونکہ سفر کے آغاز میں ایک ٹھنڈا رہ گیا ہے۔“

فلپس نے کہا اور وہ اوپر مددگار کے کاک پٹ میں آگئے۔ یہاں فلپس کے ساتھ کریگ، اینا اور ریڈ کے لیے نشستیں تھیں۔ انہوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں اور مددگار کے تمام آلات کو چیک کرنے لگے۔ مارک نے اپنے کیمین میں آکر اپنا سامان رکھا اور بیڈ کے سرہانے میکا کی تصویر لگائی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر باہر نکل آیا۔

ایک گھنٹے بعد مددگار کے انجن اشارت ہوئے۔ خلائی اسٹیشن سے جوڑے رکھنے والی سربنگ پہلے ہی الگ کی جا چکی تھی۔ مددگار کو پکڑے خلائی اسٹیشن کے آہنی بازو نے اس کے انجن اشارت ہوتے ہی اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ زمین سے اوپری مدار سے دور خلا میں نکل آیا۔ انجن تین منٹ تک پوری قوت سے کام کرتے رہے اور پھر انہیں بند کر دیا گیا۔ خلا میں مزاحمت نہیں ہوتی ہے اس لیے مددگار کو جو رفتار حاصل ہو گئی تھی وہ قائم رہتی اور یہ رفتار اتنی تھی کہ وہ ستر دن میں نیپچون کے پاس پہنچ جاتے۔ کریگ نے مددگار کو مکمل آٹو پائلٹ کر دیا تھا اب وہ سب سونے کی تیاری کرنے لگے تھے۔

اس قسم کے طویل سفر اور بے انتہا رفتار کے جسم پر پڑنے والے منفی اثرات سے نمٹنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ایک مخصوص جیسر میں جو پانی سے بھرا ہوتا تھا وہ سو

محض تھا۔ کریگ اس کا نائب اور مددگار کا پائلٹ تھا۔ اینا کیونیکیشن کی ماہر تھی اور مددگار کے تمام مواصلاتی امور اس کی ذمہ داری تھی۔ ریڈ کیونیکیشن تھا اور وہ آلات کی دیکھ بھال اور مرمت کرتا تھا۔ وہ خوش شکل اور نوجوان تھا۔ ڈاکٹر کیسٹرین ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ فزکس کی ماہر بھی تھی۔ کارن ہبل مدد اور بیرونی مرمت کا ماہر تھا۔ ساتواں فرد میکا گادر انجینئر تھا اور یہ جہاز اسی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ وہ سب اس وقت مددگار کے نچلے ہال میں جمع تھے جہاں سامان رکھا گیا تھا۔ وہ آنے والے فرد کے بارے میں تجسس تھے لیکن سوائے کمانڈر فلپس کے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ریڈ نے کہا۔

”کمانڈر، کیا یہ کوئی خفیہ مشن ہے؟“

”نہیں... لیکن اس کے بارے میں تمہیں آنے والا محض ہی بریف کرے گا۔“

اسی لمحے خلائی اسٹیشن کا مددگار کے ساتھ لگنے والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ سیاہ بالوں اور ہم رنگ آنکھوں کی وجہ سے وہ تاریک تاثر دے رہا تھا مگر وہ سفید قام ہی تھا۔ اس نے سب کو دیکھا اور بولا۔

”ہائے... میں ڈاکٹر مارک روزبرگ ہوں۔“

”ہمارے پاس پہلے ہی ایک ڈاکٹر موجود ہے۔“ میکا نے کیسٹرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”بلکہ یہ ڈبل ڈاکٹر ہے۔“

”میں صرف سنگل ڈاکٹر ہوں۔ مینیٹرولوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔“ مارک خفیف سا مسکرایا۔ ”میں تمہارے خلائی جہاز کا آخری مسافر ہوں۔“

”آخری مسافر...“ ریڈ نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”آخری سفر کا آخری مسافر۔“

”معاف کرنا یہ ہومر کا عاشق ہے۔“ اینا نے کہا اس کا اشارہ ریڈ کی طرف تھا۔

”وہ ہر زمانے کا شاعر ہے۔“ ریڈ نے تائیدی انداز میں کہا۔

”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اس وقت ہمیں ہومر کے بجائے اپنے مشن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، جس کے بارے میں مارک بتائے گا۔“ کمانڈر فلپس نے سرد لہجے میں کہا۔

مارک نے کھنکھا کر کہا۔ ”آج سے سات سال پہلے ایک خاص خلائی جہاز نظام شمسی کی حدود کی جانچ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ آخری تین بڑے سیاروں سیٹرن، یورینس اور نیپچون سے ہوتا ہوا نظام شمسی کی حد سے نکل جاتا۔“

”نکل جاتا۔“ اینا نے کہا۔ ”لیکن وہ نکلا نہیں؟“

جاتے اور ان کا جسم مخصوص طریقے سے خوراک اور آکسیجن حاصل کرتا رہتا۔ پانی کے اندر وائبریشن ان کے جسم کی تھراپی کرتی اور وہ جب طویل نیند کے بعد بیدار ہوتے تو ان کے جسم و ذہن تروتازہ ہوتے تھے۔ اس طریقے سے خوراک اور آکسیجن کی بچت بھی ہوتی تھی۔ کاک پٹ کے پیچھے رہائشی کیمپوں کے ساتھ ساتھ ہائبرنیٹ چیمبر تھے۔ وہ اپنا لباس اتار کر صرف زیر جاموں میں آگئے۔ ڈاکٹر کیچھ سب کو ایک مخصوص انجکشن دے رہی تھی، اس کے اثر سے ان کا جسم پانی میں بھی ٹھیک رہتا۔ وہ سب باری باری اپنے چیمبروں میں چلے گئے ان کے شیشے کے شفاف دروازے بند ہوئے تو انہوں نے منہ پر غوطہ خوروں کے سے نقاب پہن لیے۔ یہ بیلٹ کی مدد سے سر کو جکڑ کر رکھتے اور کسی طرح خود منہ سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اسے منہ پر لگاتے ہی وہ سوتے چلے گئے کیونکہ آکسیجن میں سلائے والی گیس بھی شامل تھی۔ چند لمحوں بعد ان کے چیمبر پانی سے بھرنے لگے اور پھر ہال اور جہاز کی تمام غیر ضروری روشنیاں اور آلات بند ہو گئے۔ انہیں ستر دن تک اسی حالت میں سوتے رہنا تھا۔

☆☆☆

مارک کی آنکھ کھلی تو وہ پانی کے اندر تھا حالانکہ جب اس کی آنکھ کھلتی تو چیمبر کا پانی نکل جانا چاہیے تھا۔ اس نے ایک طرف دیوار پر لگا ہوا جٹن دبایا تو چیمبر سے پانی خارج ہونے لگا۔ اس نے منہ سے نقاب ہٹایا اور شیشہ کھول کر باہر نکل آیا تب اس نے دیکھا اس کے باقی ساتھی ویسے ہی اپنے چیمبروں میں سو رہے تھے۔ پھر وہ کیوں جاگ گیا تھا؟ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا تھا تب اس کی نظر ایک اور خالی چیمبر پر گئی۔ اس نے دیکھا کہ فرش پر چیمبر کے پاس سے گیلے قدموں کے نشانات کاک پٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کاک پٹ کی طرف بڑھا، اسے پائلٹ کی سیٹ پر ایک عورت دکھائی دی۔ اس کے سرخی مائل بال نمایاں تھے۔ مارک کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”میکا...“

”ہاں، میرے محبوب۔“ عورت نے گنگنا کر کہا۔

”لیکن تم یہاں کیسے آئیں؟“ مارک نے کرسی اپنی طرف گھمائی۔ اب میکا اس کے سامنے تھی اس کی... حسین آنکھیں بند تھیں، اس نے پھر گنگنا کر کہا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں میں نے تمہیں بلایا ہے۔“ نیسکتے ہوئے میکا نے اچانک آنکھیں کھولیں تو مارک لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا، اس کی آنکھوں میں اندر تار یک خلا تھا۔ مارک لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سانس لینے

کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے سانس نہیں آرہی تھی۔ پھر کیچھ نے اس کی مدد کی، اس نے عقب سے اس کے سینے کے گرد ہاتھ ڈال کر اوپر کھینچا تو مارک کی سانس کی نالی میں چلا جانے والا پانی نکلنے لگا... وہ کھانس رہا تھا۔ باقی سب آس پاس موجود تھے اور ان میں بعض ہنس اور مسکرا رہے تھے۔ مارک کی حالت ٹھیک ہوئی تو وہ سوچنے لگا۔ تو یہ خواب تھا۔ کارن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے انکار کیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“

”تم نے پانی میں ہی نقاب اتار دیا تھا۔“ کیچھ نے کہا۔

”تم جاگ گئے تھے مگر شاید صورت حال سمجھ نہیں سکے تھے۔“

اس بار کارن نے اس کی طرف کافی کامگ بڑھایا۔

”اس سے تمہیں مدد ملے گی۔“

مارک نے گم لے لیا۔ ایک طرف سے فلیپس مکمل یونیفارم میں نمودار ہوا اور باقی سب کو ایسے ہی گھومتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”کیا پکنک کا ارادہ ہے؟“

”کمانڈر! ہم ابھی ستر دن بعد جاگے ہیں۔“ ریڈ نے احتجاج کیا۔

”اور ہمارے پاس صرف اڑتالیس گھنٹے ہیں ہمیں پھر ستر دن کے لیے سونا ہے۔ اگر واپس جانا ہے تو۔“ فلیپس نے سرد انداز میں کہا۔ ”اس لیے سب ڈریس اپ ہو کر اپنی ڈیوٹی پر آ جائیں۔“

”یس سر۔“ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

مددگار خود کار طریقے سے نیپچون کے گرد مدار قائم کر چکا تھا اور اب اس کے گرد گردش کر رہا تھا۔ مارک اپنے کیمین میں آیا اس نے سر ہانے لگی میکا کی تصویر دیکھی اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مارک نے اتنی بڑی دنیا میں اگر کسی سے محبت کی تھی تو وہ میکا تھی۔ حسین اور دلکش میکا جو اس کی بیوی اور اس کی زندگی تھی مگر اب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے تصویر کو ہاتھ لگایا اور باہر نکل آیا اس کے جسم پر بھی عملے والا لباس تھا۔ کاک پٹ میں تقریباً سب جمع تھے اور وہ نیپچون کو دیکھ رہے تھے، اس کی پانی جیسی نیلی سطح بالکل ہموار لگ رہی تھی۔

اینانے سحر زدہ لہجے میں کہا۔ ”خوب صورت ہے۔“

”جو پیٹر، سیٹرن اور یورینس کے مقابلے میں یہ کسی قدر کم ماس والا سیارہ ہے لیکن زمین سے سات گنا بڑا ہے۔“ مارک نے کہا۔ ”یوں سمجھ لو کہ یہ جیسے پھیلی ہوئی برف پر مشتمل ہے۔“

”کیا یہ اس کی سطح ہے؟“ ریڈ نے اشارہ کیا۔

”نہیں یہ بادل ہیں... ان کا سلسلہ دو ہزار کلومیٹر کی

بلندی سے شروع ہو جاتا ہے اور نیچے جاتے ہوئے بالآخر یہ سیارے کی سطح سے مل جاتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سطح اور کرہ ہوائی میں خاص فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ زمین پر ہے۔ اچانک ان کی توجہ گہرے رنگ کے ایک بہت بڑے مرغولے نما دائرے کی طرف گئی۔ یہ نیلے سے گہرے رنگ کا ہو رہا تھا اور اس کے وسط میں بالکل سیاہ ہو گیا تھا۔ اس میں کہیں کہیں لہریں اٹھ رہی تھیں اور اس کے نیچے رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ اس کے نیچے اور عقب میں کہیں کہیں سفید رنگ بھی جھلک رہا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ کیٹھ نے پوچھا۔

”یہ طوفان ہے، اسے عظیم سیاہ دھبہ کہتے ہیں جیسے جو بیڑ کی سطح پر عظیم سرخ دھبہ نامی طوفان ہے۔ جب سے یورنئس کو دور بینوں سے دیکھا گیا ہے یہ طوفان اسی طرح جاری ہے، اس کا سائر زمین کے کل رقبے سے بھی کہیں بڑا ہے اور اس میں ہواؤں کی رفتار آواز کی رفتار سے دو گنا زیادہ ہے۔ نظام شمسی کے کسی سیارے پر اتنی تیز ہوا میں نہیں چلتی ہیں۔“ مارک نے کہا۔ ”یہ طوفان ایک سیکنڈ میں اتنی توانائی خارج کر رہا ہے جتنی توانائی زمین پر آغاز سے اب تک آنے والے تمام طوفانوں نے بھی خارج نہیں کی ہوگی۔“

ایتانے جبر جبری لی۔ ”خوناک...“

”میکا اسی طوفان میں کہیں موجود ہے۔“

مارک کی بات پر سب نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

گریگ نے کہا۔ ”اس طوفان میں... یہ ناممکن ہے... اس میں کوئی مدار بھی قائم نہیں کیا جاسکتا۔“

”درست ہے۔“ مارک نے تسلیم کیا۔ ”لیکن یہ حقیقت ہے کہ میکا کے سگنل اسی طوفان سے آرہے ہیں اور اسی وجہ سے یہ مشن یہاں آیا ہے۔“

”مجھے اپنے جہاز کو اس طوفان میں لے جانا پڑے گا؟“ گریگ نے کہا۔ ”شاید ہم اس سے واپس نہ آسکیں۔“

”پھر کوئی ہمارے لیے آئے گا۔“ کارن ہنسا۔

”پلیز ایسی باتیں نہ کرو۔“ ایتانے گھبرا کر کہا۔

”تم موت سے ڈر رہی ہو۔“ کارن بہ دستور موڈ میں تھا۔ اس نے ایتانے کو دیکھا۔ ”مجھے کسی حسین لڑکی کے ہمراہ مرتے ہوئے بالکل ڈر نہیں لگے گا۔“

کیٹھ نے سوال کیا۔ ”میکا سے آخری رابطہ کب ہوا تھا؟“

”رابطہ ختم ہونے کے دو دن بعد یہاں سے آخری ٹرانسمیشن موصول ہوئی تھی۔“ مارک نے کہا اور جیب سے ایک چھوٹا سا ریکارڈر نکال کر اسے آن کیا۔ ”یہ مشکل سے دس سیکنڈ کی ہے۔“

مارک نے ہنسن دبا یا تو ریکارڈر سے انسانی شور اٹھا جسے بہت سے لوگ چلا رہے ہوں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا مگر آواز غیر نمایاں تھی۔ ”ایسا لگ رہا ہے کوئی بول رہا ہے ہمیں بچاؤ۔“

باقی سب نے بھی یہی سنا تھا۔ ریڈ نے پوچھا۔ ”میکا پر کتنے افراد کا حملہ تھا؟“

”انہیں افراد تھے اور وہ سب نہایت تجربے کار اور منجھے ہوئے افراد تھے۔“

”مشن کا مقصد کیا تھا؟“ گریگ نے سوال کیا۔

مارک چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ”نظام شمسی کے پاس کسی بلیک ہول کی تلاش اور اس کی مدد سے دور دراز فاصلوں تک سفر کرنا... یہ خلا کی جہاز اصل میں اسی مقصد کے تحت بنایا گیا تھا ورنہ مقامی تحقیق کے لیے اتنا بڑا جہاز بنانا ضروری نہیں تھا۔“

”دور دراز فاصلوں تک سفر کرنا؟“ گریگ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو مارک نے آس پاس نظر دوڑائی اور ایک طرف موجود رسالہ اٹھالیا۔ گریگ نے جلدی سے کہا۔ ”یہ میرا ہے۔“

رسالہ نظر نواز تصاویر پر مشتمل تھا۔ مارک نے اس کا درمیانی فل سائر پوسٹر والا صفحہ پھاڑا تو گریگ کراہا۔ ”یہ میری فیورٹ ماڈل ہے۔“

مارک نے صفحہ سامنے کیا اور اس کے دونوں سرے پھیلا کر بولا۔ ”یہ اسے پوائنٹ ہے اور یہ بی پوائنٹ ہے۔ اب ان دونوں کے درمیان اگر سفر کرنا ہو تو سب سے آسان طریقہ کیا ہوگا؟“

”سیدھ میں سفر کرنا۔“ ریڈ نے جواب دیا۔

”غلط جواب۔“ مارک نے پوسٹر کے دونوں سرے موڑے اور انہیں آپس میں ملا کر اس میں ہنسن پرودیا۔ ”خلا اس طرح تہ ہو جاتا ہے اور دیکھو دونوں سروں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔“

ایتانے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے بلیک ہول اسی طرح خلا کو آپس میں ملا دیتے ہیں؟“

”بالکل کیونکہ وہ عام مادے کے قوانین سے ماورا ہوتے ہیں۔ وہاں وقت صفر اور مادہ لامحدود ہو جاتا ہے۔ اس لیے بلیک ہول میں اپنے قوانین ہوتے ہیں۔“

”جہیں... جہیں میں کسی بلیک ہول کے پاس جانا پسند نہیں کروں گا۔“ کارن ہنسا۔ ”بلیک ہول بس ایک گڑھا ہے جو کبھی نہیں بھرتا، اس کا فاصلوں سے کیا تعلق؟“

”جدید فزکس کہتی ہے کہ تعلق ہے اور میکا اسی لیے بنایا

اور روانہ کیا گیا تھا۔

کارن پھر ہنسا۔ ”وہ نیچوں پر آ کر یہاں پھنس گیا۔۔۔ آخر کس احق نے اسے سوچا اور بنایا تھا؟“

مارک نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

”وہ احق تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“

کیٹھ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”یہ خلائی جہاز تم نے ڈیزائن کیا ہے؟“

مارک نے سر ہلایا۔ ”یہ میری ہی تصویر کی تصدیق کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ اسی لیے میں اس جہاز پر موجود ہوں۔“

”تم دیکھنے آئے ہو کہ تمہاری تصویر کا کیا حشر ہوا ہے؟“

گریک نے طنز کیا۔

”ہاں، یہ میری ذمہ داری ہے۔“ مارک نے سرد لہجہ میں کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں باتوں کے بجائے کام کرنا چاہیے۔“ فلپس نے مداخلت کی۔ ”ٹھیک بارہ گھنٹے بعد ہمیں میکا تک جانے کی کوشش کرنی ہے۔“

”کوشش؟“ کیٹھ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”ہاں کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے ہم اس کے پاس جا سکیں گے یا نہیں۔ وہ بہر حال کسی اچھی جگہ نہیں ہے۔“

انہوں نے نیچوں پر جاری طوفان کو دیکھا اور کمانڈر سے اتفاق کیا۔۔۔۔۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ کیٹھ باری باری سب کا معائنہ کر رہی تھی کہ اس طویل سفر اور خیند نے ان پر کوئی منفی اثر تو نہیں ڈالا ہے۔ مارک کی باری آئی تو اس نے آہستہ سے کہا۔

”اب مجھے یاد آ رہا ہے تمہاری بیوی۔۔۔“

”اس نے خودکشی کر لی تھی۔“ مارک نے آہستہ سے کہا۔

”میکا کی روانگی سے صرف ایک برس پہلے کی بات ہے میں اس وقت پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔“

”مجھے یاد ہے اور مجھے افسوس ہے۔“ کیٹھ نے کہا۔

”اس کی یاد میں تم نے خلائی جہاز کا نام میکا رکھا تھا۔“

مارک نے جواب نہیں دیا، صرف سر ہلایا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سب کچن کے ساتھ ڈائننگ میز پر جمع تھے۔ یہ ستر طویل دنوں بعد پہلا باقاعدہ کھانا تھا جو وہ کھا رہے تھے۔ مارک نے پاستا لیا تھا ساتھ میں کافی کا مگ تھا۔ اس مشن پر الکوحل کی اجازت نہیں تھی اور ان میں سے کوئی عادی بھی نہیں تھا، اس لیے وہ شراب کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ فلپس نے کہا۔

”مشن کے باقاعدہ آغاز سے پہلے سب کم سے کم چھ گھنٹے کا آرام کریں۔“

”اگر ہم نے میکا تلاش کر لیا تو اس میں کون کون

جائے گا؟“

”تین افراد جائیں گے اور پانچ پیچھے رہیں گے۔ جانے والوں کا فیصلہ روانگی سے دو گھنٹے پہلے کیا جائے گا۔“

جنہوں نے آرام کرنا تھا وہ کھانے کے بعد اپنے کیبنوں میں چلے گئے اور باقی اپنے کاموں میں لگ گئے۔

اینا اور کیٹھ مددگار پر رہیں اب باقی چھ مردوں میں سے کوئی تین جاتے۔ مارک بھی اپنے کیبن میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی جیبی ڈائری نکالی اور اب تک کے سفر کی روداد لکھنے لگا۔ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا میکا کے بعد اس نے شادی نہیں کی اور نہ کسی اور عورت سے تعلق رکھا۔ ان کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ بچپن میں ایک حادثے کے نتیجے میں میکا ہمیشہ کے لیے ماں بننے سے محروم ہو گئی تھی۔ ان کے جانے والے کہتے تھے کہ میکا نے اسی وجہ سے خودکشی کی تھی لیکن مارک جانتا تھا صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی۔ روداد لکھ کر اس نے ڈائری بند کی اور اپنی یونیفارم کی جیب میں رکھ لی۔ اس خلائی جہاز پر کوئی ذاتی جگہ نہیں تھی، یہ ڈائری صرف اس کے پاس محفوظ رہ سکتی تھی۔ چند گھنٹے بعد وہ باہر آیا تو کمانڈر فلپس اپنے کنسول پر مددگار کے مختلف حصوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ نیچوں کی فضا میں داخل ہونے سے پہلے اس کے تمام آلات کا مکمل ٹھیک ہونا اور کام کرنا لازمی تھا۔ مارک نے کہا۔

”نیچوں کی فضا میں کوئی غیر معمولی عنصر موجود نہیں ہے۔ یہاں پانی امونیا اور میتھین کی صورت میں ہے۔“

”لیکن درجہ حرارت خوفناک حد تک کم ہے۔“ فلپس نے کہا۔

”منفی دو سو اٹھارہ سینٹی گریڈ، اس پر پورا جہاز سپر کنڈیکٹر بن سکتا ہے۔“

”نہیں، یہ محفوظ رہے گا۔“ مارک نے اسے تسلی دی۔

وہ جانتا تھا مددگار بہت اچھا خلائی جہاز ہے، یہ توازن اور مضبوطی کے اصول پر بنایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ میکا جیسا بڑا مضبوط اور غیر معمولی نہیں تھا مگر اپنی تفکیری کے خلائی جہازوں میں سب سے بہتر ضرور تھا۔ فلپس نے سیارے کی طرف دیکھا۔

”حیرت کی بات ہے اتنے کم درجہ حرارت پر بھی یہ منجمد نہیں ہے۔“

”ہاں کیونکہ سیارے کے وسط کا درجہ حرارت پانچ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اندر سے اٹھنے والی گرمی اس کی اوپری سطح کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور اسی سے یہ طوفان وجود میں آیا ہے۔“

فلپس نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ڈاکٹر تمہارا کیا خیال

ہے میکا اس طوفان میں کیسے موجود اور برقرار ہے جب کہ یہاں ہوا کی رفتار آواز سے دو گنی ہے؟

”بہت تیز رفتار طوفان کے وسط میں ہے اور وہ ان سفید بادلوں میں کہیں ہے جو طوفان کے کنارے پر ہیں یا شاید اس کے کنارے سے بھی باہر ہیں۔“ مارک نے طوفان کے نیچے اشارہ کیا۔

روانگی سے دو گھنٹے پہلے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں پر آگئے اور اینا نے سب سے پہلے میکا سے براہ صلاتی رابطہ قائم کیا، اس کے کمپیوٹرز نے سگنل کا جواب دیا تھا۔ انہیں اسی سگنل کی مدد سے میکا تک جانا تھا۔ اینا نے ڈیٹا گریڈ کے سگنل پر منتقل کیا اور اس نے اس کا تجزیہ کر کے انہیں آگاہ کیا۔ ”میکا بادلوں کے اندر تقریباً دس کلومیٹر کی گہرائی میں موجود ہے۔“

”کیا وہ ساکت ہے؟“ فلیس نے سوال کیا۔

”بالکل ساکت ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ میک نے کہا۔

”ممکن ہے یہاں ہوا اتنی ہلکی ہو کہ میکا نے مدار قائم کر لیا ہو۔“ مارک نے وجہ پیش کی۔

”دو ہزار کلومیٹر نیچوں جیسے بڑے سیارے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ زمین پر چار سو کلومیٹر کی بلندی پر بھی مدار قائم ہو جاتا ہے یہاں ممکن نہیں ہے۔“ کیتھ نے اس کا خیال مسترد کر دیا۔

”وجہ کچھ بھی ہو ہمیں میکا تک رسائی حاصل کرنی ہے۔“ فلیس نے کہا۔ ”یاد رہے ہمارا مشن کسی قسم کی تحقیق نہیں بلکہ صرف یہ جاننا ہے کہ عملے کا کیا ہوا اور اگر ان میں سے کوئی زندہ ہے تو اس کی مدد کی جائے۔ یہ کام مکمل کر کے ہم واپسی کی راہ لیں اور اس کے لیے ہمارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں۔“

”میکا پر کون جائے گا؟“ گریگ نے پوچھا۔

”ریڈ، کارن اور میں۔“ فلیس نے کہا تو مارک آگے آیا۔

”میں بھی جاؤں گا۔“

”نہیں۔۔۔“

”کمانڈر! یہ جہاز میرا بتایا ہوا ہے اور اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔“

”اسی لیے تمہاری یہاں موجودگی لازمی ہے تم سب کی بھیجی ویڈیو دیکھو گے اور ہماری رہنمائی کرو گے۔ اگر تم جہاز پر گئے تو ہم تمہاری رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے، امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔“

بادل ناخواستہ مارک نے سر ہلایا۔ یہاں فلیس باس

تھا اور اس کا حکم ماننا لازمی تھا۔ گریگ نے اعلان کیا۔ ”ایک گھنٹا چالیس منٹ بعد ہم مدار سے اترنا شروع کر دیں گے۔“ مددگار نیچوں کے گرد اپنا چکر دو گھنٹے میں مکمل کر رہا تھا۔ ریڈ اور کارن تیاری کرنے لگے۔ وہ آلات چیک کر رہے تھے اور پریشاں ڈسوت جانچ کر دیکھ رہے تھے جنہیں ہمکن کر وہ میکا میں جاتے۔ روانگی سے ایک منٹ پہلے گریگ نے خبردار کیا۔ ”سب سیٹ بیلٹ باندھ لیں اور ہوشیار رہیں۔“

جیسے ہی وہ مقررہ جگہ پہنچے اس نے مددگار کے راکٹ انجن چلائے اور وہ مدار سے ہٹ کر سیاہ دھبے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک منٹ میں انجنوں نے اسے نیچے کی طرف دھکیل دیا تھا۔ چند منٹ پہلے مکمل طور پر ساکت مددگار نے اب لرزنا اور جھٹکے لینا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے وہ سیاہ دھبے کے پاس ہو رہے تھے اس کی حرارت براہٹ بڑھ رہی تھی۔ اینا نے کہا۔ ”یہاں کرہ ہوائی موجود ہے۔ وہ مزاحمت کر رہا ہے۔“

”مددگار اسی وجہ سے لرز رہا ہے۔“ گریگ بولا۔ وہ حرول کی مدد سے پرواز کو قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وہ سیاہ دھبے کے کنارے کے پاس تھے۔ اینا مسلسل میکا کو سگنل بھیج کر اس کا جائے وقوع دیکھ رہی تھی۔ اس نے اعلان کیا۔ ”وہ سو کلومیٹر ز دور ہے۔“

نیچے جاتے ہوئے مددگار کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ گریگ اسے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر یہ رفتار ایک حد سے بڑھ جاتی تو وہ راکٹ چلا کر بھی اسے قابو نہیں کر سکتا تھا اور نتیجے میں مددگار سیارے پر جا گرتا۔ اینا مسلسل فاصلہ بتا رہی تھی۔ ”پچاس کلومیٹر۔۔۔ تیس کلومیٹر۔۔۔ دس کلومیٹر۔۔۔“

”ایک راکٹ چلاؤ۔“ فلیس نے حکم دیا۔ گریگ نے حکم کی تعمیل کی اور مددگار کی رفتار کم ہونے لگی۔ اب وہ میکا سے دو کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر تھا مگر یہاں سوائے سفید بادلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ مارک فلیس کے پیچھے تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ ناممکن ہے۔۔۔ وہ ہے تو نظر کیوں نہیں آ رہا۔“

”ایک ہزار میٹر۔۔۔“ اینا بولی۔ ”پانچ سو میٹر۔۔۔“

”تینوں راکٹ چلاؤ۔“ فلیس چلا یا۔ جھٹکے بڑھ گئے تھے۔ گریگ نے اپنے راکٹ چلائے اور یک دم مددگار کی رفتار میں بہت زیادہ کمی آگئی اور پھر دھند چھٹی تو ان کے سامنے عظیم الجثہ میکا نمودار ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ گریگ نے راکٹ بند کئے تو مددگار یوں ساکت ہو گیا جیسے وہ کسی مدار میں ہو حالانکہ وہ کسی مدار میں نہیں تھا۔ یہاں

چاروں طرف دھندھی اور اس کے پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔
میکا کی چند ایک لائٹس ہی روشن تھیں۔ اینا میکا کا تجزیہ کرنے
لگی۔ اس نے کہا۔

”اس کا انجن بند ہے... لیکن برقی نظام کام کر رہا
ہے... اندر مصنوعی کشش پیدا کرنے والا نظام اور حرارت
پیدا کرنے والا نظام بھی بند ہے۔“

اسکرین پر پورے جہاز کا خاکہ آ رہا تھا لیکن اس میں
کہیں کوئی زندہ جسم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فلپس نے کہا۔
”ایسا لگ رہا ہے یہاں کوئی زندہ جسم نہیں ہے۔“

گریگ نے آہستہ سے کہا۔ ”سات سال بعد اس کی
توقع بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔“

”اس کے برعکس اس جہاز میں کوئی شخص ساری عمر بھی
گزار سکتا ہے۔“ مارک نے کہا۔ ”اسے اسی لحاظ سے ڈیزائن
کیا گیا ہے۔“

”مگر اس کا عملہ یہاں چند دن سے زیادہ نہیں رہ
سکا۔“ کارن نے طنز کیا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے مارک پسند نہیں
آیا تھا۔ گریگ گیس فائر کی مدد سے مددگار کو میکا کے گرد گھما رہا
تھا۔ اس نے ایک گول دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا خیال ہے یہ داخل ہونے کا راستہ ہے۔“
”مددگار کو اس سے منسلک کرو۔“ فلپس نے حکم دیا۔

گریگ اپنے جہاز کو میکا کی سیدھ میں لے آیا۔ اس سے دو
آہنی بازو نکلے اور انہوں نے دروازے کے دائیں بائیں نکلی
دوراڈز کو پکڑ لیا اب مددگار میکا سے جڑ گیا تھا۔ پھر مددگار کے
نیچے سے ایک لمبا پل نکل کر میکا کے دروازے تک گیا۔ اس
کے دونوں طرف ریٹنگ لگی تھی۔ فلپس اٹھا تو مارک نے ایک
بار پھر اس سے ساتھ چلنے کی درخواست کی مگر اس نے پھر انکار
کیا۔ ”تمہاری یہاں ضرورت ہے اس لیے تم یہیں رہو
گے۔“

چند منٹ بعد فلپس، ریڈ اور کارن پریشراڈ سوٹ
پہن رہے تھے۔ سوٹ پہن کر وہ باہر نکلنے والے انر لاک
خانے میں آئے اور اس کے اندر آنے کے بعد انہوں نے
بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اگر انہوں نے ہینڈل نہ پکڑا ہوتا تو
ہوا انہیں کھینچ لے جاتی۔ وہ پل کی ریٹنگ پکڑ کر آگے بڑھنے
لگے۔ ان کے پیچھے مددگار کا دروازہ بند ہو گیا۔ ایک منٹ سے
بھی پہلے وہ میکا کے دروازے کے سامنے تھے۔ انہوں نے
ہینڈل کے ذریعے اس کا دروازہ کھولا۔ ہوا کا جھکڑ باہر آیا اور پھر
وہ اندر گئے۔ خانہ بند کر کے انہوں نے میکا کے اندر جانے
والا دروازہ کھولا۔ وہ جہاز کے وسطی حصے میں داخل ہوئے

تھے۔ یہ ایک طویل اور عظیم الجثہ راہداری کی طرح تھا جو جہاز
کے اگلے اور پچھلے حصے کو ملا رہی تھی۔ عقبی حصہ کارگو اور انجن پر
مشتمل تھا۔ جب کہ اگلا حصہ کنٹرول، رسد اور رہائش کے لیے
تھا۔ فلپس نے ریڈ سے کہا۔

”تم میرے ساتھ چلو اور کارن تم اگلے حصے میں جاؤ گے۔“
کارن نے سر ہلایا اور اس طرف بڑھ گیا۔ وہاں ہر

طرف اوزار اور مختلف چیزیں تیر رہی تھیں۔ اگر ان کے
جوتوں میں مقناطیس نہ لگے ہوتے تو وہ بھی تیر رہے ہوتے۔
عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے فلپس کی نظر دونوں طرف
لگے کچھ الیکٹرانکس آلات پر گئی۔ اس نے سوٹ کے کمرے

کارخ ان کی طرف کر کے مارک سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہیں؟“

”یہ جیٹ بم ہیں ان کی مدد سے ایک منٹ میں اس
راہداری کو تباہ کر کے میکا کے دونوں حصوں کو الگ کیا جاسکتا ہے۔“
”کیا اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟“

”بالکل... اگر میکا کا انجن بے قابو ہو جائے تو اس کی
ضرورت پڑے گی۔“

”میکا کا انجن؟“ فلپس نے سوالیہ انداز میں کہا۔
”ابھی تم دیکھ لو گے۔“ مارک نے کہا۔ فلپس اور ریڈ

ایک چھوٹی سی سرنگ کے سامنے پہنچے۔ اس کا دروازہ ان کے
سامنے خود بہ خود کھل گیا وہ اندر داخل ہوئے تو خود بہ خود بند ہو

گیا۔ سرنگ میں میٹرز سے زیادہ طویل تھی۔ وہ اس کے
دوسرے سرے تک پہنچے تو یہاں کا دروازہ بھی خود بہ خود کھل

گیا۔ فلپس نے اندر جانے سے پہلے اس کا لاک ہینڈل کھینچ
لیا، اب یہ مستقل کھلا رہتا۔ وہ اندر آئے تو انہیں ایک چاروں

طرف سے اندرونی حصے جیسا گول کمرہ نظر آیا۔ اس میں
چاروں طرف آہنی پنپوں کے درمیان ابھرے ہوئے

سلینڈرز جیسی چیزیں لگی تھیں اور کمرے کے وسط میں ایک
سیاہ گیند تھی جس کے اوپر تین گھومتے رنگ تھے اور یہ گیند معلق

تھی۔ رنگ کے کناروں پر تیز سفید رنگ کی روشنیاں جل رہی
تھیں۔ فلپس دنگ رہ گیا اس نے بے ساختہ کہا۔

”یہ بلیک ہول ہے؟“
”ہاں ایک مصنوعی بلیک ہول، یہ میری ایجاد ہے اور

یہی اس جہاز کا انجن ہے۔ تم جانتے ہو کائنات میں بلیک ہول
سے زیادہ طاقتور چیز اور کوئی نہیں ہے۔“

”کیا یہ بند ہے؟“
”یہ بھی بند نہیں ہوتا مسلسل کام کرتا رہتا ہے اور

لامحدود توانائی پیدا کرتا ہے۔“ مارک نے کہا۔
”یہ اس کے گرد رنگ کیسے گھوم رہے ہیں؟“

”یہ اس کا متناطیسی میدان بناتے ہیں اور اسے قابو میں رکھتے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو یہ بلیک ہول سیکنڈ کے کروڑوں حصے میں اس پورے جہاز کو اپنے اندر سمو لے گا۔“

ریڈ گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ بلیک ہول کے نیچے پانی سے بھرا ہوا تالاب تھا۔ یہاں دیواروں کے درمیان رخنے تھے۔ ریڈ نے پوچھا۔ ”یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”قطعی نہیں... کوئی بھی اس کے پاس جاسکتا ہے اسے چھو سکتا ہے۔“ مارک نے جواب دیا۔ وہ مددگار کے کاک پٹ میں موجود تھا۔ گریگ، میک، اینا اور کیٹھ اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب کی کیمروں کی ویڈیو دیکھ رہے تھے۔ کارن میکا کے تاریک کنٹرول روم میں پہنچ گیا تھا، وہ مارچ کی روشنی میں سب دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔

”یہاں کوئی نہیں ہے۔“ سوٹ میں لگی مارچ کی روشنی کنٹرول مینل پر گئی تو اس پر لگا خون کا داغ نمایاں نظر آیا۔ اس نے اسے دستانے سے چھو کر دیکھا۔ ”یہ خون ہے۔“

”جہاز کا سسٹم شیر کرو۔“ اینا نے کہا تو کارن مرکزی مینل کی طرف آیا۔ یہ سارا جدید ترین ٹیچ مینل تھا، اس میں کہیں کوئی بٹن یا ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے عملی طور پر دبایا جاتا۔ اس نے ایک چھوٹی اسکرین سے یہاں کا سسٹم آن کیا۔ بڑی اسکرین آن ہوتے ہی اس نے سسٹم شیر کر دیا اور اب اینا اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے میکا کی پاور آن کی۔ اس کی بیٹریز سات سال میں بھی بہترین حالت میں تھیں۔ دو منٹ میں میکا کی برقی طاقت مکمل طور پر کام کرنے لگی تھی اور اس کی اندر اور باہر کی تمام روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ اب اینا اس کی اندرونی فضا کا دباؤ، مصنوعی کشش اور آکسیجن کے نظام کو بحال کر رہی تھی۔ فلپس اور ریڈ انجن والے حصے کا معائنہ کر کے اب اگلے حصے کی طرف آ رہے تھے۔ یہاں کارن کنٹرول روم کا معائنہ کر رہا تھا اور وہاں خاصا خوفناک منظر تھا، دیواروں پر جا بہ جا خون اور گوشت کے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔ کارن نے کہا۔

”میرے خدا، یہاں کیا ہوا ہے کوئی قتل عام... یا کوئی ایلین اندر گھس آیا تھا؟“

اب تک انہیں نہ تو کوئی زخمی انسان ملا تھا اور نہ ہی کوئی لاش دکھائی دی تھی۔ فلپس اور ریڈ اندر داخل ہوئے۔ ریڈ ذرا پیچھے رک گیا، ایسا لگا جیسے اس نے کوئی آواز سنی ہو۔ اس نے سر جھٹکا۔ آواز ایک راہداری سے آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے اس کے سوٹ سے لگا ہوا کیمرہ بند ہو گیا۔ گریگ نے اسے پکارا۔ ”ریڈ! پتا

کیمرہ چیک کرو یہ آف ہو گیا ہے۔“

ریڈ کو پتا نہیں چلا کیونکہ اسے گریگ کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ کیمرے کے ساتھ ریڈیو نے بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ آواز اسے جانی پہچانی لگی تھی۔ اسے سن کر اسے اپنا بچپن کا دوست جیف یاد آ گیا تھا۔ جیف جواب بھی اس کا دوست تھا لیکن اب وہ عام انسانوں کی دنیا سے کٹ گیا تھا۔ وہ گزشتہ دس سال سے ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل تھا۔ اس نے حد سے زیادہ منشیات استعمال کی تھی جس نے اس کا ذہن ہمیشہ کے لیے ماؤف کر دیا تھا۔ وہ، سارہ اور ریڈ اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ اسکول کے بعد یہ دوستی کسی حد تک تبدیل ہوئی تھی۔ اب سارہ ریڈ کی بیوی تھی۔ ریڈ نے راہداری میں آگے جاتے ہوئے آواز دی۔ ”جیف! یہ تم ہو؟“

”ہاں۔“ جیف کی آواز آئی۔ ریڈ نے جھانک کر دیکھا مگر یہ جگہ خالی تھی پھر اسے لگا کہ کھڑکی کے پاس کوئی تھا مگر وہ خلائی جہاز کے اندر نہیں بلکہ باہر تھا۔ شیشے سے رہ رہ کر روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کے سامنے پہنچا اور جب اس نے باہر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

☆☆☆

ریڈ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ گریگ نے فوراً فلپس اور کارن کو خبردار کیا۔ وہ پلٹ کر کنٹرول روم کے داخلی حصے کی طرف آئے یہاں سے کئی راہداریاں میکا کے مختلف حصوں میں جا رہی تھیں۔ فلپس نے کارن کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود دوسری طرف بڑھ گیا۔ وہ ریڈ کو آواز دے رہے تھے مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ فلپس ایک راہداری میں مڑا تو اسے ریڈ نظر آیا، وہ اس طرف موجود ایک شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ فلپس نے اسے پکارا تو اس نے سر موڑ کر دیکھا اور اشارے سے کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کہا۔ فلپس آگے آیا۔ کھڑکی کے باہر اسے سفید بادلوں میں ایک لہری مچلتی نظر آئی۔ اس نے تشویش سے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“

ریڈ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ ساکت کھڑا تھا۔ اسی لمحے وہ مچلتی چیز ٹپ کر میکا کی طرف آئی۔ ایک کڑا کا ہوا اور یوں لگا جیسے میکا ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔ فلپس کھڑکی سے ذرا دور تھا پھر بھی وہ جھٹکے سے پیچھے گیا تھا۔ ریڈ تو اڑ کر دور جا گرا تھا۔ چاروں طرف چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ فلپس نے چلا کر گریگ سے پوچھا۔ ”وہاں سب ٹھیک ہے؟“

مگر اس طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا، ریڈ یو کام

غور سے پڑھیں کہیں آپ بھی تبخیر معدہ گیس ٹریبل کے شکار تو نہیں؟

بد ہضمی۔ پیٹ کا بڑا ہو جانا۔ دل کی گھبراہٹ
دماغ کی بے چینی۔ سر کو چکر۔ قبض کی پرالیم۔
جسم کی تھکاوٹ۔ جوڑوں کا درد۔ سینے میں
جلن اور خوراک کا ہضم نہ ہونا۔ طبیعت کا ہر
وقت مایوس رہنا۔ زندگی سے بیزاری چہرے
کا بے رونق ہو جانا اور وزن کا بڑھ جانا یہ
سب تبخیر معدہ گیس ٹریبل ہی کی تو علامات ہیں
شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ اگر آپ بھی
تبخیر معدہ گیس ٹریبل کے شکار ہوں تو آج ہی
فون پر رابطہ کریں۔ گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک
ایسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں والا ہم
سے تبخیر معدہ گیس ٹریبل کورس منگوا لیں۔

دارالشفاء المدنی

ضلع حافظ آباد پاکستان

0333-1647663

0301-8149979

اوقات رابطہ

صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

نہیں کر رہا تھا۔ فلیپس ریڈ کی طرف بڑھا جو ساکت پڑا تھا۔
اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، پودیر بعد وہ مددگار کے طبی امداد
کے پونٹ میں میز پر اسی طرح ساکت پڑا تھا اور کیچھ مارچ
کی روشنی اس کی آنکھوں میں ڈال کر معائنہ کر رہی تھی۔ میک
اس کے ساتھ تھا۔ اس نے طبی معاون کا کورس کر رکھا تھا اور کسی
ہنگامی صورت حال میں وہ کیچھ کا اسسٹنٹ بن جاتا تھا۔ کیچھ
نے مارچ بند کی تو اس نے پوچھا۔ ”یہ ہوش میں ہے؟“

”بہ ظاہر۔“ کیچھ بولی۔ ”پتلیاں بھی رد عمل دے رہی
ہیں لیکن ایسا لگ رہا ہے اسے اس پاس کا احساس نہیں ہے۔“
”یعنی یہ ٹرائس میں ہے؟“ میک نے سوچتے ہوئے
کہا۔ ”جسٹانی حالت کیسی ہے؟“

”بہترین ہے کسی جگہ زخم یا اندرونی چوٹ کا نشان
نہیں ہے۔“ کیچھ نے کہا۔ ”الیکٹرک شاک کی علامات بھی
نہیں ہیں۔“

اس وقت فلیپس کا کپٹ میں تھا جہاں بجلی جیسی لہر
آنے کے بعد آلات سے چنگار پاں نکلی تھیں اور ان کا رابطہ
میکا سے ٹوٹ گیا تھا۔ نیٹ ورک ختم ہو گیا تھا اور ایٹا کو اسے
پھر سے تھکیل دینا پڑا تھا، تب کہیں جا کر رابطہ بحال ہوا اور
اب وہ میک کے اندر کی مصنوعی کشش اور ماحول بحال کر رہی
تھی۔ فلیپس نے مارک سے پوچھا۔ ”تم بتا سکتے ہو یہ کیا تھا؟“
اس نے نلی میں سر ہلایا۔ ”یہ چیز میرے لیے بھی اجنبی ہے۔“
”کیا یہی چیز بادلوں کے اندر نہیں چمک رہی
ہے؟“ کارن نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے یہ بجلی ہے۔“
”یہ بجلی نہیں ہے کیونکہ میکا یا مددگار پر کرنٹ کے کوئی
آثار نہیں ملے ہیں۔“ ایٹا نے کی بورڈ پر اٹھکیاں چلاتے
ہوئے کہا۔

”تب نیٹ ورک کیسے ختم ہو گیا؟“

”اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ میک وہاں آگیا۔ ”کیچھ کا

کہنا ہے الیکٹرک شاک کا کوئی نشان نہیں ملا ہے۔“

”ریڈ کی حالت کیسی ہے؟“

”وہ ٹرائس میں لگ رہا ہے، ویسے جسٹانی اور ذہنی

لحاظ سے ٹھیک ہے۔“

”میں میکا کا مکمل سسٹم ایکٹیو ویت کرنے جا رہی

ہوں۔“ ایٹا نے کہا۔ ”اس میں پانچ منٹ لگ سکتے ہیں۔“

مارک میکا سے کی جانے والی آخری ٹرانسمیشن کی

ریکارڈنگ سن رہا تھا، مگر یک اس کے پاس تھا۔ اس نے

مارک سے ریکارڈز لے کر غور سے سنا اور بولا۔ ”اب میں کچھ

”بالکل ممکن ہے۔“ مارک نے عتیقی جیسے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے اس کے انجن کا اشارت ہونا لازمی ہے۔“

”انجن ٹھیک ہے؟“

”یہ دیکھنا پڑے گا۔“ مارک بولا۔

وہ انجن والے کمرے میں آئے۔ ساری روشنیاں آن ہونے کے بعد وہاں سب واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مارک نے وہاں لگے چھوٹے سے کنٹرول ٹینل پر چند بٹن دبائے مگر کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ اس نے فلیپس سے کہا۔ ”ممکنہ طور پر کسی سرکٹ میں خرابی ہے اس لیے انجن اشارت نہیں ہو رہا ہے۔“

☆☆☆

کیچہ ریڈ کے پاس تھی۔ وہ اب تک ساکت تھا۔ کیچہ ٹہل رہی تھی۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی بچہ ہنسا ہو۔ وہ چونک گئی اس نے اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی۔ وہاں ایک میز پر قرنطینہ باکس لگا ہوا تھا۔ شفاف پلاسٹک کے باکس پر ریٹھی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ کیچہ کو لگا جیسے اس باکس میں کوئی ہوا ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر کھینچ لی۔ پھر وہ تڑپ گئی۔ اندر ایڈم بیٹھا ہوا تھا اس کا اکلوتا بیٹا... اس کے ہاتھوں پر نلکیاں لگی تھیں اور اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے۔ ان زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ ایڈم نے اس کی طرف دیکھا اور دکھی لہجے میں بولا۔ ”مام... میرے پاؤں۔“

”ایڈم۔“ کیچہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس نے چونک کر دیکھا وہ گریگ تھا۔ ”میں اتنی دیر سے تمہیں کال کر رہا تھا تم جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں؟“

”یہاں ایڈم...“ کیچہ نے کہتے ہوئے باکس کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھا۔

”کیا ایڈم...“ گریگ نے زری سے کہا۔

”یہاں ایڈم تھا میں نے خود اسے دیکھا تھا۔“

گریگ نے اس کا شانہ تھاما۔ ”کیچہ! میری بات سنو... ایڈم اس دنیا میں نہیں ہے۔“

کیچہ جانتی تھی لیکن وہ اس بات کو اپنا وہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی، اس نے خود ایڈم کو دیکھا تھا۔ وہ ایڈم جو کینسر کے ہاتھوں صرف آٹھ سال کی عمر میں دنیا سے گزر گیا تھا۔ اسکیٹ بورڈ سے گرنے کے بعد اس کے گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی جو بگڑ کر کینسر بن گئی۔ کیچہ مصروف تھی۔ وہ نئی نئی ناسا کی جاب پر آئی تھی اور بعض اوقات اسے کئی کئی دن گھر جانے کا

گیا وہ کیا کہہ رہے تھے؟“

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”وہ کہہ رہے تھے خود کو بچاؤ... وہ اپنی نہیں یہاں آنے والے دوسرے لوگوں کی بات کر رہے تھے۔“

اسکرین پر میکا کا سسٹم آن ہونے کا عمل گراٹک کی صورت میں نظر آ رہا تھا پانچ منٹ پورے ہوتے ہی میکا کا سسٹم آن ہو گیا اور پھر کمپیوٹر نے بتایا کہ میکا کا مصنوعی کشش اور آکسیجن کی فراہمی کا نظام کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ میکا کے عملے پر کیا گزری تھی اس کا پتا صرف اس کے مرکزی کمپیوٹر میں موجود ڈیٹا سے لگایا جاسکتا تھا۔ یہ ڈیٹا یہاں مددگار میں شیئر نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے لیے دوبارہ میکا کے کنٹرول روم تک جانا لازمی تھا۔ وہ پھر تیاری کرنے لگے۔ گریگ اپنی نشست پر مددگار کے آلات کا جائزہ لے رہا تھا، اس نے فلیپس کو پکار کر کہا۔ ”کمانڈا یہاں ایک مسئلہ ہے۔“

”کیا ہوا؟“ فلیپس نے پوچھا۔

”نچلے حصے میں کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔“

وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ مارک فلیپس کے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ”میں بھی جاؤں گا۔“

فلیپس نے پریشاں سوت پھینتے ہوئے کہا۔

”سوائے گریگ، کیچہ اور اینا کے سب چلیں گے۔“

مارک نے دیکھا۔ سب سوٹ پہن رہے تھے۔ مارک نے اپنے لیے سوٹ نکالا۔ وہ مددگار سے باہر آئے۔ مسئلہ فوراً سامنے آ گیا تھا، مددگار کے نچلے حصے میں چادر پھٹ گئی تھی اور اس سے گیس خارج ہو رہی تھی۔ تارکٹ گئے تھے اور ایک پائپ پھٹ گیا تھا۔ فلیپس پریشان ہو گیا، اس نے کارن سے کہا۔ ”ہمارے پاس جیس گھنٹے ہیں اس دوران میں لازمی طور پر اس کی مرمت کرنی ہے۔“

کارن نے ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لیا۔ ”مشکل ہے کمانڈر اس کے لیے کم سے کم تیس گھنٹے کا وقت درکار ہے۔“

”جیس گھنٹے۔“ فلیپس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پھر ہمیں روانہ ہونا ہے۔ میکا تم اور کارن مل کر یہ کام کر دو گے۔ مارک تم میرے ساتھ آؤ۔“

وہ ہل سے گزرتے ہوئے میکا تک آئے اور اس کے اندر داخل ہو گئے۔ فلیپس نے اپنے دستی کمپیوٹر سے وہاں کی ہوا اور دباؤ کا جائزہ لیا اور اسے نارمل پا کر اپنا ہڈ اتار دیا۔ مارک نے بھی ہڈ اتار دیا تھا۔ ہوا اور دباؤ کو نارمل پا کر انہوں نے سوٹ اتارے۔ فلیپس نے کہا۔ ”کیا اس جہاز کو واپس لے جانا ممکن ہے؟“

موقع نہیں ملتا تھا۔ جب تک پتا چلا کینسر اس کے جسم میں پھیل چکا تھا اور پھر وہ بچ نہیں سکا۔ اچانک عقب میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ مددگار کی روشنیاں ایک لمحے کو بند ہوئیں اور پھر آن ہو گئیں۔ وہ دونوں تیزی سے ریڈ کی طرف آئے جو لیٹے لیٹے لرز رہا تھا۔ کیٹھ نے انجکشن تیار کرتے ہوئے گریگ سے کہا۔ ”اے پکڑو۔“

گریگ اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک ریڈ نے اٹھتے ہوئے گریگ کا سر تھام لیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”وہ میرے اندر ہے۔“

”کون؟“

”وہ جو مجھے آئینہ دکھا رہا ہے۔“

”کون؟“ گریگ نے پھر پوچھا۔

”اس نے مجھے سارہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا، وہ سارہ سے محبت کرتا تھا۔“ ریڈ نے کہا اور بے دم سا ہو کر واپس گر گیا۔ کیٹھ اسے انجکشن لگاتے لگاتے رک گئی۔ اس نے ریڈ کی نبض اور آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں اور تشویش سے بولی۔

”یہ واپس اسی کنڈیشن میں چلا گیا ہے۔“

”پتا نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔“ گریگ نے کہا۔

”یہاں کچھ ہے، میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے ایڈم کو ہی دیکھا تھا۔“

گریگ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اس کا شانہ تھپکا اور واپس کاک پٹ کی طرف چلا گیا۔ کیٹھ پھر مضطرب انداز میں ٹپٹنے لگی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر وہی منظر آ رہا تھا جب اس نے ایڈم کو قریطینہ باکس میں دیکھا تھا۔ وہ ہر بار ریڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھتی تھی اور ایک بار جب اس نے ریڈ کی طرف دیکھا تو وہ اسے بیڈ پر نظر نہیں آیا۔

☆☆☆

مارک اور فلپس انجن روم میں تھے۔ فلپس نے پوچھا۔ ”خرابی کہاں ہو سکتی ہے؟“

”بلیک ہول کو قابو کرنے والا سسٹم ہزاروں سپر کمپیوٹرز پر سیرسز کی مدد سے کام کرتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی کام نہ کرے تو انجن کام نہیں کرتا ہے۔ مجھے اندر جا کر دیکھنا ہو گا۔“ مارک نے ایک طرف خانے میں موجود ٹول کٹ نکالی اور پھر کنٹرول مشین پر چند من دبائے تو ایک طرف چوکور خانہ کھل گیا۔ مارک نے کہا۔ ”تم یہیں رکو۔۔ کوئی مسئلہ ہوا تو میں تمہیں آواز دوں گا۔“

مارک اس چوکور راہداری میں داخل ہوا جو تین فٹ اونچی اور اتنی ہی چوڑی تھی۔ اس کی دیواروں سے ہلکی سی

روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دیواروں پر پروسیسرز تھے۔ وہ اس میں چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اندر سے راہداریاں بہت طویل تھیں اور یہ انجن روم کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہر راہداری میں جھانک رہا تھا۔ اگر کوئی پروسیسر کام کرنا چھوڑ دیتا تو جہاں وہ لگا ہوتا دیوار کی روشنی بند ہو جاتی۔ بالآخر ایک راہداری میں اسے خرابی نظر آ گئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ پروسیسر کی شیٹ سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے کھینچ کر اسے باہر نکالا اور چھوٹے سے کٹر سے اس کے تار کاٹ دیے۔ پھر اس نے ساتھ رکھا ہوا متبادل پروسیسر نکال کر فٹ کیا اور خانہ بند کیا تو اس کی دیوار بھی روشن ہو گئی تھی۔ اسی لمحے مارک کو قریب سے کسی کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔

”میکا۔۔۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”میرے محبوب۔“ میکا کی گنگنائی آواز آئی۔

”یہ ناممکن ہے۔“

”یہاں سب ممکن ہے۔“ میکا اسی انداز میں بولی۔

”تم بھول رہے ہو یہ میکا ہے۔“

اچانک ہی وہاں تاریکی چھا گئی۔ مارک نے جیبی تارچ نکال کر روشن کی۔ وہ دونوں طرف روشنی گھما کر دیکھ رہا تھا، اس نے میکا کو پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

☆☆☆

کیٹھ نے گریگ کو اطلاع دی۔ ”ریڈ غائب ہے۔“

”کہاں گیا؟“

”پتا نہیں، میں اسے تلاش کر رہی ہوں۔“ کیٹھ کہتے

ہوئے راہداری میں آئی تو اسے ریڈ لفٹ میں دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف لپکی لیکن اتنی دیر میں لفٹ نیچے جا چکی تھی۔ اس نے سیز حیاں اترتے ہوئے گریگ کو بتایا کہ ریڈ نیچے گیا تھا۔ وہ نیچے پہنچی تو انٹر لاک خانے کا دروازہ بند ہو رہا تھا ریڈ دوسری طرف دکھائی دے رہا تھا۔ کیٹھ نے چیخ کر ریڈ کو آواز دی مگر اس نے نہیں سنا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کیٹھ نے لپک کر اسے کھولنے والا بٹن دبایا مگر اس نے کام نہیں کیا۔ ریڈ نے اسے اندر سے لاک کر دیا تھا۔ کیٹھ نے اسے آواز دی۔ ”تم سن رہے ہونا پلیز۔۔۔ دروازہ کھولو۔“

”ریڈ کہاں ہے؟“ گریگ نے ریڈ پر پوچھا۔

”وہ انٹر لاک جمیمر میں چلا گیا ہے۔“ کیٹھ بولی اور

اس نے دوبارہ ریڈ سے التجا کی۔ ”بیٹے دروازہ کھول دو۔“

ریڈ اس کی طرف مڑا۔ ”نہیں۔۔۔ وہ میرے اندر ہے۔“

”کون اندر ہے؟“

”وہ جو مجھے آئینہ دکھا رہا ہے۔“ ریڈ نے کہا۔

اسی اثنا میں گریگ اور اینا بھی آگئے۔ اینا نے تیزی سے دروازے کے مثل کو چیک کیا اور اس کا لاک کھولنے لگی۔ کیچھ نے پوچھا۔ ”کتنی دیر لگے گی؟“

”کم سے کم پانچ منٹ۔“ اینا نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ گریگ نے فلپس سے رابطہ کر کے اسے صورت حال بتائی، اس نے کہا۔

”اسے روکنے کی کوشش کرؤ میں آ رہا ہوں۔“

”اسے باتوں میں لگاؤ۔“ گریگ نے کیچھ کو اشارہ کیا۔

”ریڈ بیٹے میری بات سنو۔۔۔ اگر تم نے ائر لاک کا باہر کا دروازہ کھول دیا تو تم مر جاؤ گے۔“

”مجھے مر جانا چاہیے۔“ اس نے کہا۔

”نہیں تمہاری بیوی ہے، وہ تمہارے پہلے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

”وہ بچہ بھی اپنے باپ کو نہیں دیکھ سکے گا۔“

”اگر تم زندہ رہے تو اسے دیکھو گے۔“ کیچھ نے اسے امید دلائی۔ ”پلیز دروازہ کھول دو۔“

ریڈ کا ہاتھ دروازہ کھولنے والے سبز بٹن کی طرف بڑھا لیکن اس نے اچانک سبز کے بجائے سرخ بٹن دبا دیا جو باہر کا دروازہ کھولتا تھا۔ مشینی آواز نے بتایا کہ دروازہ ایک منٹ میں کھل جائے گا۔ کیچھ چلانے لگی تھی۔ وہ اینا سے جلدی یہاں کا دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھی۔ ان کی چیخ و پکار پر اچانک ریڈ جیسے ہوش میں آ گیا، اس نے آس پاس دیکھا اور بولا۔

”میں یہاں کیوں ہوں۔۔۔؟“ پھر اس نے ائر لاک کھلنے کا اشارہ دینے والی روشنی دیکھی اور چلا یا۔ ”یہ ائر لاک کس نے آن کیا مجھے یہاں سے نکالو۔“

”یہ تم نے آن کیا ہے۔“ کیچھ بولی، وہ روہا سی ہو رہی تھی۔

فلپس کی آواز آئی۔ ”خود کو قابو میں رکھو میں آ رہا ہوں۔“

”میں مر جاؤں گا۔“ ریڈ ہراساں ہو گیا۔ ”مجھے نہیں یاد میں نے کب ایسا کیا۔“

”تم فکر مت کرو ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔“ گریگ نے اسے تسلی دی۔ اسی لمحے ائر لاک کا دروازہ کھلنے لگا۔ کیچھ نے چیخ ماری تھی۔ پریشکر ہوتے ہی ریڈ نے چیخ ماری اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ دباؤ کم ہونے سے آنکھیں باہر آ رہی تھیں۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا تھا پھر باہر جاتی ہوا اسے بھی کھینچ کر لے گئی مگر اس دوران میں فلپس ائر لاک کے دروازے کے پاس پہنچ گیا

تھا، اس نے جسپ لگائی اور ریڈ کو داپس خانے میں دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے بٹن پر ہاتھ مارا اور خانہ بند ہونے لگا۔ اسی اثنا میں اینا نے لاک کو ڈٹوڑ دیا اور اندر والا دروازہ کھل گیا۔ کیچھ اور گریگ تیزی سے اندر آئے جہاں ریڈ فرش پر تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ گریگ نے اسے اٹھا لیا اور تیزی سے کیچھ کے ساتھ چلا گیا۔ فلپس نے اپنا ہڈ اتارا۔ اینا ہراساں کھڑی تھی، اس نے پوچھا۔

”کمانڈر بایہ کیا ہو رہا ہے؟“

”پتا نہیں، مارک انجن روم کے پروسیسنگ یونٹ میں گیا تھا اور پھر میرا اس سے رابطہ نہیں ہوا یہاں یہ مسئلہ ہو گیا اور مجھے واپس آنا پڑا۔“

اینا نے روہانے لہجے میں کہا۔ ”کمانڈر ہمیں جلد از جلد اس جگہ سے واپس چلے جانا چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ہمیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔“

”کیسا مشن کمانڈر جب میکا پر کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔“ اینا نے کہا۔ ”یہاں موجود تمام افراد مارے جا چکے ہیں۔“

”ہاں لیکن ہمیں معلوم تو کرنا ہے کہ یہاں کیا ہوا ہے۔“ فلپس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے میکا کے کنٹرول روم سے ڈیٹا حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اینا! تمہیں وہاں جانا ہوگا۔“

”میں تیار ہوں۔“

کارن اور میکا مرمت کا کام کر رہے تھے اور کیونکہ وقت نہیں تھا اس لیے وہ اسے چھوڑ کر اندر نہیں آ سکتے تھے۔ ویسے انہیں صورت حال کا پتا چل رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد کیچھ نے بتایا کہ ریڈ کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن اس کے جسمانی نشوز اور کئی نسیں متاثر ہوئی تھیں، اگر وہ ہوش میں ہوتا تو شدید تکلیف محسوس کرتا، اس لیے اس کا بے ہوش رہنا درست تھا۔ ریڈ کی طرف سے اطمینان کے بعد کیچھ اور اینا میکا میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ کیچھ اینا کی مدد کرتی۔

گریگ یہیں رکتا۔ وہ پریشراڑ ڈسوت پہن کر باہر آئے۔ اس دوران میں فلپس مارک سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مارک کی طرف سے خاموشی تھی۔ وہ میکا میں داخل ہوئے۔ فلپس نے اینا اور کیچھ سے کہا۔ ”تم کنٹرول روم کی طرف جاؤ میں مارک کو دیکھتا ہوں۔“

☆☆☆

مارک ہراساں تھا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ تارچ کی روشنی میں سرنگ میں آگے بڑھنے لگا۔ تارچی کی وجہ سے اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ باہر جانے کا راستہ کون سا

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2015ء

74

تھا۔ اچانک سرنگ ایک لمحے کے لیے روشن ہوئی اور پھر تاریکی میں ڈوب گئی۔ اب رہ رہ کر روشنی اور تاریکی کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک بار روشنی ہوئی تو اس نے چند انچ کے فاصلے پر میکا کو دیکھا۔ وہ ہڑبڑا کر رک گیا مگر جب دوبارہ روشنی ہوئی تو وہ وہاں نہیں تھی۔ بالآخر وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس نے خانہ ایسے ہی کھلا چھوڑا اور انجن روم سے نکل گیا۔ وہ اندھا دھند آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے وہ میکا کے کسی ایسے حصے میں آنکلا ہو جو اس کے لیے اجنبی تھا لیکن نہیں یہ اجنبی نہیں تھا یہ تو اس کا گھر تھا، اس کا اپارٹمنٹ اور وہ بیڈ روم میں کھڑا تھا۔ تب اس نے ہاتھ روم کے کھلے دروازے سے میکا کی جھلک دیکھی وہ ہاتھ روم میں تھی۔ مارک ہاتھ روم میں آیا۔ میکا ٹب میں پانی بھر رہی تھی۔ مارک اس کے پاس آیا لیکن ایسا لگ رہا تھا وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔

مارک نے اسے پکارا مگر اس نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔ تب مارک جان گیا یہ کون سا منظر تھا۔ اس نے میکا سے التجا کی۔ ”پلیز ایسا مت کرو۔“

میکا خود سے بول رہی تھی۔ ”مارک میرے محبوب میں تمہاری مزید بے رخی برداشت نہیں کر سکتی۔“

وہ ٹب میں بیٹھ گئی، اس نے مارک کا شیو کا استرا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ مارک نے اپنا سر تھام لیا اور جیسے ہی میکا نے کلائی پر استرا چلا یا وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ ”نہیں، میں یہ منظر نہیں دیکھنا چاہتا۔“ اس نے کہا اور پھر اس نے دونوں انگوٹھے اپنی آنکھوں پر رکھ کر دبائے۔ اس بار اس کے منہ سے جو چیخ نکلی اس میں کرب نمایاں تھا۔

☆☆☆

فلپس انجن روم میں آیا۔ اس نے کنٹرول ٹینل چیک کیا اور انجن اشارت کرنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی انجن اشارت نہیں ہوا، ایسا لگ رہا تھا کہ خرابی دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ریڈیو پر اپنا سے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں اور کیچھ کنٹرول روم میں ہیں۔ میرے خدا یہاں ہر طرف خون اور گوشت کے لوتھڑے بکھرے ہوئے ہیں۔“

”انہیں نظر انداز کر دو اپنا کام کرو۔“ فلپس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“

”مارک کہاں ہے؟“

”میں اسے دیکھ رہا ہوں لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔“

”کمانڈر! مجھے لگ رہا ہے اس جہاز میں کچھ گڑبڑ ہے ہمیں جتنی جلد ہو سکے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ فلپس نے کہا اور کارن سے رابطہ کیا۔ ”مرمت کی کیا پوزیشن ہے؟“

”تقصان زیادہ نہیں ہے ہم تین گھنٹے میں مکمل کر لیں گے۔“

”کیا یہ کام تم اکیلے کر سکتے ہو؟“

”ہاں میک کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میک کو یہاں بھیج دو، میں چاہتا ہوں یہ آکر میکا کا انجن دیکھ لے اگر یہ کام کر سکتا ہے تو میکا کو زمین پر ساتھ لے جاسکتے ہیں۔“

”میں آ رہا ہوں کمانڈر۔“ میک کی آواز آئی۔

فلپس فکر مند تھا اس نے ریڈیو پر کئی بار مارک کو پکارا لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں مل رہا تھا۔ انجن کی مرمت کے لیے کھولا جانے والا خانہ ایسے ہی کھلا ہوا تھا مگر اس کے اندر مارک نظر نہیں آ رہا تھا۔ فلپس نے فیصلہ کیا کہ وہ میک کے آنے پر خانے میں جا کر اسے دیکھے گا۔ دس منٹ بعد میک وہاں آ گیا۔ فلپس نے اسے انجن پر لگایا اور خود کھلے خانے میں داخل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میک کنٹرول ٹینل پر انجن کے فنکشن چیک کرنے لگا۔ اسے تعجب ہوا کہ انجن کے تمام فنکشن بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے لیکن جب اسے اشارت کرنے کی کوشش کی جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اچانک اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ ٹینل کی طرف متوجہ ہوا چند لمحے بعد پھر آہٹ ہوئی اس نے مڑ کر دیکھا پھر کوئی نہیں تھا۔ میک چند لمحے دیکھتا رہا۔ وہ پھر ٹینل کی طرف مڑا۔ تیسری بار آہٹ ہوئی تو اسے مڑنے کا موقع نہیں ملا تھا کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ اوندھے منہ ٹینل پر گر پڑا اس سے ہوتا ہوا نیچے آگرا۔ تب اس نے مارک کو دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک رینج پانہ تھا لیکن میک کی توجہ اس کے چہرے پر تھی جس پر خون پھیلا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے۔ اس کا رینج پانہ والے ہاتھ نیچے آیا میک نے بچنے کی کوشش کی لیکن بچ نہیں سکا۔ رینج پانہ پوری قوت سے اس کے سر پر لگا تھا۔

☆☆☆

فلپس تیزی سے آگے جا رہا تھا کہ اچانک سرنگ تاریک ہو گئی۔ وہ رک گیا، اس نے ٹارچ نکال کر جلائی۔

اس نے سہارے کے لیے ایک طرف دیوار پر ہاتھ لگا لیا تھا کہ اچانک جھماکا سا ہوا اور اس کی نظروں کے سامنے ایلن کا چہرہ ابھرا۔ وہ خلائی اسٹیشن کے کنسول میں تھا اور بار بار شیشے پر ہاتھ مار رہا تھا۔ فلیپس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے کنسول کا اسٹیکٹ کاٹن دھاویا اور اس کا کنسول تیزی سے زمین کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا جس کنسول میں ایلن تھا اس سے اب شعلے نکل رہے تھے اور اچانک وہ دھماکے سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جھماکے کے ساتھ منظر غائب ہو گیا تھا۔ پھر سرنگ کی لائٹ آن ہو گئی۔ فلیپس ہانپ رہا تھا اس کے چہرے پر پسینا اور خوف تھا۔

☆☆☆

کیٹھ اور ایٹا کنٹرول روم میں تھیں۔ ایٹا مختلف مختل آن کر رہی تھی۔ بجلی والی لہر کے بعد نیٹ ورک ٹوٹنے سے یہ تمام مختل آف ہو گئے تھے۔ کیٹھ ایک طرف قطاروں میں بنے چھوٹے مختل اور ان کے سامنے موجود کرسیوں پر بکھرا خون دیکھ رہی تھی، یہاں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی دھماکے میں جسم کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں لیکن وہاں کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ ہر چیز صحیح سلامت تھی صرف اس پر خون اور گوشت بکھرا ہوا تھا۔ اسی طرح نہ کوئی ایسا آلہ تھا جس سے انسانوں کا یہ حشر کیا جاسکتا ہو۔ کیٹھ نے پلٹ کر ایٹا سے کہا۔ ”یہاں کیا ہو سکتا ہے؟“

”پتا نہیں اگر یہ سسٹم آن ہو جائے تو شاید پتا چل جائے یہاں کے کمروں نے بہت کچھ ریکارڈ کیا ہوگا۔“ ایٹا تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔

”میں نے کمانڈر سے کہا ہے کہ ہمیں جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

”ہاں لیکن اپنا کام مکمل کرنے کے بعد۔“ ایٹا نے کہا۔

”کمانڈر تم کہاں ہو؟“ کیٹھ نے ریڈیو پر فلیپس کو پکارا۔ اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر کہا۔

”کمانڈر تم کہاں ہو؟“

ایٹا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کمانڈر جواب نہیں دے رہا ہے۔“ کیٹھ نے کہا اور پھر گریگ کو کال کی۔ ”کمانڈر جواب نہیں دے رہا ہے ذرا تم اس سے رابطہ کرو۔“

گریگ نے ریڈیو پر فلیپس سے رابطہ کیا مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آ رہا تھا۔ گریگ نے کہا۔ ”میں آ رہا

ہوں۔ میک کہاں ہے؟“

”وہ کمانڈر کے ساتھ ہے۔“ کیٹھ نے جواب دیا۔

”اس کی طرف سے بھی جواب نہیں آ رہا ہے۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ کیٹھ بولی۔ ”ہمیں جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”کیسے؟“ گریگ نے کہا۔ ”ہم کمانڈر اور میک کے بغیر نہیں جاسکتے۔“

”میرا مطلب ہے ان کو تلاش کر کے ہمیں نکل جانا چاہیے۔“

”ابھی مددگار کی مرمت مکمل ہونے میں دو گھنٹے اور لگ سکتے ہیں۔“ گریگ بولا۔ ”تم فکر مت کرو میں آ رہا ہوں۔“

کیٹھ ایک بار پھر فلیپس کو کال کرنے لگی۔ وہ ہر دس سیکنڈ بعد اسے پکار رہی تھی۔ اچانک کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی پھر فلیپس کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”کمانڈر میں تمہیں کال کر رہی تھی تم جواب نہیں دے رہے تھے۔“

”مجھے تمہاری کوئی کال نہیں ملی۔“ فلیپس نے کہا اور ایٹا سے پوچھا۔ ”تم نے اپنا کام کر لیا ہے؟“

”مجھے دس منٹ اور لگ سکتے ہیں سسٹم ری اسٹور کرنے میں۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک۔“ فلیپس نے سر ہلایا۔ ”کیٹھ! تم میرے ساتھ آؤ۔“

وہ کیٹھ کو لے کر راہداری سے ہوتا ہوا انجن روم تک آیا اور اس نے کنٹرول مختل دکھایا جس پر اب خون بکھرا ہوا تھا۔

”میں میک کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا واپس آیا تو وہ غائب تھا اور یہاں یہ خون بکھرا ہوا تھا۔“

”میرے خدا... اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔“ فلیپس نے گہری سانس لے کر کہا۔ وہ واپس برج پر آ گئے۔ اس نے ایٹا اور کیٹھ کو دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”یہ جہاز زندہ ہے۔“

کیٹھ نے شک سے اسے دیکھا۔ ”کیا... کیا کیا تم نے؟“

ایٹا بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ فلیپس نے بات جاری رکھی۔ ”یہی کہ یہ جہاز زندہ ہے، یہ ہمارے بارے میں سب جانتا ہے۔ پچیس سال پہلے جب میں اپنے پہلے مشن پر خلا میں آیا تھا تب ایک حادثے کے نتیجے میں مجھے ایمرجنسی کنسول میں زمین پر جانا پڑا تھا میں اپنے ساتھی ایلن کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت میں نے خود غرضی کا ثبوت دیا تھا، اسے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ میں بچ گیا اور مجھے اس حادثے سے بری الذمہ قرار دیا گیا۔ یہ بات سوائے میرے

کوئی نہیں جانتا لیکن یہ جہاز جانتا ہے، اس نے میرے دماغ کو پڑھ لیا۔“

اینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کمانڈر ایسا ممکن نہیں ہے یہ دھات اور دوسرے مادوں کا بنا ہوا ہے جان جہاز ہے۔“

”میری بات کا یقین کرو۔“ فلپس نے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے جلد از جلد جانا ہوگا۔ اپنا تم جلد از جلد اپنا کام ختم کرو اور کیچھ تم یہاں سے زیادہ سے زیادہ پاور اسٹکس لے لو ممکن ہے ہمیں واپس مدار میں جا کر مددگار کی مرمت کے لیے ان کی ضرورت پڑے۔“

اسی لمحے گریگ اندر آیا۔ وہ سیدھا ان کی طرف آیا تھا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”میک اور مارک غائب ہیں۔“ فلپس نے کہا۔ ”میں انہیں تلاش کر رہا ہوں، تم کیچھ کے ساتھ مل کر یہاں سے پاور اسٹکس لے جاؤ ہمیں راستے میں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

پاور اسٹکس انجن روم کے ساتھ والی راہداری میں رکھی تھیں۔ کیچھ گریگ کے ساتھ یہاں آئی اور فلپس اپنا کام ساتھ برج پر موجود رہا۔ وہ دونوں اوپر بنے خانوں سے پاور اسٹکس نکال نکال کر ڈھیر کرنے لگے۔ یہ سائز میں بڑی

تھیں لیکن ان کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ کسی ایمرجنسی میں یہ ایندھن کا کام کرتی تھیں۔ ان سے انجن بھی چلایا جاسکتا تھا اور بجلی کی ضرورت بھی پوری کی جاسکتی تھی۔ ہر خلائی جہاز میں یہ ہنگامی حالات کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ اوپر سے ساری اسٹکس نکال کر کیچھ سائڈوں کی اسٹکس نکالنے لگی۔ گریگ نے چلا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کافی ہیں میں اس سے زیادہ نہیں لے جاسکتا۔“

”باقی میں اٹھالوں گی۔“ کیچھ نے کہا۔ گریگ ممکنہ حد تک اسٹکس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کیچھ اب اسٹکس جمع کر رہی تھی۔ گریگ چلا گیا تھا وہ اس کے پیچھے جا رہی تھی کہ اچانک اسے پیچھے سے ہنسنے کی آواز آئی۔ کیچھ رگ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے انجن روم کے دروازے پر ایک چھوٹا سا بہ نظر آیا وہ پلٹ کر اس طرف آئی۔ اس نے بے ساختہ آواز دی۔ ”ایڈم...“

”ممی۔“ ایڈم کی آواز آئی تو کیچھ کے ہاتھ سے اسٹکس چھوٹ گئیں، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ وہ انجن روم میں آئی۔ اسے ایک طرف سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر کسی کے چھوٹے پاؤں نظر آئے۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے آئی تو اس پر کوئی نہیں تھا لیکن اوپر سے ہنسنے کی آواز آرہی

موسم بہار کی گلاب رتیں
مارچ کے شمارے کی ندرتیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اولین صفحات ● ذہین و پراسرار لڑکی کی پرتجسس کہانی... کاشف زبیر کی زبانی

آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے مشترکہ ساتھیوں کی ایک زالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شمولیت

جواری ● احمد اقبال کے شرباز قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے نرالی انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و ماحول کی عکاسی اور محبت کی پُروردہ ناقابل فراموش کہانیاں

سزورق کی کہانیاں

نبلی موت ● ملک کے طول و عرض میں پھیلی معذنیات کی دریافت و استعمال کا گھناؤنا احوال

پل صراط ● سکون کی خاطر بڑے بڑے مل و سرائے گزرا جاسکتا ہے زندگی کے پل کھلتی ہیں تیرے



آپ کے تہرے...
مشوے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھاتیں

تھی، اسے یاد تھا جب وہ ایڈم کے ساتھ کھیلتی تھی اور وہ اس سے چھٹا پھرتا تھا تب وہ اسی طرح دل سے ہنستا تھا۔ وہ سیزمیوں سے اوپر جانے لگی۔ انجن روم کے اوپر ایک گول خلا تھا اس میں مختلف فلورز بنے ہوئے تھے۔ اسے پہلے فلور پر رینگ پر ہاتھ دکھائی دیے۔ وہ اوپر آئی۔ فلور پر چاروں طرف گیلری تھی اور اس میں مختلف راستے نکل رہے تھے۔ کیچھ ایک راستے میں داخل ہوئی اور پھر دیوانہ وار پھرانے لگی۔ وہ ایڈم تک پہنچنے کے لیے مرنے کو بھی تیار ہو گئی۔ اسے بالکل یاد نہیں رہا کہ ایڈم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ پھر وہ ایک راستے پر مڑی تو ایڈم اسے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ”مئی...“

کیچھ بے قرار ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ خلا میں گر گئی اور تقریباً سترفٹ نیچے انجن کے گولے کے نیچے فولادی جالی پر گری جس پر پانی لہریں لے رہا تھا۔ وہ پشت کے بل گری تھی اور اس کا جسم شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا اس نے دھندلائی آنکھوں سے اوپر دیکھا تو اسے ایڈم رینگ سے جھانکتا دکھائی دیا اور پھر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

☆☆☆

فلپس پہلے اپنا کے پاس آیا، اس نے میکا کا سسٹم آن کر لیا تھا اب اس کا ڈیٹا مددگار کے مرکزی کمپیوٹر کو بھیج رہی تھی۔ فلپس نے اسے مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا اور ہوشیار رہنے کا کہہ کر وہ برج سے اتر کر میکا کے رہائشی حصے میں آیا۔ اس نے احتیاطاً راستے سے لوہے کی ایک راڈ اٹھالی تھی وہ مختلف خانوں اور جگہوں پر جھانکتا پھر رہا تھا پھر ایک جگہ اسے ایک شخص کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کا شانہ اور بازو دکھائی دے رہے تھے اور اس نے ان کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ یہ شاید کھانے کا کمرہ تھا اور یہاں بھی جاہل خون بکھرا ہوا تھا۔ فلپس دبے قدموں راڈ اوپر کیے آگے آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے راڈ اوپر کی اور دوسرے ہاتھ سے کرسی گھمائی پھر اس کا ہاتھ خود نیچے آگیا۔ کرسی پر میک کی لاش تھی اور اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ اسے مارک کا خیال آیا اور وہ دانت پیسنے لگا۔ اس نے ریڈیو پر اپنا سے کہا۔ ”ہوشیار رہو مارک نے میک کو قتل کر دیا ہے۔“

”نہیں۔“ اپنا بولی۔

”میں اسے تلاش کر رہا ہوں، اگر وہ برج پر آجائے تو فوراً مجھے خبردار کرنا۔“

”او کے کمانڈر۔“ اپنا نے کہا۔

فلپس نے گریگ کو کال کی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں کاک پٹ میں آگیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”جہاز چیک کرو مارک وہاں تو نہیں ہے اس نے میک کو قتل کر دیا ہے، بہت ہوشیار رہتا۔“

گریگ بھی حیران ہوا تھا۔ ”لیکن کیوں، کیا وہ پاگل ہو گیا ہے؟“

”وقت ضائع مت کرو اسے تلاش کرو، مددگار خطرے میں ہے۔“ فلپس نے چلا کر کہا اور پھر کارن کو کال کی۔

”مرمت کا کتنا کام ہو گیا ہے؟“

”تقریباً نوے فیصد۔“

”کیا مددگار کو اوپر مدار میں لے جایا جاسکتا ہے؟ باقی کام وہاں کر لیا جائے۔“

”بس یہ آخری کچھ ٹانگے لگا رہا ہوں پھر مددگار سفر کر سکے گا۔“

”ٹھیک ہے جلد از جلد مکمل کرو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے، میک مر چکا ہے اور مارک اس کا قاتل ہے۔“

وہ اگلے حصے سے نکل کر راہداری میں آیا۔ اس نے اگلے حصے کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا مارک وہاں نہیں تھا، اسے عقبی حصے میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ انجن والے حصے کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نظر راہداری کے وسط میں لگے جیٹ بموں پر گئی جن کا کام خلا کی جہاز کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔ وہ چونکا کیونکہ ان میں سے ایک بم غائب تھا۔

☆☆☆

گریگ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ عقبی حصے کی طرف آیا تو اس نے مارک کو لفٹ سے نیچے جاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ گریگ سیزمیوں سے نیچے لپکا لیکن جب تک وہ نیچے جاتا مارک اتر لاک میں جا چکا تھا اور باہر کا دروازہ کھول رہا تھا تب گریگ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں تمام پریشاں سٹوٹ تھے۔ باہر نکل کر اس نے ہاتھ لہرایا جیسے اسے خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ پھر اس نے تمام سٹوٹ خلا میں چھوڑ دیے اور خود میکا کی طرف بڑھ گیا۔ گریگ پاگلوں کی طرح وہاں رکھے سامان کو کھنگالنے لگا۔ اسے اضافی سٹوٹس کی تلاش تھی لیکن مارک سب لے جا چکا تھا اس نے ایک بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گریگ نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اچانک فلپس کی آواز آئی۔ ”گریگ ہوشیار، فوراً جہاز سے نکل آؤ... مارک کہاں ہے؟“

”کیسے؟“ گریگ نے چلا کر کہا۔ ”وہ حرامزادہ ابھی یہاں سے تمام سوٹ سمیٹ کر لے گیا ہے۔ کماؤر! جہاز میں ایک بھی پریشراز سوٹ نہیں ہے۔“

”میرے خدا... یہاں ایک جیٹ بم غائب ہے۔ گریگ، تلاش کرو اسے۔ وہ اسے مددگار پر کہیں لگا گیا ہے۔ کیسے کہاں ہے؟“

”وہ میرے ساتھ تھی لیکن وہ مددگار پر نہیں آئی۔“ گریگ نے پاگلوں کی طرح ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے کہا مگر جیٹ بم اسے ایک طرف کپڑے کے پیچھے دیوار سے چپکا ملا۔ اس نے کپڑا ہٹایا تو اس پر اسٹاپ واچ چل رہی تھی اور صرف پانچ سیکنڈ کا وقت رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کمانڈر مل گیا ہے اور اب وقت نہیں ہے۔“

اسی لمحے دھماکا ہوا اور مددگار کا میکا کے ساتھ ملا ہوا حصہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

☆☆☆

فلپس میکا کی ایک کھڑکی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے... مددگار کی تباہی دیکھ رہا تھا پہلے اس کا پچھلا حصہ تباہ ہوا اور پھر اگلا حصہ بھی ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ گریگ، ریڈ اور کارن کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلپس نے کھڑکی کے شیشے پر دونوں ہاتھ مارے۔ اب وہ اس جہاز پر پھنس کر رہ گئے تھے۔ بس وہ اور دونوں عورتیں بچی تھیں۔ اب یہاں سے نکلنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میکا کے اگلے حصے کو الگ کر دیا جاتا تو اس کے محدود طاقت کے انجن اس قابل ضرورت تھے کہ اسے واپس زمین کی طرف دھکیل دیتے۔ لیکن اس کے لیے لازمی تھا کہ اسے پچھلے حصے سے الگ کر دیا جاتا۔ وہ راہداری میں نصب واحد جیٹ بم کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

کارن اس وقت مددگار کے نچلے حصے میں تھا۔ جب بلاسٹ ہوا تو اس نے اسے دور خلا میں دھکیل دیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا سوٹ نقصان سے محفوظ رہا تھا۔ لیکن وہ تیزی سے سیارے اور میکا سے دور ہوتا جا رہا تھا، اس نے مددگار کو کسی کھلونے کی طرح بکھرتے دیکھا۔ اس میں موجود کسی فرد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کارن اپنے سوٹ کا جیٹ چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ جیٹ اسے واپس میکا کی طرف لے جاسکتا تھا۔ مگر اتنی دیر تک باہر رہنے کے بعد اس کے سوٹ کی بیٹری کی طاقت کم ہو گئی تھی۔ اس نے جیٹ چلانا چاہا مگر وہ اشارت نہیں ہوا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹری کی باقی رہ جانے والی طاقت کو جیٹ چارج کرنے میں

استعمال کرتا۔ اس کے بغیر وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے بیٹری کی باقی طاقت جیٹ کو دے دی۔ اس کی کلائی پر لگی اسکرین پر جیٹ کی طاقت بڑھ رہی تھی اور بالآخر وہ پوری ہو گئی اور اس نے ٹھن دیا یا تو اس کے سوٹ کے پیچھے لگے جیٹ نے چل کر اسے واپس میکا کی طرف دھکیل دیا۔

کارن کے حلق سے خوشی کے مارے چیخ نکلی تھی۔ وہ بیچ گیا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مددگار کیوں تباہ ہوا تھا۔ بیٹری ختم ہونے سے اس کے سوٹ کے تمام برقی آلات نے کام چھوڑ دیا تھا۔ وہ ریڈیو پر کسی سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا اسے اتنا معلوم تھا کہ فلپس، اینا اور کیسے میکا پر تھے۔ مارک نے میکا کو قتل کر دیا تھا۔ قریب آنے پر اسے میکا کا داخلی دروازہ نظر آیا اور اس نے جیٹ کی مدد سے اپنا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ اس نے ہاتھ آگے کیے اور خود کو تصادم سے بچایا اور دروازے کا ہینڈل پکڑ لیا۔ اسے گھما کر اس نے اتر لاک کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پریشمار مل ہونے پر اس نے میکا میں جانے والا دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا ہڈ اتار اور میکا کے برج کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

فلپس واحد جیٹ بم کے پاس آیا، اس کا ہینڈل کھول کر اس نے چند ٹھن دبائے اور ڈیوائس آن ہو گئی۔ لیکن اس نے اس پر وقت مقرر کرنے کے بجائے بس اسے ایکٹو کر دیا۔ جیسے ہی اس نے ایکٹو کا ٹھن دبا یا برابر میں ایک چھوٹا خانہ کھلا جس میں ایک چھوٹا ساریوٹ پڑا تھا اس پر واحد سرخ ٹھن تھا جو ایک شفاف کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ بس یہ کور ہٹا کر ٹھن دبانے کی دیر تھی کہ جیٹ بم دھماکے سے میکا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس نے ریموٹ اٹھایا اور انجن روم کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ کھولا، اندر آتے ہی اس نے بلیک ہول کے نیچے پانی میں کیسے کو پڑے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ”کیسے۔“

اس نے کہتے ہوئے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں تھی۔ دکھ کی شدت سے فلپس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کا دیر کیسے کا ساتھ پرانا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ اس نے گھومتے دائروں کے نیچے سے دوسری طرف کسی کے پاؤں دیکھے تھے۔ وہ اٹھ کر اس طرف آیا تو اس نے مارک کو دیکھا اور اس کی حالت دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے اور پورے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا۔ فلپس

نے بے ساختہ کہا۔ ”مارک، یہ کیا ہوا تمہاری آنکھیں؟“
 ”بیکار تھیں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”میں نے نکال
 دیں... یہاں آکر مجھے پتا چلا میرے حواس کتنے غیر ضروری
 تھے۔ جب میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سوچوں سے بے
 خبر تھا۔“

اچانک فلیس کو یاد آیا کہ اب تک کیا ہو چکا تھا اور
 اسے غصہ آنے لگا۔ ”مارک، یہ سب تم نے کیا ہے؟“
 ”ہاں...“ اس نے بلا جھجک اقرار کر لیا۔
 ”کیوں؟“

”کیونکہ میکا کو نئے عملے کی ضرورت ہے۔ ہم اس کا نیا
 عملہ بنیں گے۔“

”تمہارا دماغ درست ہے تم نے میکا کو مار دیا۔ کیچھ
 کو قتل کیا۔ تم نے مددگار میں بم لگایا اور اس کے نتیجے میں
 گریگ، ریڈ اور کارن مارے گئے۔“

”کیچھ کو میں نے نہیں میکا نے مارا ہے۔ یہ اوپر سے
 گری ہے۔“

”اب صرف میں، تم اور اینا بچے ہیں۔“

”تمن بھی کافی ہیں۔“ مارک بولا۔ ”درحقیقت
 میکا کو کسی کی ضرورت نہیں ہے، یہ جہاز اب خود سب کچھ
 کر سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ زندہ ہے؟“
 ”ہاں یہ ایک ایسی زندگی رکھتا ہے جس میں ضمیر
 نہیں ہے۔“

”اس لیے انہیں افراد کی جان لینے کے بعد اب یہ
 ہمارے پیچھے پڑا ہے اور تم اس کے نمائندے ہو۔“ فلیس کا
 لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”مارک، یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”وہی جو تم سمجھ رہے ہو... وہی جو تم نے
 دیکھا... میکا اب ایک آئینہ ہے یہ تم کو تمہارا ماضی دکھاتا ہے
 وہ ماضی جو سب سے چھپا ہوا ہے۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ
 رہا... میں نے محسوس کیا کہ یہ جہاز زندہ ہے یہ میرے ماضی
 کے بارے میں جانتا ہے اس نے میری سوچ پڑھ لی ہے۔ مگر
 یہ سب کیسے ہوا؟“

”میرے بتائے ہوئے انجن کے بلیک ہول نے کسی
 دوسری دنیا سے رابطہ کر لیا ہے۔ کوئی ایسی دنیا جہاں زندگی ہم
 سے مختلف شکل رکھتی ہے۔ وہ زندگی بلیک ہول کے راستے
 یہاں آگئی۔“

”زندگی یا شیطانی قوت؟“

”تم چاہو تو ایسا بھی کہہ سکتے ہو۔“ مارک نے سر ہلایا۔
 ”وہ بڑھ نہیں سکتی ہے اس میں پیدائش کی قوت نہیں ہے ہاں
 وہ دوسروں کو اپنے جیسا بنا سکتی ہے۔ وہ مادے کو پھر سے
 ترتیب دے سکتی ہے۔“

فلیس نے بے یقینی سے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ
 میکا کا عملہ اور اب میرے ساتھی بھی...“

”ہاں وہ بھی اس قوت کا ایک حصہ بن جائیں گے۔
 صرف وہی نہیں بلکہ یہاں موجود ہر فرد چاہے وہ زندہ ہو یا مر
 چکا ہو۔“

”اس کے لیے یہ قوت پہلے ہمیں ذہنی طور پر منتشر
 کرتی ہے اور پھر قابو کر لیتی ہے۔“

مارک نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”یہ جنگ، سیاست
 اور غلبے کا اصول ہے، پہلے دشمن کو ذہنی طور پر مغلوب کرو اس
 کے بعد جسمانی شکست آسان ہوتی ہے۔“

”لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔“ فلیس نے کہا،
 اس نے ریموٹ والا ہاتھ بلند کیا تھا کہ مارک حیرت انگیز
 تیزی سے لپک کر اس کے قریب آیا، اس نے ایک ہاتھ فلیس
 کے ہاتھ پر مارا اور ریموٹ چھوٹ کر دور جاگرا۔ فلیس نے
 اس کے منہ پر مکا مارا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے
 بجائے اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبوچ کر اسے
 فضا میں بلند کر لیا۔ فلیس کا دم گھٹنے لگا، وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا
 اس نے مارک کو کئی ٹھوکریں ماریں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں
 ہوا۔ پھر مارک نے خود اسے اجمال دیا۔ وہ ایک طرف گول
 دیوار سے ٹکرایا اور لڑھک کر انجن کے نیچے پانی میں جاگرا۔
 اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ مارک گھومتا ہوا اس کی
 طرف آ رہا تھا۔

”کمانڈر، تم بیکار میں مزاحمت کر رہے ہو... وہ قوت
 ناقابل شکست ہے۔ جلد ہم سیارے پر جاری طوفان کی مدد
 سے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور جلد اس قوت کا ایک
 حصہ بن کر خود بھی ناقابل شکست ہو جائیں گے۔“

فلیس پیچھے کھسکنے لگا۔ ”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“
 ”تم کچھ نہیں کر سکتے۔“ مارک نے اس کے قریب

آکر اسے ٹھوکر ماری تو وہ اڑ کر دور گرا۔ اس بار بھی اسے شدید
 چوٹ آئی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی
 ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور پیچھے سرکنے لگا۔ جسمانی طور
 پر وہ مارک سے کہیں زیادہ مضبوط تھا لیکن اس وقت مارک
 اسے کسی بچے کی طرح مار رہا تھا۔ سب سے حیرت ناک بات یہ
 تھی کہ اس کی آنکھیں نہیں تھیں اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا

جیسے اسے سب نظر آ رہا ہو۔ پیچھے کھینکتے ہوئے فلیپس لا کھڑا کر نیچے گرا اور کوئی چیز اس کی کمر سے چبھی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم میکا لے جاؤ گے؟“

”بالکل، اس کے بغیر ہم اس قوت تک کیسے جاسکتے ہیں۔“ مارک نے کہا۔ ”یہی تو ہمیں اس لامتناہی فاصلے پر لے جائے گا۔“

”مارک تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ فلیپس نے پوچھا۔ اس کا ہاتھ پشت پر پڑی چیز کو ٹٹول رہا تھا۔

”کیونکہ وہ قوت مادے کو پھر ترتیب دے سکتی ہے وہ لاشوں کو زندہ کر دے گی اور مجھے میری میکا واپس مل جائے گی۔ اسی کے لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے۔“

”لیکن اب تم وہاں نہیں جاسکو گے۔“ فلیپس نے اپنا ہاتھ سامنے لاتے ہوئے کہا۔ اس میں بلاسٹ ڈیوائس کا ریموٹ تھا۔ اس نے بٹن پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”کبھی نہیں۔“ مارک اس کی طرف لپکا مگر وہ اسے بٹن دبانے سے نہیں روک سکا تھا۔

☆☆☆

کارن اندر آیا تھا کہ کوئی اچانک اس کے سامنے آیا اور وہ بھڑک اٹھا۔ مگر پھر اپنا کود کچھ کر پر سکون ہو گیا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ ”میرے خدا تم بچ گئے ہو۔ میں اور کمانڈر سمجھ رہے تھے کہ تم بھی مارے گئے ہو۔“

”بس قسمت تھی عین موقع پر جیٹ چل گیا اور میں واپس آ گیا ورنہ میں خلا میں جا رہا تھا۔“ کارن نے کہا۔ ”کمانڈر کہاں ہے؟“

”انجن روم میں... وہ کیچھ اور مارک کو دیکھنے گیا ہے۔“

”وہی لعنتی شخص اس تباہی کا ذمے دار ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں یہاں کیوں بھیجا گیا جب کہ انیس افراد پہلے ہی اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔“

”میرا اندازہ ہے کہ ناسا حکام کو مارک نے اس مشن کے لیے راضی کیا تھا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ اس جہاز کے لوگوں پر کیا گزری۔“

اینا اسے لے کر جہاز کے اگلے حصے میں آئی اور جب راہداری کی طرف کھلنے والا دروازہ بند ہو رہا تھا، درمیان میں لگے جیٹ بم سے آگ برآمد ہوئی اور راہداری بہت تیزی سے تباہ ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ یہ تباہی ان کی طرف آتی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اپنا کے منہ سے نکلا۔ ”میرے خدا

کمانڈر...“

وہ دونوں جھپٹ کر نزدیکی کھڑکی تک آئے جس سے میکا کا انجن والا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ راہداری تباہ ہو چکی تھی اور دھماکے کی شدت نے میکا کے دونوں حصوں کو مخالف سمتوں میں دھکیل دیا تھا۔ اگلا حصہ جس میں وہ تھے اوپری مدار کی طرف جا رہا تھا اور انجن والا سیاہ دھبے کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس میں سما گیا۔ ایناروری بھی اور کارن اس کے شانے کے گرد بازو گھمائے کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ہم بچ گئے، کمانڈر نے ہمیں بچا لیا یہ دھماکا اسی نے کیا ہے۔“

اینا نے سر ہلایا۔ ”ہمیں بچانے کا واحد راستہ یہی تھا۔ اب ہمیں واپس جانا ہوگا لیکن پہلے میں تمہیں دکھا دوں یہاں کیا ہوا تھا۔“

اینا اسے برج پر لائی جہاں ایک بڑی اسکرین پر اس نے ریکارڈ ویڈیو چلائی۔ اس میں میکا کا عملہ برج میں جمع تھا اور وہ خود کو نوچ کھسوت رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں نکال دی تھیں۔ اپنے چہروں اور جسموں سے گوشت لوج لوج کر پھینک رہے تھے۔ جگہ جگہ یہ گوشت اور ان کا خون لگا ہوا تھا۔ پھر وہ سب اڑ لاک والے خانے میں جمع ہوئے اور باہر کا دروازہ کھول دیا۔ خلا نے انہیں باہر کھینچ لیا اور پھر ان کے وجود ہمیشہ کے لیے خلا میں غائب ہو گئے۔ کارن پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ”میرے خدا...“

”اب ہمیں واپس جانا ہے۔“

کارن نے سر ہلایا۔ ”جتنی جلدی ہو سکے۔“

اینا نے میکا کے انجن اشارت کر کے اس کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور سسٹم کو آٹو پائلٹ کر کے وہ ہائیڈرو جیمبر میں سونے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دوران میں اپنا نے کارن کو فلیپس کے خیال سے آگاہ کیا تھا کہ میکا کسی قوت کے زیر اثر زندہ جسم میں بدل گیا تھا اور وہ ان کے خیالات جان کر ان پر ان کی کمزوریوں کے حوالے سے دباؤ ڈال کر انہیں احساس جرم میں مبتلا کر رہا تھا اور بالآخر خودکشی پر مجبور کر رہا تھا۔ کارن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تب ہم کیسے بچ گئے؟“

اینا نے اس کے شانے پر سر رکھ لیا۔ ”شاید اس لیے کہ ہمارے ماضی میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان سب کے لیے ان کا ماضی عذاب بن گیا تھا۔“



سودائے جنوں

پانچواں حصہ

ڈاکٹر عبدالرب بجن

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امت مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروف عمل ہیں۔ اس رپہ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعون کی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سیناتا ہے اس نے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی بلغاں ان کی چہرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی۔۔۔ جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی جنگبیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی بولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گیوم وہی ہے لیکن۔۔۔ آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں۔۔۔

اب اس بازی کا انجام۔۔۔

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر





عابد شیکھری کی پیشانی پر بکھٹ شکنوں کا جال سا بن گیا تھا۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ نائمہ نیم بے ہوش مچی جسے دھیرے دھیرے ہوش آرہا تھا لیکن عابد کے پاس مزید وقت نہ تھا، اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے اس دروازے کی طرف لپکا جس طرف اس کے مارگرائے دشمنوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ جیسے ہی وہ گن سنبھالے سیدھا ہوا، اسے سامنے تنگ سی راہداری میں کئی اسرائیلی گن بہ دست نظر آئے، مگر انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ عابد نے ان پر فائر کھول دیا، گولیوں کی بھیاں تڑتڑاہٹ ابھری اور کئی اسرائیلی کرپہا انگیز چیخوں کے ساتھ تیورا کر گر پڑے، باقی اکا 'دکا داک' بائیں پوزیشن سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر عابد انہیں بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، اس نے ان پر ایک بار پھر اپنی گن برسادی۔ گولیوں کی خوں ریز بارش ان بچے کچے اسرائیلیوں کو بھی چاٹ گئی۔ وہ واپس نائمہ کی طرف پلٹا، وہ اس شور و شغب کے باعث جلد ہی ہوش میں آکر اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اس کا چہرہ متوحش سا ہو رہا تھا۔ تاہم صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو سنبھالنے کی بھی کوشش کر رہی تھی، اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اس وقت کس قدر مخدوش اور سنگین لمحات سے دوچار تھے۔

”آگوستا“ آبدوز کے سائرن ہنوز سمع خراش آواز میں چلا رہے تھے، تاہم عابد نے اپنے حواس قائم رکھے ہوئے تھے، اس نے نائمہ کو سنبھالا دیا، اس کی اپنی سانسیں تیز چل رہی تھیں، وہ بولا۔

”نن۔ نائمہ! تم ٹھیک تو ہونا؟“ نائمہ نے ہولے سے اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دی اور اپنی شرٹ کی آستین سے اپنے نچلے ہونٹ سے بہتی خون کی لکیر کو پونچھا، تو عابد نے اس کی بدحواسی کو دور کرنے کی غرض سے اسے قلیل ترین الفاظ میں وہ سب بتایا جو رادیر پہلے اندر پیش آچکا تھا۔

اس کے بعد وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے، اپنا پستول عابد نے نائمہ کو پکڑا دیا تھا اور خود گن سنبھالی ہوئی تھی۔ یہ جدید آٹو میٹک رائفل تھی۔ ایک بار پھر اسے بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ تب تک وہ دونوں اس تنگ سی راہداری سے گزر کر ایک سیدھے ہاتھ کی جانب اچانک دکھائی دینے والے ایک دروازے سے اندر داخل ہو چکے تھے مگر جلد ہی انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ کوئی کراہیں بلکہ ایک مختصر اور تنگ سا فولادی زینہ تھا، جو نیچے کہیں جا رہا تھا۔ وہ بلا دھڑک زینے اترنے لگے، جلد ہی ان کے پیروں نے فرش چھو لیا۔ یہاں

اترنے کے بعد فوراً ہی انہیں یہ احساس بھی ہوا تھا کہ وہ کسی بڑے مشینری روم میں تھے۔ یہ بھی سردست اچھا ہی ہوا تھا۔ کیونکہ عابد کے خیال کے مطابق یہاں دشمنوں کی نفری نسبتاً کم ہو سکتی تھی۔ یہاں کی فضا بھی پرشوری تھی، عجیب قسم کی۔ شوں شوں۔ گھوں گھوں ماحول میں گونج رہی تھی۔ درحقیقت یہ سل نمبر پانچ تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے، نائب کیپٹن پیٹر لوت، ایک انجینئر اور وین آفیسر کوچ جن کے ساتھ معائنے کے لیے آیا تھا اور اس سل میں ٹائٹک ایڈ بننے کا خدشہ تھا لیکن وین آفیسر نے کیپٹن... پیٹر لوت کی تسلی کر دی تھی کہ مذکورہ خرابی دور کر لی گئی ہے وغیرہ۔ یہاں بھی پانچ فٹ قطر کے چار والٹ تھے جن کے اندر چار عدد آر، ایس، ایم۔ 28 قسم کے اسٹی میزائل نصب تھے۔ وین آفیسر کوچ جن یہاں اپنے دو نائب ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا، خطرے کا الارم یہاں بھی گونج رہا تھا اور یہ تینوں ہی فکر مند نظر آ رہے تھے، انہیں ایسی کسی بھی قسم کی صورت حال میں اپنا روم چھوڑ کے باہر جانے کی سختی سے ممانعت تھی، جس وقت کوچ جن اپنے ایک ساتھی کو دروازہ لاک کرنے کا حکم دے رہا تھا، وہ اس وقت والٹ نمبر 3 کے silos میں پپ چلانے میں مصروف تھا، تاکہ پانی جمع نہ ہو سکے۔ یہی سبب تھا کہ اسے اپنے آفیسر کے حکم کی تعمیل کرنے میں تھوڑی تاخیر ہوئی، جو عابد شیکھری اور نائمہ کے اس کمرے میں داخل ہونے کے لیے ”معاون“ ثابت ہوئی تھی۔ لہذا جیسے ہی یہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے، وہ شخص فوراً اپنا اہم کام نمٹا کے دروازے کی طرف بڑھا تھا، عابد اور نائمہ ایک گوشے میں جا چھپے تھے۔ باہر ان دونوں کی... زبردست ڈھنڈیا“ پڑی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں بھی کوچ جن کی آواز گونج رہی تھی، وہ تازہ حالات جاننے کے لیے اس وقت کسی سے انٹرکام پر باتیں کر رہا تھا۔

”کیا۔؟ امپاسیبل! یہ۔ کک۔ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ غیر یقینی انداز میں تقریباً چلا کر بول رہا تھا۔ اس پر تشویش آمیز حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ وہ کیا، اس وقت آبدوز میں موجود سب کی یہی ”حالت“ ہو رہی تھی۔

”تم جانتے ہو، یہ کون سی آبدوز ہے؟ جہاں چڑیا کا ایک بچہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اوہو۔ مجھے یقین کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔ امپاسیبل۔ امپاسیبل۔“ اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔

”ٹھنہ۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ خبردار! ہتھیار کے استعمال میں غیر معمولی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ میں کسی

ہے اس کا محمود اپنے اندر کیسا بغض چھپائے بیٹھا تھا۔ اگر ہمیں پہلے ہی اس کا ذرا بھی اندازہ ہو جاتا، بخدا ہم اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش ضرور کرتے، لیکن صد افسوس۔“
حسن علی کے لہجے سے گہرا تا سف ہویدا تھا، پھر وہ قدرے الجھ کر اس کی طرف تکتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”لیکن عزیز ی رخسانہ! اگر تمہیں پہلے ہی اپنے شوہر کی طرف سے ایسا کچھ اندازہ ہو گیا تھا تو تمہیں کم از کم ہمیں تو بتا ہی دینا چاہیے تھا، ہم اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر دیتے؟“
تب ہی رخسانہ بولی۔

”محترم آقا! ہم ایسا ضرور کرتے، مگر ہمیں بھی کبھی انہوں نے اپنے رویے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، یہ تو ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی معلوم ہوا تھا، جب وہ اپنے کمرے میں پستول نکال کر اپنے جیسے میں چھپا رہے تھے اور ہم نے اس وقت ان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی تھی، جو اس وقت سرخ ہو رہا تھا اور ان کی آنکھیں ہمیں شعلے برساتی محسوس ہو رہی تھیں، پھر وہ ہم سے کچھ کہے بنا ہی نکل گئے، ہم پھر بھی ان کے جوش کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے لیکن بعد میں اچانک ہمیں خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ محترم آقا کے ہاں آج مجاہدہ لیلیٰ تشریف لارہی ہیں، تب ہمیں گمان گزرا کہ کچھ غلط نہ ہو جائے، کیونکہ جب ہمارے فرزند کی عزیز ی لیلیٰ کے ہاتھوں ہلاکت ہوئی تھی تو ہم نے انہی دنوں ابتدا میں اپنے خاوند کو اندر ہی اندر جلتے سلگتے پایا تھا، وہ شاید اسد کی ہلاکت سے بہت دکھی رہتے تھے، کبھی کبھی اپنے غم و غصے کا بھی اظہار کرتے، پھر چپ چپ رہنے لگے، ہم بھی اپنے دل پر ہتھ رکھے ہوئے تھے، کیونکہ مجھے اپنے بیٹے کی ہلاکت سے زیادہ اس کی غداری پر دکھ تھا، لہذا آج جب ہمیں یہ سب پتا چلا تو ہمارے بھی ذہن میں کھٹک پیدا ہوئی اور پھر ہم بھی عین وقت پر یہاں آن پہنچے۔“ وہ یہ سب بتانے کے بعد سسک پڑی۔ ایسے میں لیلیٰ نے آگے بڑھ کر اسے محبت سے تھام لیا اور مغموں سے لہجے میں اس سے بولی۔

”رخسانہ بہن! اللہ گواہ ہے ہم نے آخری وقت تک یہ کوشش چاہی تھی کہ اسد کو سمجھا سکیں مگر۔“

”بس! اب اس موضوع کو یہی دفن کر دیں، اور آپ لوگ اپنی نشست جاری رکھیں، اللہ آپ کو نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔“ غیور رخسانہ یہ کہہ کر واپس پلٹ گئی۔ کمرے کی فضا کچھ دیر بوجھل رہی۔

اس ناخوشگوار واقعے کے کوئی گھنٹے بھر بعد یہ پانچوں مجاہد حسن علی کے فارم سے روانہ ہو چکے تھے۔ اس بار تیونائی

کو اس آبدوز میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔
نو۔ نیوز“ کوچ جن بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ ”سنو، سنو۔ وار ہیڈ کے تمام رومز فوراً لاک کر دو۔ خبردار۔ اپنے سیکشن کا کوئی فرد اپنا کپارٹمنٹ نہیں چھوڑے گا۔ باقی کام دوسروں کے لیے چھوڑ دو۔۔۔ واٹ؟ او۔ پوسٹ اپ۔ اس وقت میرا حکم چلے گا۔ آئی ایم ویٹن آفیسر۔ کلیئر؟ میں ابھی کیپٹن سے بات کرتا ہوں۔“
اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔ ابھی تو اسے یہ نہیں پتا تھا کہ عابد اور نائمہ اسی کمرے میں موجود تھے۔ ورنہ کوچ جن حیرت سے ہی مر جاتا شاید۔ ادھر عابد اور نائمہ اس کی۔۔۔ بدحواسیوں کو چھپ کے دیکھ رہے تھے کہ ان کی وجہ سے نہ صرف اسرائیلیوں کی اس ایشی آبدوز میں کس قدر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بلکہ ان کی توجہ اپنے اہم مشن سے بھی ہٹ گئی تھی۔ عابد شکمہری کے چہرے پر جوش کی سی سرخی پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

وہ چیخ لیلیٰ کی نہیں، بلکہ محمود الحسن کی تھی۔ کسی نے عقب سے اس کی پشت پر گولی ماری تھی جس کے باعث اس کے حلق سے ایک تیز چیخ خارج ہوئی تھی اور وہ کمزور اور بوڑھا تھا، ایک ہی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا، کیونکہ گولی کھاتے ہی وہ گرا اور دم توڑ دیا۔ لیلیٰ کو گولی مارنے کی اسے حسرت ہی رہ گئی۔ ماحول پہ اپکا انکی سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ لیلیٰ بال بال موت کے منہ سے بچی نچتی۔ محمود الحسن کے گرتے ہی سب کی پھنی پھنی آنکھوں نے اس کے عقب میں ایک پتلا العمر عورت کو ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول پکڑے کھڑے ہوئے دیکھا، جس نے سفیدی چادر اوڑھ رکھی تھی اور چہرے پہ کالا نقاب تھا۔ یہ عورت لیلیٰ اور باقر وغیرہ کے لیے اجنبی ہی تھی، تب ہی کمرے کے دھڑکتے ماحول میں حسن علی کی ہلکی آواز ابھری، اس نے ہولے سے زیر لب کوئی آیت پڑھی تھی پھر وہ اس عورت کی طرف متوجہ ہو کے مغموں کی آواز میں بولا۔

”بہن رخسانہ! یہ تم نے کیا کیا؟ اپنے خاوند۔۔۔ کو گولی مار دی؟“

”ہاں۔“ سیاہ نقاب کے پیچھے ہونٹ متحرک ہوئے۔
”میں نے بھی وہ ہی کیا، جو لیلیٰ نے میرے غدار بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ لیلیٰ جیسی مجاہدائیں ارض فلسطین کی وہ بہادر بیٹیاں ہیں جن پر میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔“ رخسانہ نامی اس خاتون کے لہجے سے ایک جوش متحرک تھا مگر آواز کی تہ میں ایک غم کی تلچٹ بھی دلی دلی محسوس ہوتی تھی۔

”آفرین ہے تم پر عزیز ی رخسانہ! مگر ہمیں دکھ بھی

آپریشن مکمل طور پر "کمانڈو ایکشن" پر انحصار کرتا تھا، یعنی بغیر کسی بھاری فزری کے صرف چند انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کی اپنی صوابدیدی کارروائی اور حکمت عملی کے بل بوتے پر اور جان کی بازی لگا کر مشن کو ہر صورت میں کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔

یہ پانچوں کمانڈوز رات کی تاریکی کا حصہ بنے محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ باقر چلنے پھرنے کے قابل تھا مگر اس کے بائیں کاندھے کا زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں تھا۔ تاہم وہ خود کو مکمل "ایکٹو" رکھے ہوئے تھا۔ صحرا میں محاق چاند کی تاریک رات اتری ہوئی تھی اور ہر طرف سنائے کا راج تھا، لیلیٰ اور باقر کے پاس تاریکی میں دیکھنے کے لیے انفراریڈ دوربین تھی، جسے وہ گاہے بہ گاہے استعمال میں لارہے تھے، ایسے ہی ایک موقع پر جب لیلیٰ دوربین اپنی آنکھوں سے لگا کر ایک ذرا گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھی تو اچانک وہ ٹھٹھکی۔ اسے سامنے کے رخ پر کوئی دھبہ سا متحرک نظر آیا، وہ چونکی اور بہ غور آنکھوں سے دوربین لگائے دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس نے حرکت کرتے اس سپاہ دھبے کی شبیہ کافی حد تک واضح کر ڈالی۔

"ایمبولینس۔" دفعتاً اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ اس کا ساتھی باقر ٹنٹکا اور پھر اس نے بھی فوراً اپنی دوربین آنکھوں سے لگالی۔

"اوہ۔ یہ تو واقعی کوئی ایمبولینس ہے۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ "اور میرا خیال ہے اس کا رخ تل ایب کی طرف ہے۔"

"یقیناً۔" اس کی تائید لیلیٰ نے بھی کی۔ "شاید کسی مریض کو تل ایب کے کسی بڑے ہسپتال لے جایا جا رہا ہے؟" "مگر لیلیٰ! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں موجود مریض کو آخر کس مقام سے لے جایا جا رہا ہے؟" باقر نے اپنی آنکھوں سے ہنوز انفراریڈ دوربین لگائے ہوئے کسی خیال کے تحت لیلیٰ سے کہا تو وہ بھی اسی طرح پرسوج انداز میں بولی۔ "ایمبولینس جس راستے سے تل ایب کی طرف بڑھ رہی ہے اس جانب تو ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر پڑتا ہے۔"

"ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" باقر بولا۔ "شاید ہماری گزشتہ ناکام تیونائی مہم میں زخمی ہونے والے کسی اسرائیلی افسر کو شفٹ کیا جا رہا ہے۔ کاش، یہ ایمبولینس قریب ہوتی تو اس پر دھاوا بولا جاسکتا تھا۔"

"ضروری تو نہیں کہ اس میں کوئی اسرائیلی افسر ہی مریض ہو؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں اسرائیلی کتوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"

"تم محسن کو بھول رہے ہو شاید؟" لیلیٰ نے اسے یاد دلایا تو وہ فوراً جیسے فرط عقیدت سے بولا۔

"ہرگز نہیں بھولا محسن جیسے بہادر مجاہد کو میں بھول سکتا ہوں، لیکن شاید میں ہی تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ پایا ہوں؟"

"میں یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ اس ایمبولینس میں ہمارا ساتھی محسن بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"یقیناً ہو سکتا ہے، اور پہلے میرے دماغ میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" وہ شاید اب لیلیٰ کی بات کا مطلب سمجھا تھا اور کسی فوری خیال کے تحت بولا تھا۔

"ہمیں فوراً اس ایمبولینس پر ایک کرنا چاہیے تھا، مگر اب تو یہ ہماری پہنچ سے دور ہے۔" دفعتاً وہ چوٹکا۔

"یہ تو نظروں سے اوجھل بھی ہو چکی۔ کاش، ہمارے پاس کوئی گاڑی ہوتی، یا پھر کوئی سواری کہ اس ایمبولینس کا پیچھا کیا جاسکتا۔" وہ پھر کف افسوس ملنے لگا تو لیلیٰ بولی۔

"آگے بڑھو باقر! گزشتہ حملے کے بعد سے تیونائی میں پہلے سے بھی زیادہ سکیورٹی کے اقدامات کیے جا چکے ہوں گے۔ ایسے میں ہم کسی سواری میں ہوتے تو چھپے ہوئے دشمنوں کی نظروں میں بھی آسکتے تھے، ہمیں پہلے سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔"

وہ آگے بڑھ گئے۔ ابھی انہیں آگے قدم بڑھائے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک یہ پانچوں بری طرح ٹھٹھکے۔ ایک "گڑگڑاتی" آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اس مخصوص آواز کو سنتے ہی لیلیٰ سرسراتی آواز میں بولی۔ "ریت میں دھنس جاؤ، جلدی۔"

پھر اسی دوران لیلیٰ نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگا لی اور چونک پڑی، ایک فائٹر ہیلی کاپٹر تیزی کے ساتھ اس سمت کی جانب پرواز کرتا نظر آیا جس طرف وہ ایمبولینس غائب ہوئی تھی۔ لیلیٰ کے ذہن طباع میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا تھا۔ یکایک اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاس بہت قلیل وقت ہو۔

"بال بال بچے، دشمنوں کا ہیلی کاپٹر یہاں آئے بنا آگے چلا گیا۔" باقر کی طہایب بھری آواز ابھری، مگر ابھی تک شاید اس کا ذہن لیلیٰ کی پر مغز سوچ تک رسائی حاصل نہ کر سکا تھا کہ وہ کن خطوط پر سوچ رہی تھی اور اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، چونکا تو اس وقت جب اس نے لیلیٰ کو

پر واز کرنا کیا معنی رکھتا تھا اس کا کچھ کچھ اندازہ لیلیٰ کو اس کی غیر معمولی چھٹی حس کے حوالے سے خوب اچھی طرح ہونے لگا تھا۔ اور تب یکا یک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ایک بار پھر اسی جانب دوڑ لگا دی، جس سمت ہیلی کا پڑ تیزی سے پرواز کر گیا تھا۔

لیلیٰ کو کچھ ایسا احساس ہوا تھا کہ یہ سارا معاملہ کسی کے ”فرار“ اور ”تغائب“ کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

”اونٹ کنارہ“ یہ مخصوص قسم کی ایسی جھنڈ دار اور موٹی جھاڑیاں ہوتی ہیں جو بنجر دیرانوں اور لوق ووق صحراؤں میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ وہ دونوں ایسی ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں آگئے تھے۔ فضا میں گردش کرتا ہوا ہیلی کا پڑ لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ ایک بڑی سی سرچ لائٹ اس کے نچلے حصے میں نصب تھی، جس کا بڑے قطر کا دائرہ صحرا کی دستوں کو کافی حد تک مٹور کپے دے رہا تھا۔ محسن اور اس کے ساتھ لگی بیٹھی بازغہ دم بہ خود سے دیکے بیٹھے تھے۔ ان کے دل سینوں میں بے طرح دھڑک رہے تھے۔ بازغہ کو شاید حالات کی سنگینی کا اتنا احساس نہ تھا جتنا محسن کو تھا کہ دیکھ لیے جانے کی صورت میں سر پہ منڈلاتا ہوا اسرائیلی ہیلی کا پڑ بلا درلغ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتا تھا اور اس کے ساتھ بازغہ بھی زندہ نہیں بچتی۔ جبکہ ہتھیار کے نام پر ان کے پاس فقط ایک پستول تھا جس کے چیمبر میں پانچ گولیاں تھیں۔ ایک لمحے کو تو محسن کو یوں لگا جیسے وہ یہاں چھپے بیٹھے نہ ہوں بلکہ اپنی بے رحم موت کا انتظار کر رہے ہوں مگر محسن نے اب تک نہ حوصلہ ہارنا سیکھا تھا نا ہی وہ کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوا تھا، اس کا اس پر پختہ ایمان تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے، ابھی آنی ہے تو ابھی آئے گی ورنہ جب لکھی ہوگی اسے سوائے اللہ کے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اس کا حوصلہ سوا ہونے لگا۔

اچانک محسن کی ٹھٹکی ہوئی نظروں نے دیکھا کہ ہیلی کا پڑ ان سے تھوڑی دور ہی فضا میں معلق ہو گیا۔ پھر اس وقت محسن کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا جب اس نے دیکھا کہ ہیلی کا پڑ اب دھیرے دھیرے نیچے ریت پر لینڈ کرنے لگا۔ اس کے مخصوص ساخت کے بنے ہوئے ”لینڈنگ اسکڈز“ ہیلی کا پڑ کو بہ وقت ضرورت ہر جگہ آسانی لینڈنگ میں مدد دے سکتے تھے۔

بہر طور ہیلی کا پڑ کے ریت پر اترتے ہی پانچ اسرائیلی کمانڈوز، جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں جدید گنیں تھامی ہوئی تھیں، چپ لگا کر ہیلی کا پڑ سے اترے، ان میں چند ایک کے

یکدم اٹھ کر کھڑے ہوتے اور یہ حکم صادر کرتے سنا۔

”فورا میرے پیچھے آؤ سب۔“ یہ کہتے ہی اس نے اس طرف دوڑ لگا دی جدھر تھوڑی دیر پہلے ایسبولینس اور بعد میں ایک اسرائیلی ہیلی کا پڑ غائب ہوا تھا۔ باقی ساتھیوں کے ساتھ باقر کو بھی لیلیٰ کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی تھی، بے شک لیلیٰ سے اس کا لاکھ قلبی تعلق صحیح، مگر اس وقت وہ اس کی لیڈر تھی اور ایک عظیم کاز میں وہ ان کی رہنما بھی باقر کیا، کسی کو بھی اس کے حکم سے سرتابی کرنے کی جرأت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سوال کرنے کی بھی، جب تک وہ خود نہ بتاتی۔

یہ چاروں لیلیٰ کی تقلید میں مذکورہ سمت دوڑتے جا رہے تھے۔ باقر ان میں سب سے پیچھے تھا، اسے لیلیٰ کی یہ اچانک حرکت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں لگ رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ ادھر لیلیٰ کا چہرہ کسی اندرونی جوش کے ابال سے تھمٹایا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے ایک عجیب سی بے چینی میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ کچھ دور اسی طرح دوڑتے رہنے کے بعد معافی وہ چونک پڑی اور اسے نہ صرف فوراً رکنا پڑا بلکہ ایک قریبی ریتیلے ٹیلے کی آڑ بھی لینا پڑی، اس کے چاروں ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ لیلیٰ کو سامنے ذرا دور وہی ایسبولینس کھڑی دکھائی دی تھی، مگر چونک کر رکنے اور گھات لگانے کا سبب، اس ایسبولینس کے قریب کھڑے ہیلی کا پڑ کا بھی موجود ہونا تھا۔ یہ وہی ہیلی کا پڑ تھا، جو تھوڑی دیر پہلے انہیں فضا میں گردش کرتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ لیلیٰ نے ایک ہاتھ سے اپنے ساتھیوں کو ریتیلے ٹیلے کی ڈھلوانی ریت پر اسی طرح لینے رہنے کا اشارہ کیا اور خود آنکھوں سے انفراریڈ دور بین لگائے سامنے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے دیکھا، اسرائیلی ہیلی کا پڑ سے پانچ، چھ کے قریب کمانڈوز وردیوں میں ملفوف اسرائیلی گن بردار.....

ایسبولینس کے پاس کھڑے تھے، جس کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر اسٹریچر پر دو مریض نظر آنے والے افراد سے وہ پوچھتا چھ میں مصروف تھے، پھر دفعتاً ہی جانے کیا ہوا کہ وہ سب اسرائیلی کمانڈوز یکدم حرکت میں آئے، اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ وہ دوبارہ ہیلی کا پڑ میں سوار ہونے لگے، اس کے چند ثانیوں بعد ہی ہیلی کا پڑ نے اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔

لیلیٰ کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور اس کے اعصاب تن گئے تھے، ایسبولینس کا یوں اچانک نظر آنا اور پھر تھوڑی دور جا کر رکنا، پھر اس کے فوراً بعد..... اسرائیلی کمانڈوز کے ہیلی کا پڑ کا وہاں پہنچنا، اور پھر اندر موجود گنتی کے دو مریضوں سے پوچھتا چھ کے فوراً بعد دوبارہ فضا میں

پاس طاقت و رٹار میں بھی تھیں، یہ وہی سات ٹاپ کمانڈرز کا خطرناک ٹولہ تھا جنہیں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آنرک فرمائش نے محسن اور بازغہ کی تلاش میں روانہ کیا تھا اور اس وقت ان تربیت یافتہ کمانڈرز کو پالی مورلیڈ کر رہا تھا، محسن کو یقین سا ہونے لگا تھا کہ اب شاید اس کے دن گنے جا چکے ہیں کیونکہ ایک تو وہ خود بھی زخمی تھا پھر ان کمانڈرز کے مقابلے میں اس کی اپنی قوت صفر تھی، محض ایک معمولی پستول سے اور جس کے جیمبر میں بھی صرف پانچ گولیاں تھیں، ان کا بھلا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا؟ آسانی سے تو وہ بھی مرنے والا نہیں تھا، چاہے اسے مقابلہ ہی کیوں نہ کرنا پڑتا لیکن ایک، دو کو تو اس نے مار گرانے کا عزم کر رکھا تھا، اصل دکھ اسے بازغہ کا تھا۔ وہ ایک نوخیز دوشیزہ تھی۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، جو محض اس کی محبت میں اپنا آرام اور سکھ چین سب تیاگ کر نہ صرف اس کے ساتھ چلی آئی تھی بلکہ اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا بیٹھی تھی، اس کی خاطر اپنے لوگوں سے، حتیٰ کہ اپنے باپ تک کو بھی چھوڑ آئی تھی اور اب اس کے ساتھ اس کا بھی جانے کیا حشر ہونے والا تھا، اصل دکھ محسن کو یہی تھا، اس نے بازغہ سے کہا۔

”بازغہ! مجھے افسوس ہے، میں تمہاری حفاظت نہ کر سکا، دیکھو... مرنے سے پہلے تم کلمہ ضرور پڑھ لینا لیکن تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ میں جب تک ان کتوں کے سامنے ڈھال بننے کی کوشش کرتا ہوں۔“

بازغہ کو خود بھی اب تک کی سگیٹنی کا یہ خوبی اندازہ ہو چلا تھا۔ محسن نے دیکھا اس کی بات پر بازغہ کے چہرے پر ایک ذرا بھی ڈر یا خوف کا شائبہ تک نہ ابھرا تھا۔ اس کے برعکس، وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی، پھر جیسے اپنے دل کی عمیق گہرائی تلے بولی۔

”اپنے محبوب کے ساتھ، اس کی بانہوں میں دم توڑنے والی، بھلا مجھ سے زیادہ اور کون خوش قسمت لڑکی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنا جینا مرنا تو بہت پہلے ہی تمہارے نام کر ڈالا تھا، میں تمہیں چھوڑ کے بھلا کہاں جاؤں گی؟ تم کلمہ پڑھو اور دشمن پر گولی چلاؤ، میں تمہارے ساتھ کلمہ پڑھتی جاؤں گی۔“

وقت نہیں بچا تھا، محسن نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہلکی آواز میں کلمہ پڑھتا چلا گیا اور بازغہ اسے دہرائی چلی گئی۔ دشمن قریب آ رہے تھے۔ انہیں شاید یقین کی حد تک شبہ ہونے لگا تھا کہ ان کا ”شکار“ زیادہ دور نہیں ہے۔ ادھر جیسے ہی کلمہ مکمل ہوا۔ محسن نے ایک دشمن کو تاک کر قاتل کر ڈالا، گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ کریمہ انگیز چیخ مار کے گرا۔ باقیوں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دائیں بائیں ریت پر خود کو گرا کر

پوزیشنیں سنبھال لیں اور قاتل کھول دیے۔ محسن نے بازغہ کو اپنے پیچھے کر رکھا تھا، سر دست وہ دشمنوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے محفوظ رہا تھا اور اسی دوران اسے ایک اور دشمن پر یکے بعد دیگرے دو تین گولیاں داغنے کا بھی موقع مل گیا، مگر اب دشمن نہ صرف سنبھل چکا تھا بلکہ اسے گھات بھی منیر آچکی تھی، اسی سبب محسن کے تینوں قاتل خالی گئے۔ بالآخر اس نے آخری گولی بھی چلا دی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے پستول... ایک طرف پھینک دیا۔ بازغہ نے اپنے محبوب کی یہ حالت دیکھی تو بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور محسن کو یقینی موت کی چاب اپنے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ تائید ایزدی کو ابھی کیا مقصود تھا یہ دونوں شاید نہیں جانتے تھے۔ گولیوں کی خوں ریز تڑتڑاہٹ ابھرنے کے ساتھ ہی محسن کو متعدد دشمنوں کی... کریمہ انگیز چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ یک لخت ایک خوشگوار حیرت ہوئی، وہ تو اپنی اور بازغہ کی یقینی موت کا تصور کیے بیٹھا تھا، جبکہ معجزہ یہ کوئی اور ہو چلا تھا۔

ادھر اپنے ساتھیوں کو لیڈ کرنے والا پالی مور، جسے اب تک اپنا مشن کامیابی کے بالکل قریب محسوس ہونے لگا تھا، اس اچانک کا یا کلمہ پر وہ ایک لمحے کے لیے پھر کچھ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ یہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟

ہوش اسے تب آیا تھا جب اس نے اپنے دو تین ساتھیوں کو ریت پر تڑپتے ہوئے پایا۔ پھر اس کے ہوش ٹھکانے آئے، وہ تیزی کے ساتھ پلٹا تو اسی وقت ایک ہینڈ گرنیڈ اس کے قریب ہی کہیں گرا، اس نے اپنی جگہ سے

بہ سرعت جست بھری، اگلے ہی لمحے ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور کئی سگلتے ہوئے شیل اس کے چہرے اور جسم کو زخمی کر گئے۔

یہ معرکہ لیلیٰ اور اس کے چار ساتھیوں نے انجام دیا تھا۔ جس کا سہرا لیلیٰ کے سر ہی جاتا تھا۔ اس کی بروقت حکمت عملی اور بیدار مغزی نے اسرائیل کے سات ٹاپ ایجنٹوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ پالی مور سمجھ گیا تھا کہ اس کا پالا کسی حریت پسند فلسطینی گروپ سے پڑ چکا ہے، جو پہلے ہی ان کی گھات میں بیٹھے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے تلے اوپر جہنم واصل ہوتے ہی اس نے راہ فرار کی ٹھانی اور اندھا دھند قاتلنگ کرتا ہوا ذرا فاصلے پر موجود اپنے بھائی کا بٹری کی جانب دوڑ پڑا۔ اس پر مجاہدین کی ایسی دہشت سوار ہوئی کہ اسے فرار پہ مجبور ہونا پڑا مگر لیلیٰ اسے کہاں چھوڑنے والی تھی۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کر کے لیلیٰ دبا دی۔ تب

تک پالی مور اپنے ہیلی کا پٹر کے قریب پہنچ چکا تھا مگر ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ گولیوں سے پھلنی ہو کر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اندر موجود پائلٹ نے اگرچہ بہت پہلے ہی صورت حال کی خطرناکی کا اندازہ لگا لیا تھا، مگر اس نے شاید پالی مور کو تیزی سے ہیلی کا پٹر کی طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھ لیا تھا اسی لیے وہ اس کے قریب پہنچنے کا خطرہ ہاتھ مگر دروازے کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بھیانک انجام سے دو چار ہوتے دیکھ کر اس نے بھی فوراً راہ فرار اختیار کرنے کی ٹھانی اور ہیلی کا پٹر کے پتکے چلا دیے۔ وہ اوپر اٹھنے لگا۔ ہیلی حلق کے بل چلا کے اپنے ساتھیوں سے بولی۔

”ہیلی کا پٹر جانے نہ پائے۔ ورنہ ہمارا مشن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسے نشانہ بناؤ۔“

اپنی مجاہدہ لیڈر کی یہ آواز سنتے ہی عبداللہ علی ارسلان اور لیتھ احمد اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر ریت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فضا میں بلند ہوتے ہیلی کا پٹر پر فائرنگ کرتے ہوئے دوڑ کر اس کے قریب بھی ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ جبکہ باقر کو شکار ہاتھ سے جاتا محسوس ہو رہا تھا، ہیلی کے حکم کے مطابق کوئی بھاری ہتھیار استعمال کرنے کی ممانعت تھی مگر باقر دیکھ رہا تھا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا تو اس نے چشم زدن میں اپنی کمانڈ وکٹ سے آر پی جی گرنیڈ لا مچر نکالا، اس ٹیم کے پاس فقط ایک ہی بھاری ہتھیار تھا، باقر نے لا مچر ریڈی کیا اور اپنے کاندھے پر رکھ کر آپٹیکل سائٹ پر آنکھ لگا کے پوری تسلی کے ساتھ ہیلی کا پٹر کا نشانہ لے کر ٹرگر دبا دیا۔ ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز کے ساتھ گرنیڈ فائر ہوا اور گاڑھے کثیف دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا وہ تیزی سے ہیلی کا پٹر کی طرف لپکا اور چشم زدن میں اس سے جا ٹکرایا، ایک سماعت شکن دھماکے سے ہیلی کا پٹر کے فضا میں پر نچے اڑ گئے۔ چند ثانیے کے لیے تاریک آسمان بھی روشن ہو گیا۔

”یہ تم نے بروقت اچھا فیصلہ کیا باقر!“ ہیلی نے اس کے قریب آ کر توصیفی لہجے میں کہا، تب تک عبداللہ اور ارسلان وغیرہ بھی قریب آ چکے تھے اسی لیے باقر نے ہیلی کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنجیدہ سے لہجے میں اس سے کہا۔

”عزیزی لیلی! ہم نے شاید اپنے اہم مشن سے ہٹ کر ایک غیر متعلقہ اور غیر اہم کام میں ہاتھ ڈال کر اپنے دشمنوں کو چونکا دیا ہے، اس حملے کے بعد یقیناً انہیں ہماری یہاں موجودگی کا پتا چل گیا ہوگا اور وہ اب پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ ہمارا اصل راستہ کھوٹا کرنے کی لیے... پست ہو جائیں گے۔“ اس کی بات سن کر لیلی خاموش رہی اور

اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس نے ایک نگاہ گرد و پیش پر دوڑائی پھر باقر سے بولی۔

”کیا تم نہیں دیکھ پائے کہ یہ دشمن یہاں کس مقصد سے اترے تھے؟ اور کن پر دھاوا بولے ہوئے تھے؟“ اس کی بات پر باقر کو ایک دمچکا سا لگا، ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ معافی لیتے ہی احمد چلا یا۔

”عزیزی لیلی! وہ دیکھیے۔ میرا خیال ہے دشمن انہی پر ہٹا بولے ہوئے تھے؟“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ سب نے بیک وقت مذکورہ سمت دیکھا اور بری طرح چونکے۔ خاص طور پر لیلی کے چہرے پر ایک پر جوش تمنا ہٹ سی ابھری اور پھر وہ دیوانہ وار اس سمت میں دوڑی۔ ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ وہ ان دو افراد کو دیکھ کر چونکے تھے جو سامنے تاریکی سے نمودار ہوئے تھے، اپنی وضع قطع سے ایک لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ دوسرا اس کا ساتھی کوئی مرد تھا جسے اس نے سہارا دے رکھا تھا، جب یہ لوگ دوڑ کر ان کے قریب پہنچے تو حیرت و مسرت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ محسن اور بازغہ تھے۔

☆☆☆

ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کے داروم میں موجود جنرل آئزک فرناش کی حالت اس وقت جنونیوں کی سی ہو رہی تھی۔ اسے ابھی تک کہیں سے بھی ایسی کوئی اطلاع نہیں موصول ہو رہی تھی جو اس کے شل پڑے اعصاب اور تھجملہ ہوئے پریشان دل و دماغ کے لیے باعث تسکین ثابت ہوتا اور نہ ابھی تک اس زخمی کا پتا چل سکا تھا اور نہ ہی لمبے عیریز ناؤن کی جینی کا کچھ سراغ مل پارہا تھا کہ آخر وہ ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ کے ہاسپٹل سے کون سے مریض کو فرار کروا کے نکل بھاگی ہے؟ علاوہ ازیں ان کی تلاش میں بھیجے گئے ساتھ ٹاپ ایجنٹ بھی ایک ہیلی کا پٹر میں روانہ کیے جا چکے تھے، ان کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی خبر نہیں آرہی تھی، جبکہ اس نے انہیں سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اسے مل مل کی خبر دیتے رہیں گے۔ پھر جب خود جنرل فرناش نے پالی مور سے رابطہ کرنا چاہا تو کوشش نہ ہم کے باوجود، رابطہ نہ ہو پایا۔

اب وہ اس وقت اپنا طیش اور جنونی طعنے اتارنے کے لیے سخت بے چمن نظر آ رہا تھا اس نے اپنی ان سب ناکامیوں اور پریشانیوں کا ذمہ دار کشنر ناؤن اور اسٹیٹ کے ہاسپٹل کے ایڈمن جنرل کو ٹھہرایا اور اس کا مکروہ چہرہ غصے اور طیش کے باعث مزید بگڑ گیا، اس نے اسی وقت ان دونوں کو سر میں گولی مار دینے کے احکامات جاری کر دیے۔

تھوڑی دیر بعد اسے بتا دیا گیا کہ اس کے حکم کے

مطابق دونوں کو گولی مار کے ہلاک کر دیا گیا ہے مگر جنرل فرناش کا اہل پھر بھی کم نہیں ہوا۔ اس نے اسی وقت ایک پانچ رکنی سرچنگ ٹیم تشکیل دے کر انہیں اپنے ساتھ ٹاپ کمانڈوز ایجنٹ کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ جنہوں نے اس کی ہدایت کے مطابق غیر معمولی تیزی کے ساتھ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلد ہی اسے یہ رپورٹ پیش کر دی کہ اسٹیٹ کی حدود سے تیس، چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیلی کاپٹر کے چلے ہوئے بلے کے ساتھ ان ساتوں کمانڈوز کی بھی لاشیں پائی گئی ہیں۔ اس اطلاع نے گویا جنرل آئزک فرناش کا زورس بریک ڈاؤن کر ڈالا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی تو وہ بہ مشکل اپنی چیئر سے اٹھا اور قریب وائن کیبنٹ سے اپنے لیے ایک بوتل نکال کر فوراً اپنے منہ سے لگالی۔ کئی گھونٹ بھرنے کے بعد بھی اس کی حالت معمول پہ نہ آسکی تو اس نے اپنی میز کی ڈراز سے ایک سلور کلر کی ڈبیا نکالی، اس کے اندر ایک سرج رکھی تھی اور ایک کانچ کا دوسری سی مخلول بھرا ایمپول رکھا تھا۔ ٹورنی کٹ اور اسپرٹ بھی تھا۔ اس نے جلدی سے ٹورنی کٹ اپنے بائیں بازو پہ باندھ دیا، جس سے اس کے بازو کی نس ابھر آئی، پھر اس نے ایمپول سے سرج بھری اور اس کی سوئی اپنی ابھری ہوئی نس میں گھونپ دی۔ ساری دوا انجیکٹ کرنے کے بعد وہ قریب دھڑے بیڈ پر جا گرا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کی حالت اب بہ بتدریج معمول پہ آنے لگی تھی۔

موساد نے ڈیوڈ اسٹار کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے لیے اپنے کچھ ایجنٹ ان کی فورس میں شامل کر رکھے تھے۔ ایسی ہی فورس کے ایک آدمی نے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر سے موساد کے سیکنڈ ان ڈائریکٹر باریق شمعون کو اپنے خفیہ پیغام میں یہ رپورٹ دی کہ جنرل آئزک فرناش کو پے در پے ناکامیوں نے بری طرح اعصابی جنون میں مبتلا کر ڈالا ہے اور اس نے اپنے ہی کشنر پیریژ ناؤن اور اسٹیٹ ہاسپٹل کے ایڈمن جنرل کو گولی مار کے ہلاک کر ڈالا ہے۔ موساد ایسے کسی اقدام کے سخت خلاف ہوتی تھی جس میں اپنے ہی آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا۔ لہذا اسے جنرل فرناش کا یہ اقدام ایک آنکھ نہیں بھایا، اس نے اس کی شکایت چیف سے کر ڈالی۔ اس نے یہ معاملہ اسی کے سپرد کر دیا، کیونکہ خود موساد کا چیف اپنے ”باپ“ (ہگانہ آرمی اور یہودیوں کو اسرائیل میں ہجرت کر کے بسانے اور ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بانی، موروثی ہیرو آئزک مین بیری جونیر) کی ہدایت کے مطابق بھارت کے خفیہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ جہاں اس نے بیک وقت بھارتی خفیہ

ایجنسی ”را“ کے چیف اور بھارتی وزیراعظم سے ملاقات کرنا تھی اور انہیں پاک، چین کی گہری ہوتی دوستی پر تشویش کے علاوہ ایک ایجنڈا یہ بھی رکھنا تھا جس کے تحت اس خفیہ ”ملاقات“ کے بعد بھارت، امریکا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ پاک، چاند دوستی خطے کے امن کے لیے سخت ترین خطرے کا باعث ہے، اسرائیل جانتا تھا کہ امریکا اور بھارت کی آنکھوں میں پاک چین دوستی ہمیشہ سے کھٹکتی رہی ہے۔ خود امریکا، چین کو ایک اقتصادی، سپر پاور کے روپ میں ابھرتا ہوا دیکھ رہا تھا بھارتی اور پاکستانی امنی دھماکوں کے بعد جب امریکا کے سپریم وٹین ایکسپریٹس نے جب دونوں ممالک کے امنی دھماکوں کا موازنہ کیا تو وہ دنگ رہ گئے تھے۔

کسی وجوہ اور مصلحت کی بنا پر دنیا کے سامنے پاکستان کی خوبی چھپائی گئی۔ مگر امریکا اس تشویش میں اندر ہی اندر کھل کے رہ گیا اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی لاحق تھی کہ پاکستان اپنی یہ ٹیکنالوجی دیگر اسلامی ممالک کو نہ ٹرانسفر کر ڈالے۔ چین بھارت کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے۔ چین نے حال ہی میں بھارت میں توانائی پوری کرنے کے لیے بیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا سمجھوتا کیا۔ امریکا دہرے معیار کا ملک ہے، درحقیقت امریکا چین کی بڑھتی ہوئی معاشی اور عسکری ترقی سے خوف زدہ ہو گیا ہے اور علاقے میں بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے اس نے بھارت کا انتخاب کیا ہے۔ عالمی امن کا داعی کہلانے والے امریکا کا یہ پرانا مشغلہ ہے کہ وہ کسی بھی ملک کے لیے پہلے مسائل کھڑے کرتا ہے پھر اچھے بھلے امن پسند خطے کو انتشار کی طرف لاتا ہے، پھر اسی ملک کے مسائل کے ”حل“ اور وہاں ”امن و امان“ کے لیے بے چین بھی ہو جاتا ہے۔

اس ملک سے دشمنی، اس ملک سے دوستی۔ عالمی بساط پر بچھی یہ شطرنج کی ایسی بازی تھی جہاں خلوص سے زیادہ جنگی حکمت عملی اور مفادات کی نادیدہ زنجیروں نے ایک دوسرے کو جکڑ رکھا تھا۔

اسرائیل جو امریکا کے کاندھے پر بندوق رکھ کے چلاتا تھا اور اس کے ہر کلیدی محکموں میں گھسا بیٹھا تھا، مگر اپنی پالیسی اس سے خفیہ ہی رکھتا تھا، موساد کے چیف کا یہ دورہ بھی اس سے خفیہ رکھا گیا تھا۔

بارق شمعون، جنرل آئزک فرناش کی ان حرکتوں کی وجہ سے گہری سوچ میں پڑ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فرناش کے خلاف کون سا قدم اٹھائے؟ جبکہ یہ حقیقت وہ بھی جانتا تھا کہ جنرل فرناش کو ہگانہ آرمی کے

آنزر میں بیری جوئیر کی بھی "آشیر واؤ" حاصل تھی۔ جبکہ مملکتی عہدے داروں سے اس سلسلے میں وہ کس منہ سے بات کرتا، جنہوں نے ابتدا میں موساد کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی تھی کہ ڈیوڈ اسٹار کے قیام کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس وقت اسرائیلی پارلیمنٹ میں ان مذکورہ عہدے داروں کی تعداد کم تھی مگر اب وہ اکثریت میں بیٹھے تھے۔ باریق شمعون نے بالآخر کسی متوقع امید کے سہارے آنزر میں بیری سے ہی ملاقات کی ٹھانی۔

☆☆☆

"کیا ہوا؟ تمہارے چہرے کی رنگت بدلی ہوئی ہے، خیریت تو ہے نا عزیز زبیدہ؟" اس کے سوئٹ میں داخل ہوتے ہی خالد بن جنید نے اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت وہ چاروں ایک ہی سوئٹ میں موجود تھے۔ زبیدہ نے پہلے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اس کے بعد ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خامے اسرار بھرے لہجے میں دھیرے سے بولی۔

"لگتا ہے ہمارے علاوہ اور لوگ بھی اس کروڑ میں سفر کر رہے ہیں جن کی اصل منزل ہماری طرح کوانڈو ہے۔"

"کیا مطلب عزیز زبیدہ؟ ذرا کھل کر بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟" شیخ دانیال نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو زبیدہ نے انہیں، روجر اور چک کی گفتگو کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا، جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے سب کو سانپ سوگھ گیا۔ پھر جنید نے ہی اس پر اظہار خیال کرنے میں پہل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ کسی مافیا کے آدمی لگتے ہیں جو کسی خاص ڈینگ کے لیے کوانڈو جارہے ہیں۔"

"لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیل نے سسلی میں اپنے اس اسپاکی اسٹیشن کو اس قدر خفیہ رکھا ہوا تھا، ان کا یہ منصوبہ لیک آؤٹ کیسے ہو گیا؟" زبیدہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اٹلی اور بالخصوص سسلی پر ٹاپ پرو فیشنل مافیا کا راج ہے، آئے روز ان کی آپس میں "گینگ وار" چلتی رہتی ہیں، جو زیادہ طاقت ور گروپ ہوتے ہیں ان کی تو باقاعدہ حکومتی حلقوں تک بھی رسائی ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عمل دخل ہوتا ہے، ایسے بعض طاقت ور مافیائی گروپ بڑی بڑی اہم شخصیات سے بھتا بھی لیتے رہے ہیں۔ یہ یہاں کی ایک "اسٹیل ہڈ" صورت حال ہے۔"

خالد بن جنید نے سسلی کی مختصر سیاسی و سماجی صورت

حال... کی تصویر کشی کی تو زبیدہ ہولے سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "خوب! عزیزم خالد بن جنید یہاں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔" اس کی وجہ یہی ہے عزیز زبیدہ کہ میں پہلے بھی ایک مشن پر یہاں آچکا ہوں۔"

"گڈ، آپ کی ہم رکابی میں ہمیں بہت حوصلہ ملے گا۔" فاروق خوش دلی سے بولا۔ تو زبیدہ اسی موضوع پر آگے تبادلہ خیال کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"اب سوچنا یہ ہے کہ یہ دونوں مافیائی گمشتے روجر اور چک ہمارے لیے کس طرح سودمند ثابت ہو سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے ہمیں اٹلی میں ملنے والے اپنے سکندر نامی ساتھی کی نصیحت کو یاد رکھتے ہوئے کسی مافیائی قسم کے لوگوں سے دور رہنا چاہیے۔" خالد بن جنید نے کہا۔ ماسوائے زبیدہ کے سب نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ یہ بات خالد بن جنید کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ زبیدہ کی طرف ہلکی مسکراہٹ سے نکتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں میری بات سے اختلاف ہے؟"

"اختلاف کی کوئی خاص وجہ تو نہیں، ویسے ان لوگوں کو استمال تو کیا ہی جاسکتا ہے؟"

"وہ کیسے؟ اگر تمہارے ذہن میں ایسا کوئی لائحہ عمل ہے تو بتا سکتی ہو؟" خالد نے اس سے کہا تو زبیدہ بولی۔

"فی الحال میرے ذہن میں کوئی ایسا واضح لائحہ عمل تو نہیں آرہا ہے، البتہ ان دونوں کو چونکائے بغیر اگر ان کی خفیہ ریکی کی جائے تو آگے کچھ سوچا جاسکتا ہے۔ جہاں یہ ہمارے کام کے ثابت نہ ہو سکے ہم ان کے راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

"تو پھر یہ کام تمہیں اپنے ذمے لینا ہوگا۔" خالد نے کہا۔

"ممکن ہے ہمارے اس اہم مشن میں خاص پیش رفت ہو سکے۔"

"بالکل، میں بھی اسی خطوط پر ہی سوچ رہی تھی۔"

زبیدہ نے پورے جوش سے کہا اور اسی لہجے میں آگے بولی۔

"مجھے ان کے قریب ہونا پڑے گا، کیوں کہ یہ ان کی طے شدہ ملاقات لگتی ہے، ممکن ہے ان کی رسائی تک کوئی آسان راستہ مل جائے کوانڈو تک پہنچنے کا؟"

"کیا اس طرح آپ بھڑوں کے چھتے میں تو ہاتھ نہیں ڈال رہی ہو، عزیز زبیدہ؟" اس کے ساتھی فاروق نے اس موضوع پر پہلی بار لب کشائی کی تو زبیدہ مسکرائی۔

اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ

ڈالے بغیر بھلا کب مقصد حاصل ہوا ہے؟"

”عزیزی زبیدہ! اس پر ی پلان مشن میں کیا میں
آپ کے ہمراہ ہو سکتا ہوں؟“

”ہاں فاروق! تم میرے ساتھ آؤ گے، لیکن مجھے کور
کرنے کی حد تک۔“ زبیدہ نے کچھ سوچنے کے انداز میں
کہا۔ اس کے بعد دونوں سوٹ سے باہر آ گئے۔

عرشے پر آ کر فاروق زبیدہ کی ہدایت کے مطابق
اس سے ذرا دور ہو گیا۔ زبیدہ نے سیدھا بار روم کا رخ کیا
تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ دونوں مذکورہ مافیائی گمشتے اٹھ کر
کہاں گئے تھے۔ بار روم میں خلاف توقع ”ہلز بازی“
دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ البتہ خوش فکروں کی خاصی تعداد
وہاں موجود تھی۔

بار روم خاصا دیدہ زیب اور فینسی اسٹائل کا تھا جس کا
فرش چمکا اور شطرنج جیسی سیاہ سفید بساط جیسا تھا، لمبے
چوڑے بار کاؤنٹر کے ساتھ ساتھ سلیتے سے چھوٹے مگر آرام دہ
اسٹول رکھے ہوئے تھے۔ بار ٹینڈر ایک سرخ و سپید اور
سنہری بالوں والی اٹالین حسینہ تھی جس نے مختصر سا چست لباس
پہنا ہوا تھا، قد یوتا تھا، اس کے ہمراہ ایک کالی رنگت کا موٹا سا
گنجا آدمی بھی تھا۔ ایک حسینہ کے ساتھ ادھیڑ عمر نیکرو عجیب ہی
تاثر پیش کرتا تھا۔ ایک جانب نفیس قسم کے صوفے بھی
دھرے تھے اور قریب سینٹر میں اسنوکر کی میز تھی۔ گویا بغیر کسی
شور شرابے کے بھی بار روم کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ شوخ و
شنگ حسینائیں مردوں کے ساتھ پینے پلانے اور ”معنی خیز
اکھیلیوں میں مشغول تھیں، کچھ لوگ اسنوکر ٹیبل پر بھی کھیلنے
میں مصروف تھے۔ شہر رنگ بالوں والی، سرو قد اور دلکش خدو
خال کی مالک ایک پرکشش خاتون کو بار میں تنہا داخل ہوتے
دیکھ کر وہاں موجود کچھ ایسے لوگ اس کی طرف زیادہ دلچسپ
نظروں سے دیکھ رہے تھے جو وہاں خود بھی کسی وجہ سے اکیلے
تھے، اور رائج دستور کے مطابق زبیدہ پر اپنا حق سمجھتے ہوئے
اس پر ”قربت“ کی امید لگا رہے تھے مگر زبیدہ نے کسی کی
طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھنا گوارا نہ کیا تھا اور سیدھا جا کر
کاؤنٹر ٹاپ کے قریب دھرے ایک اسٹول پہ جا
بیٹھی۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے تو اسے نظر انداز
کر دیا، البتہ ادھیڑ عمر موٹا نیکرو فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
”ہیس میڈم؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر استفسار یہ بولا۔
”ہیسیٹن، بلیک ڈاگ، لائنم بیئر، وٹسکی، ڈاکٹر براؤنی؟“

”سافٹ ڈرنک۔“ زبیدہ نے کہا۔

”شیور! نیکرو نے ہولے سے مسکرا کر اپنے سر کو اثباتی
جنش دی تھی۔ اس کے بعد وہ اس کے لیے ایک خوب

صورت نفیس سے بلوریں پیگ میں آئیں کیوب ڈالنے
لگا، زبیدہ نے بہ ظاہریوں اسٹول پہ بیٹھے بیٹھے ایک ذرا گردن
موڑ کے پیچھے بے اعتنا سی نگاہ ڈالی اور دوسرے ہی لمحے وہ
اندر سے چونکی، ان دونوں مذکورہ مافیائی گمشتوں میں سے
ایک چمک نامی گماشتہ میز پر اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے
ایک وٹسکی کی بوتل اور دو پیگ بڑے تھے۔ ایک خالی
تھا، دوسرا ادھ بھرا، اس کا دوسرا سا تھی دکھائی نہیں دیا۔ اسی
اشٹا میں نیکرو بار ٹینڈر نے اس کے لیے سافٹ ڈرنک تیار
کر کے اس کے آگے سرکا دیا۔ زبیدہ ہلکی ہلکی چسکیاں لینے
لگی۔ اسی وقت دو تین مرد اس کے دائیں بائیں والے اسٹولز
پر آن بیٹھے اور اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے
لگے، ایک نے خاصے اوجھے انداز میں کہا بھی۔

”اتنی خوب صورت حسینہ کے ہاتھوں میں سافٹ
ڈرنک؟ اگر میری طرف سے ڈبل بلیک ڈاگ ہو جائے تو
سفر بھی حسین ہو جائے گا اور۔“

”سوری! آئی ہیو اے یو اے فرینڈ۔“ زبیدہ نے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور اپنا
پیگ لیے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دانستہ اسی جانب کو
اپنی تھی جدھر چمک اکیلا بیٹھا تھا۔ باقی اریب قریب کی میزیں
لوگوں سے پر تھیں۔

”اگر آپ برانہ مانیں تو میں ادھر بیٹھ سکتی ہوں؟“
چمک ایک جوان مرد نما، شکل صورت سے خاص نہ تھا
مگر مردانہ وجاہت کا حامل تھا، ایک جوان خوبصورت عورت
کی بات بھلا کیسے ٹھکراتا فوراً مسکرا کر بولا۔ ”اٹس مائی
پلیزر۔ ضرور، بیٹھے، پلیز۔“

”بھینکس، میں بس اپنا سافٹ ڈرنک ختم کر کے اٹھ
جاؤں گی، آپ شاید اپنی گرل فرینڈ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
زبیدہ نے مسکرا کر دانستہ کہا۔

”او۔ نو۔ نو۔ نیو۔ آئی ہیو ناٹ۔ میں بھی آپ کی طرح
اکیلا ہی ہوں۔ ویسے مجھے چمک کہتے ہیں، اینڈ یو مادام؟“

”ڈیوہرا، تم مجھے ڈیسی کہہ سکتے ہو۔ میرے مہی
(ہسپنڈ) بھی مجھے اسی نام سے ہی پکارتے ہیں۔“ زبیدہ
نے ایک دلنشیں سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے
جھوٹ بولا تو اس کی توقع کے عین مطابق چمک کی آنکھوں
میں معنی خیزی چمک ابھری۔

”او، گریٹ۔ یو میرڈ! میں اپنے اندر ایک سنسنی خیزی
محسوس کرتا ہوں جب کوئی پیپلی میرڈ خاتون مجھ سے مخاطب
ہو، ٹائس ٹو میٹ یو۔“ چمک نے اپنے دانت نکالتے ہوئے

سپانے کروں گی مگر افسوس، مجھے اب تک کوئی وفادار اور شائستہ انسان نہیں ملا۔“

اس کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی زبیدہ کی طرف مصالحت کے لیے اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ طوعاً و کرہاً زبیدہ کو بھی اس سے ہاتھ ملانا پڑا۔

پھر مسکرا کر بولی۔ ”میرڈ تو مجھے نہیں کہہ سکتے ورنہ میں اس شپ میں تنہا سفر نہیں کر رہی ہوتی۔“

”تاکس ٹو۔“ چک باچھیں پھیلا کر بولا۔ ”کمال ہے آپ جیسی حسین خاتون جس کی بیوی ہو اور وہ، کہیں اور تنہا بیٹھا ہو۔ بد قسمت انسان ہی ہو گا وہ۔“

”اسے ہر وقت مجھ سے زیادہ اپنے کاروبار کی فکر رہتی ہے۔“ زبیدہ کی بات پر چک کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک ابھری، قدرے نیچی آواز میں بولا۔

”کیا کاروبار کرتا ہے تمہارا شوہر؟“ زبیدہ اسے جس لائن پر لانا چاہا رہی تھی چک اسی جانب آ رہا تھا۔ منہ بسور کر بولی۔

”مجھے اس کے کاروبار سے کیا لینا دینا، مجھے تو اس کے ہر وقت ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے، مگر ایک وہ بے وقوف ہے کہ ایک جوان خوب صورت عورت کی تنہائی کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا اور مجھے بہلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ او، ڈی! مائی سوٹ ہارٹ! میں تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتا ہوں، تاکہ تم ملکاؤں جیسی شاہانہ زندگی گزارو، ویسے اس میں شک بھی نہیں کہ وہ مجھ پر کوئی پابندی نہیں رکھتا، وہ جب اپنے کسی بزنس ٹور پر جاتا ہے تو میرے نیے نوٹوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے، وہ بلاشبہ مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے۔ دولت میں بھی بہت کشش ہوتی ہے، اب شاید میں بھی اس کی عادی ہو گئی ہوں، مگر میری تنہائی۔“ اس نے ایک حسرت زدہ سی ہنکاری بھری اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”تمہارا شوہر کیا کاروبار کرتا ہے؟“ چک نے اپنے اندر کی سنسنی پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے پھر وہی سوال کیا، اس کی سوئی انجی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

زبیدہ اس جراثیم پیشہ مافیائی گماشتے کی نفسیاتی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”وہ سونے اور ہیروں کی کھدائی کے ٹھیکے لیتا ہے۔“

افریقا اور برازیل سے لوٹے ہوئے ابھی اسے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ وہ دوبارہ ایمازون کے جنگلوں کی خاک چھاننے کے لیے چلا گیا، مجھے بھی ساتھ لے جاتا ہے اکثر، مگر مجھے اب اس کے ساتھ خوار ہونے کا کوئی شوق نہیں، میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بار وہ کہیں گیا تو پھر میں بھی کہیں نکل جاؤں گی۔ جب تک وہ لوٹے، میں اپنی مرضی سے میر

یہ سب سن کر چک کو زبیدہ ایک سونے کی چڑیا کی صورت میں نظر آنے لگی، اسے زبیدہ ایک ایسی روایتی Rich Wife محسوس ہونے لگی جس کے پاس دولت کی کمی تو نہیں تھی مگر ہم سفر ساتھی کی وہ طلب گار ضرور تھی اور وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی ”خواتین“ اپنے پارٹنر کے انتخاب کے سلسلے میں کس قدر سخت بھی ہوتی ہیں، اس نے سوچا، آسانی اچھی ہے مگر طواغیث اکر کے کھائے گا تو اسے بہت کچھ ملے گا۔ لہذا وہ اب پہلے سے زیادہ مؤدب نظر آنے اور خود کو بھی اسی کے رنگ میں پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”مادام! کیسی عجیب بات ہے کہ میری کہانی بھی آپ کی کہانی سے مختلف نہیں، چھوڑیں، کہ میں اب کیا اپنی سیلفش بیوی کا رونا روؤں، بس مادام! مجھے اپنی اپنی طرح ایک تنہائی کا مارا ہوا انسان ہی سمجھیں، آپ نے خود دیکھ ہی لیا ہو گا کہ یہاں کتنی حسین و رنگین تیلیاں اڑتی پھر رہی ہیں مگر میں نے کسی کو منہ نہیں لگایا، اور یہاں اکیلا بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔“

”ہاؤ امیزنگ۔!“ زبیدہ کمال کی اداکاری کرتے ہوئے مسرت آمیز حیرت سے بولی۔ ”پھر تو ہم دونوں محض محاورے نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار ہوئے۔“

”آف کورس۔“

”اگر تمہارے ساتھ واقعی کوئی اور نہیں ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ ہماری اچھی گزرنی چاہیے۔“

پھر اس نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔ ”ویسے تم کہاں کا ارادہ رکھے ہوئے ہو؟“

چک نے کچھ سوچتے ہوئے شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔ ”جہاں یہ کم بخت! تقدیر لے جائے۔ اور آپ؟“

”میرا بھی وہی جواب ہے جو تمہارا ہے۔“ زبیدہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دلنشیں انداز میں مسکرائی پھر نہایت چالاکی سے گویا اسے ایک ”حد“ میں رکھنے کی غرض سے آگے بولی۔ ”ویسے تم مجھے خاصے مہذب نظر آتے ہو۔“ وہ بھی اس کے جھانسنے میں آتے ہوئے اپنا سر خم کرتے ہوئے بولا۔

”مادام! میں مہذب نظر نہیں آتا بلکہ مہذب ہوں۔“

ٹھیک اسی وقت اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے، زبیدہ کی بھی بھانپتی آنکھوں نے یہ تاڑ لیا مگر وہ لاعلم سی بیٹھی رہی، تو چک نے ایک جانب نگاہ ڈالنے کے بعد اس سے خاصی غلٹ میں کہا۔ ”مادام! پلیز ڈونٹ مائنڈ، میں

ابھی آیا، آپ یہاں سے جانا مت۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ زبیدہ اپنی گردن ذرا موڑے بہ ظاہر بے نیازی سے چک کو ایک طرف جاتا دیکھنے لگی اور پھر قدرے چونکی، جب اس نے چک کو اپنے دوسرے ساتھی روجر سے ملتے دیکھا۔ چک کی "باڈی لینگویج" سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ روجر کو اس طرف آنے سے مانع رکھے ہوئے تھا، جدھر زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ زبیدہ وزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی، صاف دکھائی دے رہا تھا کہ روجر، اپنے ساتھی چک پر کسی بات پر برہم ہو رہا تھا، پھر بڑی مشکل سے وہ اسے فارغ کر کے اس کی طرف لوٹا اور اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو کے جھینپے جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مادام! اس ڈسٹرنگ پر معافی چاہوں گا، وہ میرا دوست تھا، خفا ہو رہا تھا مجھ پر کہ میں اس کے ہمراہ بال روم میں نہیں گیا اور مجھے یہاں تمہارے ساتھ دیکر ناراض ہونے لگا کہ عورتیں تو بال روم میں بھی تھیں، اب اسے میں کیا بتاتا کہ میری طرح تم بھی ذرا مختلف نیچر کی ہو اور ہمارے ستارے آپس میں مل چکے ہیں۔"

"یقیناً، مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔" زبیدہ ایک دل آویز مسکراہٹ اس پر نچھاور کرتے ہوئے بولی تو چک ایک بار پھر محذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"آپ برا نہ منائیں تو مجھے ذرا دیر کے لیے ایکسکوز کریں، میں اپنے دوست سے مل کر اس کی ناراضگی ذرا دور کر لوں۔" اس کی بات سن کر زبیدہ نے تھوڑا سا برا منہ بنا لیا اور اسی لہجے میں اس سے شکوہ کیا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ تم بھی میری طرح اکیلے ہی شپ میں سز کر رہے ہو لیکن۔" اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو چک ذرا پریشان سا ہو گیا بولا۔ "میں نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا مادام! اکیلے سے میری مراد، میرے ساتھ کوئی ساتھی لڑکی نہیں تھی، یہ بھی بس شپ میں ہی اسنوکر کا ساتھی بننے کی وجہ سے دوست بنا تھا۔ ورنہ میرا اس سے کوئی گہرا رابطہ نہیں ہے۔"

"کلیئر۔" زبیدہ نے مسکرا کر کہا اور چک مطمئن ہو گیا۔ تاہم بولا۔ "ویسے میں پالرمواتر ونگا اور آپ؟"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم چاہو تو؟" زبیدہ نے اک اداانے دینواری سے کہا تو چک کا دل اندر سے مارے خوشی کے بتیوں اچھل پڑا، بولا۔ "اے گریٹ مادام! میرے ساتھ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

"تھینکس۔" وہ مسکرائی پھر چک جب رخصت

ہونے لگا تو زبیدہ بھی دانستہ اس کے ساتھ ہی بار روم سے نکلی اور مختصر سی راہداری سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی کھٹکتے ہوئے لہجے میں چالاکی سے بولی۔ "لگتا ہے اتفاق سے ہم دونوں کے رہائشی کیمین بھی قریب قریب ہی ہیں۔"

"ہاں شاید، میرا وہ سامنے والا کیمین ہے اور تمہارا؟" اس نے سامنے ایک بائیں جانب والے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو زبیدہ بولی۔

"میرا کیمین بھی اس کے دائیں موڑ پر ہی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا، صبح ہم اکٹھے ناشتا کریں گے، اور اس شپ کو بھی ایک ساتھ ہی الوداع کریں گے، جو ہمارے لیے بہر حال خوش قسمت ہی ثابت ہوا۔"

"بالکل! زبیدہ نے بھی اپنے سر کو۔۔۔۔۔ اثباتی جنبش دیتے ہوئے اس کے خیال کی توثیق کر ڈالی۔

زبیدہ کا ایک مقصد پورا ہو گیا تھا، پھر جب وہ اس سے ایک دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہوئی تو ذرا آگے جا کر وہ دیوار کی آڑ لے کر کھڑی ہو گئی، ایسے میں اسے اپنا ساتھی قاروق دکھائی دیا، زبیدہ نے اسے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کا مخصوص اشارہ کیا، جسے سمجھ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا تو زبیدہ تیزی کے ساتھ واپس پلٹی اور دوبارہ چک والے رہائشی کیمین کی طرف آگئی۔ ایک نگاہ گرد و پیش پر ڈالنے کے بعد اس نے دروازے سے کان لگا دیے، اور دوسرے ہی لمحے اس کے لبوں پہ عیارانہ مسکراہٹ عود کر آئی، حسب توقع اندر چک اور روجر کے درمیان گرم بحث ہو رہی تھی۔

"تم جانتے ہو، چک کہ ہم کس قدر اہم مشن پر نکلے ہوئے ہیں؟ اور تمہیں ایسے میں عشق سو جھڑپا ہے۔"

زبیدہ کو روجر کی درشت آواز سنائی دی، چک جواباً اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں ہو روجر! یہ ایک لمبا ہاتھ ثابت ہو سکتا ہے ہمارے لیے۔ وہ ایک کھرب ہتی بزنس مین کی ایسی بیوی ہے جو تنہائی کی ماری ہوئی ہے مگر محتاط بھی ہے، میں نے اسے بڑی مشکلوں سے شیشے میں اتارا ہے۔"

"اور تم اس کی تنہائیوں کے ساتھی بننا چاہتے ہو؟" روجر کی طنز میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری تو دروازے سے لگی کھڑی زبیدہ کو اندازہ ہونے لگا کہ چک کے مقابلے میں روجر ذرا محتاط آدمی ہے، پھر اسے چک کی تحمل سی آواز سنائی دی۔

"روجر! اسے رجھانے کے لیے بہ وقت ضرورت مجھے شاید یہ بھی کرنا پڑ جائے، مگر دیکھو، ایسی بات نہیں جو تم سوچ رہے ہو عورتوں کی بھلا ہمارے لیے کیا کی رہی ہے؟ مگر

یہ عورت ہمارے لیے سونے کی چڑیا ثابت ہو سکتی ہے۔“

”اپنا پلان بتاؤ۔“ بالآخر روبرو بولا۔

”گڈایہ کی نا سمجھداری کی بات، اب شاید تم میری بات صحیح طرح سمجھ پاؤ۔ بہت آسان اور سادہ پلان ہے میرا۔ اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا ہے، وہ سونے اور ہیروں کا بہت بڑا بیو پارٹی ہے، تم میرا ساتھ دو تو ہم اس سونے کی چڑیا کو یرغمال بنا لیں گے۔ اس کے بعد اس کے شوہر سے ایک لمبی رقم بہ طور تادان کا مطالبہ کریں گے۔“

”اور اس مشن کا کیا ہوگا؟ جس کے پورا ہونے کے انتظار میں باس ہمارا خطر بیٹھا ہے؟“

”پہلے باس کا مشن پورا کریں گے، اور ہم نے اس سلسلے میں کون سا پہاڑ کھودنا ہے روجر ڈیٹر! مذاکرات ہی تو کرنے جا رہے ہیں، کامیابی، ناکامی ہمارے ذمے کب ہے؟ اس کے بعد باس جانے اور وہ لوگ۔ ہم آزاد ہو جائیں گے اور پارمو سے واپس نیپلز کا رخ کریں گے، یاد ہے نا۔۔۔ ہمارا پرانا ٹھکانا، وہاں سے ہم اپنا اصل کام شروع کر دیں گے۔“

”باس کو بتائے بغیر؟“

”باس کو بتائیں گے تو ہمارے حصے میں کیا خاک آئے گا؟“

”اور اگر بعد میں باس کو پتا چل گیا تو ہمیں خاک میں ضرور ملا دے گا۔“

”ایک بڑی رقم ہتھیانے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں کسی کا کتا بننے کی ضرورت ہوگی، وہ بھی چیک ڈکراس جیسے خنزیر آدمی کا کتا، سوچو ذرا روجر! یہ بھی ہماری کوئی زندگی ہے؟ قسمت نے ہمیں غلامی کی زنجیریں توڑنے کا ایک موقع دیا ہے، اپنا کام کرنے کے بعد ہم اسٹیٹ نکل جائیں گے، وہاں ہم مل کر اپنا گینگ بنائیں گے، اس وقت اولڈ میکسیکو اس سلسلے میں بڑا زرخیز ہے۔“

”تب تک اس چڑیا کا کیا کرو گے پھر؟“

”اسے فی الحال ساتھ ہی رکھنا ہوگا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، ورنہ یہ چڑیا پھر ہو جائے گی۔“

”کیا؟ تم اسے کوانڈو لے جاؤ گے؟“

”یہی کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں سیر و تفریح کا بہانہ چل سکتا ہے۔“

”اسپاسمیل، اسے ہم پر شبہ ہو جائے گا کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں اور تمہاری ساری پلاننگ بری طرح ناکام ہو جائے گی۔“

”یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو، مذاکرات والا کام کچھ زیادہ طویل نہیں ہے، واپس نیپلز آ کر اپنے اصل منصوبے پر عمل شروع کر دیں گے۔“

”میرے ذہن میں ایک شارٹ کٹ آتا ہے۔“

”کیسا شارٹ کٹ؟“

”ہمیں کوانڈو مذاکرات کا کھڑاگ پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پارمو جانے کے بجائے نیپلز اتر جاتے ہیں اور اپنے اصل منصوبے پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی، مگر اب ممکن نہیں، ہمیں کوانڈو مذاکرات کی خانہ پری اب کرنا ہی پڑے گی، کیونکہ باس اس کا سیٹ اپ تیار کر چکا ہے اور اس کی نظریں ہم پر ہوں گی، تاخیر کی صورت میں اسے ہمارے ”سلب“ ہونے کا پتا چل جائے گا اور ہماری تلاش شروع ہو جائے گی، اس خطرناک صورت میں ہم اپنی جان بچائیں گے یا اپنے منصوبے پر عمل کریں گے؟“

”ہم۔“ روجر کی پرسوج ہمکاری خارج کرنے کی آواز ابھری۔۔۔ تو چک آگے بولا۔

”باس کا کام کرنے کے بعد باس جانے اور کوانڈو والے، ہم مذاکرات کی رپورٹ باس کو دینے کے فوراً بعد اپنا پرسنل ٹیچ لیں گے، کیونکہ ہم باس کے طریقہ کار سے واقف ہیں، وہ ایک کے بعد دوسری ذمے داری ہمارے بجائے کسی اور کے ہی سپرد کرے گا، تب تک ہم آرام سے نیپلز میں بیٹھ کر اپنے پرسنل منصوبے کو آگے بڑھائیں گے۔ ایگری؟“

چک نے اپنی بات مکمل کی تو روجر کی بھی پر جوش سی آواز ابھری۔ ”ایگریڈ، اینڈ ڈن۔“

زبیدہ جب وہاں سے ہٹ کر اپنے کیمین پہنچی تو کامیابی کے جوش تلے اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا، اس کے ساتھیوں، بالخصوص خالد بن جنید نے اس کی ذہنی فراست کی تعریف کی۔

”یہ لوگ پہلے ہی کوانڈو جانے کا ایک سیٹ اپ تیار کر چکے ہیں۔“ زبیدہ نے منصوبے سے انہیں مزید آگاہ کرتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا اور آگے بولی۔ ”اور کوانڈو پہنچے تک ان کا یہ ”سیٹ اپ“ چونکہ پہلے سے تیار اور طے شدہ اور نسبتاً آسان ہوگا، ہمیں اس سے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مشن کو آگے بڑھانا ہوگا، اس طرح ہمارا بہت سا وقت بھی بچ جائے گا اور ان کے طے شدہ اور محفوظ شارٹ کٹ سے ہم بھی کوانڈو پہنچ جائیں گے۔“

اس کے بعد زبیدہ انہیں باقی کی گفتگو سے آگاہ

کرنے لگی۔

صبح کاذب کی ایک چمکتی، سنہری دھوپ میں یہ لوگ سسلی کے دارالحکومت اور بندرگاہ ”پارمو“ پر اتر چکے تھے۔

☆☆☆

اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کو جینی بہت پہلے اپنے باپ جان فسویٹر کی محکماتی ”جانبداری“ سمیت، ڈاکٹر کمال کے حادثے والی رپورٹ، موٹر ویکل کولیزن اینڈ ایکسیڈنٹل کیس (motor vehicle collisions and accidental case) بشمول معنی گواہوں اور ڈی کارلو کی چہرہ دستیوں کے متعلق پوری تفصیل کے ساتھ آگاہی دے چکی تھی۔ جینی نے یہ رپورٹ آن لائن کی تھی اور اس کے بارے میں ڈاکٹر کمال کو ابھی نہیں بتایا تھا۔ چیف انسپکٹر آف اسکاٹ لینڈ یارڈ نے جینی کو ایک ری پلائی کیا کہ وہ اس سلسلے میں ساری ”مینوئل رپورٹ“ لے کر، اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ہیڈ کوارٹر ”وہاٹ ہال پولیس“ پہنچ جائے۔

جینی کو احساس تھا کہ اگر اس کی انکوائری ہوگئی تو اس کے باپ کے خلاف محکمہ جاتی ایکشن لیا جاسکتا ہے۔ اور نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑ سکتے تھے لیکن جینی یہ بھی جانتی تھی کہ اس ”جانبداری“ میں اس کا باپ سٹر جان ملوث نہیں تھا وہ تو صرف رابطے کا کام کر رہا تھا اور ”اوپر“ سے اسے جو حکم دیا جارہا تھا وہ اس پر عمل کرنے پر مجبور تھا، اسی لیے اگر عتاب آیا تو اس کے باپ پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر آئے گا، جو کسی سیاسی مصلحت کے تحت شریںڈی کارلو کو بچانا چاہتے تھے۔

حماد اندال جو پہلے جینی کی طرف سے بددلی کا شکار تھا، اس کی اس کوششوں کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ جینی بھی دھن کی پکی نگلی تھی اس نے بالآخر کمال کو قائل کر کے ہی چھوڑا، پھر ایک روز یہ تینوں دوست اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ہیڈ کوارٹر، وہاٹ ہال پولیس جا پہنچے۔ جینی نے مذکورہ کیس سے متعلق قائل پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے چیف پولیس انسپکٹر نے غور سے ان کی باتیں سنیں پھر تقریباً گھنٹے بھر تک وہ کیس کا مطالعہ کرتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے تفتیشی لائحہ عمل کے لیے ان سے چوبیس گھنٹے کا وقت مانگا، یہ مدت گزرتے ہی ڈی کارلو کو گرفتار کر لیا گیا۔ سارے ثبوت اس کے خلاف جاتے تھے، یقین ڈیوڈ، جو ڈی کارلو کا باپ تھا جس کے لیے مذکور ہو چکا تھا کہ وہ ماضی میں برٹش پارلیمنٹ میں اقلیتی امور کا وزیر رہ چکا تھا، ساتھ ہی جیوش ہوم کو بھی لیڈ کرتا تھا، ایک یہودی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوا اپنی ذات میں ایک مکمل نیم ہوتا ہے اور

اس کے خیر میں یہ بات تہ شدہ ہوتی ہے کہ وہ موساد کا آلہ کار اور اپنے وطن اسرائیل کا جاسوس ہے جب نیتن ڈیوڈ برطانیہ میں اپنی پارلیمانی مدت پوری کر چکا تو موساد کی طرف سے اسے الیابیتھ کے دیرینہ کار پر امریکا روانہ کیا گیا، جیوش ہوم کی صورت میں جہاں بہت پہلے سے اس کی سیاسی ساکھ قائم تھی، اسے امریکی پارلیمنٹ میں شمولیت ملی اور وہ ہنگامہ کی کاؤنٹر انٹیلی جنس الیابیتھ کے آلہ کار کی حیثیت سے وہاں کام کرنے لگا۔ لہذا جب امریکی پارلیمنٹ میں موجود.... ڈی کارلو کے باپ، نیتن ڈیوڈ کو اپنے بیٹے کی گرفتاری کی خبر ہوئی تو اس نے پہلے متعلقہ محکمے اور پھر بعد میں اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کیں تو اسے اپنے بیٹے ڈی کارلو اور پاکستانی اسکالر ڈاکٹر کمال احمد کے درمیان ”چپقلش“ کا پتا چلا، نیتن ڈیوڈ خود بھی ایک کٹر اور متعصب یہودی تھا اور امریکی پارلیمنٹ میں موجود الیابیتھ کی ”ڈکٹیشن“ پر موساد کے لیے کام کرتا تھا۔ نیتن کارلو کا اپنا ماضی سان فرانسسکو کے ایک گھنٹا سے ساحلی علاقے ”کیوٹی“ سے شروع ہوا تھا۔ نیتن ڈیوڈ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کے ماں باپ اس سے پہلے جرمنی میں رہتے تھے جہاں انہیں وہاں بسنے والے چند دیگر یہودی خاندانوں کی طرح سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد سے جہاں دیگر یہودی خاندان بڑی مشکلوں سے چھپ چھا کر اور اپنی جانیں بچا کر وہاں سے ہجرت کر کے امریکا پہنچے تو نیتن کے ماں باپ بھی اس میں شامل تھے، یہاں بھی ان کی زندگی کسمپرسی کا نمونہ رہی مگر یہاں انہیں جرمنی کے مقابلے میں بہر حال امان تھی کیوں کہ جرمنی میں یہودیوں کو سخت نفرت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایڈلوف ہٹلر نے جب ہزاروں یہودیوں کو ایک سیلن زدہ تہ خانے میں ”گسل“ دینے کے بہانے ان پر زہریلی گیس چھوڑ دی تھی تو اس کے اس لرزہ خیز ظلم پر بڑی لے دے ہوئی تھی اس پر ہٹلر نے چند مسمی بھر یہودیوں کو آزاد کر دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ ضرب الشال جملہ بھی کہا تھا کہ ”دنیا دیکھے گی کہ میں یہودیوں کو ہلاک کر کے ظلم کر رہا تھا یا دنیا پر احسان، بہت جلد تم ان کی عالمی کارستانیاں دیکھو گے۔“

بعد میں عالمی مبھروں نے تسلیم کیا تھا کہ عالمی جنگ انہی کی کارروائیوں کے باعث ہوئی تھی اور آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ اسرائیل اب بھی وہی کچھ کر رہا ہے، وہ دھیرے دھیرے ایک بار پھر دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر دھکیل رہا ہے۔

یہودی قوم مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ وہ کسی کے بھی

دوست نہیں ہیں، وہ صرف اپنے اور اپنی قوم کے دوست ہیں، اپنے حلیفوں کو بھی وہ اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہیں اور بس، بلکہ اکثر اپنے وسیع تر مفادات کی خاطر انہیں بھی ”چونا“ لگانے سے نہیں چوکتے۔

بہر طور پانی کے ایک دخانی بحری جہاز میں یہ دونوں میاں بیوی سان فرانسسکو پہنچے اور کیوبی کے ہی ساحلی علاقے میں ایک ٹین کے ڈربا نما گھر میں رہائش اختیار کی، یہاں ٹین کا باپ ساحل پر ہی بار برداری کی نوکری کرنے لگا مگر وہ اب اکثر بیمار رہنے لگا تھا، یوں اس کی بیوی گھٹیا قحبہ خانوں میں ویٹریس کی نوکری کرنے لگی، ٹین نو عمر تھا، وہ اس زندگی سے سخت نفرت کرتا تھا، اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، امریکا میں وہ تعلیم یافتہ لوگوں کی وقعت سے آگاہ تھا۔ ٹین بلا کا چالاک، موقع پرست اور چال باز، چرب زبان تھا، اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں نے اسے مزید پڑھنے کے لیے شہر کی ایک بڑی یونیورسٹی میں داخل کروا دیا تھا، یونیورسٹی میں داخلے کے بعد اس نے گھر اور اپنے ماں باپ کو بھلا دیا اور وہیں کا ہو کے رہ گیا، وہیں اس نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور پھر اپنے ہمنواؤں کی مدد سے وہ بتدریج اوج حاصل کرتا چلا گیا۔ وہیں اس نے جیوش ہوم کی باگ سنبھالی تھی، پھر اس کی ”خدمات“ کو دیکھتے ہوئے موساد نے اسے برطانیہ روانگی کا حکم دیا کہ وہاں بھی وہ ان کے وسیع تر مفادات کے لیے جیوش ہوم کو ”فعال“ کرے اور یہی اس نے کیا، پھر اسے واپس امریکا بلا لیا گیا، ٹین ڈیوڈ خود بھی یہی چاہتا تھا، کیونکہ اسے برطانیہ کے مقابلے میں امریکا میں بیٹھ کر ”کھل“ کے کام کرنے کے مواقع ملتے تھے۔

بہر طور ایک مسلم اور وہ بھی پاکستانی اسکالر کے ہاتھوں اپنے بیٹے کی یہ ہزیمت اسے برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے ڈاکٹر کمال کے خلاف اپنے اختیارات کا استعمال شروع کر دیا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب ڈاکٹر کمال کو اس بین الاقوامی تعلیمی ادارے ”لینڈز یونیورسٹی“ سے نکالوا کر دم لے گا۔ اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اس کے بیٹے پر ڈاکٹر کمال کو کار سے نگر مار کے ہلاک کرنے کا الزام بھی لگا ہے اور اس پر اب ”اقدام قتل“ کا مقدمہ بننے والا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے لندن اپنے بیٹے سے فون پر بات کی جو اس وقت اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کے حوالے تھا۔ اسے ”تسلیاں“ دینے کے بعد اس نے اپنے بیٹے کی ”نیل“ کے لیے لندن کے ہی ایک قابل وکیل کو ہار

کیا تا کہ قانونی طور پر وہ اس کا مقدمہ لڑ سکے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے خود ساختہ دو عدالتی بھی لندن روانہ کر دیے۔ یہ سارے کام نمٹانے کے بعد وہ ہنگامی بنیاد پر ایک روزہ ذاتی دورے پر اسرائیل روانہ ہو گیا۔ وہاں اس مکار شخص نے پہلے تو اس سلسلے میں ایک مختصر اور عمومی ملاقات موساد کے بارق شمعون سے کی پھر ہگانہ کے سربراہ آنر مین بیرری جونیر سے تفصیلی ملاقات کی۔ جب وہ اسرائیل سے واپس امریکا روانہ ہو رہا تھا تو بڑا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ وہ، ہگانہ کے سربراہ کی نظروں میں اپنے بیٹے کی ”قابل فخر“ کارکردگی گوش گزار کر کے اس کی مدد اور غیر معمولی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی اسے اب اطمینان بھی تھا کہ لندن میں موجود گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں مصروف ”ٹن بیٹھ“ اس کے بیٹے کا اب وہاں خاطر خواہ دفاع کر سکتی تھی۔

لہذا ٹن بیٹھ کی مادام میڈوسا کو ٹین ڈیوڈ کے دورے کے بعد ہی آنر مین بیرری کی جانب سے ہاٹ لائن پر ڈی کارلو کے حوالے سے اور اس کے ”تحفظ کے سلسلے میں پیغام موصول ہوا۔

مادام میڈوسا، جو پہلے ہی ایک دیرینہ مقصد کی خاطر جزیرہ کوڈی کارلو کی مدد کے لیے لالچی تھی اس پیغام کے فوراً بعد اس نے جزیرہ کو طلب کر کے اس سلسلے میں مزید بریف کر دیا جبکہ سیکریٹ کاؤنٹر یونٹ کے دوسرے انچارج بالی مور کو اس نے جزیرہ سے ہٹا کر ایک اور اہم مشن سونپ دیا کہ وہ جلد سے جلد یہاں خفیہ طور پر سرگرم اس سورسز کا پتا چلائے جو کہ فلسطینی حریت پسندوں کو آئی آر اے (آر ایس آر ای) (پبلک آرمی) کے تعاون سے سپورٹ کر رہی تھی۔ وہ فلسطینی مجاہدین کی اس سورسز کا جلد سے جلد قلع قمع کرنے کے لیے بے تاب تھی، کیونکہ اسے وہ لرزا دینے والا لہجہ ابھی تک نہیں بھولا تھا جب ہگانہ کے آنر مین بیرری جونیر نے اس کے اس ”سورسز“ والے انکشاف کے بعد، اس پر مارے طیش کے پستول تان لیا تھا کہ اس کی (ٹن بیٹھ کی) موجودگی کے باوجود یہ فلسطینی سورسز اب تک وہاں کیوں فعال تھی؟ تاہم اب مادام میڈوسا کی گھاگ نگاہیں محسوس کر رہی تھیں کہ ممکن ہے ڈی کارلو اور ڈاکٹر کمال والے کیس کی وجہ سے یہ خفیہ سورسز حرکت میں ضرور آ سکتی ہے اور یہی وہ موقع ہو گا جب اس پر ہاتھ ڈالا جاسکے گا۔ یہ سب کر چکنے کے بعد وہ خود ”مرینہ“ والے اپنے منصوبے کے اگلے مرحلے کے بارے میں غور کرنے لگی۔ جس میں وہ فیری

جانتے وہ ایک کتنی بڑی درسگاہ میں زیر تعلیم ہے، اس کا کیریئر تباہ ہو کر رہ جائے گا، اس کا مستقبل داؤ پر لگ سکتا ہے، بلکہ لگ چکا ہے۔“

”ج۔ج۔ج۔ جناب! کوئی عام وکیل تو یہ بھی نہیں کروا سکتا، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔“

بیرسٹر ہاکن بوکھلا کر بولا۔ ”آپ کے بیٹے کے خلاف

motor vehicle collisions and

accidental case کا مقدمہ بے حد مضبوط اور ٹھوس

دلائل پر بنا ہے، خدا کرے کہ وہ بری ہو جائے تو اس پر بھی شکر

بجالائیے گا۔“ ہاکن نے بھی آخر میں نیتن کو ایک تلخ حقیقت

سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھا تھا اور پھر اسے کیس کی مختصر تفصیل

سے بھی آگاہ کر دیا، جسے سن کر نیتن ڈیوڈ کے بھی ہوش ٹھکانے

آگئے۔ اسے اندازہ ہوا کہ جو ہاکن نے کیا، یہ بھی کم نہ تھا۔

بطور اسے مزید اس سلسلے میں ہدایت دینے کے بعد اس نے

سلسلہ منقطع کر دیا۔

ڈی کارلو کی حالت اپنے باپ سے بھی زیادہ پر غیظ

ہو رہی تھی، اس نے ڈاکٹر کمال کے خلاف یونیورسٹی میں

نفرت و ذاتی بغض کا جو غبار اپنے سینے میں بھر رکھا تھا اس

میں مزید اضافہ ہونے لگا تھا، بلکہ اب تو معاملہ ذاتی رنجش

سے بڑھ کر جانی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اس کی ڈاکٹر کمال کے

خلاف ہر وہ کوشش بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئی تھی

جس سے کمال کو یونیورسٹی میں بدنام کرانا مقصود تھا، اس کے

برعکس وہ خود اپنے کالے کرتوتوں کے باعث اپنے ہی

کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرا تھا۔ ابھی اسے کورٹ کی

طرف سے سزا تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے وکیل بیرسٹر

ہاکن نے اس کی تیل پر رہائی ملنے کے بعد اسے یہ تنبیہ ضرور

کر ڈالی تھی کہ اسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، جب تک کہ

اس پر لگا الزام دھل نہیں جاتا، یہ صورت دیگر کیس ابھی

عدالت میں چل رہا تھا، اسے کڑی سزا ہو سکتی تھی۔ مگر ڈی

کارلو کا سینہ اس وقت ڈاکٹر کمال کے خلاف نفرت و غیظ سے

بھرا ہوا تھا۔ وہ اس سے انتقام لینے کے لیے سخت بے چین

تھا، تیل پر اپنی رہائی کو وہ موقع غنیمت جانے ہوئے

تھا۔ اس جنون میں اس نے اپنے باپ کے ہائر کردہ وکیل کی

نصیحت کو بھی درخور اعتنا نہیں جانا اور ڈاکٹر کمال سے نمٹنے کے

لیے نئے دجھے جھکنڈوں پر غور و خوض کرنے لگا۔

ڈی کارلو کو پڑھائی وڑھائی سے کوئی شغف نہ

تھا، امریکا کے مقابلے میں اسے لندن کی فضا زیادہ اچھی لگتی

تھی۔ ماں کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا اور وہ لندن میں

میں کے اصول (ڈمن کو اسی کا بھیس بھر کے دھوکے سے مارنا) کو آزمایا ہی تھی، یعنی ایک برقع پوش مسلم خاتون کے روپ میں وہ ڈاکٹر کمال کو دھوکا دیتے ہوئے اس کے گرد ایک جال بن رہی تھی۔ مادام میڈوسا بڑی ذہانت، مکاری اور چال بازی کے ساتھ لندن میں بیٹھی بڑے مربوط طریقے سے اپنے مشن کی چوکھی چال چلنے میں مصروف کار تھی۔

ادھر جینی کی ذاتی کوششیں اس حد تک تو رنگ لائی

تھیں کہ بالآخر شر پسند ڈی کارلو کو گرفتار کر لیا گیا

تھا۔ یونیورسٹی میں اس کا نام خراب ریکارڈ کی زد میں آ گیا

تھا، وہ جو کڑھا ڈاکٹر کمال کے لیے کھود رہا تھا، اس میں وہ خود

گر پڑا تھا۔ لیڈز یونیورسٹی ایک بین الاقوامی سطح کا تعلیمی

ادارہ تھا، عالمی سطح پر اس کی ایک ساکھ تھی، اس کے اسکالرز

یا اسٹوڈنٹس کی کسی غیر قانونی سرگرمی میں ذرا سی بھی

غیر احتیاطی قطعاً برداشت نہیں کی جاتی تھی اور فوراً اسے

یونیورسٹی سے خارج کر دیا جاتا تھا، یہی نہیں بلکہ اسکالرز

کو ڈی پورٹ بھی کر دیا تھا مگر یہاں ڈی کارلو کا معاملہ مختلف

تھا، وہ عام شخصیت کے زمرے میں نہیں آتا تھا مگر اب

یہاں بھی معاملہ یونیورسٹی کی بین الاقوامی ساکھ کا تھا اسے داؤ

پہ نہیں لگایا جاسکتا تھا، لہذا اس سلسلے میں یونیورسٹی انتظامیہ

نے ایک مینٹگ بھی کی جس میں ڈی کارلو کی پولیس حوالگی

زیر بحث رہی تھی۔ ڈی کارلو کو اب مزید ڈھیل نہیں دی

جاسکتی تھی، نہ ہی اس کے حق میں اب اور کوئی جانب داری

برتی جاسکتی تھی۔ اگلی مینٹگ میں لندن کے میئر کو بھی شامل کیا

گیا تھا۔ بالآخر اس فیصلے کو کورٹ کے فیصلے کے آنے تک

محفوظ رکھنے پر اتفاق کر کے مینٹگ برخاست کر دی گئی۔

ادھر نیتن ڈیوڈ کے ہائر کردہ وکیل اپنی سی سر توڑ

کوششوں سے ڈی کارلو کی ضمانت تو کروانے میں کامیاب

ہو گیا مگر اس کا کیس ختم نہیں کرا سکا۔ جبکہ ڈی کارلو کی ضمانت

بھی مشروط ہوئی تھی۔ یعنی کیس کا کوئی فیصلہ ہونے تک ڈی

کارلو شہر تو کجا وہ علاقہ تک چھوڑ کر جانے کا مجاز نہیں ہو سکتا

تھا، جہاں وہ رہتا تھا۔ اس طرح کی ”مشروط“ ضمانتیں

مغربی معاشرے میں ملزم کو آدھا مجرم تو قرار ہی دیتی

تھیں خواہ بعد میں فیصلہ اس کے حق میں ہی کیوں نہ ہو۔ نیتن

ڈیوڈ کو جب یہ پتا چلا تو اس نے اپنے وکیل بیرسٹر ہاکن کی

فون پر ہی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی۔

”تمہیں کس الو کے پٹھے نے بیرسٹر بنایا ہے؟ لندن

کے کتوں نے شور نہیں مچایا تمہاری جھوٹی شہرت پر، یہ کس

طرح کی ضمانت کروائی ہے تم نے میرے بیٹے کی؟ تم نہیں

ڈائریکٹر ایک اسرائیلی خاتون ہے، نام مادام میڈوسا ہے، اس سے جا کر ایک ملاقات کرلو، وہاں یہ تمہارا مکمل تحفظ کرے گی، میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں، اوکے۔“
اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا، کارلو نے وہ ایڈریس نوٹ کر لیا تھا۔

جینی کی ان کاوشوں پر حماد اور ڈاکٹر کمال دونوں اس کے ممنون تھے، حماد کی بہن حبیبہ کی شادی حماد کی واپسی پر مشروط تھی، اسی لیے وہ عراق جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا، وہ بے حد خوش تھا جبکہ اس سے زیادہ خوش جینی اور کمال ہو رہے تھے، بلکہ جینی تو کچھ زیادہ ہی ایکسائٹڈ ہو رہی تھی، یہ قول اس کے، یہ سفر اس کے لیے ایک یادگار اور نہ بھولنے والا سفر ثابت ہو سکتا تھا، نیز وہ بہت انجوائے بھی کرے گی مگر جانے کیا بات تھی کہ حماد ایک عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار ہو رہا تھا، سفر کی شاپنگ تینوں دوستوں نے بے حد خوشی خوشی اور اکٹھے کی تھی۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب یہ تینوں دوست عراق روانہ ہونے کے لیے ایک بھگی بھگی شام میں لندن کے ہتھروڈ ایئرپورٹ پہنچے، جینی اور ڈاکٹر کمال کے سفری کاغذات کا بندوبست وغیرہ حماد نے بہ آسانی کر دیا تھا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ حماد اندال نے Metallurgy میں انجینئرنگ کی تھی اور اب یہاں لندن لیڈز یونیورسٹی میں سبجیکٹ اسپیشلائزیشن کی غرض سے آیا ہوا تھا، یہ اسکا لرتو نہیں تھا، تاہم اپنے خرچے پر یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا خاندانی بیک گراؤ نہ خاصا مضبوط تھا، جو عراق کے شہر بغداد کے مشہور اور پوش علاقے ”النصور“ میں رہائش پذیر تھا، اس خاندان کا شمار بغداد کے متمول اور معزز گھرانوں میں ہوتا تھا، حماد کا باپ شامل اندال بغداد میں ایک اعلیٰ اور کلیدی اہمیت کے حامل عہدے پر فائز تھا۔ حماد کی والدہ ام کلثوم بھی ”موصل“ کے ایک معزز قبائلی سردار خاندان سے تعلق رکھتی تھی، جو ایک اچھی وفا شعار بیوی اور ماں بھی تھی۔ بہر طور لندن سے عراق تک قطراٹریز کی بھی فلائٹ تھی، دستیاب آر لائن میں اس وقت تین فلائٹس تھیں۔ انہوں نے دوسری فلائٹ کا انتخاب کیا تھا۔ ویسے لندن سے عراق کا فاصلہ تقریباً دو ہزار پانچ سو بیالیس میل (چار ہزار نوے کلومیٹر) تھا۔

تینوں دوست اس سفر میں ایک عجیب سی اور جداگانہ سنسنی سی محسوس کر رہے تھے۔ حماد کے لیے تو اس لیے یہ سفر خوش کن ثابت ہو رہا تھا کہ اس کے ہمراہ جینی اور ڈاکٹر کمال

ہی دفن تھی، اب اس کا دل بھی ادھر ہی لگتا تھا۔ اس کے آوارہ اہباش دوستوں کی یہاں کوئی کمی نہ تھی۔
ادھر بیرسٹر ہاکن کو بھی ڈی کارلو کے اندرونی اہال کا شاید اندازہ ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اسے نصیحت کرنے کے باوجود اس کے باپ نیتن ڈیوڈ کو بھی حفظ ماتقدم کے تحت ایک عدد دفن کھڑکا دیا کہ وہ خود بھی اپنے بیٹے کو ایسی نازک صورت حال میں اپنی طرف سے بھی نصیحت کا حق ادا کر دے، نیتن نے یہی کیا۔
جس وقت ڈی کارلو اپنی رہائش گاہ میں بیٹھا، ڈاکٹر کمال سے انتقام لینے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا، اسے اپنے باپ کا فون موصول ہوا۔
”ہیلو! مائی سن، کارلو!“

”ہیس ڈیڈ!“ وہ بے دلی سے بولا۔ باپ کو اس کے لہجے میں چھپی ایک سنگتی ہوئی تپش کا احساس ہوا، بولا۔
”مائی سن! ابی کیئر فل اینڈ کول ڈاؤن۔ جب تک تمہارا کیس ختم نہیں ہو جاتا، خود کو کول مائنڈ رکھو۔“
”ڈیڈ میں ڈاکٹر کمال کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا، دیش اٹ۔“ ڈی کارلو کے اندر بھرا ہوا زہر بالآخر زبان پہ آ گیا۔
”شیور۔ اٹ دل بی اسپین، بٹ میں اس زندہ کو مردہ بنا دوں گا، میرے ہوتے ہوئے تم اس بات کی فکر کیوں کرتے ہو؟“ دوسری طرف سے نیتن کی زہر میں بجھی مشتملانہ آواز ابھری۔ ”تم کیا کرو گے اس کا؟ زیادہ سے زیادہ۔ اسے گولی مار کر ہلاک کرو گے؟ مگر جو میں اس کے ساتھ کرنے والا ہوں وہ تم دیکھنا، اس سے تمہارا سیروں خون بڑھے گا، اسی لیے مائی سن! ابھی اپنا خون مت جلاؤ۔“
”ڈیڈ! میں یہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا ہوں۔“ ڈی کارلو پر غیظ لہجے میں بولا۔

”تمہارے ہاتھوں سے ہی سب ہوگا، مگر ابھی ذرا صبر سے کام لو۔“ دوسری طرف سے نیتن نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش چاہی۔ ”مت بھولو کہ تم اس وقت لندن میں ہو اور تمہارا کیس دنیا کی مشہور پولیس اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سپرد کیا جا چکا ہے، امریکا میں یہ سب کچھ ہوتا تو اور بات تھی، مگر اس کے باوجود میں نے اتنا تمہارا دفاع کیا کہ سٹی پولیس کو تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ ہو سکے اور ایسا ہوا بھی مگر۔“

وہ دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک ٹائیے کے لیے تھما، بھر بولا۔ ”خیر میں نے کہا مائی سن! ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ، میں یہ سب دیکھ لوں گا تم ایک کام کرو، ایک ایڈریس نوٹ کر دو، یہ ڈیکسا میٹھ ان کارپوریشنڈ کمپنی ہے، اس کی

گھٹنے ہو چکے تھے۔ کمال نے حماد کی بات سن کر یوں ہی جینی کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا، جو اس کے ساتھ کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر تارکی میں تیرتے کالے بادلوں کو دیکھنے میں محو تھی۔

پھر اس نے گردن موڑ کر حماد سے دھیمی آواز میں کہا۔
”حماد! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں، خدا خیر کرے گا۔“

”ہاں! میں بھی یہی دعا کرتا ہوں دوست کہ خدا سب خیر ہی کرے۔“

”دیکھو! ابھی جینی سے اس قسم کی کوئی بات مت کرنا۔ ویسے تو بڑے حوصلے والی ہے لیکن اس طرح کی سیاسی صورت حال تو اچھے بھلے آدمی کو بھی پریشان کر ڈالتی ہے یہ تو پھر ایک نازک اندام عورت ہے، تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟“ اس کی بات پر حماد اندال نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی پھر بولا۔

”خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ ہم بغداد کے ائر پورٹ پر اتریں اور خدا نخواستہ ہم پر بمباری شروع ہو جائے، میں ویسے ہی عراق کی تازہ صورت حال کی بات کر رہا تھا۔“

جہاز کچھ دیر کے لیے ترکی پر اتر اس کے بعد وہ بغداد کے ائر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔

بغداد اس وقت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ائر پورٹ کے باہر ایک بھاری بھر کم گاڑی انہیں لینے آئی تھی، ایک ڈرائیور اور دو عدد مسکے گاڑ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چوتھا شخص ایک ٹھکنے قد اور سرخ و سپید رنگت کا آدمی تھا، اس نے مخصوص وردی نما سا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا، جسے حماد نے ”انکل سعد“ کے نام سے پکارا تھا اور بڑے احترام کے ساتھ ان سے بغلیں ہوا تھا، چہرے مہرے سے وہ ایک بردبار اور ذمے دار آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ کمال اور جینی بھی اس سے ملے۔ غائبانہ تعارف تو ان کا ہو چکا تھا، البتہ حماد نے انہیں بتایا کہ انکل سعد بے ان کے والد شامل اندال کے آفیشل سیکریٹری ہیں، اور ان کے گھر کے فرد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

کمال کو محسوس ہوا جیسے سعد بے کچھ غلبت کا شکار تھا۔ اس نے وہاں زیادہ گفتگو سے اعتراف ہی برتا تھا۔
بہر طور یہ سب اس بڑی سی بھاری بھر کم مگر خاصی آرام دہ جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

سفر کے دوران ہی حماد نے سعد بے سے اپنے گھر والوں کی خیر خیریت کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا

جیسے دوست بھی ہم رکاب تھے۔ جبکہ کمال اور جینی کے لیے تو ویسے ہی یہ سفر منفرد اور نیا تھا کہ وہ دونوں پہلی بار عراق عازم سفر ہو رہے تھے۔

دوران سفر، شاید جینی نے تو نہیں البتہ ڈاکٹر کمال نے حماد کے چہرے سے گاہے بے گاہے مترشح ہونے والے تاثرات ضرور بھانپ لیے تھے، بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔
”کیا بات ہے دوست! تم کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے کھو سے جاتے ہو؟ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ؟“ چونکہ یہ دونوں اب اس کے ایک طرح سے مہمان بھی تھے، جانے یہ لوگ کیا سمجھیں؟ حماد کو اپنی نامعلوم سی اس بے چینی کے بارے میں بتانا ہی پڑا، بولا۔

”کچھ خاص تو نہیں دوست! بس، ویسے ہی۔ جب میں نے گھر ٹیلی فون پر بات کی تھی اور اپنے گھر والوں کو یہ بتایا کہ میرے دو دوست بھی ساتھ آرہے ہیں تو انہیں یہ جان کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ خاص کر میری چھوٹی بہن نے تو اس بات پر بہت مسرت کا بھی اظہار کیا تھا، وہ سب آپ دونوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے چین اور چشم ماروٹن دل ماشاد کیے بیٹھے ہیں، لیکن۔“

وہ اتنا کہہ کر رکا تو کمال بہ دستور اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے تکتا رہا، حماد چند ثانیے تھم کر بولا۔

”والد عزیزم سے بھی میری بات ہوئی تھی، مگر مجھ سے انہوں نے کوئی پریشانی والی بات نہ کی، بلکہ مجھ سے کیا وہ گھر میں کسی سے بھی اپنی کوئی پریشانی شیئر ہی نہیں کرتے ہیں، یہ تو عزیزی والدہ ہیں جو ان کے ساتھ ایک گہری ہم آہنگی رکھتی ہیں، ان سے کوئی بات نہیں چھپی رہتی، تاہم مجھ سے بھی انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا، میرے والد چونکہ بغداد میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں، انہی سے پتا چلا ہے کہ عراق کی سیاسی فضا ایک بار پھر دگرگوں ہونے لگی ہے، کچھ اشارہ ایسا ملتا ہے کہ دوبارہ وہی کہانی عراق کے ساتھ دہرائی جانے والی ہے، یعنی کچھ عاقبت نااندیش عراقی جرنیل ایک بار پھر ”کٹھ پتلی“ کا رول پلے کرنے والے ہیں جس کی وجہ سے بغداد اور عراق کے آسمان پر ایک بار پھر جنگ کے بادل منڈلانے لگے ہیں، بس یا کمال! دعا کرو۔ سب ٹھیک رہے، بس! یہی وجہ تھی میرے پریشان ہونے کی، تم سے ذکر اس لیے نہیں کیا کہ جانے تم کیا سمجھو؟“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا، تو کمال کے چہرے پر بھی سنجیدگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

جہاز کو لندن پہنچا اور پورٹ سے ٹیک آف کیے دو

تھا، اور سعد بے اسے انتہائی مختصر جوابات دے رہا تھا، یہاں تک کہ حماد نے ہی چپ ساہلی۔ اسے بغداد کی سڑکوں پر جانے کیوں غیر معمولی سننا محسوس ہوا، اگرچہ رات کافی بیت چکی تھی لیکن پھر بھی اسے پہلے کے مقابلے میں یہ سب کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا، حتیٰ کہ بغداد شہر بھی ایک نامعلوم سی خاموشی میں ڈوبا ہوا سا لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک پوش علاقے میں داخل ہوئی۔ اور اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک بڑے سے قلعہ نما حویلی کے بلند وبالا چوٹی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

ہشت فروزاں سے بنی یہ قلعہ نما حویلی بلاشبہ قدیم و جدید تعمیر صناعی کا شاہکار نظر آتی تھی۔ حماد کے لیے تو اس میں کوئی نیا پن نہ تھا، مگر حویلی کے گرد بنی چہار دیواری۔۔۔ بہر حال اس کے لیے نئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر کمال اور جینی کے لیے یہ سب کی الف لیلوی محل سے کم نہیں تھا، ان دونوں کی آنکھوں سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔ جب وہ اندر پہنچے تو ان پر ایک سحر کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ پرانے وقتوں کے کسی پادشاہ کے محل میں آگئے ہوں، یہاں آکر کمال اور جینی کو حماد اندال کی حیثیت اور امارت کا اندازہ ہوا تھا کہ وہ کتنے بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بلند وبالا دروہام، سنگ مرمر کے چکراتے زینے، دیباہ حریر کے خوش نما ویدہ زیب پردے۔ خوبصورت محرابیں، غلام گردشیں اور فرش پر بچھے نرم و گرم غالیچے، جھتوں پر جھولتے مور کے پنکھ کی طرح بڑے بڑے کرشل فالوس، اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا دیدہ زیب و بیش قیمت فرنیچر۔ ایک نسبتاً بڑے ہال نما کمرے میں انہی دیواروں سے خاندان کے پرکھوں کی رعونت آمیز اور رعب دار تصویریں بھی آویزاں نظر آئیں۔

یہ بڑی آرام دہ اور برعیش نشست گاہ تھی جو شاید بیک وقت مہمان خانے کا بھی منظر پیش کرتی تھی کیوں کہ اس کے ایک جانب بڑی بڑی عمرابی چوکھٹوں والے دروازے بھی نظر آ رہے تھے۔ کچھ خدام اور خادماہیں بھی نظر آ رہی تھیں، جو کمال اور جینی کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آ رہے تھے۔ ان دونوں کو دہاں بیٹھا دیا گیا اور حماد خود ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حماد اپنے گھر والوں سمیت دوبارہ ان کے پاس آ گیا۔ اس کے ہمراہ تین افراد تھے۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹی جوان بہن حبیبہ بھی، جو ایک معصوم صورت اور درسیا نے قد کی خوب صورت و دشیزہ

ہی نظر آتی تھی۔ بال شہد رنگ کے لمبے اور گھنے تھے۔ جسم صحت مند تھا۔ وہ رات کی مناسبت سے بھی اچھے ہی لباس میں تھی جو عراقی اور مغلیہ طرز امتزاج کا نمونہ نظر آتا تھا، جس میں کلا سک ٹیچ نمایاں تھا، حماد کی ماں بھی ایک باوقار خاتون کے روپ میں تھی۔ شامل اندال بھی کمال کو ایک پروقار اور سنجیدہ مزاج انسان کے روپ میں دکھائی دیے تھے، اخلاق کے بھی اچھے انسان ثابت ہوئے، ان سب نے ڈاکٹر کمال اور جینی کا بڑی محبت اور آداب میزبانی کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ حبیبہ تو جینی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ رات کافی ہو گئی تھی، اس لیے کچھ زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکا، تاہم اس کے باوجود کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ چونکہ ان کے بھی حماد کے ساتھ آنے کی انہیں اطلاع تھی، اسی لیے ان کی رہائش وغیرہ کا بھی بندوبست پہلے ہی سے کیا جا چکا تھا۔ جینی کو تو حبیبہ اپنے ساتھ ہی زنان خانے میں لے گئی جبکہ کمال کے لیے مہمان گاہ میں ہی ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔

اگلی صبح ان سب نے ایک بڑی سی میز پر اکٹھے اور گھر کے فرد کی طرح ناشتا کیا، جو بہت پر تکلف تھا، ناشتے کی ٹیبل پر بہت سی باتیں بھی ہوتی رہیں، جو زیادہ تر پڑھائی وغیرہ سے متعلق تھیں، اس کے بعد حماد نے اپنے باپ سے عراق کی تازہ سیاسی صورت حال کا موضوع چھیڑا، جس پر پہلے انہوں نے کترانے کی کوشش چاہی مگر جب حماد نے انہیں کمال اور بالخصوص جینی کے بارے میں اعتماد میں لیا تو بے اختیار مسکرا کے انہوں نے پہلے کمال اور جینی کی طرف دیکھا پھر اپنے بیٹے حماد سے شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ”بیٹے! میں صرف تمہیں جانتا ہوں، اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری دوستی کی کسوٹی کس قدر سخت اور محتاط ہے اور تم خود بھی ایک ذمے دار انسان ہو، رہی بات تمہارے ان معزز دوستوں کی تو میری بات یہ دونوں بھی سمجھ چکے ہوں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے تھمے پھر بولے۔

”تم نے صحیح اندازہ لگا یا بیٹا! افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ ہم نے ماضی سے سبق نہیں سیکھا، پھر اقتدار کا نشہ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے وفاداروں کی تمیز کھودیتا ہے، اب بھی یہی کچھ ہونے چلا ہے، اسرائیل کی آنکھ میں جو اسلامی ممالک شروع سے ہی کھکتے رہے ہیں ان میں عراق سرفہرست رہا ہے، اور امریکا اس کا ہمنوا رہا ہے، مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ خود ہماری صفوں میں میر صادق اور میر جعفر جیسے غدار گھسے بیٹھے ہیں، یہ وہ مار آستین ہیں جنہوں نے پہلے بھی

رہے تھے۔ ذہنی و نظریاتی ہم آہنگی کے باعث یہ ان کا بھی پسندیدہ موضوع تھا۔ کمال سے نہ رہا گیا، وہ بھی اس اہم گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ”آخر ہر بار عراق کو ہی کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے؟“

”اسرائیل کی وجہ سے، کیونکہ اسرائیل کو اس وقت فوری طور پر جس ملک سے اپنی سلامتی کا خطرہ ہے وہ عراق ہی ہے۔“ حماد اندال کی ماں ام کلثوم نے کہا۔ وہ عراق کے ایک غیور اور محب وطن سردار کی بیٹی تھیں، ان کے دل میں بھی اپنے وطن کا درد جوش مارنا فطری بات تھی، بولیں۔

”یہ ہماری تاریخ ہے کہ بغداد پہلی بار نہیں لٹا۔ 1285ء میں ہلاکو خان نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے پندرہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کروا دیا۔ کتب خانے جلا دیے گئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ 1401ء میں بغداد نے پھر تیورنگ کی صورت میں اس عذاب کا سامنا کیا تھا۔ اور ایک صدی بعد 1508ء میں مغربی حکمران شاہ اسماعیل نے بغداد پر قابض ہو کر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔“

”1534ء میں عثمانی خلافت یہاں آئی تو مسلمانوں نے کچھ سکون کا سانس لیا لیکن 1622ء میں پھر ایرانی حکمران شاہ عباس اول نے اپنے پیش رو شاہ اسماعیل کی تاریخ دہرائی اور 1638ء میں خدا خدا کر کے سلطان مراد نے یہاں عثمانی خلافت قائم کی تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا مگر بچو! ہماری بد بختی یہ ہے کہ بغداد کو اپنوں سے زیادہ غیروں نے لوٹا۔ یہ لٹیرے بھی تو غیر ملکی نہیں ہیں۔ بغداد کے مضافات میں سے بھی یہاں لوٹ مار کرنے آتے ہیں۔ ہماری بد اعمالیوں کی سزا ہے یہ۔ کاش! ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے ہی سبق سیکھا ہوتا اور مسلمان اپنی ہی تاریخ سے سبق سیکھ لیں۔“ ام کلثوم ٹھٹھکی سی ہونے لگیں تو حماد نے موضوع سخن فوراً اپنی بہن حبیبہ کی شادی کی طرف موڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کے بولا۔

”بھئی اب جنگوں کی باتیں، جنگجو جانیں ہم تو اپنی پیاری سی بہنا کو دلہنیا کے روپ میں دیکھنے کی خواہش دل میں لیے اتنی دور سے آئے ہیں، اب ذرا اس سلسلے میں بھی گفتگو ہو جائے۔“

حبیبہ شرما کے اندر کمرے میں بھاگ گئی، سب اس کی اس روایتی معصوم ادا پر ہنس دیے تو ام کلثوم نے ہنستے ہوئے، جینی کو حبیبہ کے پیچھے جانے کا کہا۔ جینی تو پہلے ہی تیار تھی، یوں بھی ساری رات دونوں آپس میں یوں کھل مل کر باتیں کرتی رہی تھیں۔ بالآخر ایک دوسرے کو جانتی

عراقی صدر کو بڑی بڑی بڑکیں مارنے پر اکسایا لہذا عراق نے کویت پر چڑھائی کر دی۔ دنیا جنگ کے دہانے پہ آکھڑی ہوئی، دشمنان اسلام اسرائیل کو موقع ملا جو پہلے ہی عربوں کا جانی دشمن تھا، امریکا سمیت اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق پر چڑھ دوڑا۔

اب پھر وہی کھیل کھیلا جانے والا ہے، بلکہ ہمیں تو یہاں تک بھی خبر ملی ہے کہ دو عراقی جرنیل ہی آئی اے سے بھی مل چکے ہیں اور اسرائیل کی سہ پر امریکا عراق پر دو واضح الزام عائد کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ بین الاقوامی قوانین کے برخلاف عراق کے پاس کیمیائی اور وسیع تباہی پھیلانے والا اسلحہ ہے۔ دوسرے یہ کہ عراقی عوام کو عراقی صدر کے ظلم و جبر سے نجات دلانا، جہاں گزشتہ پینتیس برسوں سے مسلسل انسانی حقوق پامال کیے جا رہے ہیں جبکہ عراق اور ایران کی دس سالہ جنگ میں ان اہمیتوں کا استعمال کی اجازت خود امریکا نے دی تھی۔ امریکا نہ صرف خاموش رہا بلکہ جو ممالک ان ہتھیاروں کے غیر قانونی استعمال پر چیخ رہے تھے، ان کے الزامات بھی مسترد کرتا رہا۔ گویا امریکا اس طرح کل عالم اسلامی پر اپنا فوجی قبضہ چاہتا ہے، ساتھ ہی خام تیل کے ذخائر پر قبضہ جمانا اور اسرائیل کے لیے بقا کی ضمانت اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانا، نیز دریائے نیل سے دریائے فرات تک اسرائیل کی رسائی کرانا ہے۔ جبکہ اسلامی بیداری کا قلع قمع کرنا تو اس کا اہم منشور ہے۔“

”مگر عزیزم والد! عراقی صدر کے پاس بھی آپ جیسے وفاداروں کی کمی نہیں، کیا بھی آپ لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ آخر کیوں بار بار صیہونی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔“

حماد نے باپ سے کہا، ناشائستہ کیا جا چکا تھا اور یہ لوگ ایک کشادہ نشست گاہ میں آکر بیٹھ چکے تھے، بیٹے کی بات پر شامل اندال کے چہرے پہ ایک غمناک سی جھجکی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔ ”ہماری باتوں کو وہ خاطر میں لائے جب نا، بلکہ اب تو خود صدر صاحب کے وفادار بھی ان سے کئی کترانے لگے ہیں، شاید میری طرح انہوں نے بھی جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے دیکھ لیے ہیں۔“

”تو پھر اس کا مطلب ہے اگر خدا نخواستہ ایسی ویسی بات ہوئی تو آپ کو بھی خطرہ ہے۔“

”اللہ نہ کرے عزیز! لیکن اگر ایسا ہوا تو ہم بھی کب محفوظ ہیں۔“ حماد اندال کی ماں نے درمیان میں کہا۔ ڈاکٹر کمال اور جینی بڑے غور و فکر سے ان کی گفتگو سن

ہوں، غلوں اور محبت کی یہی تو پہچان ہوتی ہے کہ غیر بھی اپنے سے لگتے ہیں۔ حبیبہ نے جینی کو شرماتے ہوئے اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں بھی بتایا تھا، جینی کو اس کے شرمانے کی یہ ادا بہت بھانے لگی تھی۔

بہر طور وہ دن ان تینوں دوستوں نے بغداد کی سیر سپانے میں گزارا، ملکی سیاسی حالات اور حماد کے باپ کے ذمے دار عہدے کے باعث ان کے ہمراہ دو مسلح گارڈز بھی تھے، جبکہ سجدے بھی ان کے ساتھ تھا، انہوں نے میوزیم کی سیر کی، بازار دیکھے، یہ سب کمال اور بالخصوص جینی کو بڑا طلسماتی اور انتہائی سحر انگیز لگ رہا تھا۔ عراق کی فضا انہیں نیم صحرائی محسوس ہو رہی تھی۔

ان کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے حماد بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ انہیں اپنے وطن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جس کے مطابق عراق کا قدیم نام جو یونانیوں نے اسے دیا تھا وہ ”میسو پوٹیمیا“ تھا جس کا مطلب دو دریاؤں (فرات اور دجلہ) کا شہر ہے۔

عراق ایشیا کا اہم عرب اور مسلمان ملک ہے، تیل کے ذخائر میں دنیا میں دوسرے نمبر پر اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے جنوب میں کویت اور سعودی عرب، مغرب میں اردن، شمال مغرب میں شام، شمال میں ترکی اور مشرق میں ایران ہے۔ اسے ایک محدود سمندری رسائی بھی حاصل ہے جو خلیج فارس کے ساحل ام قصر میں ہے جو بصرہ سے قریب ہے، عراق دنیا کے قدیم ترین ممالک میں شامل ہے جس نے کئی تہذیبوں کو جنم دیا، فلسطین کی طرح اسے انبیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس کے شہر ”قرنہ“ کو اپنا وطن بنایا تھا۔ عراق کا دارالحکومت بغداد ہے۔ جو اس کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کے علاوہ، کوفہ، بصرہ، کربلا، سامرا، موصل، کرکوک اس کے مشہور شہر ہیں۔ بابل، بصری، اکادی اور اسیریا کی تہذیبیں اسی علاقے میں پروان چڑھیں اور فنا ہوئیں۔ مسلمانوں نے ساتویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ فتح کیا تھا، مسلمانوں کے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کے شہر ”کوفہ“ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کے بعد عربوں نے اموی اور عباسی سلطنت کی صورت میں عراق پر حکومت کی۔ عباسیوں نے پہلی بار بغداد کو دارالحکومت بنایا۔ 1258ء عیسوی میں منگولوں نے ہر لوخان کی قیادت میں بغداد کو تاراج کیا۔

اس کے بعد یہ سوہویں صدی عیسوی میں عثمانی سلطنت کا حصہ بنا، جس کی یہ حیثیت جنگ عظیم اول تک برقرار رہی۔ جنگ عظیم اول کے دوران برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں فرانس اور برطانیہ نے بندر بانٹ کر کے مشرق وسطیٰ کے حصے بخرے کر دیے۔ 1932ء میں انگریزوں نے اسے آزادی دی مگر عراق میں برطانیہ کے فوجی اڈے برقرار رہے اور اصل طاقت اسی کے پاس تھی جنگ عظیم دوم کے بعد امریکا کا اثر اس خطے میں بڑھنا شروع ہوا۔

14 جولائی، 1958ء میں بریگیڈیئر جنرل عبدالکریم قاسم اور کرمل عبدالسلام عارف کی قیادت میں عراقی فوج نے انقلاب برپا کیا اور عراقی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے عراق کو جمہوریہ قرار دیا اور معاہدہ بغداد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بریگیڈیئر جنرل عبدالکریم قاسم اور کرمل عبدالسلام عارف میں بعد میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ 1963ء میں ایک اور فوجی بغاوت میں بعث پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور کرمل عبدالسلام عارف کو صدر بنا دیا گیا۔ یہ وہی پارٹی تھی جس کے رکن صدام حسین بعد میں صدر بن گئے۔

حماد خاموش ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کمال اور جینی بہت اٹھاک سے اس کی بات سننے میں محو تھے۔ پھر وہ یونہی مسکرا کر ان سے بولا۔ ”میں بھی کیا لمبی چوڑی تاریخ لے کر بیٹھ گیا، تم بھی بور ہوئے۔“

”ہرگز نہیں۔“ ڈاکٹر کمال نے فوراً کہا۔ ”ہمیں حقائق سے آگاہی ہونی چاہیے، اس سے ایک منبوط دلیل جنم لیتی ہے، ہم کسی کے ساتھ مدلل گفتگو کر سکتے ہیں کہ ہم محض لکیر کے فقیر نہیں ہیں بلکہ حقائق جان کر کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں، امریکا اور اسرائیل پوری دنیا میں کیا گل کھلاتے پھر رہے ہیں، دلیل کے ساتھ اس کی آگاہی لازماً ہونی چاہیے۔“

جینی نے بھی کمال کی بات سے اتفاق کیا، تاہم اس نے ایک تلخ نکتہ کی طرف بھی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک بات اپنی جگہ مسلمہ ہے، تم دونوں روشن خیال ہو، شاید میری بات سے اتفاق کرو؟ ان ساری ریشہ دوانیوں میں انہوں کی عاقبت نااندیشی کا بھی ضرور عمل دخل ہوتا ہے۔“

دونوں کو اس کی بات سے اتفاق کرنا پڑا تھا۔

حبیبہ کی شادی سے متعلق سارے انتظامات ہو چکے تھے۔ اس کے ہونے والے شوہر کا نام احمد حمادی تھا، اس کا باپ ایک تاجر تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا، بغداد کا ہی رہنے والا تھا۔ حماد نے اس سے بھی ان دونوں کو ملوایا، وہ بھی ان

اس قدر highly کیوں کر رکھا ہے؟
 ”کیپٹن! یہ آبدوز ہی نہیں بلکہ ایک چلتا پھرتا ایٹمی
 ری ایکٹر بھی ہے۔“ کوچ جن جوابا بولا۔
 ”ہم کافی عرصے سے سمندر گردی میں مصروف
 ہیں، اس سارے سسٹم کو ری کولنگ کی ضرورت پڑتی رہتی
 ہے، اگرچہ میں نے اس کا بھی خاطر خواہ بندوبست کر رکھا
 ہے لیکن، ایک معمولی خرابی کے باعث۔“ وہ کیپٹن کو اس
 خرابی سے متعلق بتانے لگا، جسے عابد بھی غور سے سن رہا تھا۔
 ”اوکے۔ اوکے۔“

بزر میں پریمان کی مفاہمانہ آواز ابھری۔
 ”تم ایسی ہدایات کے مجاز ہو جن! تم بھی محتاط رہو،
 ہم جلد ان دونوں مہم بنٹھوں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔“
 ادھر عابد کے دل و دماغ میں زبردست ہلچل مچی ہوئی
 تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کوچ جن نے کپتان پریمان سے
 جس معمولی خرابی کا ذکر کیا تھا، عابد اس کے محرکات پر غور
 کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس معمولی خرابی کو
 ”خاص“ بنادے، جسے بتانا اس کے لیے کیا بلکہ ایک عام آدمی
 کے لیے بھی مشکل نہ تھا، تو یقیناً یہ اسرائیلی آبدوز چشم زدن میں
 جہنم کا نمونہ بن جائے گی مگر عابد اور نائمہ بھی اس میں جھسم
 ہونے سے نہیں بچ سکتے تھے، اور عابد انہی عوامل پر غور کر رہا تھا
 کہ، کچھ ایسا ہو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاکھی بھی نہ ٹوٹے۔
 ”خبردار! اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت، ورنہ بھیجا اڑا
 دوں گا تمہارا۔“

دفعۃً عابد کی سماعت سے ایک سانپ کی طرح
 بھنکارتی آواز نکلرائی اور ساتھ ہی ایک سرد ٹال بھی اس کی
 گھنٹی سے آن لگی تھی۔

☆☆☆

بھیڑ بے جیسی غراہٹ سے مشابہ اس آواز کو سن کر نائمہ
 ہی نہیں بلکہ عابد جیسا آہنی اعصاب کا مالک شخص بھی ایک
 لمحے کولرز گیا۔ غالباً یہ وہی آدمی تھا، جو ذرا دیر پہلے والٹ نمبر
 3 کے silos میں پب چلا رہا تھا۔ اور جسے کوچ جن نے
 دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا۔ پتا نہیں کس طرح لوٹنے
 وقت اس کی نظر ان دونوں پر پڑی تھی۔

”شیر! ادھر آؤ“ ساتھ ہی وہ حلق پھاڑ کے چلایا بھی تھا۔
 ٹھیک اسی وقت نائمہ نے، جو اس دوران غیر محسوس
 انداز میں بیٹھے بیٹھے ہی کچھ اس پوزیشن میں ہو گئی تھی کہ اس
 کی ٹانگ جب حرکت میں آئی تو وہ سیدھی اس آدمی کی

سے مل کے خوش ہوا تھا۔ اچھا وجہ یہ تو جوان تھا، اس کے
 باپ جمشید حمادی سے بھی ملاقات ہوئی، وہ ایک پچاس پچپن
 سالہ خوش اخلاق آدمی تھا مگر وہ بھی انہیں، حماد کے باپ
 شائل کی طرح ملکی حالات پر کچھ فکر مند دکھائی دیا تھا۔
 اس کی زبان پر بھی بار بار عراق کی تیرہ و تار ہوتی
 سیاسی فضا اور کسی بھی وقت بغاوت پھوٹ پڑنے کی باتیں
 تھیں، بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہہ رہا تھا کہ کسی بھی وقت
 امریکا اور اس کے اتحادی عراق پر چڑھ دوڑنے کے لیے
 تیار بیٹھے تھے۔

یہی محسوس ہوتا تھا کہ اسی وجہ کے تحت، شادی کی
 تقریب کو سادگی سے نمٹانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، یوں لگتا تھا
 جیسے یہ دونوں خاندان جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش
 ہونا چاہتے ہوں۔

شادی کی تقریب میں ابھی دو روز باقی تھے، جب
 متوقع ہنگامی حالات نے اچانک سر اٹھالیا۔

امریکا نے عراق کے تمام فضائی راستے بند کر دیے۔
 جس وقت کمال اور جینی حماد کے حویلی نما گھر میں
 تھے، آدمی رات کو سعد بے کی اچانک آمد نے سب کو
 پریشان کر ڈالا، اس نے حماد کے باپ شائل کو بغاوت
 پھوٹنے کی تشویشناک اطلاع سے آگاہ کیا نیز مشورہ بھی دیا
 کہ اسی وقت وہ اپنے خاندان سمیت اس قلعہ نما حویلی کو
 چھوڑ کر کہیں اور نکل جائے۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد کوچ جن کپتان پریمان سے انٹر کام
 پر بات کر رہا تھا، اس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ عابد
 کی گھنٹی اور نائمہ اس کے کپار ٹنٹ میں موجود تھے، اور
 دونوں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اس ایٹمی آبدوز کو تباہ
 کرنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک گوشے
 میں دبکے بیٹھے، موقع کے منتظر تھے اور اس کی وہ گفتگو بھی
 بغور سن رہے تھے جو وہ اس وقت آبدوز کے کپتان پریمان
 سے کر رہا تھا۔

”نو..... نو..... سر! میں اس کی ہرگز اجازت نہیں
 دے سکتا۔ ان دونوں (عابد اور نائمہ) پر بغیر کوئی ہتھیار
 چلائے پکڑنا ہوگا، آبدوز کے اندر کسی قسم کی معمولی آتش
 گیری بھی اسے فنا کر ڈالے گی۔“

”میری کوشش یہی ہوگی، جن!“ بزر میں کپتان
 پریمان کی بھاری آواز ابھری تھی۔

”مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ سارا وہی سسٹم

ٹانگوں کے بیچ میں پڑی، ضرب زوردار تھی جس کے باعث وہ آدمی درد سے دہرا ہوا اور تب عابد نے بھی حرکت میں آنے میں دیر نہیں لگائی، اس کا ہاتھ اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو نائمہ ہرگز ایسا خطرناک رسک نہیں لیتی، کیونکہ اس شخص نے اپنے پستول کی ٹال عابد کی کینٹینی سے لگا رکھی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اس ضرب کے ساتھ ہی غصے میں لیبلی دبا دیتا، لیکن ذرا دیر پہلے ہونے والی ان لوگوں کی گفتگو سے انہیں بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ کم از کم اس ”والٹ“ میں گولی چلانا کس قدر سنگین اور خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

عابد کا ہاتھ تکتے ہی اس آدمی کا پستول چھوٹ گیا، نائمہ کے ”بگ ٹو“ والے مخصوص جوتے کی ضرب نے اس آدمی کو شاید ”اندر“ تک توڑ کے رکھ ڈالا تھا، عابد کے دوسرے گھونٹے نے اسے والٹ کی دیوار سے ٹکرا کے فرش بوس کر ڈالا تھا، اس ”کھڑبڑ“ پر جب تک کوچ جن اور اس کے باقی دو ساتھی سنبھلتے، عابد ان کے جہنم واصل ساتھیوں سے حاصل کی ہوئی گن ان پر تان چکا تھا، ان تینوں کو جیسے یکلخت سانپ سونگھ گیا تھا۔

اسی دوران عابد پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ اس کے پاؤں کے نشان دروازے سے یہاں تک چلے آ رہے تھے، جو انہی کے ساتھیوں کی لاشوں کے خون سے لت پت تھے، جس سے پہلے والے آدمی کو ان کی یہاں موجودگی کا پتا چلا تھا۔

”خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔“

عابد نے ان تینوں دم پہ خود کھڑے اسرائیلیوں سے خوں خوار لہجے میں کہا۔ تو کوچ جن بڑی زہریلی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”انجام تو تمہارا بھی بڑا بھیانک ہوگا، بہتر یہی ہے کہ۔“

اس کی آواز درمیان میں ہی دب گئی۔ کیونکہ اسی لمحے عابد کی ٹانگ تیزی سے حرکت میں آئی تھی اور کوچ جن کراہ نما آواز کے ساتھ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا تھا اور عقب میں بے مثل پورڈ سے جا لگرایا تھا۔ عابد کی لات اس کے سینے پہ لگی تھی۔

”کستے! اب اگر تو نے فضول بکواس کی تو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“ عابد نے وحشت جنوں خیز لہجے میں اسے گھور کر کہا۔ ”نقطہ اتنا سن لے کہ ہم اس وقت اپنے سر

سے کفن باندھے ہوئے ہیں، اب اگر میری مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو میں اس آبدوز کو جہنم کا نمونہ بنا دوں گا۔“

عابد کے لہجے کی قطعیت گھن گرج نے کوچ جن سمیت اس کے دونوں ساتھیوں کو اچھی طرح یہ باور کرا دیا تھا کہ معاملہ ان کی سوچ سے بھی زیادہ سنگین تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب ان کے بشروں سے ٹپکتی غیظ و نفرت، گہری تشویش میں بدل چکی تھی۔ اس دوران نائمہ نے بڑی پھرتی کے ساتھ ان کے سامنے کا گرا ہوا پستول اچک لیا تھا۔

”تت۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ بالآخر کوچ جن کو سنبھلتے ہوئے کہنا پڑا تو عابد زہر خند مسکراہٹ سے بولا۔

”گڈ! ایسا ہی چلنا چاہیے۔“ اس کا بے پروا انداز ان پر یہ نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے کافی تھا کہ انہیں واقعی اپنی جانوں کی پروا نہ تھی۔

”اسی وقت کیپٹن سے بات کرو اور اس سے کہو کہ آبدوز کو سمندر کی تہ میں لے جانے کا حکم صادر کرے اور ہمارے خلاف کسی بھی قسم کے کمانڈو ایکشن کا خیال تک اپنے دل میں نہ لائے۔ جسٹ، ڈاؤن آؤ۔“

عابد نے اس سے تحکمانہ کہا۔ کوچ جن نے فوراً اس کی تعمیل کی۔ انٹرکام پر اس نے کیپٹن پر ایمان سے بات کی اور نہایت مختصر انداز میں اسے پہلے یہاں کی ”صورت حال“ اور پھر عابد کے حکم کے متعلق بتا دیا۔ کیپٹن پر ایمان نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نیز اس نے کوچ جن سے کہا کہ وہ خود عابد سے بات کرنا چاہتا ہے۔

کوچ جن نے اس کی بات عابد کے سامنے دہرا دی اور ساتھ ہی انٹرکام کا مائک اور اسپیکر بھی وائڈ کر دیا۔

”میں کیپٹن پر ایمان، تم سے مخاطب ہوں۔ یعنی طور پر تمہارا تعلق فلسطینی حریت پسندوں سے ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں اس قسم کی کسی سرفروشی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہاری کسی قسم کی مہم جوئی، آبدوز میں کھسے بیٹھے تمہارے دوسرے ساتھیوں کے لیے بھی موت کا سبب بن جائے گی، بہتر یہی ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سمیت سرنڈر کر دو۔“

کیپٹن پر ایمان کی آواز نغوت آمیز رعونت سے بھرپور تھی، ساتھ ہی اس کے لہجے سے غرور اور طاقت کا گھمبڑ بھی مترشح تھا۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ عابد کے اور ساتھی بھی اس آبدوز میں کھس آئے تھے اور مزید یہ کہ عابد کم از کم اپنے ساتھیوں کی موت کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

”کیپٹن پر ایمان! کسی زعم اور بھول میں مت رہنا، اگر جنگ چاہتے ہو تو یہی کسی، ہم تیار ہیں، لیکن اس

جنگ کا نتیجہ صرف تمہاری بربادی ہی نکلے گا، ہم تو یوں بھی مر سے کفن باندھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ہمارے لیے پھر بھی یہ سودا کھانے کا سودا نہیں ہوگا، مگر جنگ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا، میں اور اس آبدوز میں موجود میرے ساتھی تمہارے اس چلتے پھرتے ایٹمی ری ایکٹر کے لیے بم ثابت ہو سکتے ہیں۔“ اپنے خیالی ساتھیوں کا اس نے بھی حوالہ جاری رکھنا ضروری سمجھا تھا، ظاہر ہے، پریمانن یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس اسرائیل کی اس اہم ترین آبدوز میں داخل ہونا معمولی بات نہیں تھی اور نہ ہی ایسی مضبوط اور مربوط بلاٹنگ اکیلے انسان کے بس کی بات ہو سکتی تھی۔ اب یہ انہیں کیا پتا تھا کہ عابد اور نائمہ کس طرح نادانستگی اور حادثاتی طور پر اس میں داخل ہوئے تھے۔

آگوسٹ 29 کے کیپٹن پریمانن اور عابد شکھری کے درمیان یہ ڈائیلاگ جاری تھی اور کوچ جن کے چہرے سے تشویش فزوں تر ہوتی دکھائی دے رہی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک طرف کیپٹن پریمانن کی گفتگو سے خوف کھا رہا تھا اور دوسری طرف اسے عابد کے پختہ عزائم کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔

”آفسر کوچ جن! تم نے ان کی کسی گیدڑ بھیگی میں نہیں آنا ہے۔“ دفعتاً کیپٹن پریمانن کی دوبارہ آواز ابھری۔ ”تم جانتے ہونا کہ یہ آبدوز تمہارے ملک و قوم کا کتنا قیمتی سرمایہ ہے۔ خبردار! چاہے تمہیں جان سے ہی کیوں نہ جانا پڑے، مگر اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا، میں ابھی کمانڈوز روانہ کرتا ہوں۔“

”کیپٹن! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ معا کوچ جن تقریباً چلا کر بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پریمانن سے کہنا چاہ رہا ہو کہ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ یا تمہاری عقل گھاس چرنے لگی ہے۔“

”ان کے عزائم بہت خطرناک ہیں، والٹ میں بار بار silos کے پمپ چلانے کی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ نائٹزک ایڈ بننے کا خطرہ بڑھ جائے گا اور...“

”یوفول!“ کیپٹن پریمانن کی غصیلی آواز ابھری۔ ”اپنی کسی کمزوری کا اظہار مت کرو اور ان کی کوئی بات نہیں مانتی ہے تمہیں۔ اس عظیم آبدوز کو میں ان کے لیے جو ہے دان بنادوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

کیپٹن پریمانن عابد کی سوچ سے بڑھ کے نہایت چالاک اور مکار ثابت ہوا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ عابد

دامن بچا کے اپنا مشن پورا کرنے کا قائل تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹنے پائے، اس کی وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو، یہ اس کا اپنا نظریہ تھا۔

یہی سبب تھا کہ اندر سے وہ کچھ تشویش کا شکار بھی ہوا تھا، مگر اس کا اظہار کیے بغیر وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کوچ جن سے بولا۔

”تمہارا یہ سر پھرا کیپٹن، نہ صرف تم سب کو مردائے گا بلکہ اس آبدوز کو بھی ہمارے ہاتھوں بھسم کر دے گا۔“

”دیکھو! مذاکرات ہوتے رہیں گے، میں ابھی نائب کیپٹان پیٹرنوٹ سے بات کرنے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ کوچ جن نے عابد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت silos میں پمپ چلانے کی از حد ضرورت ہے، ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔“

”پہلے نائب کیپٹن سے بات کرو، پھر اس کے بارے میں سوچیں گے۔“ عابد نے کبھیر لہجہ میں اس سے کہا۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو آخر۔ اگر پمپ...“

”شٹ اپ!“ عابد حلق کے بل دھاڑا۔ ”جسٹ، ڈو ات، واٹ آئی سے یو؟“

کوچ جن کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی تھی۔ بولا۔

”اوکے۔ اوکے۔ پھر کم از کم مجھے ایٹمی ری ایکٹر بند کرنے دو، تاکہ مذاکرات کے دوران دھیرے دھیرے خطرے کی طرف تونہ بڑھ پائیں۔“

اس کی بات پر ایک بار پھر عابد اس سے کوئی درشت بات کرنے والا تھا کہ اچانک اس کے قریب، محتاط کھڑی نائمہ نے مداخلت کی، موجودہ صورت حال کو دھیرے دھیرے خطرے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر، ایسے میں اس کا ذہن بھی اتار چڑھاؤ کا شکار تھا۔ وہ کوچ جن کی طرف دیکھتے ہوئے پرسوج انداز میں اپنی بھویں سکیڑ کر اس سے بولی۔

”یہ بہتر رہے گا۔ مگر ایٹمی ری ایکٹر کا آن آف سسٹم کدھر ہے؟ ہم تمہیں باہر تو بالکل نہیں نکلے دیں گے۔“

”ری ایکٹر کا ”والو“ نیچے ہے، جو ایک مخصوص آلے کی مدد سے کھلتا ہے۔“ وہ بولا۔ سخت بہ لخت کوچ جن کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک وپن آفسر تھا اور ”بارود“ کب اپنے لیے خطرناک ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ ایک ”اسکل پرونر“ کے ماسوائے کوئی نہیں لگا سکتا اور وہ ایک ایسا ہی آدمی تھا۔

”وہ آلہ کدھر ہے؟ ممکن ہے مجھے تمہارے ساتھ جانا پڑے۔“ نائمہ بولی، عابد کو اپنی ساتھی کی بات پر کھٹک ہوئی

”مائی گاڈ! ی ی ی... یہ... خطرے کا الارم ہے۔ ت۔ تم۔ پاگل ہو گئے ہو۔ مم۔ میں۔ ابھی بات کرتا ہوں۔“ کوچ جن لرزتی آواز میں بولا۔ اس کے بعد اس نے انٹرکام پر نائب کیپٹن پیٹرنوٹ سے بات کی اور فر فر اسے ساری صورت حال کے بارے میں بتا دیا، ساتھ ہی اسے کیپٹن پریمانن کی ہٹ دھرمی سے بھی آگاہ کر دیا۔

”سنو! ہم سب سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فٹا ہو جائیں گے۔“ معاندانہ اپٹیکر پر نائب پیٹرنوٹ کی آواز ابھری۔ وہ عابد اور نائمہ سے مخاطب تھا۔

”ہمیں بات کرنے کا موقع تو دو، تمہارے جو بھی مطالبے ہیں ہم مان بھی سکتے ہیں۔ ڈائمنڈ آفر بھی ہو سکتی ہے، تم لوگ بس۔ پمپ چلنا رہنے دو۔“

”مسٹر نوٹ! بہتر یہی ہوگا کہ پہلے تم اپنے اس گھمنڈی کیپٹن پریمانن کو سمجھاؤ، جو ہمارے خلاف کمانڈو آپریشن کرنے کے لیے پرتول رہا ہے۔“ عابد نے کہا۔

پھر شاید نوٹ نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور تیزی سے بولا۔ ”میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا۔ پانچ، چھ سرائیکی وردی پوش کمانڈوز اندر در آئے۔ جبکہ دھماکے کی آواز سنتے ہی عابد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نائمہ کو لے کر ایک آہنی فیمل کی آڑ میں چلا گیا تھا اور وہیں سے سنبھل کر اس نے اپنی گن کا رخ دروازے کی طرف موڑ لیا تھا۔ اور جیسے ہی اسے رخ در انداز دکھائی دیے، عابد نے کسی بات کی پروا کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ کوچ جن کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور دو پہلے اندر داخل ہونے والے سرائیکی کمانڈو لقمہ اجل بنے۔ کمرے میں خطرے کا الارم بجانے والی سیٹی بہ دستور مع خراش آواز میں گونج رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی وجہ سے کمرے میں بارود کی ناگوار سی بو پھیلنا شروع ہو گئی۔

اپنے دو ساتھیوں کا چشم زدن میں یہ انجام دیکھ کر باقیوں نے دائیں بائیں پناہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ عابد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسا کمانڈو ایکشن تھا؟ جبکہ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مذاکرات کی آڑ میں ان پر چھپ کر وار کیا جائے گا، مگر شاید اپنی ”عظیم“ ایٹمی آبدوز کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے والا گھمنڈی کیپٹن پریمانن اپنی اس ہزیمت کی پردہ پوشی کرنا چاہتا تھا، کیونکہ بالکل غیر متوقع طور پر عابد اور نائمہ کا آگوسٹا میں در آنا اس کے لیے کیا بلکہ آبدوز میں موجود

اس نے نائمہ سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر نائمہ نے ایک غیر محسوس اشارے سے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

”وہ آلہ میرے پاس ہی ہے یہاں۔“ کوچ جن عجلت میں بولا۔

”نکالو۔“ نائمہ بولی۔ کوچ جن پر بدحواسی طاری تھی، اس نے حرکت کی، مگر عابد اسے گن پوائنٹ پر لیے ہوئے تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کرے۔ وہ آلہ یعنی ”کریک“ ایک قیہ بنانے والی مشین سے مشابہ تھا۔ جسے کوچ جن نے ایک فرشی کینٹ کا ڈھکن اوپر اٹھا کر باہر نکالا تھا۔ قریب اس کے ایک ہیمر بھی رکھا تھا، وہ بھی اس نے نکال لیا تھا۔ نائمہ نے آگے بڑھ کر یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھوں سے اچک لیں، کوچ جن عجیب سی حیرت کے ساتھ نائمہ کو تکتے لگا، جبکہ عابد کے چہرے سے معنی خیز مسکراہٹ مترشح تھی، وہ شاید نائمہ کی اس حرکت کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہی ہوا، نائمہ نے اسی ہیمر کی مدد سے ایٹمی ری ایکٹر کو بند کرنے والا ”کریک“ توڑ ڈالا۔ یہ دیکھ کر کوچ جن کی آنکھوں میں یکا یک خوف و ہراس اتر آیا۔ اور وہ پاگلوں کی طرح چلا کر اس سے بولا۔ ”بے وقوف لڑکی! یہ تم نے کیا غضب کر دیا؟ کریک توڑ دیا، اف۔ اب ہم سب کو بھیا تک موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

”ہم بھی یہی چاہتے تھے، تمہارے اس گھمنڈی کیپٹن پریمانن کو پتا چلنا چاہیے کہ ہم گیدڑ بھکیاں دینے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ عابد ایک جوش تلے لہجے میں کوچ جن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بتا دو اب اپنے کیپٹن کو کہ کیا اب بھی وہ ہماری بات نہیں مانے گا؟“ نائمہ نے بھی جوش سے ختماتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

کوچ جن کی ہی نہیں اس کے ساتھ کھڑے دو ساتھیوں کی بھی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف نکلے جا رہے تھے۔

”دو... دیکھو! اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔“ کوچ جن ہکلا یا۔ ”مم... میں اب بھی سب سنبھال سکتا ہوں۔ اگر... اگر تم... میرے ایک ساتھی کو silos کا پمپ چلانے کی اجازت...“

”تم محض وقت ہی ضائع کر رہے ہو کوچ!“ عابد نے اس کی بات کاٹی۔

ٹھیک اسی وقت کمرے میں تیز سیٹی کی آواز گونجی۔

ہر اس یہودی کے لیے انتہائی سبکی کا ہی باعث تھا، جنہیں خود بہ "عظیم قوم" ہونے کا گھمنڈ سوار تھا کہ وہ اپنے برے بھلے کی تیز بھی کھو چکے تھے اور تمللا کر انہوں نے "ڈائریکٹ ایکشن" پلان کر ڈالا تھا۔

عابد نے بھی خود کو پہلے ہی سے اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ پہلے ہی "نلے" میں دو کو ڈھیر کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، جبکہ کوچ جن چیخ چیخ کر اپنے کمانڈوز کو ایسا حملہ کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا، عابد اور نائمہ کے لیے تو یہ سب "آریا پار" کے مترادف تھا، لہذا عابد نے اسی طرف اپنی گن کا رخ کیا جدھر اسرائیلی کمانڈوز آڑ لینے کی جستجو میں تھے، عابد کی گن نے ایک اور برسٹ اگلا۔ والٹ کی دیواروں سے ان گنت چنگاریاں پھوٹی تھیں۔ بد قسمتی سے نشانہ خطا گیا تھا، اس بار کوئی اسرائیلی اس کے چلائے ہوئے برسٹ کا شکار نہیں ہوا تھا۔ والٹ میں یکلفت دم بہ خودی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ایک دھڑکتا ہوا سناٹا تھا، جو کسی چھپے ہوئے طوفان کی طرف اشارہ دیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اسی وقت کمرے میں گھمنڈی کیپٹن پریمان کی ہزینائی آواز ابھری۔ "تم لوگ بیچ کر کہیں نہیں جاسکتے، اب بھی وقت ہے، ہر نذر کردو۔ ورنہ بھیا نک موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"کیپٹن!" اسی لمحے کوچ جن کی جنون سے مغلوب آواز ابھری۔ "ی ی ی۔ یہ۔ یہ۔ تم نے بہت غلط کیا ہے۔ اس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ تم اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہو۔ ہمیں نہیں معلوم ان لوگوں نے ایشی ری ایکٹر بند کرنے والا کریک توڑ ڈالا ہے۔"

"جنگی چالوں کو تم سے زیادہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کوچ!" وائڈ اسپیکر پر پریمان کی مغرور آواز ابھری تھی۔ "اب تم اپنا کام شروع کردو۔ میں دشمنوں کو اپنی جگہ محدود کر چکا ہوں۔"

اور نبی کوچ کا ایک ساتھی تیزی سے حرکت میں آیا، جبکہ عابد کو مکار پریمان کی یہ چال سمجھنے میں چنداں دیر نہیں لگی تھی، اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ مذکورہ آدمی کو اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تھا کہ ایک طرف پوزیشن سنبھالے ہوئے کمانڈو نے بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ اپنی گن سے تاک کر نشانہ لیتے ہوئے "سنگل شاٹ" کھیلا اور دوسرے ہی لمحے گن اس کے ہاتھوں سے ٹپکتی چلی گئی۔ اسی وقت نائمہ نے اپنے پستول سے والٹ کی

طرف بڑھتے ہوئے اس آدمی کا نشانہ لینا چاہا مگر اسی وقت بد کے ذہن طباع میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا، اس نے نائمہ کا پستول والا ہاتھ نہ صرف فوراً نیچے کر دیا بلکہ اس کے ہاتھ سے لے کر پستول خود پکڑ لیا۔ ادھر وہ آدمی silos کے پاس پہنچ چکا تھا اور پمپ چلانے کی تیاری کرنے لگا، تو عابد کو پورا یقین تھا کہ وہ اس "سنگل شاٹ" کھیلنے والے کو بڑی کامیابی کے ساتھ "بلف" کرے گا اور وہی ہوا، سنگل شاٹ والا کمانڈو یہی سمجھا تھا کہ اب ان کے پاس اسلحہ نہیں رہا، کیونکہ اگر ہوتا تو وہ ضرور اس پمپ چلانے والے آدمی کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے، جیسا کہ وہ دیکھ چکا تھا اور اس نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔ یوں وہ عابد کی بروقت بیدار مغزی کی ٹرک میں آ گیا اور درانہ وار اپنی ہیوی گن سنبھالے اس کی طرف لپکا تو عابد، جو دھڑکتے دل کے ساتھ اسی موقع کا منتظر تھا، بڑے آرام سے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ تیار کر ان کے اوپر ہی آ رہا، اپنی مہم جوئی کے جوش تلے وہ ان کے خاصے قریب پہنچ گیا تھا۔

عابد اور نائمہ کے لیے سنگین ہوتی صورت حال کی اس کا یا کلب نے ایسی "گنڈم" پیدا کی کہ دوسرے ہی لمحے اس جہنم داخل اسرائیلی کی ہیوی مشین گن، عابد کے ہاتھوں میں آچکی تھی، ورنہ محض ایک پستول سے ان لڑاکا کمانڈوز کا مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل ہی ثابت ہو سکتا تھا۔

پستول دوبارہ نائمہ کو تھا کر اس نے اسے مخصوص اشارہ کیا، نائمہ نے تاک کر اس آدمی کا نشانہ لیا ہی تھا کہ، دوسرے ہی لمحے silos کے قریب کھڑا وہ آدمی ایک لرزا دینے والی چیخ کے ساتھ فرش پر گرا۔ silos کے چیمبر سے تاریکی رنگ کی گیس، دھوئیں کی صورت میں خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ سب کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس آدمی پر جم گئیں۔ وہ فرش پہ گر کر بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے نیلے رنگ نے جھاگ بہنے لگے۔

اسی وقت وین آفیر کوچ جن کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ "او، مائی گاڈ! کیا نائٹرک ڈائی آکسائیڈ بننے کا عمل شروع ہو گیا؟ اب کوئی نہیں بچے گا، سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ ہم سب اس زہریلی نیورولیس کا شکار ہونے والے ہیں۔ یہ عظیم آبدوز، اب ہم سب کی قبر بننے والی ہے۔ آہ! دشمنوں نے بڑا کاری وار کر ڈالا۔"

جاری ہے



حسین اتفاقات

ارم واحدی

بہ ظاہر بعض لوگ اپنی تقدیر کو خود ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ درحقیقت وہ اپنی زندگی سدھارنے کے لیے کسی نہ کسی کے خلاف سازشوں کا تانا بانا بن رہے ہوتے ہیں... بالکل ایسے ہی واقعات کسی کی زندگی میں بھی رونما ہوئے جنہیں اس نے حسین اتفاقات کا نام دے کر خود کو ہر الزام سے بخوبی بچالیا لیکن... تازنہ والے بھی قیامت کی نگاہ رکھتے تھے، وہ خود بھی کسی قیامت سے کم نہ تھی اور اس کی گہری آنکھوں نے سطح آب سے تہ آب کا منظر واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔

یہ تمام فریب میں جلا کرتے والے ایک ساحر کی کار فرمائیاں

نکرائے تھے۔ کم از کم روتھ تو ایسا ہی بھتیجی تھی اور میکس کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے تو اس روز وہ نہیں بلکہ ان کی کشتیاں آپس میں ٹکرائی تھیں۔
سی ارچن نامی کشتی آہستہ آہستہ قریبی ساحل پر ٹکر

روتھ جب بھی گزشتہ تین سالوں پر نگاہ ڈالتی۔ تو اسی نتیجے پر پہنچتی کہ یقیناً میکس نے یہ سب کچھ بہت سوچ کر کیا تھا۔ شاید ان کی پہلی ملاقات سے بھی پہلے..... وہ دونوں اتفاقاً ایک دوسرے سے ملے تھے یا یوں کہا جائے کہ

انداز ہونے ہاری تھی۔ شام کا دھند لگا چھانے لگا تھا، جب دونوں کشتیوں کے اگلے حصے آپس میں ٹکے سے ٹکرائے۔ دونوں کے کپتان حمزی سے لپکے تاکہ دیکھ سکیں کہ نقصان زیادہ تو نہیں ہوا مگر چونکہ دونوں کشتیوں ہی کے اطراف میں بڑے بڑے ٹائر نمالائف بوائے لگے ہوئے تھے اس لیے دونوں ہی نقصان سے محفوظ رہی تھیں۔ اسکاٹش نیل نامی دوسری کشتی کے کپتان نے دوسرے کپتان کو مزاحیہ انداز میں سلیوٹ کیا اور کشتی کے زیریں کیمین میں چلا گیا۔ میکس کشتی کے مرثیے پر سامنے بیٹھ کر اطمینان سے کتاب میں مشغول ہو گیا۔ اس اثنا میں اسکاٹش نیل کا کپتان عرشے پر لوٹ آیا۔ اس نے وہی مزاحیہ سلیوٹ دوبارہ کیا تو میکس نے کتاب نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”گڈ ایوننگ جناب! آج تو ہماری ٹکر ہو گئی۔“ دوسرے کپتان نے اپنا دھسکی کا گلاس ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

”مگر شکر ہے کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔“ میکس اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ ”میرا نام میکس بینٹ ہے۔“

”اینگلس وینڈرسن.....“ عمر رسیدہ کپتان نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ یہیں کے رہنے والے ہیں اینگلس؟“

میکس نے رسا پوچھا۔

”نہیں۔“ اینگلس نے جواب دیا۔ ”میں اور میری بیوی جرسی میں رہتے ہیں مگر ہمارے جڑواں بیٹے یہاں جنوبی ساحلی پٹی پر واقع ایک اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اس لیے ہم کشتی کے ذریعے ہر تین چار ماہ بعد یہاں آتے ہیں۔ بیٹوں کی اسکول کی ٹرم ختم ہوتی ہے تو ہم انہیں چھٹیوں میں گھمانے لے جاتے ہیں۔ اور تم؟ کیا تم برائنن میں رہتے ہو؟“

”نہیں میں لندن میں رہتا ہوں مگر جب کبھی ویک اینڈ پر وقت ملتا ہے تو یہاں چلا آتا ہوں، کشتی رانی کے لیے۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ اسی دوران میں ایک عورت کشتی کے زیریں کیمین سے برآمد ہوئی۔ اینگلس مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”روتھ! یہ میکس بینٹ ہے۔ ہماری کشتیاں آپس میں ٹکرائی تھیں۔“ میکس نے مسکرا کر عورت کی جانب دیکھا۔ وہ اینگلس کی بیوی کم اور بیٹی زیادہ لگتی تھی۔ دونوں کی عمروں میں کم از کم بیس برس کا فرق تھا۔ گوکہ وہ زیادہ حسین نہ تھی مگر

پرکشش ضرور تھی۔ مختصر لباس میں چھریا مگر سڈول جسم۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ روزانہ باقاعدگی سے ورزش کرتی ہوگی۔ اس نے میکس کو دیکھا اور شرمیلے انداز سے مسکرائی۔

”اینگلس بولا۔“ ”کیا آپ ہمارے ساتھ ایک ڈرنک پینا پسند کریں گے؟“

”ضرور، شکریہ۔“ میکس یہ کہہ کر دوسری کشتی میں جو کہ کافی بڑی تھی، چھلانگ لگا کر کود گیا۔ آگے جھکتے ہوئے اس نے روتھ سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسز وینڈرسن۔“

”پلیز..... مجھے روتھ ہی کہلانا پسند ہے۔ کیا آپ برائنن سے ہیں؟“ روتھ نے استفسار کیا۔

”نہیں۔“ میکس بولا۔ ”میں ابھی آپ کے شوہر سے یہی بات کر رہا تھا کہ میں یہاں بس کشتی رانی کے لیے کبھی کبھار آتا ہوں..... آپ جرسی میں کیا کام کرتے ہیں اینگلس؟“

میکس اینگلس کی جانب دوبارہ متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ وہاں پیدا تو نہیں ہوئے ہوں گے؟“

”نہیں ہم ایڈنبرا سے وہاں شفٹ ہو گئے تھے، میری ریٹائرمنٹ کے بعد قریباً سات برس پہلے۔ اس سے پہلے ایک کمپنی میں منیجر تھا۔ اب تو بس جو تھوڑی بہت اپنی خاندانی جائیداد بچکی ہے، اسی کی دیکھ بھال کرتا ہوں تاکہ کچھ آمدن کا سلسلہ بنارہے۔ کچھ کشتی رانی کر لیتا ہوں اور تھوڑا بہت گالف بھی کھیل لیتا ہوں اور تم؟“

”آپ ہی کی طرح مگر فرق صرف یہ ہے کہ میں جس جائیداد کا خیال رکھتا ہوں، وہ میری نہیں دوسرے لوگوں کی ہوتی ہے۔ میں ایک ویسٹ اینڈ پراپرٹی ایجنٹ کا جونیئر پارٹنر ہوں۔“ میکس نے جواب دیا۔

”خوب۔ تو آج کل لندن میں پراپرٹی کی قیمتوں کا کیا حال ہے؟“ اینگلس نے دھسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”ویسے تو بہت سے پراپرٹی ایجنٹوں کے لیے گزشتہ چند سال کافی برے گزرے کیونکہ کوئی جائیداد فروخت کرنا نہیں چاہتا اور خریدنے کی سکت تو آج کل صرف غیر ملکیوں میں ہی رہ گئی ہے۔ جس کسی کی بھی لیز تجدید کے لیے آتی ہے تو وہ کرایہ کم کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور باقی کرایہ دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔“

اینگلس نے قہقہہ لگایا۔ ”پھر تو تمہیں جرسی آ جانا چاہیے۔ کم از کم تم اس بات سے تونج جاؤ گے.....“

”ہمیں اب کپڑے تبدیل کر کے تیار ہو جانا چاہیے۔ نہیں تو بچوں کو کانسرٹ پر لے جانے کے لیے دیر

ہو جائے گی۔" روتھ نے انگس کی بات کاٹے ہوئے کہا۔
 انگس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ "سوری میکس.....
 آپ سے باتیں کرنے میں بہت مزہ آ رہا تھا مگر روتھ ٹھیک
 کہہ رہی ہے۔ شاید ہم پھر بھی دوبارہ ایک دوسرے سے
 ٹکرائیں۔"

"میں اس کا انتظار کروں گا۔" میکس نے مسکراتے
 ہوئے کہا۔ پھر قریب پڑی میز پر اپنا گلاس رکھا اور اپنی کشتی
 پرواہیں چھلانگ لگا کر چلا گیا۔ روتھ اور انگس اپنی کشتی کے
 زیریں کیبن کی جانب چلے گئے۔ ایک مرتبہ پھر میکس نے اپنا
 ناول اٹھایا اور بالآخر وہ صفحہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوئی
 گیا جہاں سے اس نے پڑھنا چھوڑا تھا مگر جانے کیوں وہ
 کتاب میں چھپے الفاظ پر دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح روتھ عرشے پر آئی تو ہاتھ میں چائے کا کپ
 تھاما ہوا تھا۔ سی آر چن کو اپنے برابر لنگر انداز نہ پا کر اسے کسی
 قدر مایوسی ہوئی۔ وہ دوبارہ نیچے جانے ہی والی تھی کہ اسے
 ایک جانی بھجانی کشتی ساحل کے پاس آتی دکھائی دی۔ وہ
 انتہاک سے کشتی کے بادبانوں کو قریب آتے دیکھتی رہی کہ
 شاید میکس پھر اسی جگہ لنگر انداز ہو جہاں گزشتہ شب ہوا تھا۔
 میکس نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا مگر اس نے میکس کو
 لنگر انداز کرنے کا ٹانگہ کیا۔

لنگر انداز ہونے کے بعد میکس نے چلا کر پوچھا۔
 "انگس کہاں ہے؟"

"بچوں کو لینے گئے ہیں۔ پھر انہیں فٹ بال میچ پر لے
 جائیں گے۔ مجھے شام تک ان کی واپسی کی امید نہیں ہے۔"
 روتھ نے غیر ضروری تفصیلی پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔

میکس نے کشتی کو گھاٹ پر باندھا اور اوپر دیکھ کر
 بولا۔ "تو پھر آج آپ میرے ساتھ کچھ کیوں نہیں کر لیتیں؟
 یہاں بہت ہی اچھا اطالوی ریستوران ہے جس کے بارے
 میں یہاں آنے والے بیشتر سیاح علم نہیں رکھتے۔"

روتھ نے کچھ دیر پس و پیش سے کام لیا اور اس کی
 پیشکش پر غور کیا اور آخر کار بولی۔ "ہاں، کیوں نہیں۔"
 جب روتھ تیار ہو کر سامنے آئی تو اس نے سیاہ رنگ کا
 مختصر لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ میک اپ بھی کچھ ضرورت
 سے زیادہ ہی تھا۔

میکس نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "آج تو
 آپ قیامت ڈھا رہی ہیں۔" روتھ ہولے سے مسکرا دی۔
 وہ ساحل سے ہوتے ہوئے چہل قدمی کے انداز میں

شہر کی جانب چل دیے۔ ذرا آگے جا کر وہ اطالوی ریستوران
 آگیا۔ میکس نے آگے بڑھ کر روتھ کے لیے دروازہ
 کھولا۔ اندر داخل ہونے پر روتھ کو یہ دیکھ کر کافی مایوسی ہوئی
 کہ ہال کچھا کچھ بھرا ہوا ہے۔

"اوہو! ہمیں تو یہاں جگہ نہیں مل پائے گی۔" وہ
 پڑمردگی سے بولی۔

ہوٹل کا منیجر اسے دیکھتے ہی لپکا۔ "آپ کی مخصوص
 ٹیبل مسٹر بینٹ۔"

"شکریہ ویلریو۔" میکس بولا اور منیجر انہیں ہال کے
 ایک قدرے خاموش اور الگ تھلگ گوشے کی جانب لے گیا۔
 بیٹھنے کے بعد میکس نے پوچھا۔ "آپ کیا پینا پسند
 کریں گی روتھ، ٹیمپن؟"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" روتھ ایسے بولی جیسے یہ اس کے
 لیے روزمرہ کی بات ہو۔ درحقیقت ایسا شاف وناور ہی ہوتا تھا
 کہ وہ لنچ سے پہلے ٹیمپن پیے۔ ویسے بھی انگس ایسی فضول
 خرچی کا قائل نہیں تھا۔ ماسوائے شاید اس کی سالگرہ کے دن۔
 میکس نے میڈیو کارڈ کھولا۔ "یہاں کا کھانا بہت ہی
 لذیذ ہوتا ہے۔"

"بہت خوب۔"
 "ساتھ میں کچھ سلاڈ ہو جائے۔" میکس نے تجویز دی۔
 "ٹھیک ہے۔" روتھ بولی۔

میکس نے مینیو کارڈ بند کیا اور ٹیبل کے دوسری جانب
 بیٹھی روتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دونوں لڑکے آپ
 کے اپنے تو نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر اگر وہ اتنے بڑے
 ہیں کہ بورڈنگ اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

"وہ کیوں نہیں؟" روتھ اندازِ دلربائی سے بولی۔
 "کیوں؟..... بھی انگس کی عمر دیکھ کر میں نے تو
 یہی اندازہ لگایا تھا کہ دونوں لڑکے اس کی کسی پہلی بیوی سے
 ہوں گے۔"

"نہیں۔" روتھ قہقہہ لگا کر بولی۔ "انگس نے بہت
 دیر سے شادی کی اور مجھے بہت فخر محسوس ہوا تھا جب اس نے
 مجھے شادی کی پیشکش کی تھی۔"

میکس نے کوئی جواب نہ دیا۔
 "اور آپ؟" روتھ نے پوچھا۔

"میں تو چار مرتبہ شادی کر چکا ہوں۔" میکس نے
 جواب دیا۔

روتھ بھونچکی رہ گئی۔ میکس قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "سچ کہوں
 تو ایک دفعہ بھی نہیں۔ شاید آج تک سچ لڑکی سے ملاقات ہی

نہیں ہوئی۔“
”مگر آپ تو ابھی جوان ہیں اور جس لڑکی کو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔“ روتھ بولی۔

”میں عمر میں آپ سے تو بڑا ہوں۔“ میکس اپنی مردانگی جتانے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ جیسی جواں سال لڑکی کو جری کچھ بے رونق اور روکھا پھیکا نہیں لگتا؟“ ساتھ ہی اس نے ٹیبل سے آگے جھک کر سنہری بالوں کی ایک لٹ کو پیچھے کیا جو روتھ کے ماتھے پر آگری تھی۔ روتھ شرما کر مسکرائی۔

”اس بے رونقی کے بھی کچھ فائدے ہیں۔“ روتھ اس انداز سے بولی جیسے دل سے اس بات پر یقین نہ رکھتی ہو۔
”مثلاً کیا فائدے؟“ میکس نے اصرار کیا۔

”ٹیکس کی شرح صرف بیس فیصد ہے۔“

”ارے انگلش کے جری میں رہنے کی یہ وجہ تو ہو سکتی ہے مگر آپ کی نہیں۔ خیر بہر حال میں تو انگلینڈ ہی میں رہنا پسند کرتا ہوں بھلے وہاں پر ٹیکس کی شرح چالیس فیصد ہو۔“

”جب سے انگلش ریٹائر ہوا ہے، ہمیں ایک لگی بندھی آمدنی پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایڈنبرا میں رہتے تو اس طرح کا طرز زندگی رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔“ روتھ آہستہ سے بولی۔

”تو زندگی کی رہنمی کی حد برائین تک ہی ہے۔“ میکس مسکراتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی منیجر نیو کی دو پلیٹیں اٹھائے نمودار ہوا اور ان کے سامنے چن دیں۔ ایک دوسرا ویٹر سلا کی ڈش ٹیبل کے درمیان رکھ کر چلا گیا۔

”مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ روتھ نے سلسلہ کلام دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”انگلش ہمیشہ سے ہی میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“

”کسی چیز کی بھی نہیں؟“ میکس نے ٹیبل کے نیچے سے اپنا ہاتھ روتھ کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے کہا۔

روتھ جانتی تھی کہ اسے میکس کا ہاتھ فوراً ہی ہٹا دینا چاہیے مگر روتھ نے ایسے لاتعلقی کا اظہار کیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ روتھ نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے سوال کیا۔

”میں زمانے کی رفتار سے بہت پیچھے ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اب مجھے کوئی فلم دیکھنی چاہیے؟“

”ارے ہاں۔ ٹام اسٹارڈ کی نئی فلم اگلے ہی ماہ لگ رہی ہے۔“ میکس قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”اگر آپ ایک دو روز کے لیے فرار ہو سکیں تو ہم دونوں اسے اکٹھے

جا کر دیکھ سکتے ہیں۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے میکس۔ انگلش چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہوں اور ویسے بھی ہم لندن تو بھی کبھا رہی جاتے ہیں۔“

میکس نے اس کی خالی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ نیو کی آپ کی توقعات پر پوری اتری۔“ روتھ نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔

”تو پھر آپ کو یہاں کا کریم بروڈے بھی چکھنا چاہیے۔ منیجر ویلر یو کی بیوی وہ بھی کمال کا بناتی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ اس سفر میں میں جتنا کھا چکی ہوں اس کے لیے مجھے جم میں کچھ زیادہ ہی وقت لگانا پڑے گا مگر میں کافی کا ایک کپ پی سکتی ہوں۔“ روتھ بولی۔ جیسے ہی میمپن کا ایک اور گلاس اس کے سامنے آیا۔ اسے دیکھتے ہی روتھ کے ماتھے پر شکنیں نمایاں ہو گئیں۔

”چلو مان لیتے ہیں کہ آج آپ کا برتھ ڈے ہے۔“ میکس بولا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بے باکی سے ٹیبل کے نیچے دوبارہ غائب ہو گیا۔

اصولاً روتھ کو اسی لمحے اٹھ کر ہوٹل سے باہر نکل جانا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس روتھ نے اطمینان سے سوال کیا۔ ”تو تم کتنے عرصے سے اسٹیٹ ایجنٹ کا کام کر رہے ہو؟“

”جب سے میں نے کالج چھوڑا۔ کمپنی کے سب سے نچلے درجے سے کام شروع کیا اور ابھی پچھلے سال ہی جونیئر پارٹنر بنا ہوں۔“

”مبارک ہو۔ تمہارا دفتر کہاں ہے؟“
”مے فیئر کے عین وسط میں۔ آپ کسی دن تشریف لائیے نا..... جب بھی لندن آتا ہو۔“

”میں لندن بہت کم جاتی ہوں۔“ روتھ آہستہ سے بولی۔ ایک ویٹر کو اپنی جانب آتا دیکھ کر میکس نے اپنا ہاتھ روتھ کی ٹانگ پر سے ہٹا لیا۔ جب ویٹر ان کے سامنے کافی کے دو کپ رکھ چکا تو میکس نے اسے بل لانے کے لیے کہا۔

”کیا آپ بہت جلدی میں ہیں؟“ روتھ نے سوال کیا۔ ”جی ہاں، مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ میں نے سی آر چن پر پرانی شراب کی ایک بہت قیمتی بوتل چھپا رکھی ہے اور یہ اسے کھولنے کا بہترین موقع ہو سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے

ٹیبل سے آگے جھک کر روتھ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ میں نے وہ بوتل کسی خاص دن یا کسی خاص مہمان کے لیے بچا کر رکھی ہے۔“

”میرے خیال میں یہ کوئی عطلندی کی بات نہ ہوگی۔“
”تو کیا آپ ہمیشہ عطلندی کی باتیں ہی کرتی ہیں؟“

میکس اس کا ہاتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

”بات یہ ہے کہ مجھے واقعی اب اسکاٹش ہیل پرواہیں
جانا چاہیے۔“

”تاکہ آپ خرید تمین کھٹے انگس کا انتظار کرنے میں گزار دیں؟“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔“ روتھ اٹکتے اٹکتے بولی۔
 ”آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کو گمراہ کر کے فائدہ
 اٹھانے کی کوشش کروں گا؟“

”آپ کا ارادہ تو یہی لگا ہے۔“ روتھ اپنا ہاتھ میکس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

”ہاں مگر اس شراب کی بوتل کو جھکنے سے پہلے نہیں۔“

میگس بولا۔ جیسے ہی ویٹر بل لے کر واپس آیا، اس نے بل دیکھا اور دس دس پاؤنڈ کے چار لوٹ ٹشتری پر رکھ دیے۔

ایکس نے ایک مرتبہ روتھ کو بتایا تھا کہ ریسٹوران میں جو لوگ نقد رقم سے بل ادا کرتے ہیں، انہیں یا تو کریڈٹ کارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی یا پھر وہ اپنی قلیل آمدنی

کے سبب کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔
میکس بل ادا کرنے کے بعد اٹھ گیا۔ واپسی پر تمام راستے وہ
خاموش رہے، یہاں تک کہ وہ گھاٹ تک پہنچ گئے۔ روتھ کو

لگا کہ اس نے سی ار جین پر سے کسی کو کودتے دیکھا تھا مگر دوبارہ دیکھنے پر کوئی دکھائی نہ دیا۔ جب وہ کشتی کے قریب پہنچ گئے تو روتھ کا خیال تھا کہ وہ میگیس کو خدا حافظ کہہ دے گی۔

مکروہ غیر ارادی طور پر اس کے ہمراہ زیریں سین میں داخل ہو رہی تھی۔

زینہ اترتے ہوئے پوی۔ پورا لوں چل کر اس نے کے بعد وہ جس کی بانہوں میں تھی۔ اس نے میکس کو آہستہ سے پیچھے دھکیلا۔
 ”اکیلے آدمی کے لیے تو بہترین ہے۔“ میکس نے اتنا کہا اور شاہ کی ٹوٹر کھول کر دو گلاس تیار کرنے لگا۔

انتانی لہا اور سراپ کی یوں مھول کر دو گھاس تیار کرے گا۔
پھر ایک جام روتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اپنا
دوسرا بازو اس کی کمر میں حائل کر دیا اور دھیرے سے اسے
اپنی طرف کھینچا۔

پھر میکس نے اسے جام پیش کیا۔ شراب نے دونوں کی وارفتگی کو اس حد تک بڑھا دیا کہ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا۔

”تم جانتے ہو کہ تم دوسرے مرد ہو جس کے ساتھ میں اس حد تک گئی ہوں۔“ روتھ نے بعد میں آہستہ سے کہا۔

مرد نہیں آیا؟“ میکس نے اپنے لیے شراب کا ایک اور جام بناتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ روحہ نے جواب دیا۔ ”حالانکہ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جبر اللہ پر نیکوٹ جو ہمارے بیٹوں کے پرانے اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہے، وہ مجھے چاہتا ہے مگر وہ

کبھی کمال پر ہلکے سے یو سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ بس چاہت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔“

”ہاں شاید میں بھی..... وہ ایک بہت ہی اچھا انسان ہے۔“ روتھ نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا اعتراف کیا۔

”مردہ احمق ہے۔“ میکس نے کہتے ہوئے ایک بار
پھر اسے بانہوں میں بھر لیا۔

روٹھ کی نظر اچانک اپنی گھڑی پر پڑی تو اس نے چونک کر کہا۔ "اودھ میرے خدایا! کیا اتنا وقت ہو گیا ہے؟"

”گمبھرا نے کی ضرورت نہیں میری جان۔“ میکس بولا۔ ”ہمارے پاس اب بھی شراب کے ایک اور جام کا وقت ہے اور شاید محبت کے سمندر میں ایک اور ڈبکی لگانے کا“

بھی۔ اب تم جو بھی مناسب سمجھو۔“
 ”دونوں ہی تجاویز اچھی ہیں مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ
 اس حالت میں انگلش ہمیں ایک ساتھ دیکھے۔“
 ”طریقہ یہ ہے کہ ان سے پہلے کہہ لیں کہ تم میری بہن“

”چلو پھر اسے کسی اور وقت کے لیے بچا رکھتے ہیں۔“
 میکس نے شراب کی بوتل میں کارک لگاتے ہوئے کہا۔
 ”یا پھر کسی اور لڑکی کے لیے۔“ روتھ نے جلدی
 جلدی انا جا رہی۔ کہ تو مجھے کیا میکس؟

جلدی اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے کہا۔ سبیس نے ایک پال پن اٹھایا اور بوتل پر لکھ دیا۔ ”صرف روتھ کے ساتھ پینے کے لیے۔“

”اب اس بات کا فیصلہ تو تم ہی کو کرنا ہے میری

جان۔۔۔ ایس لے اے چومتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی اس نے روتھ کو چھوڑا تو وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے کیمین کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کسٹی کے عرشے پر آئی اور پھر اسی

اس کاٹش تیل تک واپس پہنچے ہی وہ گزشتہ دو کمشنوں کی یادوں کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے اس بات کا

سمجھتا۔ پھر دوپہر میں اس نے کھانے کی تیاری شروع کی۔ اپنے خانہ ماں کو اچھی طرح تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کس قسم کا کھانا چاہیے اور پھر شام کو اپنے کمرے میں کپڑوں کا انتخاب کرنے میں اسے کافی دیر لگ گئی۔ یہاں تک کہ وہ ابھی کپڑے پہن بھی نہ پائی تھی کہ آٹھ بج کر چند منٹ پر دروازے کی گھنٹی بجی۔

روتھ نے کمرے کا دروازہ کھول کر بیڑھیوں کے اوپر سے ہی اپنے شوہر کو میکس کا استقبال کرتے سنا۔ انگلس کی آواز سے کتنا بڑھا پا جھلک رہا تھا جب اس نے دونوں مردوں کو باتیں کرتے سنا۔ اسے ابھی تک ادراک نہ تھا کہ انگلس میکس سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور وہ اس بارے میں زیادہ جوش و خروش کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر بالآخر اس نے ایک ڈریس کا انتخاب کیا جس کے بارے میں اس کی ایک دوست نے کہا تھا کہ یہ بہت ہی بھڑکیلا ہے۔

دونوں روتھ کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میکس نے آگے بڑھ کر روتھ کو گال پر اسی طرح ہلکا سا بوسہ دیا جیسا کہ جبرالڈ پر۔ سکوت ہمیشہ کرتا تھا۔ ”میں میکس کو ایڈریان میں ہمارے بچکے کے بارے میں بتا رہا تھا۔“ انگلس بولا اور پھر دوبارہ بیٹھنے ہی کہنے لگا۔ ”اور یہ بھی کہ ہم اسے بیچنا چاہتے ہیں کیونکہ عنقریب ہمارے دونوں بیٹے یونیورسٹی میں چلے جائیں گے اور ان کے تعلیمی اخراجات بھی بڑھ جائیں گے۔“

انگلس کی عجیب فطرت تھی۔ گھر آئے مہمان کو پانی کے گلاس کو بھی نہیں پوچھا اور فوراً کام کی بات شروع کر دی۔ روتھ نے... میکس کے لیے جلدی سے شراب کا ایک جام تیار کیا۔

”میں نے میکس سے گزارش کی ہے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے بچکے کو جا کر دیکھ آئے۔ اس کی قیمت کا تخمینہ لگائے اور یہ بھی بتائے کہ اس کے خیال میں اسے بیچنے کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا۔“

”ہاں، یہ ایک مناسب خیال ہے۔“ روتھ نے میکس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی نظروں سے انگلس بھانپ نہ جائے کہ وہ اس مہمان کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتی ہے۔

”میں تو کل ہی فرانس جاسکتا ہوں۔“ میکس بولا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو..... کیونکہ میرا اس دیک اینڈ پر کوئی دوسرا پروگرام تو ہے نہیں۔ پھر میں پیر کے روز آپ کو

اگلے دن جب وہ کشتی کے عرشے پر آئی تو سی ارچن کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ ”کیا کسی خاص چیز کو تلاش کر رہی ہو؟“ انگلس نے اوپر آتے ہی سوال کیا۔ وہ ہلٹی اور مسکرا کر کہنے لگی۔ ”نہیں، بس میں تو جری واپس لوٹنے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔“

لگ بھگ ایک ماہ بعد جب ایک دن روتھ نے فون اٹھایا تو لائن کی دوسری طرف میکس کو پایا۔ روتھ کی سانس تیز تیز چلنے لگی، بالکل اسی طرح جس طرح پہلی دفعہ میکس کے ساتھ ہم نشیں ہوئی تھی۔

”میں کل جری آ رہا ہوں۔ ایک گاہک کے لیے ایک پراپرٹی دیکھنی ہے۔ کیا ہم کہیں مل سکتے ہیں؟“ ”تم ہمارے ساتھ رات کا کھانا کیوں نہیں کھا لیتے؟“ روتھ نے اسے مدعو کرتے ہوئے کہا۔

”اور تم مجھے ہوٹل کے کمرے میں آ کر کیوں نہیں مل لیتیں؟“ اس نے تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ یہ ڈنر کا خیال رہنے دو۔“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ ڈنر پر ملنا ہی بہتر رہے گا۔ جری میں تو دیواروں کے ہی نہیں بلکہ گھڑکی دروازوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بارے میں کوئی اسکینڈل بنے۔“

”چلو بھی اگر تم سے ملاقات کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے تو پھر ٹھیک ہے، ڈنر ہی کر لیتے ہیں۔“ ”آٹھ بجے؟“

”آٹھ بجے ہی مناسب رہے گا۔“ اس نے تائیدی اور فون رکھ دیا۔ روتھ نے فون بند ہونے کی آواز سنی تو اسے خیال آیا کہ اس نے میکس کو اپنے گھر کا راستہ تو بتایا ہی نہیں اور وہ اسے دوبارہ فون کر نہیں سکتی تھی کیونکہ نہ اس کے پاس اس کا فون نمبر تھا، نہ ہی ہوٹل کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔

جب روتھ نے انگلس کو ڈنر پر آنے والے مہمان کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو کر بولا۔ ”اس کے آنے کا اس سے بہتر وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بھی میکس سے کچھ مشورہ لینا چاہتا ہوں۔“

اگلے روز روتھ صبح ہی سے شاپنگ میں معروف ہو گئی۔ بہترین کوالٹی کا گوشت، تازہ سبزیاں اور ایک اچھی سی شراب کی بوتل جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اگر انگلس کو پتا چلتا تو وہ اسے انتہائی درجے کی فضول خرچی

تمام معلومات فراہم کر سکوں گا۔“

”ارے، یہ تو بہت ہی شاندار بات ہو گئی۔“ انگلس خوش ہوتے ہوئے بولا۔ اور پھر کچھ توقف کے بعد دھسکی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے روتھ کہ اگر تم بھی میکس کے ساتھ چلی جاؤ تو معاملات اور بھی تیزی سے طے پا جائیں گے۔“

”نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میکس اکیلا ہی یہ کام بخوبی کر سکتا ہے۔“

”ارے نہیں۔ یہ مشورہ اسی نے تو دیا ہے اور دیے بھی تم اسے وہ جگہ اچھی طرح دکھا سکتی ہو۔“

”مگر میں یہاں پر کچھ مصروف ہوں۔ وہ دیکھیے نا.....“ روتھ ابھی کوئی بہانہ سوچ ہی رہی تھی کہ انگلس اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہاں، تمہارا لیڈیز کلب اور ہیلتھ کلب اور نہ جانے کیا کیا۔ نہیں بھئی ان سب کو کچھ دن تمہارے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔“

روتھ کو انگلس کا اس طرح میکس کے سامنے اس کا مذاق اڑانا بہت بُرا لگا۔ وہ منہ بسور کر بولی۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ کے خیال میں میرا ساتھ جانا ضروری ہے تو چلی جاتی ہوں۔“ اور اس بار اس نے میکس کی جانب دیکھا۔ میکس کا چہرہ سپاٹ اور کسی نجی قسم کے جذبات سے مکمل طور پر عاری تھا۔

☆☆☆

ایڈریان جانے کے پروگرام میں انہیں تین دن لگے مگر زیادہ یادگار تھیں وہ تین راتیں جو انہوں نے ساتھ گزاریں۔ جب تک وہ جرسی واپس آئے تو روتھ بھی دعا کر رہی تھی کہ ان کی باتوں سے کبھی یہ عیال نہ ہو جائے کہ دونوں کا افسر چل رہا ہے۔ میکس نے انگلس کو ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی اور بچکے کی مالیت کے بارے میں بھی بتایا۔ بوڑھے انگلس نے میکس کے مشورے سے اتفاق کیا کہ گھر کو موسم گرما کی تعطیلات سے چند ہفتے قبل ہی فردخت کرنا مناسب رہے گا۔ دونوں نے اسی بات کو ہاتھ ملا کر پکا کیا اور میکس نے کہا کہ جیسے ہی کسی جانب سے اس بارے میں کوئی غور طلب آفر سامنے آئی تو وہ ان سے فوراً رابطہ کرے گا۔

روتھ اسے اتر پورٹ تک چھوڑنے گئی اور میکس کے کسٹمر کاؤنٹر کے پاس لگے ہجوم میں گم ہونے سے پہلے بولی۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اگلی بار جب تم مجھ سے بات کرو تو اس میں ایک ماہ سے کم عرصہ لگے؟“

میکس نے اگلے ہی دن انگلس کو فون کر کے بتایا کہ

اس نے بچکے کو پیرس کے دو بہت ہی مستند پراپرٹی ایجنٹوں کے حوالے کر دیا ہے جن کے ساتھ وہ کئی سالوں سے کاروبار کر رہا ہے۔ مزید برآں اس نے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہیں، میں نے ان ایجنٹوں کے ساتھ اپنی فیس بانٹنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ آپ پر کوئی اضافی بوجھ نہ پڑے۔“

”ارے، یہ تو تم نے میرے دل کی بات کر دی۔“ انگلس نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور فون رکھ دیا۔ روتھ کو میکس کے ساتھ بات کرنے کا موقع ہی نہ مل پایا۔ اگلے چند روز تک فون کی گھنٹی بجتے ہی روتھ لپک کر اٹھاتی کہ انگلس کہیں پھر اسے میکس سے بات کرنے سے محروم نہ کر دے مگر میکس نے تمام ہفتہ فون نہ کیا۔ بالآخر جب اس نے اگلے صبح کے روز فون کیا تو انگلس کمرے میں قریب ہی موجود تھا۔

”میں تو تمہارے قریب آنے کے لیے ترس رہا ہوں میری جان۔“ میکس نے فون اٹھاتے ہی کہا۔

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی میکس۔“ روتھ نے جواب دیا۔ ”مگر میں تمہاری بات انگلس سے کراتی ہوں تاکہ تم اسے بھی یہ خوش خبری دے سکو۔“ جیسے ہی اس نے فون انگلس کے ہاتھ میں تھمایا تو اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب اگر میکس کے پاس اسے دینے کے لیے کوئی خبر ہی نہ ہوئی تو؟

”تو مجھے ہمارے لیے کیا خوش خبری ہے آپ کے پاس؟“ انگلس نے فون پکڑتے ہی پوچھا۔

”ہمیں آپ کے بچکے کے لیے نو لاکھ فرانک کی آفر آئی ہے جو کہ تقریباً ایک لاکھ پاؤنڈز بنتے ہیں مگر میں ابھی اس سے مطمئن نہیں ہوں کیونکہ دو اور پارٹنروں نے بھی آپ کے بچکے میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فرانسیسی ایجنٹوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہمیں دس لاکھ فرانک سے اوپر کی قیمت پر ہی سودا کرنا چاہیے۔“

”اگر تمہاری بھی یہی رائے ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ انگلس بولا۔ ”اور اگر تم سودا طے کر لو تو میں وہاں آکر معاہدے کے کاغذات پر دستخط کر دوں گا۔ ویسے بھی میکس، میں نے روتھ کو لندن لے جانے کا کافی عرصے سے وعدہ کر رکھا ہے۔“

”بہت خوب، میرا بھی آپ دونوں سے ملنے کا بہت دل کر رہا ہے۔“ میکس نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔ پھر اس نے ہفتے کے آخر میں فون کیا اور گوکہ اس بار روتھ کو ایک آدھ جملہ کہنے کا موقع مل ہی گیا، انگلس کے فون پر آنے سے پہلے مگر وہ میکس کے جذبات کا گرجوٹی سے جواب نہ دے پائی۔

”ایک لاکھ سات ہزار چھ سو پاؤنڈز؟ ارے یہ تو میری توقعات سے بہت بہتر قیمت ہے۔ شاہاش میکس! بس اب تم معاہدے کی کاغذی کارروائی سنبھالو اور بیعانہ لے کر بینک میں جمع کروادو۔ میں پہلی ہی فلائٹ سے وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ انگلس نے فون رکھا اور روتھ کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ ”ارے بھی لگتا ہے کہ تم سے کیا ہوا لندن لے جانے کا وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔“

☆☆☆

لندن میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چیک ان کرنے کے بعد روتھ اور انگلس میکس سے جنوبی اسٹریٹ پر واقع ایک اعلیٰ ریسٹوران میں ملے جس کے بارے میں انگلس کچھ نہیں جانتا تھا اور پھر جب اس نے مینیو کارڈ پر چھٹی قیمتیں دیکھیں تو اسے فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اگر چنانچہ اس موقع سے ملتا تو وہ کبھی اس جگہ کا انتخاب نہ کرتا مگر تمام عملہ بہت ہی اچھے اخلاق کا تھا اور یہ ظاہر میکس کو اچھی طرح جانتا بھی تھا۔

روتھ کو کھانا بہت ہی بیزار کن لگا کیونکہ انگلس تو بس بچلے کے سودے ہی کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور پھر جب میکس نے اسے اس بارے میں مکمل طور پر مطمئن کر دیا تو وہ اس کے ساتھ اسکاٹ لینڈ میں واقع اپنی دیگر جائداد کے بارے میں صلاح مشورہ کرتا رہا۔

”ان پر اپریٹیز سے بھی مجھے کچھ خاص آمدن نہیں ہو رہی۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر تم ان پر بھی ایک نظر ڈال کر مجھے ان کے بارے میں بھی اپنا ماہرانہ مشورہ دے سکو کہ اب ان کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ہاں ہاں ضرور..... کیوں نہیں۔“ میکس نے کہا۔ روتھ نے اکتاہٹ کے ساتھ کھانے کی پلیٹ سے نظر اٹھا کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ ”کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ کیونکہ مجھے آپ کا رنگ بہت ہی سفید ہوتا نظر آ رہا ہے۔“

”مجھے اپنی دائیں جانب کچھ درد سا محسوس ہو رہا ہے۔ آج ویسے بھی کچھ زیادہ ہی لمبا دن تھا اور ویسے بھی مجھے ان مہنگے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایک رات کی پرسکون نیند اس کا بہترین علاج ثابت ہوگی۔“ انگلس نے رک رک کر جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ہوٹل واپس جانا چاہیے۔“ روتھ نے ایک وفا شعار بیوی کی طرح مشورہ دیا۔

”میں بھی روتھ سے اتفاق کرتا ہوں۔ بس ابھی مل چکا کرو رہا ہوں۔ آپ کے لیے ٹیکسی کا انتظام کرنے کا کہتا ہوں۔“ میکس نے فوراً روتھ کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے کہا۔ انگلس لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور روتھ کی بانہوں کے سہارے ریسٹوران سے باہر آیا۔ جب میکس باہران سے سڑک کے کنارے ملا تو اس نے کہا۔ ”گڈ نائٹ انگلس..... مجھے امید ہے کہ صبح تک آپ کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے مسکراتے ہوئے ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا۔

ہوٹل لوٹنے کے بعد جب تک روتھ نے انگلس کو بستر پہ لٹایا تو اس کی طبیعت کچھ خاص بہتر نہ ہوئی تھی اگرچہ اسے معلوم تھا کہ انگلس کبھی اس اضافی خرچے کی تائید نہیں کرے گا مگر پھر بھی روتھ نے ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر ڈاکٹر ان کے کمرے میں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے انگلس کا چیک اپ کیا اور روتھ کو یہ پوچھ کر حیرت کر دیا کہ اسے انگلس کے رات کے کھانے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ روتھ یاد کرنے لگی کہ انگلس نے اس رات کیا کیا کھانے کا انتخاب کیا تھا مگر اسے تو بس یہی یاد تھا کہ انگلس نے سب کچھ میکس کی تجاویز کے مطابق ہی آرڈر کیا تھا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ صبح ہوتے ہی انگلس کو کسی اسپیشلسٹ کو ضرور دکھایا جائے۔

”کیا ضرورت ہے؟“ انگلس نے کمزوری آواز میں احتجاج کیا۔ ”مجھے کچھ کچھ نہیں ہوا ہے اور اس کا علاج تو ہمارا جری والا فیملی ڈاکٹر بھی کر سکتا ہے۔ ہم صبح ہوتے ہی پہلی فلائٹ پکڑ کر جری واپس چلے جائیں گے۔“ گوکہ روتھ ڈاکٹر کی تجویز سے مکمل اتفاق کرتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ اپنے شوہر کے آگے اس کی ایک نہ چل پائے گی۔ آخر کار جب انگلس سو گیا تو اس نے میکس کو ہوٹل کی لابی سے فون کیا تاکہ اسے آگاہ کر سکے کہ وہ صبح ہوتے ہی جری واپس لوٹ جائیں گے۔ وہ یہ سن کر تھوڑا سا پریشان ہوا اور اپنی طرف سے دوبارہ پیشکش کی کہ اگر وہ کسی بھی طرح ان کی مدد کر سکے تو اسے خوشی ہوگی۔

صبح جب وہ دونوں جری واپسی کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھے تو فضائی میزبان نے انگلس کی حالت دیکھ کر اسے ہوائی سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ”ہمیں انہیں جلد از جلد جری لے کر جانا ہے تاکہ ان کا فیملی ڈاکٹر ان کا علاج کر سکے۔“ روتھ گڑگڑائی۔ اس کی مسلسل کوشش کے بعد ہی انہیں ہوائی جہاز پر سفر کرنے کی اجازت ملی۔

روتھ نے چلنے سے پہلے ہی ایک گاڑی کے لیے فون کر دیا تھا جو انہیں ائر پور سٹاپ سے سیدھا گھر لے گئی۔ یہ بھی ایک اضافی خرچہ تھا جس پر اسٹیکس کو تحفظات ہوتے مگر جب تک ہوائی جہاز جری میں اترا، اس وقت تک اسٹیکس کسی بھی قسم کی رائے دینے کی حالت میں نہ تھا۔

گھر پہنچتے ہی روتھ نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر نے ویسے ہی اسٹیکس کا معائنہ کیا جیسا کہ لندن کے ڈاکٹر نے کیا تھا اور روتھ سے یہی سوال دہرایا کہ اسٹیکس نے گزشتہ شب کھانے میں کیا کھایا تھا؟ بالآخر ڈاکٹر نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اسٹیکس کو جلد از جلد کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ دوپہر میں اسٹیکس کو بذریعہ ایسولینس کالج اسپتال منتقل کر دیا گیا اور جب وہاں پر اسپیشلسٹ ڈاکٹر نے اس کا مکمل معائنہ کر لیا تو روتھ کو برابر والے کمرے میں بلا کر کہا۔ ”مجھے خدشہ ہے مسز ہنڈرسن کہ خبر زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آپ کے شوہر کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ شاید زیادہ بھاگ دوڑ اور اس کے بعد کچھ نامناسب غذا کی وجہ سے۔ اور پھر آپ نے انہیں اسپتال لانے میں بھی بہت دیر کر دی۔ اسٹیکس کی حالت اور ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے میرا آپ کو یہی مشورہ ہوگا کہ آپ اپنے بچوں کو اطلاع دے دیجئے تاکہ وہ اپنے والد سے آخری مرتبہ مل سکیں۔“

اس شب جب روتھ واپس گھر آئی تو اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سے رابطہ کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز کو اس نے فوراً پہچان لیا۔

”میکس!“ وہ بے اختیار بولی۔ ”تم نہیں جانتے کہ مجھے تمہاری آواز سن کر کتنی تقویت ملی ہے۔ اسپیشلسٹ نے اسٹیکس کا چیک اپ کیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اسٹیکس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے اور مجھے اپنے بیٹوں کو گھر بلا لینا چاہیے۔“ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ”مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں یہ بات ان سے کیسے کر پاؤں گی۔ تم نہیں جانتے کہ وہ اپنے باپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“

”یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں کل ہی ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو فون پر تمام احوال سے آگاہ کر دوں گا اور پھر ان کو اسکول سے لے کر اپنے ساتھ ہی ہوائی جہاز سے جری لے آؤں گا۔“ میکس بولا۔

”اوہ میکس! تم کتنے اچھے ہو۔“ روتھ تشکر سے لبریز ہو کر بولی۔

”ایسے حالات میں کم از کم میں اتنا تو کر ہی سکتا

کترینیں

☆ جو کسی مسلمان کو ایسی جگہ ذلیل کرے گا جہاں اس کی عزت کی جاتی ہے تو اللہ اسے ایسی جگہ ذلیل کرے گا جہاں اسے اللہ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔

☆ زبان کا وزن بہت ہلکا ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔

☆ عورت کے لیے شرم سے بڑھ کر کوئی زیور اور چادر سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔

☆ حسد اور گھمنڈ جب آدمی کے اندر داخل ہوتے ہیں تو وہ عقل کو باہر کر دیتے ہیں۔

☆ تمہارے نفس کی تربیت کے لیے اتنا کافی ہے کہ تم ان چیزوں سے دوری اختیار کرو جو تمہیں دوسروں میں بری لگتی ہیں۔

☆ تقویٰ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ بندہ اللہ کی چھوٹی سے چھوٹی نافرمانی سے بھی بچنے کی کوشش کرے کیونکہ جو بندہ چھوٹے گناہوں کو معمولی سمجھتا ہے، وہ کبھی بڑے گناہوں سے نہیں بچ سکتا۔

☆ تم کسی بھی انسان کو برا مت سمجھو، شاید وہ ایسا نہ ہو جس طرح تم سمجھتے ہو حقیقی علم تو اللہ کے پاس ہے اور تم تو لاعلم ہو۔

☆ ایمان والی اصلی عورت کا زیور سونا چاندی نہیں بلکہ حیا اور پردہ ہے۔

☆ کبھی کسی ایسے شخص پر ظلم نہ کرو جس کے پاس فریاد کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ ہو۔

☆ جو تکلیف تم خود برداشت نہیں کر سکتے، وہ کسی دوسرے کو بھی نہ دو۔

☆ دو چہرے انسان کو کبھی نہیں بھولتے، ایک مشکل میں ساتھ دینے والا اور دوسرا مشکل میں ساتھ چھوڑنے والا۔

☆ وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں کیونکہ اکثر وقت پر سمجھ نہیں ہوتی اور سمجھ آنے تک وقت نہیں رہتا۔

☆ افضل انسان وہ ہے جو اپنی اصلاح میں لگا رہے۔

☆ عزت کماتا دولت کمانے سے زیادہ مشکل ہے اور عزت گنانا دولت گنوانے سے زیادہ آسان ہے۔

☆ توبہ کرنے والے کی آنکھ کا ایک آنسو دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆ خدا پر بھروسے کا ہنر سیکھ لو۔ لوگ جتنے بھی سچے ہوں بدل ضرور جاتے ہیں۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہوں۔“ میکس بولا۔“ اور اب تم بھی کچھ آرام کرنے کی کوشش کرو۔ آواز سے ہی بہت ٹھنکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میں دوبارہ فون کروں گا جیسے ہی یہ پتا چلا کہ ہم کوئی فلائٹ سے جری آپا میں گئے۔“

روتھ دوبارہ اسپتال چلی گئی اور ساری رات ایک وفلا شعار بیوی کی طرح اپنے شوہر کے سرہانے گزاری۔ اینگلز نے صرف ایک ہی شخص سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وہ تھا اس کا خاندانی وکیل مسٹر کریڈک۔ روتھ نے مسٹر کریڈک کو اگلے ہی دن بلالیا اور خود میکس اور اپنے بیٹوں کو لینے ائرپورٹ چلی گئی۔

میکس کسٹمر ہال سے باہر آیا تو دونوں لڑکے اس کے دائیں اور بائیں جانب تھے۔ روتھ کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دونوں بیٹے بہت ہی سنبھلے ہوئے تھے۔ میکس ان کو اسپتال لے گیا۔ روتھ کو یہ جان کر کافی مایوسی ہوئی کہ وہ اگلے ہی دن لندن واپس جا رہا تھا مگر جاتے ہوئے اس نے روتھ کو سمجھایا کہ اس وقت اسے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے خاندان کے ساتھ گزارنا چاہیے۔

اینگلز جمعے کے روز اسپتال میں پرسکون حالت میں دم توڑ گیا۔ روتھ اور دونوں بیٹے اس وقت اس کے ساتھ ہی تھے۔

میکس جنازے میں شمولیت کے لیے آیا اور اگلے ہی دن دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ روتھ جب اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کر رہی تھی تو اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔“ کیا وہ کبھی پھر میکس سے مل پائے گی؟“ میکس نے اگلے ہی دن اسے فون کر کے خیریت دریافت کی۔“ بالکل تنہا ہوں اور کچھ احساسِ جرم بھی ہے کہ مجھے تمہاری کمی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔“ روتھ آہ بھرتے ہوئے بولی۔“ تم دوبارہ کب جری آؤ گے میکس؟“

”ابھی کچھ دن تک تو نہیں آسکتا اور مت بھولو کہ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ جری میں کھڑکیوں اور دروازوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

”مگر اب میں کیا کروں؟ تنہائی مجھے کاٹنے کو آرہی ہے۔ دونوں بیٹے اسکول واپس لوٹ گئے ہیں اور تم لندن میں پھنسے ہو۔“

”تم لندن کیوں نہیں آ جاتیں؟ کچھ آب و ہوا بھی بدل جائے گی اور یہاں کوئی تمہیں پہچاننے والا بھی نہیں۔ ہم یہاں آزادانہ رہ سکتے ہیں۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مجھے اس بارے

میں سوچنے کے لیے کچھ وقت دو پھر میں تمہیں فون کر کے بتاتی ہوں۔“

پھر اگلے ہی ہفتے روتھ ہیٹھروائر پورٹ لندن کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہاں میکس اس کا منتظر تھا۔ روتھ کو اس کا اخلاص اور اخلاق بہت ہی اچھا لگا۔ خاص طور پر جب وہ بیٹھے بیٹھے یکدم گم صم ہو جاتی تھی اور بیمار محبت سے اجتناب کرتی تو میکس اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا پھر جب چند روز بعد وہ اسے واپس ائرپورٹ چھوڑنے آیا تو وہ اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی۔

”دیکھو تو سہمی مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے تو ابھی تک تمہارا فلیٹ اور دفتر بھی نہیں دیکھا۔“

”میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہارا ہوٹل میں قیام کرنا ہی بہتر تھا۔ میرے گھر اور دفتر کو تو تم اگلی دفعہ آ کر بھی دیکھ سکتی ہو۔“ میکس بولا۔ یہ سن کر روتھ مسکرائی۔ شاید اینگلز کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ ائرپورٹ پر خدا حافظ کہنے سے پہلے میکس نے روتھ کو بانہوں میں سمیٹ کر کہا۔

”میں جانتا ہوں میری جان کہ اس وقت تم ایک بہت ہی مشکل وقت سے گزر رہی ہو مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ شاید آنے والے دنوں میں تم مجھے اینگلز کی جگہ لینے کے قابل سمجھو گی۔“

☆☆☆

جری واپس آنے کے کئی دن بعد تک روتھ میکس کے الفاظ یاد کر کے دہراتی رہی۔ جیسے وہ کسی بہت ہی دلفریب نغمے کے بول ہوں جنہیں وہ دل و دماغ سے نکال ہی نہ پار رہی ہو۔

پھر تقریباً ایک ہفتے بعد اینگلز کے وکیل مسٹر کریڈک کا فون آیا۔ انہوں نے روتھ کو اپنے آفس آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اسے اینگلز کی وصیت اور اس کے مضمرات سے آگاہ کر سکیں۔ روتھ نے اگلے ہی دن ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

روتھ کا خیال تھا کہ جس طرح وہ اور اینگلز ایک آرام دہ زندگی گزار رہے تھے، اسی طرح وہ اینگلز کے گزر جانے کے بعد بھی ایک مناسب طرز زندگی رکھ سکے گی کیونکہ اینگلز کوئی فضول خرچ انسان تو تھا نہیں کہ مستقبل کی فکر نہ کرتا اور معاملات کو ایسے ہی چھوڑ کر چلا جاتا اور پھر اسے یہ بھی یاد تھا کہ اسپتال میں اینگلز نے مسٹر کریڈک سے ملنے پر کس قدر اصرار کیا تھا۔

روتھ نے کبھی ایٹکس کے کاروباری معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ان میں کچھ خاص دلچسپی تھی۔ ایٹکس اگرچہ رقم کے معاملے میں نہایت زیرک اور کاریاں تھا مگر اس نے بھی روتھ کی کسی فرمائش کو رد بھی نہ کیا تھا اور ویسے بھی میکس نے حال ہی میں تو ایٹکس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پاؤنڈز کا چیک جمع کروایا تھا۔ سو اگلے ہی دن وہ مسٹر کریڈٹ کے دفتر جا پہنچی، اس یقین کے ساتھ کہ اس کے آنجنہانی شوہر نے اس کی گزر بسر کے لیے کچھ نہ کچھ مناسب انتظام ضرور کیا ہوگا۔

وہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی دفتر پہنچ گئی تھی مگر اس کے باوجود استقبال پر موجود سیکریٹری نے اسے انتظار کرائے بغیر سیدھا کمپنی کے سینئر پارٹنر کے کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی روتھ نے دیکھا کہ ایک بڑی بورڈ روم ٹیبل کے گرد تین صاحبان بیٹھے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر وہ فوراً ہی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مسٹر کریڈٹ نے اپنے دیگر پارٹنرز سے اس کا تعارف کرایا۔ روتھ نے سوچا کہ شاید ایٹکس کی وفات کی خبر سن کر سب اس سے تعزیت کی غرض سے آئے ہیں مگر وہ دوبارہ اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور اپنے سامنے پڑی ہوئی موٹی موٹی فائلوں کو دیکھنے لگے۔ پہلی مرتبہ روتھ کا ماتھا ٹھنکا۔ ایٹکس کی جائداد کے معاملات میں کوئی رخنہ والی بات تو نہ تھی؟

ٹیبل کے ایک سرے پر بیٹھے سینئر پارٹنر نے سامنے رکھا دستاویزات کا ایک بڑا سا بنڈل کھولا اور ایک بڑی سی دستاویز نکالی۔ پھر اپنے آنجنہانی کلائنٹ کی بیوہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”سب سے پہلے تو میں اپنی اور اپنی فرم کی طرف سے مسٹر ہینڈرسن کی اچانک موت پر اظہارِ افسوس کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی شکریہ۔“ روتھ نے سر جھکا کر کہا۔

”ہم نے آپ کو آج صبح اس مقصد کے لیے تکلیف دی ہے تاکہ آپ کو آپ کے شوہر جواب اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں، ان کی وصیت کی تفصیلات سے آگاہ کر سکیں۔ اس کے بعد آپ ہم سے جو بھی سوال پوچھنا چاہیں پوچھ سکتی ہیں۔“

روتھ سن سی ہو گئی اور کانپنے لگی۔ آخر ایٹکس نے یہ بات اس سے کیوں چھپائی تھی کہ جائداد کے معاملات میں کچھ گڑبڑ ہے؟

وکیل نے وصیت کی پیش بندی کے بعد تر کے کی تفصیل کچھ یوں بیان کی۔ ”میں اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد اپنی بیوی روتھ کے نام کرتا ہوں، ماسوائے درج ذیل کے۔“

(1) دو سو پاؤنڈز زنی کس اپنے دونوں بیٹوں کے نام جسے میں چاہوں گا کہ وہ میری یاد میں کسی نیک کام میں صرف کریں۔

(2) پانچ سو پاؤنڈز اسکاتس رائل اکیڈمی کے نام جس سے انہیں ایک اچھی سی پینٹنگ خریدنی سے جو کہ لازمی طور پر ایک اسکاتس پینٹر کے ہاتھ کی ہی بنی ہوئی چاہیے۔

(3) ایک ہزار پاؤنڈز میرے پرانے جارج وائس کالج کے نام اور مزید دو ہزار پاؤنڈز ایڈنبرا یونیورسٹی کے نام۔ وکیل نے مزید کچھ اور چھوٹی چھوٹی رقم کا ذکر کیا جنہیں ایٹکس نے مختلف لوگوں کے نام مختص کیا تھا اور آخر میں پانچ سو پاؤنڈز کالج اسپتال کے نام تھے جہاں پر آخری ایام میں ایٹکس کی خوب اچھی طرح سے دیکھ بھال کی گئی تھی۔

سینئر وکیل نے روتھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے پاس کوئی سوالات ہیں مسٹر ہینڈرسن جن کے جواب ہم دے سکیں؟ یا آپ بھی اپنے آنجنہانی شوہر کی طرح اپنے تمام قانونی معاملات کی دیکھ بھال ہم سے ہی کروانا چاہیں گی؟“

”سچ کہوں تو مسٹر کریڈٹ..... ایٹکس نے کبھی اپنے کاروباری معاملات کے بارے میں مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ سو میں نہیں جانتی کہ اس ضمن میں کیا قانونی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ بس جب تک ہمارے لیے اتنا سرمایہ موجود ہو کہ جس سے میرے بیٹوں کا اور میرا گزارہ اسی طرح آرام سے ہوتا رہے جیسا کہ ایٹکس کی زندگی میں ہوتا تھا تو مجھے آپ کے قانونی معاملات سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

مسٹر کریڈٹ کی بغل میں بیٹھے پارٹنر نے کہا۔ ”مجھے مسٹر ہینڈرسن کا قانونی مشیر ہونے کا شرف حاصل رہا ہے جب سے وہ اس جزیرے پر تشریف لائے تھے، تقریباً سات سال قبل۔ مسٹر ہینڈرسن! اگر آپ اس سے متعلق کوئی سوال پوچھنا چاہیں تو مجھے آپ کو تمام صورت حال بتانے میں خوشی ہوگی۔“

”اوہ، یہ تو آپ کی بڑی مہربانی ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ مجھے آپ سے کیا سوال کرنا چاہیے ماسوائے اس

کے کہ میں جانتا چاہوں گی کہ میرے شوہر کے اثاثوں کی کل مالیت کیا ہوگی؟“

”یہ تو بہت ہی آسانی سے بتایا جاسکتا ہے۔“ مسٹر کریڈک بولے۔ ”کیونکہ انہوں نے نقد رقم تو کچھ خاص نہیں چھوڑی مگر جائیداد اور اثاثوں کا اندازہ لگانا میری پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں شامل ہے۔“ پھر اپنے سامنے رکھے فائلوں کے ڈبیر سے ایک فائل نکال کر کھولتے ہوئے دوبارہ سلسلہ کلام شروع کیا۔ ”میرے محتاط اندازے کے مطابق تمام اثاثہ جات کی مالیت تقریباً ایک کروڑ اسی لاکھ سے دو کروڑ کے درمیان ہونی چاہیے۔“

”فرائک؟“ روتھ نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔ ”نہیں میڈم..... پاؤنڈز۔“ مسٹر کریڈک نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کافی غور و خوض کے بعد روتھ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اس خوش قسمتی سے ہاتھ لگی خطیر دولت کا کسی سے بھی ذکر نہیں کرے گی۔ اپنے بیٹوں سے بھی نہیں۔ اگلے ویک اینڈ جب وہ لندن گئی تو اس نے میکس کو وصیت کے بارے میں بھی بتایا۔

”تو کیا کچھ حیران کن انکشافات بھی ہوئے؟“ میکس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، کچھ خاص نہیں۔“ اینگلس نے ہمارے بیٹوں کے نام چند سو پاؤنڈز چھوڑے ہیں اور تمہارے توسط سے ملے وہ ایک لاکھ پاؤنڈز ہیں جو کہ اس ایڈریان والے بچکے کو فروخت کر کے ملے تھے۔ بس دال دلایا چلتا رہے گا۔ ویسے بھی میں کوئی بہت زیادہ فضول خرچ عورت نہیں ہوں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنا کام کاج تو جاری رکھنا پڑے گا۔ اگر تم اب بھی مجھ سے شادی کے خواہش مند ہو تو.....“

”پہلے سے بھی زیادہ میری جان۔ ویسے بھی میں اینگلس کے چھوڑے ہوئے مال پر عیش کرنے کے خیال پر ہی لعنت بھیجتا ہوں۔ اور ہاں میرے پاس تمہارے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔“ میکس بولا۔ ”میری کمپنی نے اگلے سال جرسی میں اپنا براچ آفس کھولنے کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔ میں نے ان سے یہ کام کرنے کی ایک ہی شرط رکھی ہے۔“

”اور وہ شرط کیا ہے؟“ روتھ نے بے صبری سے پوچھا۔ ”وہ یہ کہ اگر وہاں کی ایک مقامی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے۔“

روتھ وارفنگی کے ساتھ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسے وہ شخص مل گیا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی بقیہ تمام زندگی بسر کرنا چاہے گی۔

☆☆☆

میکس اور روتھ کی شادی چیلسی کے رجسٹرار کے دفتر میں تین ماہ بعد انجام پائی جس میں صرف روتھ کے دونوں بیٹے بطور گواہان کے موجود تھے اور وہ بھی کچھ کہنے کچھ سے ہی تھے۔ ”وہ کبھی ہمارے والد کی جگہ نہ لے پائے گا۔“ بین نے اپنی ماں سے جذباتی انداز میں کہا تھا جبکہ ٹولس نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

”فکر نہ کرو۔“ میکس نے انہیں اتر پورٹ لے جاتے ہوئے کہا۔ ”وقت کے ساتھ تمہارے تمام خدشات دور ہو جائیں گے۔“

جب وہ پتھر دار پورٹ سے ہنی مون پر روانہ ہوئے تو روتھ نے اس بات پر قدرے مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ ان کی شادی میں میکس کے کسی دوست یا سگی ساسھی نے شرکت نہ کی تھی۔

”دراصل اینگلس کی وفات کے اتنے کم عرصے کے بعد ہماری شادی سے طرح طرح کے شکوک و شبہات جنم لے سکتے ہیں اور یہ میں کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔“ میکس نے اسے مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہوگا کہ میں کچھ عرصے کے بعد ہی تمہیں لندن میں اپنے عزیز واقارب سے متعارف کراؤں۔“ یہ کہتے ہوئے میکس نے محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ روتھ کے تمام خدشات میکس کی باتیں سن کر دور ہو گئے اور وہ مکمل طور پر پرسکون ہو گئی۔

اٹلی کے شہر ونس میں جہاز کے اترتے ہی وہ موٹر بوٹ کے ذریعے سینٹ مارک اسکوائر کے قریب ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ وہاں ہر چیز بڑی نفاست کے ساتھ آراستہ تھی۔ روتھ کو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ اس کا نیا شوہر اسے گھنٹوں ملبوسات اور دیگر فیشن کی اشیا کی دکانوں میں شاپنگ کرانے سے بالکل نہیں گھبراتا تھا۔ اس میں ایسے ملبوسات بھی شامل تھے جو روتھ کے نزدیک خاصے بیش قیمت تھے۔ پورا ہفتہ گنڈولائی ناؤ نما کشتیوں میں مکمل آرام و سکون کے ساتھ کئی کئی گھنٹے سیر کرنے میں گزارے جس کے بیچ میکس ایک لمحے کو بھی روتھ سے جدا نہ ہوا۔

جمعے کے روز میکس نے میکسی کرائے پر لی اور اپنی نئی نویلی دلہن کو جنوبی اٹلی کے شہر فلورنس لے گیا جہاں دونوں

نے وہاں کے مشہور تاریخی مقامات کی سیر کی۔ شام کو خوب پاستا کھاتے اور مارکیٹ اسکوائر کے پنجوں بیچ رقص کرنے والے سیاحوں میں شامل ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو وہ جب ہوٹل واپس آتے تو صبح کی سپیدی نمایاں ہو رہی ہوتی۔ تیسرے ہفتے وہ روم روانہ ہو گئے جہاں پر ہوٹل کے بیڈروم، اوپیرا ہاؤس اور تاریخی وٹیکن سٹی میں ان کا بیشتر وقت گزرا غرضیکہ تین ہفتے پلک جھپکنے میں بیت گئے۔

وہ اپنے میٹوں کو باقاعدگی سے خط لکھتی۔ رات کو سونے سے پہلے دن کا تمام احوال ان کو خط کی صورت میں گوش گزار کرتی۔ خاص طور پر یہ کہ اس کا وقت کتنا اچھا گزر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ میکس کی تعریفوں کے پل باندھتی تاکہ دونوں بیٹے اسے اپنے باپ کی حیثیت میں قبول کر لیں مگر اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ ایسا ہونے میں کافی وقت درکار ہوگا۔

جب روتھ اور میکس جرسی واپس لوٹے تو میکس کا انداز ویسا ہی گرم جوش اور والہانہ تھا۔ روتھ کے لیے اب فکر کی بات بس ایک ہی تھی کہ میکس کو ابھی تک اپنی کمپنی کا ذیلی دفتر کھولنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ مل پائی تھی۔ وہ روزانہ تقریباً صبح دس بجے گھر سے نکلتا مگر زیادہ وقت شہر کے بجائے گالف کلب ہی میں گزارتا۔

”بھئی تعلقات بنانے پڑتے ہیں۔“ وہ ہمیشہ یہی وجہ بیان کرتا۔ ”کیونکہ ایک بار براؤنچ آفس کھل جائے گا تو یہی تعلقات کام آئیں گے۔“

”مگر ایسا ہوگا کب؟“ روتھ نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

”بس اب زیادہ دیر نہیں ہے۔“ وہ تسلی دیتا۔

”جسہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میرے کاروبار میں سب سے اہم چیز مناسب جگہ کا انتخاب ہی ہوتا ہے اور اچھی جگہ کے لیے اگر تھوڑا انتظار بھی کرنا پڑ جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہوتا۔“

مگر جیسے جیسے ہفتے گزر رہے گئے تو روتھ کو تشویش لاحق ہوتی گئی۔ جب بھی وہ اس موضوع پر کوئی بات شروع کرتی تو وہ اسے یہ کہہ کر چپ کر ادیتا کہ وہ چیخ چیخ کرنے والی بیوی بنتی جا رہی ہے۔ بیچتا وہ کم از کم ایک ماہ تک اس بات کا دوبارہ تذکرہ نہ کرتی۔

جب ان کی شادی کو چھ ماہ گزر گئے تو روتھ نے تجویز دی کہ کیوں نہ وہ ایک ویک اینڈ لندن میں گزار آئیں۔ ”اس طرح مجھے تمہارے کچھ دوستوں سے بھی ملنے کا موقع مل جائے گا۔ ٹیگز وغیرہ بھی دیکھیں گے اور تم اپنی کمپنی کو اپنی

کارکردگی کی رپورٹ بھی دے دیتا۔“ مگر ہر دفعہ میکس کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر اسے ٹال دیتا۔ البتہ یہ وعدہ اس نے ضرور کیا کہ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ وہ وینس واپس جا کر ہی منا لیں گے۔

روتھ نے سوچا تھا کہ دو ہفتوں کی چھٹیاں ان کی حسین یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کافی ہوں گی اور شاید میکس کو بھی ایسی کوئی تحریک مل جائے کہ جرسی واپس لوٹنے پر وہ اپنے آفس کے لیے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر ہی ڈالے مگر حالات کچھ یوں بنے کہ ان چھٹیوں میں اور ہنی مون میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پہلے تو جب وہ جہاز سے وینس اترے تو وہاں پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور وہ ایک لمبی قطار میں کھڑے فیکسی کا انتظار کرتے رہے کیونکہ چلنے سے پہلے ایسا کوئی بندوبست نہ کیا تھا۔ جب ہوٹل پہنچے تو روتھ پر انکشاف ہوا کہ میکس نے ہوٹل میں بکنگ ہی نہیں کرائی تھی۔

یہ سوچ کر کہ روتھ نے اپنے تئیں ایسا کر لیا ہوگا۔ بلاوجہ بے چارے منیجر پر میکس نے گرج برس کر اپنا غصہ اتارا اور پھر تیز تیز قدموں سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ پھر وہ تیز بارش میں اپنے سامان سمیت ایک گھنٹا بھگتے پھرے اور آخر کار بڑی مشکل سے انہیں ایک چھوٹے سے معمولی ہوٹل میں جگہ ملی۔ وہ بھی شراب کے بار کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں دو الگ الگ بیڈ لگے ہوئے تھے۔

شام کو شراب پیتے ہوئے میکس کو یاد آیا کہ وہ تو اپنا پرس اور کریڈٹ کارڈ جرسی ہی میں بھول آیا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی کہ جرسی واپسی تک سفر کے تمام اخراجات روتھ کو اٹھانے پڑے تو وہ برا نہیں منائے گی۔ ویسے بھی اب تو تقریباً تمام بلز اور دیگر اخراجات وہ خود ہی برداشت کرتی تھی۔ نیز اس نے سوچا کہ شاید اس وقت اس بات پر کوئی بحث کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پھر فلورنس میں ناشتے کے وقت روتھ نے جھپکتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا کہ اسے امید ہے کہ جرسی پہنچے ہی میکس کو اس کے آفس کے لیے کوئی موزوں جگہ مل جائے گی اور پھر معصومیت سے پوچھا کہ کیا میکس کے دفتر والے اس تاخیر پر اسے کچھ کہتے نہیں؟ میکس یکدم غصے میں آ گیا اور چیخا چلاتا ہوا ناشتے کے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ روتھ کی روز روز کی چیخ چیخ سے تنگ آ چکا ہے پھر اس دن تمام وقت میکس نے باہر گزارا اور روتھ کو شکل نہ دکھائی۔

روم میں بھی تقریباً سارا وقت بارش ہوتی رہی اور میکس کے تئیں بھی بگڑے رہے۔ کبھی کبھی تو وہ صبح کو باہر نکل

جاتا اور جب واپس لوٹتا تو روتھ سوچتی ہوتی۔

بچوں کا پرانا ہیڈ ماسٹر ہمیشہ کی طرح نرم خو اور خوش مزاج تھا اور جب وہ تنہا تھے تب بھی اس نے بس روتھ کے گال پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ روتھ نے اپنے تیزی سے بگڑتے ازدواجی مسائل کے متعلق اس سے رائے لینے کا سوچا۔ جیرالڈ نے روتھ کی بات کو بڑی توجہ سے سنا اور کئی مرتبہ دھیرے سے سر کو ہلایا۔ جب روتھ نے ٹیبل کی دوسری جانب سے اپنے پرانے دوست کی جانب دیکھا تو پہلی دفعہ اس کے ذہن میں طلاق کا خیال آیا مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

جب جہاز نے جرسی کے لیے اڑان بھری تو روتھ نے سکھ کا سانس لیا۔ گھر واپس لوٹنے کے بعد روتھ میکس سے بڑی نپلی بات کرتی اور کوشش کرتی کہ ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ خاص طور پر اس کے کام کی سست رفتاری کا بالکل کوئی تذکرہ نہ کرے۔ مگر اس کی لاکھ کوشش کے باوجود میکس یا تو منہ بسورے بیٹھا رہتا یا پھر بلاوجہ غصے میں پھرجاتا۔ ہر گزرتے ماہ کے ساتھ ان کے درمیان حائل خلیج بڑھتی گئی اور کچھ عرصے بعد تو روتھ نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا کہ میکس کے براؤنج آفس کا کیا بنا؟ اسے کافی عرصے سے یہ احساس ہو چلا تھا کہ میکس کے دفتر کھولنے کا تمام ارادہ ہی چوہٹ ہو چکا تھا اور کبھی تو یہ خیال بھی اس کے دل میں آتا کہ آیا ایسا کوئی کام میکس کے ذمے تھا بھی یا نہیں؟

پھر ایک دن ناٹشے کے دوران میکس نے اچانک ہی یہ اعلان کیا کہ اس کی کمپنی نے جرسی میں براؤنج آفس کھولنے کا منصوبہ ہی ترک کر دیا ہے اور اسے خط کے ذریعے مطلع کر دیا ہے کہ اگر وہ کمپنی میں پارٹنر رہنا چاہتا ہے تو اسے لندن واپس آ کر اپنی جگہ سنبھالنی پڑے گی۔

”اور اگر تم انکار کر دو تو؟“ روتھ نے پوچھا۔ ”کیا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟“

”نہیں، انہوں نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ دوسری صورت میں مجھے پارٹنرشپ سے مستعفی ہونا پڑے گا۔“ ”مجھے تو لندن منتقل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہے۔“ روتھ نے صلاح دی۔ اس امید میں کہ شاید اسی طرح ان کی ازدواجی مشکلات کا کوئی حل نکل سکے۔

”نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس کی کوئی ضرورت ہوگی۔“ میکس نے اس انداز میں کہا جیسے وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ مشکل کا حل کیسے نکالنا ہے۔

”میرے خیال میں بہتر رہے گا کہ اگر میں ہفتے کے دوران لندن میں رہوں اور ویک اینڈ پر تمہارے پاس جرسی آجایا کروں۔“ میکس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ روتھ کے نزدیک یہ کوئی بہتر حل نہیں تھا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس بارے میں میکس سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میکس اگلے ہی روز لندن روانہ ہو گیا۔

روتھ تو بھول چکی تھی کہ آخری مرتبہ کب انہوں نے کوئی پیار محبت بھری بات کی تھی۔ جب میکس شادی کی دوسری سالگرہ کے لیے جرسی نہ آیا تو روتھ نے دھمی دل کے ساتھ جیرالڈ پر سکوٹ کی طرف سے ڈنر کی دعوت کو قبول کر لیا۔

میکس جب اگلے ہفتے گھر لوٹا تو روتھ نے خاص طور پر انتظام کیا تھا۔ صبح جا کر شاپنگ کی تاکہ میکس کے دل پسند پکوان کے لیے گوشت، تازہ سبزیاں اور دیگر اشیاء خرید سکے اور ساتھ ہی ایک قیمتی شراب کی بوتل بھی۔ اپنے پہننے کے لیے اس نے وہ لباس منتخب کیا جو میکس نے پہلی دفعہ وٹس میں اس کے لیے پسند کیا تھا۔ پھر خود گاڑی ڈرائیو کر کے اسے ایئر پورٹ لینے چلی گئی۔ وہ اپنی معمول کی فلائٹ پر نہ آیا جب دو گھنٹے بعد میکس لاؤنچ سے باہر آیا تو یہی کہا کہ ہیتھرو پر دیر ہو گئی تھی۔ اس نے روتھ سے اتنی دیر انتظار کروانے کے لیے معذرت کرنے کی تکلیف بھی نہ کی۔

پھر جب وہ گھر پہنچے اور کھانا کھانے بیٹھے تو اس نے کھانے، شراب اور روتھ کے لباس، کسی پر بھی کسی قسم کے تعریفی کلمات ادا کرنے کی زحمت نہ کی۔ جب روتھ کھانے کی چیزیں سیٹ کر اور دیگر کاموں سے فارغ ہو کر اوپر آئی تو بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ میکس گہری نیند سوچکا تھا۔

ہفتے کا سارا دن میکس نے گالف کلب میں گزارا اور اتوار کو دوپہر کی فلائٹ سے واپس لندن چلا گیا۔ ایئر پورٹ پر روانگی سے قبل اس کے الفاظ یہی تھے کہ وہ نہیں جانتا کہ پھر کب واپسی ہوگی۔ روتھ کو دوبارہ طلاق کا خیال آیا۔

☆☆☆

جیسے جیسے ہفتے گزرتے رہے، لندن سے بس کوئی اکاؤنٹ فون کال ہی آتی یا پھر کبھی کبھار کسی ویک اینڈ پر میکس کا آنا ہوتا۔ بس خانہ پری کے لیے۔ روتھ نے جیرالڈ پر سکوٹ کے ساتھ زیادہ وقت بتانا شروع کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے درمیان معاملات بھی دور تک حلے گئے۔

”کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ اگلے روز جب وہ سوکراٹھے تو روتھ نے جیرالڈ کو کپڑے پہنتے دیکھ کر سوال کیا۔ ”مگر تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو۔“ جیرالڈ نے

نہایت دھمے لہجہ میں اسے یاد دلایا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہماری شادی بس اب نام ہی کی حد تک رہ گئی ہے اور یہ صورت حال کافی عرصے سے ہے۔ دراصل میں میکس کے حسن و جمال اور سحر انگیز شخصیت سے بہت جلد متاثر ہو گئی تھی اور بالکل ایک اسکول گرل کی طرح اس پر لٹو ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں نے دوسری شادی میں جلد بازی کرنے کے موضوع پر ڈھیر سارے ناول اور کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔“

”ارے لڑکی مجھے موقع ملے تو میں توکل ہی تم سے شادی کر ڈالوں۔“ جیرالڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم تو جانتی ہو کہ میں تو پہلی نظر میں ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔“

”اچھا..... تو چلو میں بھی تمہاری شادی کی پیشکش کو قبول کرتی ہوں۔“ روتھ نے ہنس کر اپنے عاشق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب جب کبھی دوبارہ میکس جرسی آیا تو میں اس سے طلاق کے بارے میں ضرور بات کروں گی۔“

مگر میکس کو جرسی آنے میں ایک مہینا لگا اور اگرچہ اس دن بھی اس نے رات دیر گئے کی فلائٹ سے آنا ہی مناسب سمجھا مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے روتھ کو اپنا منظر پایا۔ جب اس نے روتھ کا بوسہ لینے کی کوشش کی تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور پھر بڑے بے تلع انداز میں بولی۔ ”مجھے تم سے طلاق چاہیے۔“

میکس ایک لفظ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم تک آیا اور ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ گم صدمہ بیٹھا رہا اور روتھ اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر اس نے سوال کیا۔ ”کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور آگیا ہے؟“

”ہاں!“ روتھ نے سرد مہری سے جواب دیا۔

”کیا میں اسے جانتا ہوں؟“

”ہاں۔“

”جیرالڈ؟“ اس نے روتھ کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“

ایک مرتبہ پھر میکس سوچوں میں گم ہو گیا۔

”چلو میں تمہارے لیے راستہ آسان کیے دیتی ہوں۔“ روتھ نے کہا۔ ”تم مجھے جیرالڈ سے ناجائز تعلقات رکھنے کے سبب بد چلنی کی بنا پر طلاق دے سکتے ہو اور میں اس پر عدالت میں کوئی پس و پیش نہ کروں گی۔“

میکس کا جواب سن کر روتھ کو کافی حیرانی ہوئی۔ وہ

غلط فہمی

ایک عورت نے اپنی سہیلی کی بہادری سے متاثر ہو کر کہا۔ ”تم نے واقعی بہادری دکھائی کہ ایک چور پر ایسے ہل پڑیں۔“

سہیلی نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ کب پتا تھا کہ یہ چور ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ میرا شوہر دیر سے گھر آیا ہے۔“

انتخاب۔ آمنہ ریاض، ملتان
پہلا آدمی دوسرے آدمی سے۔ ”تم شادی سے پہلے کیا کرتے تھے۔“

دوسرا آدمی روتے ہوئے۔ ”جو میرا دل کرتا تھا۔“

☆☆☆

سردار بیٹے کی برات لے کر گیا تو دلہن کا باپ بولا۔ ”آپ نے تو کہا تھا کہ صرف پچاس بندے ہوں گے۔ آپ کے ساتھ تو دو سو بندے ہیں۔“

سردار۔ ”بندے تے پچاس ای نہیں، باقی سارے تے چول نہیں۔“

مرسلہ۔ اسد عباس، چک نمبر 41، شمالی سرگودھا
استاد۔ ”کل تم نے چھٹی کیوں کی؟“

اسٹوڈنٹ۔ ”سر گھر میں مہمان آئے تھے۔“
استاد۔ ”oh i see“

اسٹوڈنٹ۔ ”او آئی ہوندی تے میں آج وی نہیں سی آتا۔“

مرسلہ۔ اسد عباس، چک نمبر 41، شمالی سرگودھا

بولا۔ ”مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے اور شاید بہتر ہوگا اگر ہم اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے بیٹوں کے کمرے کی چھٹیوں پر گھر آنے کا انتظار کر لیں۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی روتھ مان تو گئی مگر اسے اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ میکس نے اس کے بیٹوں کا ذکر کیا کیونکہ اسے نہیں یاد تھا کہ آخری مرتبہ کب میکس نے ایسا کیا تھا۔

میکس نے وہ رات گیٹ روم میں گزاری اور اگلے ہی دن صبح کو لندن لوٹ گیا۔ اپنے دو بڑے بڑے سوٹ کیسوں کے ہمراہ۔ پھر اس کے بعد کئی ہفتوں تک اس کا جرسی آنا نہ ہوا جس دوران روتھ اور جیرالڈ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق پروگرام بناتے رہے۔

جب روتھ کے دونوں بیٹے کرسس کی چھٹیوں میں گھر آئے تو یہ سن کر کہ ان کی ماں اپنے نئے شوہر سے طلاق لے رہی ہے، نہ تو کوئی حیرانی ہوئی نہ ہی کوئی تشویش۔ میکس نے تو کرسس پر گھر آنے کا تکلف ہی نہ کیا مگر روتھ کے بیٹوں کے واپس پونپورٹی لوٹ جانے کے اگلے ہی دن وہ گھر آ گیا۔ وہ بذریعہ میکسی گھر پہنچا اور صرف ایک گھنٹا وہاں ٹھہرا۔ ”میں طلاق کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے روتھ سے کہا۔ ”اور میں نے سوچا ہے کہ لندن پہنچے ہی اس بارے میں قانونی کارروائی شروع کر دوں گا۔“ روتھ نے صرف سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ سب کچھ جلد از جلد اور سہولت سے طے پا جائے تو میرا مشورہ یہ ہوگا کہ تم بھی لندن ہی کے کسی وکیل کی خدمات حاصل کر لو۔ اس طرح مجھے بار بار جرسی کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے جس سے صرف دیر ہی لگے گی۔“

روتھ کو اس کی اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ میکس کی راہ میں کوئی دشواری حائل کیے بغیر اس رشتے سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ میکس کے لندن جانے کے چند روز بعد ہی روتھ کو طلاق کے کاغذات لندن کے ایک وکیل کی جانب سے موصول ہوئے۔ روتھ نے اس وکیل کے بارے میں کچھ نہ سن رکھا تھا۔ اس نے اپنے لیے انگلش کے ایک پرانے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ساتھ میں یہ بھی تاکید کی کہ وہ اس قسے کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہے۔

جب اس سلسلے میں کورٹ کی جانب سے آخری ڈگری وصول ہوئی تو جیرالڈ نے تجویز دی کہ اس بات کا تو جشن منانا چاہیے، کہیں اچھی سی چھٹیاں گزار کر۔ روتھ نے تجویز کو کھلے دل سے سراہا مگر جانے کے لیے بس ایک ہی شرط رکھی اور وہ یہ کہ کہیں بھی جائیں گے مگر اٹلی کے آس پاس بھی نہیں پھکیں گے۔

”تو کیوں نہ بذریعہ کشتی یونانی جزائر کی سیر کی جائے؟“ جیرالڈ نے تجویز دی۔ ”اس طرح اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں رہے گا کہ ہمیں میرے کسی طالب علم یا اس کے والدین کا سامنا کرنا پڑ جائے۔“ اگلے ہی روز وہ اتھنز کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب وہ اسکارسوس کی بندرگاہ پر پہنچے تو روتھ نے کہا۔ ”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی شادی کی تیسری سالگرہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ گزاروں گی۔“

جیرالڈ نے اسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ”اب میکس کو بھولنے کی کوشش کرو۔ وہ ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔“

”ہاں تقریباً۔“ روتھ آہستہ سے بولی۔ ”میں نے سوچا تھا کہ طلاق سے متعلق تمام امور بخیر و خوبی طے پا جاتے تو اس کے بعد ہی جرسی سے کہیں باہر جاتی۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ آخرا اب اتنی مزید دیر کس وجہ سے ہو رہی ہے؟“ جیرالڈ نے پوچھا۔

”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ روتھ نے جواب دیا۔ ”مگر جو بھی وجہ ہوگی، اس کا علم میکس ہی کو ہوگا۔“ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ میں نے آج تک میکس کا سے فیئر کا دفتر دیکھا تک نہیں اور نہ ہی اس کے کسی دوست اقارب سے ملی۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب میرے تخیل ہی کا حصہ تھا۔“

”ہاں یا پھر میکس کے تخیل کا!“ جیرالڈ نے اس کی کمر کے گرد اپنی ہاتھوں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر اب میکس کے بارے میں مزید باتیں کر کے وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ یونانیوں کے بارے میں کچھ بات کرتے ہیں۔“ اگلے تین ہفتے انہوں نے یونانی جزائر کے اطراف میں کشتی رانی کرنے میں گزارے۔

تفریح کے یہ شب و روز بہت ہی لطیف تھے کیونکہ جیرالڈ کشتی رانی میں بے حد ماہر تھا۔ روتھ کو تو حیرت ہوتی کہ کیسے وہ طوفانی لہروں کے بیچ بھی ہنسا مسکراتا رہتا ہے۔

جب وہ جرسی واپس پہنچے تو جیرالڈ روتھ کو گھر چھوڑنے آیا۔ روتھ نے جب دروازہ کھولا تو ڈاک کے ایک انبار نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سوچا کہ اس سب کو تو شام تک انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

روتھ نے وہ رات کروٹیں بدل کر گزاری۔ آخر کار نیند کے چند لمحوں اس کے حصے میں آ ہی گئے۔ بیدار ہونے پر اس نے سوچا کہ چائے کا ایک کپ بنایا جائے۔ ساتھ ہی اس نے خطوط کے ڈھیر کو دیکھنا شروع کیا۔ پھر ایک موٹے سے پیکٹ پر اس کی نظر جم گئی جس پر فوری اور پرائیوٹ لکھا تھا اور پوسٹ مارک لندن کا تھا۔ روتھ نے بے صبری سے اسے کھولا اور ایک دو دستاویز نکالیں جسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ایک حتمی طلاق قرار پاتی ہے درج ذیل دو فریقین کے مابین۔ (1) مسٹر میکس ڈونالڈ بینٹ..... اور (2) مسز روتھ اتھل بینٹ“ چلو یہ قصہ تو اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔“ روتھ نے بہ آواز بلند کہا اور جیرالڈ کو

فون کیا تاکہ اسے بھی یہ خوش خبری سنا سکے۔

”ماہوس کن۔“ جبرالڈ نے کہا۔

”ماہوس کن؟ کیوں؟“ روتھ نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں میری جان کیونکہ تم کو تو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ میری عزت و تکریم میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ جب سے میرے اسکول کے طالب علموں کو اس بات کا پتا چلا ہے کہ میں ایک شادی شدہ خاتون کے ساتھ چھٹیاں گزار کر آیا ہوں۔“

روتھ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ ”جبرالڈ! تمیز کرو اور اب تم ایک شریف اور عزت دار شادی شدہ آدمی بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”ارے میں تو اور انتظار کر ہی نہیں سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”مگر اب مجھے جانا ہوگا کیونکہ گناہ کی زندگی گزارنا ایک بات ہے اور اسکول کی اسبلی میں صبح کی عبادت میں شریک ہونا دوسری۔“

روتھ ہاتھ روم گئی اور وزن کی مشین پر کھڑی ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے کانٹے کی سوئی جہاں جا کر رکی، وہ مقام دیکھ کر اس نے ایک دکھ بھری آہ بھری اور فیصلہ کیا کہ اس دن وہ کم از کم ایک گھنٹا جم میں گزارے گی۔ جیسے ہی وہ نہانے کے لیے جانے لگی تو فون کی گھنٹی بجی۔ وہ تو لیا پیٹ کر باہر آئی اور سوچنے لگی کہ یہ یقیناً جبرالڈ ہی ہوگا۔

”گڈ مارننگ مسز بینٹ!“ دوسری طرف سے ایک نہایت مہذب آواز آئی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اس نام سے کس قدر نفرت کرنے لگی تھی۔ ”میں کریڈک بول رہا ہوں میڈم۔ میں گزشتہ تین ہفتوں سے آپ سے رابطہ کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہوں۔“

”اوہو مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔“ روتھ بولی۔ ”مگر میں یونانی جزائر پر تعطیلات گزار کر گزشتہ شب ہی واپس لوٹی ہوں۔“

”اوہ میں سمجھا، چلیے اب تو ہم مل سکتے ہیں..... کسی مناسب وقت پر؟“ اس نے روتھ کی سیر و تفریح میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، کیوں نہیں مسٹر کریڈک۔ میں آپ کے دفتر بارہ بجے تک پہنچ سکتی ہوں۔“ روتھ نے کہا۔ ”اگر آپ کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو۔“

”آپ جس وقت بھی تشریف لانا چاہیں ہمارے لیے مناسب ہے۔“ مسٹر کریڈک نے رکی خوش مزاجی کے ساتھ کہا۔

روتھ نے اس روز جم میں خوب ورزش کی، اس مقصد کے ساتھ کہ یونان میں بڑھا ہوا وزن جلد از جلد کم کر سکے کیونکہ معزز شادی شدہ عورت وہ ہونہ ہو مگر سلم اسمارٹ ضرور دکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ ورزش سے فارغ ہوئی تو گھڑی کی سوئیاں بارہ کے قریب تھیں۔ اس نے بھاگ بھاگ لا کر روم سے کپڑے نکالے اور غسل کے بعد کپڑے تبدیل کر کے جلدی جلدی تیار ہوئی مگر پھر بھی جب وہ مسٹر کریڈک کے دفتر پہنچی تو بارہ پینتیس ہو چکے تھے۔ استقبال پر موجود لڑکی ایک مرتبہ پھر اسے سینئر پارٹنر کے دفتر کی جانب لے گئی۔ جیسے ہی وہ دفتر میں داخل ہوئی تو مسٹر کریڈک کو بے صبری سے کمرے کا گشت کرتے پایا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنا انتظار کرایا۔“ روتھ نے شرمندگی سے کہا۔ اسے دیکھ کر دونوں پارٹنر تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس مرتبہ مسٹر کریڈک نے اسے چائے کا پوچھے بغیر ہی ہاتھ کے اشارے سے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ ساتھ ہی مسٹر کریڈک اور دوسرے پارٹنر بھی بیٹھ گئے اور پاس پڑی قائلوں کے ڈھیر سے ایک کاغذ نکالا۔

”مسز بینٹ! ہمیں آپ کے شوہر کے وکیل کی طرف سے یہ قانونی نوٹس موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے مکمل تصفیے کا تقاضا کیا ہے۔ آپ کی طلاق ہو جانے کے بعد۔“
 ”ہم نے تو کبھی کسی تصفیے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔“ روتھ نے بے یقینی کی حالت میں جواب دیا۔
 ”یہ تو کبھی معاہدے کا حصہ ہی نہیں تھا۔“

”وہ تو خیر ہوگا۔“ مسٹر کریڈک نے کاغذات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر بد قسمتی سے آپ نے طلاق کی وجہ اپنے ناجائز تعلقات کو بنایا کسی مسٹر جبرالڈ کے ساتھ.....“ پھر نام کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”جبرالڈ پریسکوٹ کے ساتھ۔ جب آپ کے شوہر اپنے کام کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے۔“

”یہ تو صحیح ہے مگر ہم نے ایسا صرف اس لیے کیا تھا تاکہ طلاق سے متعلق معاملات تیزی سے نمٹ سکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم دونوں ہی جلد از جلد طلاق حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

”مجھے یقین ہے مسز بینٹ کہ ایسا ہی معاملہ ہوگا۔“ اسے اس نام سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔
 ”مگر مسٹر بینٹ کی شرائط مان کر آپ نے انہیں اس کیس میں ایک بے قصور فریق بنا دیا ہے۔“

”مگر اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ روتھ نے پوچھا۔ ”کیونکہ آج صبح ہی مجھے اپنے لندن کے وکیل سے اس بات کا تصدیقی خط موصول ہو گیا ہے جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ہماری طلاق مکمل طور پر اختتام پذیر ہو چکی ہے۔“

مسٹر کریڈک کے پارٹنر جو ان کے پہلو میں بیٹھے تھے، روتھ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ”کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ مسٹر بینٹ ہی کی تجویز تھی کہ آپ طلاق کے معاملات کے لیے لندن کے ہی کسی وکیل کا انتخاب کریں؟“

”اوہ تو یہ معاملہ ہے۔“ روتھ نے سوچا۔ ”یہ وکیل صرف اس لیے بیچ تاؤ کھا رہے ہیں کیونکہ میں نے ان کی خدمات حاصل نہیں کیں۔“

”جی ہاں۔“ اس نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ ”دیکھیے ہم نے ایسا صرف معاملات کو آسان بنانے کے لیے کیا تھا کیونکہ میکس اس وقت لندن میں مقیم تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کیس کے سلسلے میں بار بار جری آنا جانا پڑے۔“

”بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ ایسا کرنے سے مسٹر بینٹ کے لیے تو بہت ہی آسانی ہو گئی۔“ سینئر پارٹنر نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کیا آپ کے شوہر نے بھی مالی تصفیے کے بارے میں کوئی بات کی؟“

”کبھی نہیں۔“ روتھ نے قدرے کرخت لہجے میں جواب دیا۔ ”اے تو میری مالی حیثیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔“

”مگر میرے اندازے کے مطابق تو.....“ مسٹر کریڈک کے ساتھی وکیل نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر بینٹ کو کافی اچھی طرح سے آپ کی مالی حیثیت اور آپ کے اثاثہ جات کی مالیت کا اندازہ تھا۔“

”مگر یہ ناممکن ہے۔“ روتھ نے اصرار کیا۔ ”میں نے تو اپنی دولت اور اثاثہ جات کے بارے میں کبھی اس سے ذکر ہی نہیں کیا۔“

”کچھ بھی ہو مگر انہوں نے آپ کے اوپر ایک دعویٰ دائر کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھلے آپ نے بھی ان سے کچھ نہ کہا ہو مگر انہوں نے آپ کے آنجنابی شوہر کے اثاثوں کی مالیت کا بہت صحیح اندازہ لگایا ہے۔“

”تو آپ اسے لکھ بھیجیں کہ میں اسے اس میں سے ایک پائی بھی نہیں دینے والی کیونکہ یہ ہمارے معاہدے کا حصہ تھا ہی نہیں۔“

”میں مانتا ہوں کہ آپ صحیح فرما رہی ہیں مسز بینٹ مگر ساتھ ہی مجھے ڈر ہے کیونکہ طلاق میں قصور دار فریق آپ

تھیں اس لیے اب ہمارے پاس دفاع کے لیے کوئی بھی طریقہ نہیں بچا۔“

”کک..... کیا مطلب؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ روتھ پر بجلی سی گر پڑی۔

”دیکھیے، جری میں تو اس کے متعلق قانون بہت ہی واضح ہے اور اگر آپ نے ہم سے پہلے رابطہ کر لیا ہوتا تو ہم آپ کو بہت بہتر طریقے سے مشورہ دے سکتے تھے۔“ مسٹر کریڈک نے کہا۔

”کک..... کیا قانون؟“ روتھ نے پھر ہکلاتے ہوئے کہا۔

”جری کے قانون کے مطابق جب اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ طلاق کے معاملے میں ایک فریق مکمل طور پر بے قصور ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو وہ فریق اپنے آپ ہی دوسرے فریق کی جائیداد اور اثاثوں میں ایک تہائی حصے کا حق دار ہو جاتا ہے۔“

یہ سنتے ہی روتھ تھر تھر کانپنے لگی۔ ”اور کیا اس سے کوئی استثناء نہیں مل سکتا؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ایک صورت میں استثناء مل سکتا ہے۔“ مسٹر کریڈک بولے۔ روتھ نے امید بھری نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

”اگر آپ کی شادی کی مدت تین سال سے کم ہو تو پھر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا مگر مسز بینٹ آپ کی ازدواجی زندگی کی مدت تین سال اور آٹھ دن تھی۔“ پھر انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے مسز بینٹ کہ مسٹر بینٹ کونہ صرف آپ کی جائیداد کی مالیت کے بارے میں آگاہی حاصل تھی بلکہ ان کو جری کے طلاق سے متعلق قوانین کے بارے میں بھی اچھی طرح علم تھا۔“

تین ماہ بعد جب دونوں اطراف کے وکیلوں نے روتھ کے تمام اثاثہ جات کی مالیت کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو میکس ڈونالڈ بینٹ کے نام ایک چیک جاری کیا گیا جس کی کل مالیت بائیس لاکھ ستر ہزار پاؤنڈز تھی۔ یہ اس کیس کے حتمی اور مکمل تصفیے کی رقم تھی۔

جب بھی روتھ گزرے ہوئے تین سالوں پر نگاہ ڈالتی تو اسی نتیجے پر پہنچتی کہ یقیناً میکس نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ مکمل تفصیل کے ساتھ۔ ہاں، شاید ان کی پہلی ملاقات سے بھی پہلے.....

فرزندِ دروغ

ملکِ سندھیات

WWW.PAKSOCIETY.COM

زن، زراور زمین کے بعد اگر کسی جذبے کی بدولت حادثات جنم لیتے ہیں تو وہ حسد ہے... اور اگر یہ جذبہ رقیب کے دل میں جگہ بنالے تو دو میں سے کسی ایک کی زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں... وہ بھی اسی آگ میں جلتا رہا اور بالآخر اپنی ذات سے وابستہ باقی تمام رشتوں کو بھی جلا ڈالا... انسان کی سوچ کا یہ کرشمہ ہے، جو کرنے کی ٹھان لے اسے کر گزرتا ہے یہ اور بات کہ وہ مثبت اور منفی میں سے کس سمت کا انتخاب کرے۔ اگرچہ منفی اقدام کے اثرات سے بچنے کے لیے وہ بہت عقل لڑاتا ہے لیکن لہو اپنے قاتل کا پتا خود ڈھونڈ لیتا ہے۔

ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دو افراد میرے پاس آئے۔ ان میں ایک دراز قامت اور دوسرا پست قد تھا۔ دراز قامت دبلا پتلا جبکہ پست قد گھٹسے ہوئے مائل بہ فریبی بدن کا مالک تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ میں نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا اور باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں بھئی..... کیا معاملہ ہے؟“

دراز قامت دبلے پتلے شخص نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”جناب! میرا نام رحمت علی ہے۔ میں اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان ہوں۔“

”کیوں.....“ میں نے رحمت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا ہوا ہے تمہاری بیٹی کو؟“

”تھانے دار جی! آسہ کم ہو گئی ہے۔“ وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ”میں نے پورا مغل پورہ چھان مارا ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔“

مطلع ابر آلود تھا۔ فضا میں ٹھنڈی رچی بسی تھی۔ وقفے وقفے سے آسمان پر بجلی بھی چمک اٹھتی تھی جیسے زمینی صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ آسمان کی روئی شکل کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ اب تب میں وہ اپنے ضبط کے سارے بند کھول دے گا۔ اس ٹھنڈے موسم میں، میں تھانے میں بیٹھا امور تھانے داری شمار ہا تھا۔

ان دنوں میری تعیناتی ضلع جھنگ کے ایک دور دراز قصبے میں تھی۔ مذکورہ قصبہ ریلوے لائن اور مکی سڑک کے درمیان واقع تھا اور اس کا باقاعدہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن بھی تھا جہاں پسنجر ٹرینیں دس پندرہ منٹ کے لیے رکا کرتی تھیں۔ وہ ماہ دسمبر کا آخری عشرہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا، موسم کی خشکی اور بے بسی اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں اگر بارش شروع ہو جاتی تو خون کورگوں میں جننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے، میں تھانے سے اٹھنے کا



ہوئے بتایا۔ ”نہیں جناب! آئیہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی البتہ..... اس کی سنگنی ہو چکی ہے۔ اگلے سال اس کی شادی کا ارادہ تھا۔“

”میں نے کرامت کے بیٹے لیاقت سے آئیہ کا رشتہ طے کیا تھا۔“ رحمت علی نے بتایا۔ ”کرامت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگلے سال ان کی شادی کا پروگرام تھا مگر اس سے پہلے ہی آئیہ کہیں گم ہو گئی ہے۔“

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”آئیہ اپنی جن سہیلیوں کے ہمراہ چھپرے سے مٹی نکالنے گئی تھی کیا آپ لوگوں نے ان سے بھی پوچھ گچھ کی ہے؟“

”جی ہاں..... سب سے پوچھا ہے۔“ رحمت علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن ان سب کا کہنا یہی ہے کہ آئیہ چھپرے کی طرف سے واپس آ گئی تھی۔ کسی کو بھی اس کی گمشدگی کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔“ ”کسی کو کچھ خبر نہیں۔“ میں نے رحمت علی کے الفاظ دہرائے پھر سوال کیا۔ ”کیا آئیہ کی وہ سہیلیاں بھی مغل پورہ ہی میں رہتی ہیں؟“

”جی ہاں..... سب کے گھر آس پاس ہی ہیں۔“ ”سب لڑکیاں گھر واپس آ گئیں مگر آئیہ نہیں پہنچی۔“ میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ”کہاں جا سکتی ہے وہ.....!“ ”تھانے دار جی ا“ رحمت علی نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ”آپ کسی بھی طرح میری آئیہ کو ڈھونڈ نکالیں جی۔“ صغریٰ نے رورو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آئیہ کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہے.....“ ”صغریٰ بی بی، رحمت علی کی بیوی اور آئیہ کی ماں تھی۔ آئیہ سے چھوٹے رحمت کے دو بیٹے تھے جن کے نام اور عمریں علی الترتیب کچھ یوں تھیں۔ توصیف بارہ سال اور احمد آٹھ سال۔ یہ معلومات بعد میں رحمت علی کی زبانی ہی مجھے تک پہنچی تھیں۔ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

”رحمت علی! مجھے تمہاری بیٹی کی گمشدگی کا سخت افسوس ہے اور میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ میں بہت جلد آئیہ کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی۔“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تمہاری بیٹی کی بازیابی کے سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی سخت ضرورت ہوگی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں جس قصبے میں تعینات تھا، مغل پورہ وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے رحمت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو تم مغل پورہ کے رہنے والے ہو؟“

”جی تھانے دار صاحب ا“ رحمت علی کے ساتھی نے جواب دیا۔ ”میں رحمت کا چھوٹا بھائی کرامت علی ہوں جی۔ ہم سب آئیہ کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ کچھ پتا نہیں چل رہا، وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ ہم نے مغل پورہ اور اس کے ارد گرد کا سارا علاقہ اچھی طرح دیکھ لیا ہے مگر اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ اب تھک ہار کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔“

”یہی تو سب سے بڑی خرابی ہے کہ لوگ جھکنے کے بعد تھانے اور پولیس کا رخ کرتے ہیں۔“ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ مسئلے کی ابتدا ہی میں ہم سے رجوع کر لیں تو ان کی جیت کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں خیر.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ لوگوں کو کب پتا چلا کہ آئیہ غائب ہو چکی ہے؟“ ”وہ جی آج دوپہر میں۔“ رحمت علی نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

”کیا وہ گھر کے اندر سے غائب ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب ا“ رحمت علی دو ٹوک انداز میں بولا۔ ”وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑے چھپرے (جوہڑ) کی طرف گئی تھی۔ یہ لوگ مٹی نکالنے اکثر چھپرے کی جانب جاتی رہتی ہیں۔ سب واپس آ گئیں مگر آئیہ.....“ ”بولتے بولتے رحمت علی کی آواز بھرا گئی اور وہ کندھے پر موجود رومال کی مدد سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

میں نے روئے سخن گشودہ آئیہ کے چچا کرامت علی کی طرف پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”آئیہ کی عمر کیا ہو گئی؟“

”یہی کوئی بیس اکیس سال جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟“

ننانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ کرامت علی میرے سوال کا جواب نفی میں دے گا کیونکہ اگر آئیہ شادی شدہ ہوتی تو ان لوگوں کے ساتھ اس کا شوہر بھی موجود ہوتا۔ کرامت علی نے میرے اندازے کی تصدیق کرتے

کر کے رخصت ہو گئے۔

میں نے حوالدار دلاور خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

”دلاور خان! ہم پندرہ بیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کے بعد تھانے سے نکلیں گے۔ تم ضروری تیاری کر لو۔“

”جانا کہاں ہے ملک صاحب؟“ دلاور خان نے اپنی کنگ سائز مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”مغل پورہ!“ میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

”ابھی یہ دونوں بھائی جو آئے تھے نا، انہی کے گھر جانا ہے۔“

”اچھا اچھا.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”ان میں سے کسی کی لڑکی گم ہو گئی ہے نا.....“

”ہاں..... اسی سلسلے میں تفتیش کرنے جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ملک صاحب! آپ موسم دیکھ رہے ہیں نا.....؟“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے گھور کر حوالدار کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

اس سے پہلے کہ حوالدار دلاور خان میرے سوال کا جواب دیتا، قصبے کی مسجد میں اذان مغرب کی صدا بلند ہوئی۔

میں نے حوالدار کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے رحمت علی اور کرامت علی کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر تھانے سے رخصت کر دیا تھا۔ میں چاہتا تو ان کے ساتھ بھی مغل پورہ جاسکتا تھا لیکن میں محض مغرب کی نماز کی خاطر رک گیا تھا۔ آسیہ کی گمشدگی والا معاملہ ایسا ہنگامی نوعیت کا نہیں تھا کہ گھنٹے، آدھے گھنٹے کی تاخیر سے کوئی خاص فرق پڑ جاتا۔ اگر میں بھی ان کے ساتھ ہی نکل کھڑا ہوتا تو مغرب کی نماز راستے ہی میں ہو جاتی۔

☆☆☆

جب ہمارا تانکا مغل پورہ میں داخل ہوا تو برقانی رات کا سیاہ ریشمی اندھیرا ہر شے کو اپنی آغوش میں سمیٹ چکا تھا۔ ماحول میں ایک عجیب سا سو گوار سا تانکا تھا تاہم اس کے ساتھ ہی آسمان کے حور بھی خامے خطرناک نظر آتے تھے۔

یونہی محسوس ہوتا تھا کہ بارش کسی بھی لمحے شروع ہو سکتی ہے۔

کرامت علی اور رحمت علی کے گھر ایک دوسرے کے ساتھ، پہلو بہ پہلو جڑے ہوئے تھے۔ مغل پورہ کی آبادی پانچ سو سے چھ سو کے درمیان رہی ہوگی۔ ہم نے تانکا کلی

”میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں سرکار۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”آپ حکم تو کریں۔“

”کیا آسیہ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی تھی؟“

”نہیں جی..... بالکل نہیں.....!“

”اور تمہاری.....؟“

”تھانے دار جی! بھائی صاحب بہت ہی امن پسند اور سرطیم طبع انسان ہیں۔“ کرامت علی نے کہا۔ ”ان کی کسی سے بھی تلخ کلامی نہیں ہوئی تو دشمنی کیسے ہو سکتی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔“

میں آئندہ دس منٹ تک گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوال کرتا رہا مگر آسیہ کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ بالآخر میں نے ان سے کہا۔

”تم دونوں گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے پاس آتا ہوں۔ مجھے وہاں کچھ ضروری کام ہے۔“

”کس قسم کا کام جناب؟“ چھوٹے بھائی کرامت علی نے چوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تم لوگ میرے پاس آسیہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئے ہونا.....“ میں نے باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اب میرا جو کام ہوگا، وہ آسیہ کی تلاش اور بازیابی کے سلسلے ہی میں ہوگا۔“

دونوں کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نے مزید کہا۔ ”میں دراصل ان لڑکیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں جو آسیہ کے ساتھ مٹی نکالنے چھپر کی طرف گئی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں، ان میں سے کوئی آسیہ کے حوالے سے ضرور جانتی ہوگی۔“

”آپ کوشش کر کے دیکھ لیں جی۔“ رحمت علی نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔ ”ہمیں تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔“

”آسیہ کے ساتھ آج کتنی سہیلیاں چھپر پر گئی تھیں؟“

”تین جناب!“ کرامت علی نے جواب دیا۔

”عائشہ، رضوانہ اور خالدہ۔“

”ہوں.....!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ان میں سے کون کون شادی شدہ ہے؟“

”کوئی بھی نہیں تھانے دار صاحب۔“ اس نے بتایا۔

”وہ تینوں کنواری ہیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور ان تین لڑکیوں کو بھی بلا لو۔ میں کچھ دیر میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔“

ان دونوں بھائیوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام

کے داخلی سرے پر کھڑا کیا اور رحمت علی کے دروازے تک پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم گھر کی بیشک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

رحمت علی کی گاؤں کے اندر ہی کریمانے کی دکان تھی جہاں بیٹھ کر وہ دن بھر مختلف نوعیت کے سودے بچا کرتا تھا جبکہ اس کا چھوٹا بھائی کرامت علی کو چوان تھا۔ اس کا اپنا تانگا گھوڑا تھا۔ وہ عموماً ریلوے اسٹیشن سے سواریاں اٹھا کر مغل پورہ اور آس پاس کے دیگر گاؤں دیہات تک پہنچایا کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں کا رزق روزگار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ آسیہ کی گمشدگی نے ان کا آرام و سکون غارت کر دیا۔

میں نے دونوں بھائیوں کو ایک مرتبہ پھر تسلی بخشی دی۔ خاص طور پر آسیہ کی ماں صغریٰ بی بی کو میں نے یقین دلایا کہ میں بہت جلد اس کی بیٹی کو تلاش کر کے اس کے پاس پہنچا دوں گا۔ میری ہمدردی بھری باتوں نے بڑی حد تک صغریٰ بی بی کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

میری فرمائش پر یکے بعد دیگرے ان تین لڑکیوں کو رحمت علی کے گھر میں بلایا گیا جو آج دن میں گمشدہ آسیہ کے ساتھ چھپڑے مٹی نکالنے گئی تھیں۔ ان میں عائشہ، رضوانہ اور خالدہ شامل تھیں۔ میں نے ان سے باری باری سوالات کیے۔ عائشہ بھاری تن و توش کی مالک ایک موٹی تازی لڑکی تھی۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور جسامت سے بچپن سال کی نظر آتی تھی تاہم بعد ازاں اس کی عمر میں معلوم ہوئی۔ عائشہ خاصی گھبراہٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ شاید یہ اس بات کا اثر تھا کہ وہ ان لمحات میں ایک نہیں بلکہ دو باوردی پولیس والوں کے سامنے حاضر کی گئی تھی۔ حوالدار اگرچہ بیشک کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا تھا تاہم پولیس کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے۔

”عائشہ! تم میری بیٹی کی طرح ہو اس لیے مجھ سے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”آرام سے مجھے بتاؤ کہ آج دن میں چھپڑ پر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”واقعہ.....“ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہاں تو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا تھانے دار جی۔“

”واقعہ پیش آیا تھا یا نہیں، یہ زیادہ اہم نہیں ہے۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ آسیہ کہاں تم ہو گئی ہے؟“ ”مم..... مجھے..... آسیہ کے بارے میں کچھ پتا نہیں جناب۔“ وہ سرسراہتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نہیں جانتی،

وہ کہاں چلی گئی ہے۔“

”تم آسیہ کی سہیلی ہونا؟“

”جی.....!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ”اگر تم آسیہ کی سہیلی ہو تو تمہیں اس کے گم ہونے کا دکھ بھی ہوا ہوگا.....؟“

”جی بہت زیادہ دکھ ہوا ہے مجھے.....“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”اور تم یہی چاہتی ہو نا کہ..... آسیہ جلد از جلد مل جائے؟“ میں نے مخصوص انداز میں پوچھنے کا عمل جاری رکھا۔

”جی..... میں یہی چاہتی ہوں۔“ اس نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔

”اگر واقعی تم آسیہ کی واپسی کی خواہش مند ہو تو اس کی تلاش کے لیے مجھ سے بھرپور تعاون کرو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم چاروں سہیلیاں آج دن میں چھپڑ سے مٹی نکالنے گئی تھیں۔ میں واپس آگئیں اور ایک..... یعنی آسیہ ابھی تک غائب ہے جب وہ تم لوگوں کے ساتھ گئی تھی تو ساتھ ہی واپس کیوں نہیں آئی؟“

”تھانے دار جی.....!“ عائشہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے بڑی سادگی سے بتایا۔ ”آسیہ ہمارے ساتھ تو نہیں گئی تھی۔“

”ساتھ نہیں گئی تھی.....!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”عائشہ! اس بات سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

اس وقت ہمارے علاوہ بیشک میں رحمت علی اور کرامت علی بھی موجود تھے۔ عائشہ کی بات نے ان دونوں کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دیدے پھاڑ کر عائشہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عائشہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”جناب! میں اور رضوانہ ایک ساتھ چھپڑ کی طرف گئی تھیں۔ آسیہ، خالدہ کے ساتھ بعد میں وہاں پہنچی تھی۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، آسیہ اور خالدہ بعد میں چھپڑ پر پہنچی تھیں لیکن تم لوگ وہاں سے واپس تو ایک ساتھ ہی آئی ہوگی نا.....؟“

”نہیں جی.....!“ ہنسی کٹی عائشہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں اور رضوانہ پہلے چھپڑ سے گھر کی طرف چل پڑی تھیں۔ خالدہ نے کہا تھا کہ وہ اور آسیہ بعد میں آئی ہیں تو بعد ہی میں واپس جا بیگی۔“

”یعنی..... تم اور رضوانہ ان دونوں کو چھپڑ پر چھوڑ کر واپس آ گئی تھیں؟“

”جی تھانے دار صاحب.....!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اس کے بعد آسیہ اور خالدہ کے ساتھ وہاں چھپر پر کیا حالات پیش آئے اس کی تمہیں کوئی خبر نہیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”جی..... یہی حقیقت ہے۔“ وہ دیر سے بولی۔
”ویسے تمہارے خیال میں.....“ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”آسیہ کہاں جاسکتی ہے؟“
”میں اس بار سے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”آپ خالدہ سے پوچھیں۔ وہ زیادہ بہتر بتا سکتی ہے۔“

”خالدہ سے تو میں بڑی تفصیل کے ساتھ پوچھوں گا لیکن ایک بات اچھی طرح تم بھی اپنے ذہن میں بٹھا لو عائشہ.....!“ میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ابھی مجھے جو کچھ بتایا ہے اگر بعد میں، اس میں سے کوئی بات غلط نکلی تو یاد رکھنا، میں تمہارے سلسلے میں کوئی نرمی نہیں برتوں گا۔“

”تھانے دار جی.....“ وہ معتدل لہجے میں بولی۔
”میں نے جو کچھ کہا وہ سولہ آنے سچ ہے اس لیے مجھے کسی قسم کا کوئی ڈر خوف نہیں۔ آپ جس طرح بھی چاہیں، میری باتوں کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“

دو چار گھنٹی سوالات کے بعد میں نے عائشہ کو فارغ کر دیا۔ دو منٹ کے بعد عائشہ کی جگہ رضوانہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رضوانہ کی عمر بائیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ سانولے رنگ کی ایک دہلی پکی لڑکی تھی۔ اپنی بات چیت میں مجھے وہ کھسکی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کو ایک سے پہلے تو عائشہ کے بیان کی تصدیق کی پھر مزید استفسار کیا لیکن پندرہ بیس منٹ کی سوالاتی جمنائٹک کے بعد ایک بھی ایسی بات یا نکتہ سامنے نہ آ سکا جو کسی بھی زاویے سے آسیہ کی تلاش میں، کسی بھی طرح مدد و معاون ثابت ہو سکتا۔ اس کا بیان، عائشہ کے بیان کا برتو تھا۔ میں نے اسے فارغ کرنے کے بعد خالدہ کو بلا لیا لیکن پتا چلا کہ خالدہ فوری طور پر میرے پاس نہیں آ سکے گی۔

”کیوں کرامت علی.....!“ میں نے اطلاع دینے والے سے پوچھا۔ ”خالدہ کے یہاں آنے میں کون سی دشواری ہے؟“

”اسے بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے جناب۔“ کرامت علی نے بتایا۔ ”اور وہ اس وقت سو رہی ہے۔ اس کی ماں جوں

کو میں بلالایا ہوں۔ وہ اندر صغریٰ کے پاس بیٹھی ہے۔ آپ کا حکم ہو تو میں بتول کو یہاں لے آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، لے آؤ۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔
تھوڑی دیر کے بعد بتول نامی وہ عورت میرے سامنے موجود تھی۔ اس سے گفتگو کے بعد پتا چلا کہ بتول ایک بیوہ عورت تھی۔ اس کے شوہر قادر بخش کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ بتول کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی عابدہ شادی شدہ تھی اور سرگودھا کے کسی گاؤں میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بتول یہاں محل پورہ میں خالدہ کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ قادر بخش ایک چھوٹا زمیندار تھا اور اپنے پیچھے دس ایکڑ زمین چھوڑ گیا تھا۔ بتول خود تو کاشت کاری نہیں کرتی تھی تاہم اس نے یہ قطعہ اراضی ایک مزارع کو دے رکھا تھا۔ زمین کی فصل اور فصل کی آمدنی سے ان ماں بیٹی کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔

میں نے آسیہ کی گمشدگی کے حوالے سے بتول سے بھی کئی سوالات کیے لیکن اس کی طرف سے کوئی تسلی بخش جواب نہ آیا تو میں نے پوچھا۔

”خالدہ کو کب سے بخار ہے؟“

”آج شام سے جی۔“ اس نے بتایا۔

”دن میں تو وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دن میں چھپر سے مٹی نکالنے کے لیے گئی تھی؟“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی اچانک پھونک کر اسے تپ (بخار) چڑھا ہے اور اس وقت تو وہ بے ہوش پڑی ہے۔ اسے اپنی کوئی سدھ بدھ ہی نہیں۔“

”تم نے اسے کسی کو دکھایا نہیں؟“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”دکھایا ہے جی۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”حکیم جی کو گھر پر بلا کر لائی تھی میں۔ انہوں نے چیک کرنے کے بعد دوا کی دی ہے اور کہا ہے، صبح تک بخار اتر جائے گا۔“

”حکیم جی نے اسے بخار کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی؟“

”جی..... وہ کہتے ہیں، خالدہ کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”آج کل کی اولاد کسی کی سنتی بھی تو نہیں۔ کئی بار کہا ہے، گرم کپڑے پہن کر رکھا کرو مگر اس شیدین

(شیدائیں) کو کچھ زیادہ ہی گری لگتی ہے۔ ہم پر بھی جوانی آئی تھی مگر مجال ہے کہ ہم نے بھی اپنے بڑوں کی بات رد کی ہو.....“
ہر دور کے بڑوں کو اپنے چھوٹوں سے یہ شکایت رہی ہے..... اور یہ شکایت رہے گی کہ وہ ان کی بات نہیں سنتے۔
بتول بھی اپنی بیٹی خالدہ کے حوالے سے اسی بات کا رونا رو رہی تھی۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہہ دیا۔

”میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں بتول بی بی۔ آج کل کے بچوں کو اپنے بڑوں کا ذرا بھی احساس نہیں۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔“

”آمین.....!“ وہ چھت کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔
میں نے مزید چند سوالات کے بعد بتول کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم گھر جا کر اپنی بیٹی کا خیال رکھو۔ میں کل کسی وقت آ کر اس کا بیان لے لوں گا۔“
وہ مجھے دعا میں دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا کہ خالدہ، گمشدہ آسیہ کی پڑوسن تھی یعنی رحمت علی کے گھر کی مشرقی دیوار کے ساتھ اس کے چھوٹے بھائی کرامت علی کا گھر جڑا ہوا تھا اور مغربی دیوار کے ساتھ بتول بی بی کا گھر واقع تھا۔ رحمت علی ان دونوں کا مشترکہ پڑوسی تھا۔

”کرامت علی!“ بتول بی بی کے جانے کے بعد میں نے آسیہ کے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا بیٹا لیاقت کہیں نظر نہیں آ رہا۔ اگلے سال آسیہ کی اس سے بادی ہونے والی تھی۔ اس موقع پر اسے تو یہیں ہونا چاہیے تھا.....؟“
”آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب۔“ کرامت علی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیاقت اگر مغل پورہ میں ہوتا تو کسی بھی صورت وہ اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔“

”تو کیا وہ مغل پورہ سے باہر کہیں گیا ہوا ہے؟“ میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

”جی..... وہ آج صبح ہی لاہور گیا ہے۔“ کرامت علی نے بتایا۔ ”وہاں کرشن نگر میں اس کی خالہ رہتی ہے۔ وہ اسی سے ملنے گیا ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر در یافت کیا۔ ”اس کی واپسی کب ہوگی؟“

”دو دن کا کہہ کر گیا ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اب دیکھیں، دو دن ہی لگتا ہے یا تین چار.....!“

”لیاقت علی کی خالہ کا نام کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”اور لاہور کے محلہ کرشن نگر میں وہ کس جگہ رہتی ہے؟“

”میری بڑی سالی یعنی لیاقت کی خالہ کا نام تو بشری ہے جی۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”بشری کا گھر والا اجمل حسین وہاں کرشن نگر میں دودھ دہی کی دکان چلاتا ہے اور کافی مشہور ہے۔ آپ کسی سے بھی پوچھیں گے تو وہ اجمل دودھ فروش کی دکان یا گھر کی نشاندہی کر دے گا۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک کاغذ پر یہ معلومات درج کرتے ہوئے کہا۔

کرامت علی نے استفسار کیا۔ ”کیا آپ لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو یہ بھی کرنا پڑے گا۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”ضرورت محسوس ہوئی..... کا کیا مطلب ہے جناب!“ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا آپ میرے بیٹے پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں.....؟“

”کرامت علی! پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے بیٹروں سے چلتی ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ہم ہر متعلقہ شخص کو بلا تفریق شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو پھر کہیں جا کر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جہاں تک تمہارے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارا بیٹا حسب پروگرام دو دن کے بعد واپس آ جاتا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں اس سے ادھر ہی پوچھتا چھ کروں گا ورنہ دوسری صورت میں مجھے اس کا بیان لینے کے لیے کرشن نگر لاہور جانا پڑے گا۔“

میں پندرہ بیس منٹ مزید وہاں رکا پھر رخصت کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں بھائیوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ابھی تک ایسا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگ سکا جس کو تمام کرمیں آسیہ کی تلاش کا کام شروع کر سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ صبح تک ایسی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ میں کل دن میں کسی وقت خالدہ کا بیان لینے یہاں آؤں گا۔ آپ لوگ بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں اور پریشان ہونے کے بجائے اپنے دماغ کو قابو میں رکھتے ہوئے یہ پتا لگانے کی کوشش کریں کہ آسیہ آخر جا کہاں سکتی ہے..... مجھے امید ہے، انشا اللہ! میں بہت جلد آسیہ کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“
انہوں نے میری تاکید اور ہدایات پر عمل کرنے کا

یقین دلایا اور میں حوالدار دلاور خان کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر تھانے کی سمت روانہ ہو گیا۔

فضا اور ماحول میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے اب بھی بجلی چمک اٹھتی تھی جو رات کی تاریکی میں خاصا خوف ناک تاثر پیدا کرتی تھی۔ گہرے بادلوں کی براجمانی کے باعث آسمان پر ستاروں کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بقول کسے، ان لمحات میں آسمان جی دست و تہی داماں ہو کر رہ گیا تھا۔

ہم مغل پورہ اور تھانے کے وسط میں تھے کہ مجھے تھانے میں حوالدار کی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ وہ فرنٹ سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں عقبی نشست پر براجمان تھا۔ میں نے گردن موڑ کر حوالدار سے پوچھا۔
”دلاور خان! تم نے ادھر تھانے میں مجھ سے کیا کہا تھا؟“
”کیا ملک صاحب؟“ وہ چونک کر الٹا مجھ سے سوال کر بیٹھا۔

”جب میں نے مغل پورہ جانے کے حوالے سے تمہیں تیاری کرنے کو کہا تھا تو تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔“ میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اور تمہارے جواب دینے سے پہلے ہی اذانِ مغرب ہونے لگی تھی..... کچھ یاد آیا ذہن میں.....؟“
”جی ملک صاحب!“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا تھا..... آپ موسم دیکھ رہے ہیں۔“
”بالکل ٹھیک۔ تم نے یہی کہا تھا۔“ میں نے تصدیق کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”دلاور خان! تمہیں میرے ساتھ کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“
”دو تین سال تو ہو ہی گئے ہیں ملک صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان دو تین سال میں.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کب کب اور کہاں کہاں مجھے فرائض کی تکمیل کے دوران میں موسم کا خیال کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“

”جی..... ملک..... صاحب.....!“ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ ”مم..... میرا مطلب ہے..... آپ ان چیزوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔“

ادھر حوالدار کی بات ختم ہوئی ادھر آسمان کے ضبط کے بند کھل گئے۔ پہلے ہلکی بوندا باندی اور پھر باقاعدہ بارش شروع ہو گئی۔ تھانے پہنچتے پہنچتے ہم پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ اگر بارش سیدھی یعنی آسمان سے زمین کی طرف ہوتی

تو ہماری کافی بچت ہو سکتی تھی لیکن شمال سے جنوب کی سمت چلنے والی ہوائ نے چھا جوں مینہ ہمارے اوپر ”اچھا!“ دیا تھا۔ جب ہم تانگے سے نکل کر تھانے کی عمارت میں داخل ہوئے تو ہم پر باقاعدہ کچکی طاری ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح قدرے صاف اور خشک تھی۔ آسمان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھار بریلی ہوا کا دباؤ انہیں آسمان پر ایک طرف سے دوسری جانب اڑائے لیے جارہا تھا۔ رات بھر کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا اور اذانِ فجر کے ساتھ کہیں جا کر بارش رکی تھی۔ اس بارش نے موسم کی شدت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے صبح ضروری امور سے یکے بعد دیگرے نمٹنے کے بعد ناشتا کیا اور وردی پہن کر تھانے کی طرف جانے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر ہونے والی دسک نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

جب تک میں اپنے کوارٹر کا صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچتا، اس دوران میں دسک ایک بار اور ابھر چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو وہاں اپنے ہی تھانے کے ایک باوردی کا نشیبل کو کھڑے پایا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔
”اقبال..... کیا بات ہے؟“

”وہ جی..... ملک صاحب.....“ اقبال نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ”وہ گمشدہ..... آسیہ کا سراغ مل گیا ہے جناب!“
”کیا مطلب؟“ اقبال کے انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ”آسیہ کا سراغ کہاں سے ملا ہے؟“

”آپ تھانے آجائیں جناب اور پرویز سے خود ہی ساری تفصیل پوچھ لیں۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”اسی نے آسیہ کو ادھر جنگل میں دیکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”تم چلو، میں ابھی پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

کانشیبل مجھے سیلوٹ کر کے واپس چلا گیا تو میں سوچنے لگا، یہ پرویز نامی شخص کون ہو سکتا ہے اور صبح ہی صبح وہ جنگل میں کیا کر رہا تھا۔ جس چھپر میں سے گمشدہ آسیہ کل دوپہر میں مٹی نکالنے گئی تھی وہ مغل پورہ کے جنوب میں نہر کے کنارے واقع تھا اور اس کے قریب ہی سے ریلوے

لائن بھی گزرتی تھی۔ مذکورہ ریلوے لائن نہر کے اوپر سے گزر کر جھنگ شہر کی طرف جاتی تھی۔ ایک طرح سے وہ بڑا چھتر ریلوے لائن اور نہر کے ملاپ سے بننے والے کوٹنے میں واقع تھا۔ نہر کی دوسری جانب جنوب میں ایک گھٹا جنگل دور تک پھیلا ہوا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر پرویز نامی اس شخص کو اندر بلا لیا۔ جب میں برآمدے سے گزر کر کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے اسے ایک بیچ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ پرویز ٹھٹھکرا لے بالوں والا ایک گورا چٹا شخص تھا۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرے مہرے سے وہ ایک عام سا دیہاتی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ میرے سامنے میز کی دوسری جانب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے پرویز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم نے آسیہ کو کہاں دیکھا ہے.....؟“ ”جنگل میں جناب.....“ اس نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”ادھر درختوں میں اس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“

پرویز کے چہرے کے تاثرات نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ وہ آسیہ کے حوالے سے کوئی خوشگوار خبر نہیں لایا ہوگا۔ آسیہ کی ”لاش“ کا ذکر کر کے اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

”کیا تم نے اس کی لاش کو چھو کر دیکھا ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”میرا مطلب ہے، تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ مر چکی ہے..... اور یہ بھی بتاؤ کہ تم نے آسیہ کو پہچانا کیسے؟ کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے؟“

”تمہارے دار صاحب! میں بھی موضع مغل پورہ ہی کا رہنے والا ہوں۔“ اس نے سنہلے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”اس لیے آسیہ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی پتا ہے، وہ کل دوپہر سے کم ہے۔ پورا مغل پورہ آسیہ کی کشدگی سے واقف ہے۔ وہ میرے ذہن میں بھی تھی لہذا جب میں نے کسی لڑکی کو ملنے درختوں میں بے ترتیب پڑے دیکھا تو میرے قدم بے اختیار اسی جانب اٹھ گئے اور فریب جانے پر مجھے پتا چلا کہ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”..... کہ وہ آسیہ ہے۔ جس آسیہ کو پورا مغل پورہ کل دوپہر سے ڈھونڈ رہا تھا وہ ادھر جنگل میں بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے چھونے کی کوشش نہیں کی۔ کافی دیر تک

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا رہا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اسے زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ زندہ نہیں، میں جنگل سے واپس آ گیا..... اور سیدھا آپ کے پاس پہنچ گیا ہوں۔“

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”تم صبح ہی صبح جنگل کی طرف کیا لینے گئے تھے؟“

”جناب! میں ایک غریب لکڑہارا ہوں۔“ اس نے عاجزانہ لہجے میں بتایا۔ ”یہی میرا روزگار ہے۔ میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہوں اور انہیں مختلف لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہوں جس سے چار پیسے مجھے مل جاتے ہیں جن سے میرا گھر چلتا ہے۔ بیوی بچوں والا ہوں سرکار.....“

اتنی محنت بھی نہ کروں تو ان کو کھلاؤں گا کہاں سے.....“

”تم جو بھی کرتے ہو، بہت اچھا کرتے ہو۔“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کون سی بات مائی باپ.....؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے ہنسنے لگا۔

”مغل پورہ گاؤں نہر اور تھانے کے بیچ میں پڑتا ہے۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم اتنی بڑی اطلاع کو لے کر سیدھے تھانے پہنچ گئے۔ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ پہلے تمہیں آسیہ کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے.....؟“

”یہ خیال میرے دماغ میں آیا تھا جی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں ریلوے لائن کے کنارے چلتے ہوئے تھانے پہنچ گیا۔ میں نے یہی سوچا تھا جناب کہ آپ کو اطلاع دینے کے بعد میں مغل پورہ جا کر سب کو آسیہ کے بارے میں بتاؤں گا۔“ لہجائی توقف کر کے اس نے اجازت طلب انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔

”تمہارے دار جی..... میں جاؤں.....؟“

”تم نہیں جاسکتے پرویز.....!“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”جج..... جی.....“ وہ خوفزدہ انداز میں مجھے ہنسنے لگا۔ ”مم..... میں سمجھا نہیں تھا نے دار صاحب؟“

”مغل پورہ والوں کو آسیہ کی موت کی اطلاع کیسے پہنچے گی اس کی تم بالکل فکر نہ کرو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے تھانے کا عملہ یہ کام بہ آسانی کر لے گا۔ تم میرے ساتھ جائے وقوعہ پر چلو گے۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش

دیتے ہوئے بولا۔ ”جو آپ کا حکم تھانے دار صاحب.....“
آئندہ پندرہ منٹ میں، میں نے جنگل کی جانب
جانے کی تیاری کر لی اور ٹھیک دس بجے ہم تھانے سے روانہ
ہو گئے۔ میرا تھانہ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے،
ریلوے کے کنارے واقع تھا جو ریلوے اسٹیشن کے
نزدیک ہی تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبائی ریلوے اسٹیشن تھا۔
یہ ریلوے اسٹیشن زیادہ معروف نہیں تھا۔ ہم تانگے پر سوار
ہو کر، ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کچے میں سفر کرتے
ہوئے نہر کے پل تک پہنچ گئے۔ پھر پرویز کی راہ نمائی میں
ہمیں جائے وقوعہ تک رسائی حاصل کرنے میں کسی وقت کا
سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک بات کا اوپر میں ذکر کرنا بھول گیا
کہ تھانے سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اس واقعے کی
اطلاع مغل پورہ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا۔

آسیہ کی بے یار و مددگار لاش گھنے درختوں کے جھنڈ
میں گیلی زمین پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر اگرچہ گرم لباس
موجود تھا تاہم ان لمحات میں وہ لباس خاصا بے ترتیب ہو رہا
تھا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بد نصیب زندگی
کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ میرے اسی محتاط اندازے کے
مطابق آسیہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور
اس کی موت کو بھی اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا۔ کل دن میں
کسی وقت یا پھر شام میں اس کی زندگی کا چراغ گل کیا گیا
تھا۔ میں اکڑوں بیٹھ کر آسیہ کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔
اس نوعیت کے واقعات میں عموماً لڑکی کو برباد کرنے
کے بعد موت کے منہ میں دھکیلا جاتا ہے لیکن آسیہ کی لاش
کے عمیق جائزے کے بعد یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس
پر کسی بھی طرز کا مجرمانہ حملہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ میری فوری اور
ماہرانہ رائے تھی جس کی تصدیق یا تردید پوسٹ مارٹم
رپورٹ ہی سے ہو سکتی تھی۔

میں نے آسیہ کی لاش کو خشک جگہ پر منتقل کرنے کے
بعد ایک چادر سے ڈھانپ دیا اور گھوم پھر کر دونوں ارج کا
جائزہ لینے لگا۔ میں تھانے سے اپنے ساتھ حوالدار دلاور
خان اور کانسٹیبل رشید کو بھی تانگے میں بٹھالایا تھا۔ انہیں بھی
میں نے مختلف کام سونپ دیے۔ وہ الگ الگ سمت میں
روانہ ہو گئے۔

وہ جنگل خاصا گھنا تھا۔ جب میں جائے وقوعہ کا گہری
نظر سے جائزہ لے رہا تھا تو میرے ذہن میں مختلف سوالات
بھی چکرار رہے تھے مثلاً یہ کہ آسیہ اس گھنے جنگل میں کیا لینے
آئی تھی؟ وہ خود آئی تھی یا کسی نے اسے یہاں بلایا تھا؟ کیا وہ

کسی سے ملنے جنگل میں پہنچی تھی؟ وہ تو دوپہر میں چھپڑ سے مٹی
نکالنے ادھر آئی تھی پھر جنگل کا رخ کس مقصد سے کیا؟ کہیں
وہ کسی سازش کا شکار تو نہیں ہو گئی.....

ہر سوال کے اختتام پر میری سماعت میں ایک ہی نام
گوںج اٹھتا تھا اور وہ نام تھا..... خالدہ!..... آسیہ کی گہری
کھلی اور بتوں کی بیٹی خالدہ..... جسے کل شام تیز بخار نے
اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ آسیہ اسی خالدہ کے ہمراہ مغل پورہ
سے مٹی والے چھپڑ تک آئی تھی اور پھر اطلاعات کے مطابق
وہ اپنے گھر نہیں پہنچ سکی تھی۔ خالدہ ہی بتا سکتی تھی کہ وہ جنگل
میں کیا کرنے آئی تھی.....؟

میں انہی گہمیر خیالات کے ساتھ جائے وقوعہ کا نقشہ
تیار کرنے میں مصروف تھا کہ حوالدار تیز قدموں سے چلتے
ہوئے میرے پاس پہنچا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش
پائی جاتی تھی۔

”کیا ہوا دلاور خان؟“ میں نے اس کی حالت کے
پیش نظر سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”تم اتنے گھبرائے
ہوئے کیوں ہو.....؟“

وہ ایک کڑا میری جانب بڑھاتے ہوئے معنی خیز
انداز میں بولا۔ ”یہ دیکھیں ملک صاحب.....!“
میں نے اس کے ہاتھوں سے وہ کڑا لے کر گھما پھر کر
دیکھا پھر اس سے دریافت کیا۔ ”یہ ایک پھل کا کڑا ہے،
کلائی پر پہنا جانے والا۔ تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے
ہو۔ یہ کس کا ہے؟“

مذکورہ پھل کا کڑا مردانہ کلائی میں پہنا جانے والا
ایک مخصوص کڑا تھا جس پر بڑی مہارت سے چتر کاری کی گئی
تھی جیسا کہ پھل کے نوادرانی زیورات پر عموماً دیکھنے کو ملتی
ہے۔ وہ اپنی شکل میں گول ضرور تھا مگر اس کے دونوں
سرے ایک دوسرے سے آدمی انچ کے فاصلے پر تھے یعنی
اسے اپنی مرضی سے دبا کر اور کھینچ کر قدرے چھوٹا بڑا کیا
جاسکتا تھا۔ دونوں سروں پر کچے کے سائز کی گولائیاں بنی
ہوئی تھیں۔ آپ کی نظر سے یقیناً اس ساخت کے کڑے
گزرے ہوں گے چاہے وہ پھل کے ہوں یا نہ ہوں.....

حوالدار نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا۔
”جناب! میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ کڑا کس کا ہے..... یہ مجھے
اس درخت کے پاس زمین پر پڑا ملا ہے۔“ بات ختم کرتے
ہی اس نے ایک نزدیکی درخت کی سمت اشارہ کر دیا۔

مذکورہ درخت اس مقام سے لگ بھگ دس گز کی
دوری پر واقع تھا جہاں آسیہ کی لاش پڑی ملی تھی۔ میں جائے

ہونے سے پہلے میں اس شیطان کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

کرامت علی نے چونک کر میری جانب دیکھا اور اضطرابی انداز میں بولا۔ ”جناب..... میں محسوس کر رہا ہوں، آپ نے قاتل کے حوالے سے کوئی اہم سراغ پالیا ہے.....؟“

”تم بالکل ٹھیک محسوس کر رہے ہو کرامت علی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے آپ لوگوں کے پر خلوص تعاون کی ضرورت ہے۔“

”ہم تعاون کیوں نہیں کریں گے تمہانے دار صاحب۔“ رحمت علی نے غم سے بوجھل آواز میں کہا۔ ”میری جوان جہان بیٹی کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میں تو یہی چاہوں گا، وہ نامراد جلد از جلد قانون کی گرفت میں آجائے جو آسیہ کی موت کا ذمے دار ہے۔“

”آپ کسی سراغ وغیرہ کا ذکر کرنے والے تھے.....“ کرامت علی نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا جہاں بادلوں کی ٹکڑیوں نے ایک بار پھر متحد ہونا شروع کر دیا تھا۔ گھنے جنگل میں تو ویسے ہی مناسب روشنی کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اوپر سے بادل گھر آنے کے سبب اندھیرا سا چھاتا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر ہم یہیں کھڑے کچھری کرتے رہتے تو کسی بھی وقت تیز بارش ہمیں اپنا اسیر بنا سکتی تھی۔ موجودہ غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر میں نے کرامت علی سے کہا۔

”اب ساری اہم باتیں رحمت علی کے گھر میں بیٹھ کر ہوں گی، مجھے آج ویسے بھی جتول کی بیٹی خالدہ کا بیان لینے مغل پورہ تو جانا ہی تھا۔“

میری اس تجویز پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور اگلے چند لمحات میں ہم جنگل سے نکل کر مغل پورہ کی سمت روانہ ہو چکے تھے۔ رحمت علی، کرامت علی اور دیگر افراد مغل پورہ سے پیدل ہی چل کر جنگل تک پہنچے تھے کیونکہ یہ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں نے آسیہ کی لاش کو تانگے میں رکھوا کر حوالدار دلاور خان کی نگرانی میں سرکاری اسپتال کی طرف روانہ کر دیا تھا اور خود ان لوگوں کے ساتھ مغل پورہ کی طرف چل پڑا تھا۔ کانسٹیبل رشید بھی میرے ہمراہ تھا۔

راستے میں، میں نے آسیہ کے باپ رحمت علی سے پوچھا۔ ”تمہاری پڑوسن کا کیا حال ہے.....؟“

”جی.....!“ وہ بوکھلا گیا۔ ”میں سمجھا نہیں سرکار.....؟“

”میں جتول کی بیٹی خالدہ کی بات کر رہا ہوں۔“ میں

وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے میں لگ گیا تھا اور حوالدار و کانسٹیبل کو میں نے گرد و نواح کا جائزہ لینے پر مامور کر دیا تھا۔ بالآخر حوالدار دلاور خان ایک کام کی چیز ڈھونڈنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے وہ کڑا ٹھنڈا لے لے بالوں والے پرویز کی طرف بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔

”اس کڑے کو پہچانتے ہو.....؟“

چند لمحات کے غور و فکر کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ کڑا دیکھا ہوا تو لگ رہا ہے لیکن یہ یاد نہیں آ رہا کہ میں نے اسے کہاں اور کس کے پاس دیکھا ہے۔“

”تم مغل پورہ کے رہنے والے ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یقیناً تم نے اس کڑے کو مغل پورہ ہی کے کسی شخص کی کلائی میں دیکھا ہوگا؟“

”جی..... جی ہاں۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یاد نہیں آ رہا..... کس بندے کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم اپنے ذہن کو مصروف رکھو اور یاد کرنے کی کوشش کرتے رہو کہ یہ کڑا تم نے کہاں اور کس کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔“ میں نے پرویز سے کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

”دلاور خان..... موقع کا کام مکمل ہو چکا۔ اگلا مرحلہ آسیہ کی لاش کو سرکاری اسپتال پہنچانے کا ہے اور یہ کام تم کرو گے۔“

”جو حکم ملک صاحب!“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”لیکن ابھی تک آسیہ کے گھر والوں میں سے کوئی یہاں نہیں پہنچا۔ ان کی موجودگی میں اگر لاش اٹھائی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔“

ادھر دلاور خان کی بات پوری ہوئی ادھر رحمت علی، کرامت علی چند افراد کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ان کے چہروں اور آنکھوں سے گہری پریشانی اور اضطراب جھلک رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور آسیہ کی لاش کے اوپر سے چادر ہٹا دی۔

رحمت علی نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیٹی کی لاش کو دیکھا اور بھراؤنی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تمہانے دار صاحب..... کس ظالم نے میری بیٹی کی جان لی ہے؟“

”مجھے بھی بڑی شدت سے اسی ظالم اور سفاک شخص کی تلاش ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آج کا سورج غروب

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا بخارا اتر آیا نہیں؟“
اس نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے
بتایا۔ ”جی، اتر گیا ہے۔“

”مطلب یہ کہ وہ اب ہوش میں ہے؟“ میں نے
استفسار یہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اور اس سے بات
ہو سکتی ہے.....؟“

رحمت علی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

کرامت علی کا خیال تھا کہ میں مغل پورہ پہنچے ہی کوئی
سنسنی خیز انکشاف کروں گا لیکن میں واپسی کے سفر کے
دوران میں اپنا ایک مخصوص ذہن بنا چکا تھا چنانچہ جب میں
نے پہلے خالدہ کا انٹرویو لینے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے حیرت کا
شدید جھٹکا لگا اور بے ساختہ اس کے منہ سے لکلا۔

”آپ تو بھائی صاحب کے گھر میں بیٹھ کر کوئی اہم
انکشاف کرنے والے تھے۔“

”تو میں نے ایسا کرنے سے کب انکار کیا ہے۔“
میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”خالدہ کا بیان اس سنسنی خیز
انکشاف سے زیادہ اہم ہے میری نظر میں۔ آئیے آخری بار
اسی خالدہ کے ساتھ زندہ دیکھی گئی تھی۔ مٹی والے چھڑے
لوٹ کر وہ گھر واپس نہیں آئی۔ وہ جنگل میں کیسے پہنچی اس راز
سے صرف خالدہ ہی پردہ اٹھا سکتی ہے۔“ میں نے لگاتی
توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے
ہوئے کہا۔

”میں آئیے کا تفصیلی بیان لینے کے بعد رحمت علی کے
پاس ہی آؤں گا۔ آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ آج شام سے
پہلے آئیے کے قاتل کا پتا چل جائے گا۔“

میری بات ان دونوں بھائیوں کے ذہن میں بیٹھ گئی
لہذا انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میں بتول کے گھر
میں داخل ہو گیا۔

وہ دو کمرے اور ایک بیٹھک پر مشتمل ایک چھوٹا
سا گھر تھا۔ اس مکان کا رقبہ ساڑھے چار یا پانچ مرلے رہا
ہوگا۔ کراچی کے رہائشی اسے ”ایک سو بیس گز“
تصور کر لیں۔ بتول نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال
کیا۔ میں نے کاشمیل کو بیٹھک میں چھوڑا اور خود بتول کے
ہمرہ اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں مقتول آئیے کی
سہیلی خالدہ موجود تھی۔

خالدہ کی عمر کم و بیش بیس سال رہی ہوگی۔ وہ گندی
رنگت کی مالک ایک ہشاش بشاش اور تیز طرار لڑکی تھی۔

تاہم حالیہ بخار نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ لحاف اوڑھے
ایک چارپائی پر لیٹی تھی۔ میری آمد پر وہ سرہانے کے
سہارے دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ بتول نے
خالدہ والی چارپائی کے نزدیک ہی میرے لیے ایک کرسی
ڈال دی اور کہا۔

”تھانے دار جی! آپ خالدہ سے بات چیت
کریں۔ میں آپ کے لیے گرم دودھ لے کر آتی ہوں۔“
”اس ٹکلف کی کوئی ضرورت نہیں بتول۔“ میں نے کرسی

پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”میں نے خاصا ٹکڑا ناشا کر رکھا ہے۔“
اس نے شاید میری بات سنی نہیں یا پھر سن کر نظر انداز
کر دی تھی۔ میں نے بتول کو ذہن سے جھٹکا اور خالدہ کی
جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے
ہوئے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

”خالدہ بیٹی! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“
”ٹھیک ہوں جی۔“ وہ نقاہت بھری آواز میں بولی۔
”تمہیں آئیے کے بارے میں تو پتا چل چکا
ہوگا.....؟“

”جی.....!“ اس نے مختصر جواب پراکتفا کیا۔
”آئیے تمہاری گہری اور پیاری سہیلی تھی خالدہ۔“
میں نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میری
طرح تمہاری بھی یہی شدید خواہش ہوگی کہ آئیے کا قاتل
جلد از جلد قانون کی گرفت میں آجائے.....؟“

اس نے ایک بار پھر مختصر جوابی سے کام لیا۔
”جی.....!“

”وہ کل دن میں تمہارے ساتھ چھڑے سے مٹی نکالنے گئی
تھی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں استفسار کے سلسلے کو
آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم تو واپس آ گئیں مگر آئیے گھر
نہیں لوٹی..... کل دوپہر ہی سے اس کی تلاش جاری تھی اور
آج صبح نہر کے اس پار یہ تلاش اختتام کو پہنچی ہے..... آئیے کی
لاش کی دریافت کے ساتھ!“ میں نے لگاتی توقف کر کے
ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اب تم مجھے بتاؤ گی کہ آئیے کے ساتھ کیا واقعہ پیش
آیا ہے؟“

”مم..... میں کچھ نہیں..... جانتی.....!“ وہ نحیف سی
آواز میں منمنائی۔

”اس طرح بات نہیں بنے گی خالدہ!“ میں نے
بہلانے پھسلانے والے انداز میں کہا۔ ”تمہیں پوری سچائی
اور بہادری کے ساتھ سب کچھ بتانا ہوگا۔“

”میں کچھ..... جانتی ہی نہیں تو..... بتاؤں کیا جی۔“

وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

میں خالدہ سے سوال و جواب کے دوران میں مسلسل اس کی آنکھوں اور چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے دوسرے زاویے سے سوالات شروع کر دیے۔

”کل دن میں تم اور آسیہ ایک ساتھ جوہڑ کی طرف گئی تھیں نا؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اور وہاں چھپڑ (جوہڑ) پر عائشہ اور رضوانہ سے بھی تم لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی۔“ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ”وہ بھی سنی نکالنے چھپڑ پر پہنچی ہوئی تھیں.....؟“

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے گردن کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”عائشہ اور رضوانہ تم دونوں سے پہلے چھپڑ سے واپس آ گئی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اور آسیہ ایک ساتھ واپس آئی تھیں.....؟“

”جی..... جی ہاں.....!“ اس نے جواب دیا۔

”پھر تم تو صحیح سلامت گھر پہنچ گئیں.....“ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور آسیہ غائب ہو گئی، کیوں؟..... کیا وہ تمہارے ساتھ گھر نہیں آئی تھی۔ تم دونوں ایک دوسرے کی پڑوشیں ہو۔ کیا وہ تمہارے ساتھ ہی اپنے گھر کے دروازے تک نہیں آئی تھی؟“

”نن..... نہیں جی.....!“ خالدہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی لمحے بتول ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے کے اندر دودھ سے بھرے ہوئے گلاس اور ایک پلیٹ میں ابلے ہوئے انڈے دکھائی دے رہے تھے جن کو چھری کی مدد سے دو لخت کر کے ان کے اوپر کالی مرچ اور نمک چھڑکا گیا تھا۔ بتول نے مذکورہ ٹرے کو ایک پستہ قامت تپائی پر رکھا پھر تپائی سمیت وہ ٹرے میرے سامنے پہنچ گئی۔ بتول نے کہا۔

”تھانے دار جی..... ایک گلاس آپ کے لیے ہے اور دوسرا اس پاگل خالدہ کے لیے۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آپ دیکھا ماریں گے تو یہ چپ چاپ ناشا کر لے گی۔ میری تو یہ سنی ہی نہیں ہے۔“

”تم فکر نہ کرو بتول.....“ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتول کو واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”خالدہ بہت اچھی بچی ہے۔ یہ میری بات نہیں ٹالے گی۔“ بتول میرا اشارہ سمجھ کر واپس چلی گئی اور میں دوبارہ خالدہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے نرمی بھرے لہجے میں کہا۔

”باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا پیتا بھی جاری رہنا چاہیے۔ تم اپنے عمل سے بتول پر یہ ثابت کر دو گی کہ تم نے میری بات ٹالی نہیں۔ میں صرف یہاں کا تھانا انچارج ہی نہیں ہوں، تمہارا اور تمہاری دوست آسیہ کا سچا خیر خواہ بھی ہوں۔ تم مجھ پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتی ہو۔“

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نے اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور دوسرے میں انڈے کا پیس تھما دیا۔ اس نے میری اس کوشش کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے درمیان ایک بار پھر گفتگو ہونے لگی۔ بتول کی آمد سے قبل خالدہ نے ایک سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔ میں نے بات چیت کا سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہوئے کہا۔

”تو تمہارا بیان یہ ہے کہ کل دوپہر میں آسیہ تمہارے ساتھ اپنے گھر کے دروازے تک نہیں آئی تھی؟“

”جی..... یہی سچ ہے۔“ لیکن چھپڑ سے واپسی پر تو وہ تمہارے ساتھ ہی تھی۔“ میں نے ابھمن زدہ انداز میں سوال کیا۔ ”پھر وہ کہاں چلی گئی تھی؟“

”ہم دونوں چھپڑ سے ایک ساتھ ہی واپس ہوئی تھیں۔“ وہ رک رک کر بتانے لگی۔ ”لیکن گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے وہ پھل کے درخت کے پاس اچانک رک گئی تھی جیسے اسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے آسیہ! تم چلتے چلتے ٹھہر کیوں گئیں۔ کیا ہوا.....؟“

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا تھا۔ ”خالدہ! تم گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر کے بعد آتی ہوں۔“ ”تھوڑی دیر کے بعد..... کیا مطلب!“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو.....؟“

”میں واپس چھپڑ کی طرف جاؤں گی۔“ وہ ادھر ادھر نگاہیں گھماتے ہوئے بولی۔ ”میں تھوڑی دیر کے بعد واپس آؤں گی۔ تم جاؤ گھر.....“

مجھے اس کی بات سے ابھمن محسوس ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”چھپڑ پر دوبارہ جانے کا کیا مقصد ہے۔ تمہارا وہاں کیا رہ گیا ہے؟“

وہ جزبہ ہو کر مجھے بکٹنے لگی۔ میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔

”دیکھو خالده! میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جھک نہیں ماری۔ تمہاری باتوں سے میں نے اتنا تو اندازہ لگا ہی لیا ہے کہ آسیہ کسی مرد سے ملنے دوبارہ چھپڑ کی طرف گئی تھی۔ اگر تم اپنی زبان سے اس مرد کا نام بتا دو گی تو مجھے خوش ہوگی ورنہ اگر میں نے اپنی نفیث کے دوران میں اس بندے کا سراغ لگا لیا اور بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم اس شخص کو اچھی طرح جانتی تھیں تو پھر میں تمام تر نرمی کو فراموش کر کے تمہارے لیے جلا د بھی بن سکتا ہوں۔“

میرے سناتے ہوئے الفاظ کا خالده پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور خوف زدہ سی آواز میں بولی۔ ”جی..... آپ کا اندازہ درست ہے۔“

”وہ کس سے ملنے دوبارہ جوہڑ کی طرف گئی تھی.....!“ میں نے اپنے الفاظ میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ”اپنے منگیتر لیاقت علی سے.....؟“

”نہیں..... نہیں۔“ اس نے ٹٹی میں گردن ہلا دی۔

میرا کڑا استفسار جاری رہا۔ ”پھر.....؟“

”لیاقت تو آسیہ کا منگیتر تھا جی اور اگلے سال ان کی شادی بھی ہونے والی تھی۔“ وہ جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیاقت تو اس کا پڑوسی بھی تھا۔ اس سے ملاقات کرنے کے لیے چھپڑ کی طرف جانے کی کیا ضرورت تھی پھر.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتانے لگی۔

”پھر جی..... لیاقت تو کل صبح ہی گاؤں سے لاہور روانہ ہو گیا تھا.....“

”یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں خالده!“ میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آسیہ کل دوپہر میں تمہیں اکیلے واپس بھیج کر کس بندے سے ملنے دوبارہ چھپڑ کی طرف گئی تھی؟“

”قدیر..... قدیر..... سے جی۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”قدیر..... یہ کون ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”اور آسیہ سے اس کا کیا تعلق ہے.....؟“

”قدیر بھی مغل پورہ ہی میں رہتا ہے جی۔“ خالده نے قدرے سراسیمہ انداز میں جواب دیا۔ ”اس کے باپ خادم حسین کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں تاج بی بی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے اور.....“ وہ بولتے بولتے لمبے بھر کو تھمی، ایک گہری سانس خارج کی پھر بتایا۔

”دل.....!“ اس نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

”دل!“ میں نے اس کے جواب کو دہرایا اور کہا۔

”تمہارا مطلب ہے.....؟“

”ہاں، ہاں..... وہی۔“ وہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ”سمجھا کرو نا.....“

”اور میں“ سمجھ“ کر واپس آگئی تھی۔“ خالده نے اپنے بیان کے اختتام میں بتایا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں کہ آسیہ چھپڑ سے کب واپس آئی تھی یا نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے شام سے پہلے ہی تیز بخار چڑھ گیا۔ رات میں اماں نے بتایا تھا کہ آسیہ کہیں گم ہو گئی ہے اور اب پتا چلا ہے کہ وہ..... کہ وہ.....!“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے دودھ والا خالی گلاس خالده کے ہاتھ سے لے کر ٹرے میں رکھ دیا۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں نے اسے انڈے کے تین چار پیس بھی کھلا دیے تھے۔ میں ان دونوں نعمتوں سے پہلے ہی نمٹ چکا تھا۔ بات چیت کے اس موڑ پر آ کر آسیہ کی موت نے خالده کو رنجیدہ کر دیا تھا۔ آسیہ اس کی گہری سہیلی تھی، اپنی عزیز از جان سہیلی کی ابدی جدائی پر خالده کو اسی طرح دکھی اور طول ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں آسانی سے خالده کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے رواروی میں مجھے ایک ایسا نکتہ سمجھا دیا تھا جو مجھے آسیہ کے قاتل تک پہنچا سکتا تھا۔

”خالده بیٹی! میں تمہارے جذبات اور احساسات کو سمجھ سکتا ہوں۔“ میں نے شفقت بھری آواز میں اسے پکارا۔ ”آسیہ کی ناگہانی موت کا مجھے بھی اتنا ہی صدمہ ہے جتنا کہ تمہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ اس کا قاتل جلد از جلد جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پکٹج جائے اور یہ تمہارے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔“

”میرے تعاون کے بغیر.....؟“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”ہاں..... مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم میرا ساتھ دو تو میں شام سے پہلے آسیہ کے قاتل کو گرفتار کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے تمہانے دار صاحب؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”آسیہ دوبارہ چھپڑ کی طرف کیوں گئی تھی، یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے خالده۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس نے اپنے ”دل“ کے چھپڑ پر رہ جانے کی بات کی تھی۔ یہ کیا ماجرا ہے.....؟“

”آسیہ، قدیر کو پسند کرتی تھی۔“

”قدیر کو پسند کرتی تھی۔“ خالدہ کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”اس کی سنگینی کرامت علی کے بیٹے لیاقت علی سے ہوئی تھی، اگلے سال ان کی شادی بھی ہونے والی تھی اور..... وہ قدیر کو پسند کرتی تھی؟“

”جی تھانے دار صاحب! یہی سچائی ہے۔“ وہ بڑی رمان سے بولی۔ ”آسیہ اور قدیر ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔ آسیہ کے باپ نے زبردستی اس کی سنگینی لیاقت سے کر دی تھی اور اگلے سال ان کی شادی کا بھی پروگرام تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ لیاقت، آسیہ کو بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کا دل تو قدیر ہی میں اٹکا ہوا تھا اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی رہتے تھے۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تو مختل پورہ میں یہ کہانی چل رہی تھی۔“

”تھانے دار صاحب! میں جتنا جانتی تھی اور جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔“

”خالدہ! میں نے تمہیں جیٹی کہا ہے تو تمہاری بات کا بھی یقین کروں گا۔“ میں نے سلی آمیز لہجہ میں کہا۔ ”یہ بتاؤ، قدیر کرتا کیا ہے؟“

”وہ کھیت مزدور ہے جی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم قدیر کو قتل سے تو ابھی طرح پہچانتی ہونا.....؟“

”جی..... جی ہاں.....“

”اور اس کی چیزوں کو.....؟“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میں کبھی نہیں تھانے دار صاحب؟“ اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگی۔

”میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ میں نے اپنا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب کے اندر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جائے وقوع سے مجھے ایک بہت ہی خاص چیز ملی ہے۔ تم دیکھ کر بتاؤ گی کہ اس چیز کا تعلق قدیر سے ہو سکتا ہے یا نہیں.....“

وہ تجسس بھرے انداز میں مجھے جھکنے لگی۔

اگلے ہی لمحے میں نے اپنی جیب میں سے قتل کا وہ کڑا باہر نکال لیا جو جائے وقوع کے نزدیک، ایک درخت کے نیچے حوالدار دلاور خان کو پڑا ہوا ملا تھا۔

”مفتش کڑے پر نگاہ پڑتے ہی خالدہ چونک اٹھی اور بے ساختہ اس کے منہ سے لکھا۔“ یہ..... یہ آپ کو..... کہاں

سے ملا.....؟“

”آسیہ کی لاش کے پاس سے۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری آنکھوں سے جھلکنے والی بے قراری اس امر کا حینا جاگتا ثبوت ہے کہ تم قتل کے اس کڑے کو اچھی طرح پہچانتی ہو۔“

”جی..... جی تھانے دار صاحب۔“ وہ تھوک نکلے ہوئے بولی۔

”یہ کڑا کس کا ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”قدیر کا.....!“

وقوع کی دوپہر مقتول آسیہ قدیر سے ملنے چھپڑ کی طرف گئی تھی۔ چھپڑ اور جنگل کے بیچ صرف ایک نہر رواں دواں تھی۔ اگر وہ خالدہ کو چھپڑ کی طرف جانے کا بتا کر جنگل کے اندر پہنچ گئی تھی تو بھی اس سے یہی اندازہ قائم کیا جاسکتا تھا کہ وہ قدیر ہی سے ملنے جنگل میں گئی تھی یا قدیر اسے اپنے ساتھ جنگل کے اندر لے گیا تھا۔ قدیر کی کلائی کا وہ مخصوص کڑا جنگل سے ہمیں ملا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ قدیر گزشتہ روز جنگل میں گیا تھا۔ کڑیاں ایک ایک کر کے آپس میں مل رہی تھیں اور یہ بہت جلد ایک مربوط زنجیر کی شکل اختیار کرنے والی تھیں۔ بس، ایک بات مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی۔

اور..... وہ بات یہ تھی کہ خالدہ کے بیان کے مطابق آسیہ اور قدیر ایک دوسرے کی چاہت میں گردن گردن تک دھنسنے ہوئے تھے۔ اس قسم کے عشقیہ پس منظر میں قدیر کا آسیہ کا قاتل ہونا سمجھ سے بالاتر نظر آتا تھا..... مگر پولیس کی تفتیش کی گاڑی تو اس اصول پر کام کرتی ہے کہ..... اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں.....!

خالدہ سے میں اور کوئی کام کی بات نہیں اگلا سکتا تھا لہذا میں اس کے گھر سے نکل کر آسیہ کے گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

آسیہ کی رازدار سہیلی خالدہ سے ہونے والی ملاقات اس قدر بھرپور اور معلومات افزا تھی کہ مجھے آگے کسی مرحلے پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے آسیہ کے باپ رحمت علی اور اس کے چھوٹے بھائی کرامت علی کو ایک کمرے میں بٹھا کر تازہ ترین حالات کی سنگینی سے آگاہ کر دیا۔ میں نے جنگل سے ملنے والا قتل کا کڑا بھی باری باری انہیں دکھایا۔ ان دونوں کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا۔ میری بات کے اختتام پر رحمت علی نے غصیلے انداز میں کہا۔

”یہ قدیر.....الو کا پٹھا مجھے شکل ہی سے آوارہ اور بد معاش لگتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کی درخواست کو رد کر دیا تھا۔“

”درخواست کو رد کر دیا تھا۔“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”وہ لنگا ایک روز گاؤں سے باہر مجھ سے ملا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے پہلے تو مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ آسیہ سے کچی محبت کرتا ہے۔ وہ آسیہ کا بہت خیال رکھے گا لہذا میں اسے اپنی فرزندگی میں لے لوں۔“

”پھر تم نے اس کی درخواست رد کر دی۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”تم نے اسے اپنی فرزندگی میں لینے سے صاف انکار کر دیا ہوگا..... ہیں نا.....؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس کی منحوس شکل ہی سے نفرت تھی۔ جنگلیوں کی طرح اس نے سر کے بال بڑھار کھے ہیں اور غنڈوں کے مانند میس کے بن کھولے، چوڑا ہو کر پورے گاؤں میں گھومتا پھرتا ہے.....“ وہ لمبے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شیطان کی اولاد قدیر ہاتھ دھو کر میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے اور کسی بھی صورت اس کی جان نہیں چھوڑے گا تو میں نے فوری طور پر آسیہ کی منگنی کرامت کے بیٹے لیاقت کے ساتھ کر دی۔“

”لیکن بھائی صاحب.....!“ کرامت علی، اپنے بڑے بھائی رحمت علی کے خاموش ہوتے ہی بول اٹھا۔ ”یہ قدیر والا معاملہ آپ نے ہمیں تو نہیں بتایا تھا.....“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کرامت علی کے استفسار میں شکوہ بھرا ہوا تھا۔ رحمت نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

”یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے میں نے تم سے یا تمہاری بیوی شہناز سے اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔“

”رحمت بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ کرامت کی شکایت فزوں تر ہو گئی۔ ”آپ اتنے خاص اور اہم بلکہ نازک معاملے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے مجھے آپ کی بات سن کر سخت افسوس ہوا ہے۔“

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کرامت علی کے چہرے پر نمودار ہونے والے ناگواری کے تاثرات میں گہرائی پیدا

ہوتی جا رہی تھی۔ رحمت نے نہایت ہی سرسری انداز میں کہا۔

”افسوس کیسا کرامت علی۔ میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کر دی ہے.....؟“

”یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے.....“ کمرے کے باہر سے نسوانی آواز ابھری۔ ”اپنی بیٹی کے عیب کو چھپا کر ہمارے بیٹے کے گلے باندھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے، ہم بچ گئے۔“

”تم چپ رہو شہناز.....“ کرامت نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں بات کر رہا ہوں نا.....!“

”تمہاری گھر والی کو تمہاری بات بے وزن لگ رہی ہے کرامت۔“ رحمت علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اسی لیے اس نے باہر سے لقمہ دینا ضروری سمجھا ہے۔ تم اسے بھی اندر ہی پکھری میں بلا لو۔“

”رحمت بھائی! سچی بات سب کو کڑوی لگتی ہے۔“ کرامت کی بیوی شہناز نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اگر ہمیں پتا ہوتا کہ آسیہ نے کہیں اور ٹانگہ کر رکھا ہے تو ہم اس رشتے کے لیے ہامی ہی نہ بھرتے۔ خدا کا غضب ہے.....“ اس نے لمحائی توقف کیا پھر خشکے لہجے میں بولی۔

”بے حیا کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور اگلے سال شادی بھی ہونے والی ہے..... وہ اب بھی اپنے یار سے جنگل میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتی پھرتی تھی۔“

”زبان سنجال کر بات کرو شہناز.....“ ایک اور زنانہ آواز ابھری۔ ”کچھ تو شرم کرو۔ ابھی تو میری بیٹی کی لاش ملی ہے..... اور تم نے الٹی سیدھی بکواس شروع کر دی۔“

یہ یقیناً مقتول آسیہ کی ماں صفراں (صفرائی بی بی) تھی۔ شہناز کی جلی کٹی باتوں نے اس کو سکا کر رکھ دیا تھا۔

”شرم میں کیوں کروں، تم کرو آسیہ کی اماں.....“ شہناز ترخ کر بولی۔ ”میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس میں ایک بھی بات غلط نہیں۔ مجھ پر یقین نہیں ہے تو جا کر تھانے دار صاحب سے پوچھ لو.....“

اب یہ معاملہ خطرناک حدود میں داخل ہونے جا رہا تھا۔ رحمت علی اور کرامت علی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر تناؤ تو دکھائی دیتا تھا تاہم دشمنی والی کوئی بات نہیں تھی جبکہ ان کی بیویاں لڑنے مرنے پر تیار نظر آتی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”رحمت! تم دونوں اپنی بیویوں کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میں چلا ہوں۔ اب میرا یہاں پر کوئی کام نہیں ہے۔“

”آپ کہاں جائیں گے؟“ کرامت علی نے پوچھا۔
 ”قدیر کے پاس۔“ میں نے دونوک الفاظ میں
 جواب دیا۔ ”میں اسے اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔
 اس سے تفتیش ادھر تھانے ہی میں ہوگی۔“
 ”اگر آپ کہیں تو میں اپنا تانگا نکالتا ہوں۔“ وہ
 پیشکش کرنے والے انداز میں بولا۔ ”آپ کا تانگا تو آسیہ
 کی لاش لے کر اسپتال گیا ہے۔“
 ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا
 مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کسی نہ کسی طرح اپنی واپسی کا
 بندوبست خود کر لوں گا۔ تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے
 اور سنو تم دونوں.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری
 سانس لی پھر باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے
 ہوئے کہا۔

”جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب آپس میں لڑائی جھگڑا
 کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارا اور تمہاری بیویوں کا فساد
 آسیہ کو زندہ نہیں کر سکتا بلکہ اگر تم لوگوں نے الزام تراشی کے
 اس فتنہ پر ور سلسلے کو بند نہ کیا تو بھائی، بھائی کا دشمن بن جائے
 گا۔ حالات اور عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ آپس کے
 اختلافات کو فی الحال فراموش کر کے آگے کی سوچو.....“
 وہ دونوں خاموش نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ایک
 دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بتا نہیں، میری بات ٹھیک طرح سے
 ان کی سمجھ میں بیٹھ بھی سکی تھی یا نہیں اور میں نے یہ جاننے کی
 کوشش بھی نہیں کی۔ فی الحال ان دونوں بھائیوں کا معاملہ
 میری نظر میں زیادہ اہم نہیں تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں قدیر
 احمد کو چھاپنا تھا لہذا میں کاسٹیکل رشید کو ساتھ لے کر اس کے
 گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے سامنے
 میز کی دوسری جانب قدیر احمد کھڑا تھا۔ قدیر کی عمر پچیس اور
 تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ سانولی رنگت کا مالک ایک
 دراز قامت شخص تھا۔ اس نے سر کے بال زلفوں کی صورت
 بڑھا رکھے تھے۔ میں نے قدیر کو کھیتوں میں کام کرتے
 ہوئے گرفتار کیا تھا اور اپنے ساتھ تھانے لے آیا تھا۔ اسے
 میری زبانی ہی پتا چلا تھا کہ آسیہ اب اس دنیا میں باقی نہیں
 رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ اس کی گمشدگی ہی سے آگاہ تھا۔
 حوالدار دلاور خان آسیہ کی لاش کو ضلعی اسپتال پہنچا کر واپس
 آ گیا تھا اور اس وقت وہ قدیر کے عقب میں مستعد کھڑا تھا

جیسے وہ میرے اشارے کا منتظر ہو۔ ادھر میں نے اشارہ کیا
 اور ادھر اس نے قدیر کی دھلائی شروع کر دی۔
 میرا تفتیش کا اپنا ایک مخصوص طریقہ کار ہے۔ میں
 اولین یہی کوشش کرتا ہوں کہ کبھی سیدھی انگلی ہی سے نکل
 آئے۔ اگر مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل
 نہیں ہو پاتی تو پھر میں دوسرے تفتیشی طریقوں کے بارے
 میں سوچتا ہوں یعنی اس صورت میں کبھی نکالنے کے لیے انگلی
 کو میڑھا کر تانچہ پر لازم ہو جاتا ہے۔ میں نے گرفتاری کے
 وقت قدیر کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ وہ راستے
 بھر مجھ سے یہی سوال کرتا آیا تھا مگر میں نے جواب دینا
 ضروری نہیں سمجھا تھا۔ تھانے پہنچ کر بھی جب اس کی زبان پر
 یہ سوال برقرار رہا تو میں نے پوچھا۔
 ”کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ میں نے تمہیں کس سلسلے
 میں گرفتار کیا ہے.....؟“

”اگر مجھے پتا ہوتا تو میں آپ سے پوچھتا ہی کیوں
 جناب.....“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”میں تو آسیہ کی گمشدگی کی
 وجہ سے پہلے ہی بہت پریشان تھا۔ اوپر سے آپ نے اس
 کی موت کی خبر بھی سنا دی اور گرفتار کر کے زبردستی مجھے تھانے
 بھی لے آئے۔ اتنا تو بتادیں کہ آخر میرا قصور کیا ہے.....؟“
 ”اگر تم اتنے ہی معصوم اور بھولے بھالے ہو تو مجھے
 بتاؤ..... تم آسیہ کی گمشدگی سے پریشان کیوں تھے؟“ میں
 نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں استفسار
 کیا۔ ”تمہارا اس سے کیا رشتہ تھا.....؟“

”میرا آسیہ سے محبت کا رشتہ تھا۔“ وہ مضبوط لہجے میں
 بولا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔“
 ”جو لوگ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں وہ آپس میں
 ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ بھی ہوا کرتے ہیں قدیر!“
 میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری طرح
 خود غرض اور سفاک نہیں؟“

”جناب.....!“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے
 ہوئے بولا۔ ”میں نے کون سی خود غرضی اور سفاکی کا مظاہرہ
 کیا ہے؟“

”تم جس کو چاہنے کے دعوے دار ہو اس کے خون
 میں ہاتھ رنگنا تمہاری خود غرضی و سفاکی نہیں تو اور کیا ہے؟“
 میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری
 کھوکھلی چاہت اور محبت کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے قدیر!“

”جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کی حیرت
 دوچند ہو گئی۔ ”میں تو آسیہ کو معمولی سی گزند پہنچانے کا بھی تصور

م کی پیشکش م نے پیش کیا ہے

م :-

کاڈائریکٹ اور رٹیریوم ایبل لنک
سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
کے ساتھ

نہیں کر سکتا اور آپ اس کے قتل کی بات کر رہے ہیں.....؟“
 ”کیا یہ بات درست ہے کہ تم چوری چھپے آسہ سے ملاقاتیں کیا کرتے تھے؟“ میں نے ایک دوسرے زاویے سے اسے گھسنے کی کوشش کی۔

”جی ہاں، یہ درست ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”جبکہ تمہیں اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ آسہ کی معنی ہو چکی تھی۔“ میں نے کہا جانے والی نظر سے قدیر کو گھورا۔ ”اور اگلے سال اس کی لیاقت کے ساتھ شادی بھی ہونے والی تھی.....؟“

”جی ہاں۔ میں آسہ کی معنی کے بارے میں بھی جانتا تھا۔“
 ”اس کے باوجود بھی تم اس سے ملاقاتوں سے باز نہیں آتے تھے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”جبکہ تمہیں اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ تمہاری یہ حرکت اس کے رشتے والے معاملے کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی.....؟“

”تھانے دار صاحب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ بات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی گہری محبت کرتے تھے اور میں نے آسہ کے باپ چاچا رحمت علی سے رشتے کی بات بھی کی تھی مگر اس نے مجھے بری طرح جھڑک دیا تھا اور پھر.....“ وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اور پھر اس واقعے کے چند ہی روز بعد رحمت علی نے آسہ کی اپنے بھائی کے بیٹے لیاقت سے معنی کر دی تھی۔“
 ”آسہ اور لیاقت کی معنی ہو گئی مگر تم پھر بھی چھپ چھپ کر آسہ سے ملتے رہے۔“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ تم کتنا گھناؤنا کام کر رہے ہو.....؟“

”میں مانتا ہوں کہ آسہ کی معنی ہو جانے کے بعد مجھے اس سے ہر قسم کا ناتا توڑ دینا چاہیے تھا۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا..... بلکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مجبور تھے۔ آسہ کسی بھی قیمت پر لیاقت سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھی مگر وہ اپنے باپ کے زبردستی کے فیصلے کے سامنے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہم جب بھی ملتے، وہ یہی رونا روتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں کوئی ایسی راہ نکالوں کہ ہماری شادی ہو جائے۔“

”تو کیا تم ایسی راہ نکالنے میں کامیاب رہے تھے؟“
 میں نے چپے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اگر کامیاب ہو جاتا تو پھر بات ہی کیا تھی جناب!“
 وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
 میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے مقصد میں ناکام رہے تھے؟“

”جی ہاں.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 ”مجھے اس گمبیر مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آیا تھا حالانکہ ایک موقع پر آسہ نے یہاں تک کہا تھا کہ ہم خاموشی سے بھاگ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں اور وہاں جا کر شادی کر لیتے ہیں لیکن.....!“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ جناب..... آپ اسے میری شرافت سمجھیں یا بزدلی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں آسہ کے ساتھ بھاگنے کی ہمت نہ کر سکا.....!“

”یہ تمہاری بزدلی تھی یا شرافت اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد تم نے ایک سنگین قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور.....“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”سنگین قدم.....؟“
 ”ہاں..... سنگین قدم!“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟“
 ”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ”جب تمہیں یقین ہو گیا کہ آسہ کسی طرح تمہاری نہیں ہو سکتی تو تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“
 ”یہ جھوٹ ہے.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھ پر الزام ہے۔“

”اوائے الزام کی اولاد.....“ حوالدار نے اس کی کمر پر ایک لات رسید کرتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”تم ملک صاحب کو جھوٹا کہہ رہے ہو..... تمہیں شرم نہیں آتی.....؟“
 دلاور خان آپوں آپ ہی جلال میں آگیا تھا حالانکہ میں نے اسے کسی قسم کی جارحانہ کارروائی کا اشارہ نہیں کیا تھا۔

حوالدار کی لات کھانے کے بعد قدیر توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کا دماغی توازن تو میرے جیسے اور نکیلے سوالات نے درہم برہم کر رکھا تھا، حوالدار کے زوردار حملے نے اس کے جسمانی توازن کا بھی تختہ کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل اس کا بدن میز کی طرف جھکا۔ اگلے ہی لمحے اس کا سر میز

جی کہانیوں آپ بیسیوں جگہ بیسیوں کتابی مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ اپریل ۲۰۱۵ء
کی جھلکیاں

خلا شناس

اس سائنس دان کا احوال زیست جس
نے دنیائے سائنس کو نیا رخ عطا کیا

ہمارے احوال والا

دنیا کے ادب کی ایک معروف شخصیت کا زندگی
نامہ جس نے عالمی طور پر پاپولر بنایا تھا

ماہ موسم بہار

عیسوی سن کے اس مہینے سے جڑی اہم
شخصیات و واقعات کا مختصر سا جائزہ

مینا کمال

مینا کماری اور کمال امر دہوی کی زندگی
کے اہم گوشوں پر ایک نظر

لوہا کے علاوہ

طویل سرگزشت ”سراب“ جس کے پیچ ختم نے قارئین کو
مسکراتے رکھا ہے۔ دنیا بھر سے دلچسپ و معلومات بھرے
قصبے، سبق آموز واقعات اور دل کو چھو لینے والی جج بیاتیاں

آج ہی نزدیکی بک اشال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ: ہر شمارہ خاص شمارہ: ہر شمارہ خاص شمارہ

کی چوبی سطح سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی
اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ بھی خارج ہوئی۔

دلاور خان کسی عقاب کے مانند اس پر جھپٹ پڑا پھر
بکلی کی سی تیزی سے اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر قدیر کو
سیدھا کھڑا کر دیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

”بندے دا پتر بن کر الف کی طرح سیدھا کھڑا ہو جا
اور..... ملک صاحب جو بھی پوچھیں اس کا سچا اور کھرا جواب
دے ورنہ.....!“

حوالدار دلاور خان نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ
ناکمل چھوڑا تو قدیر منت ریز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے
گھٹکیا یا۔

”تھانے دار صاحب! یہ زیادتی ہے..... میرے
ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔“

”اوتے ظلم وزیادتی کے گھوڑے.....!“ حوالدار
نے اسے دیکھا مارا۔ ”تم نے ابھی تک ظلم اور زیادتی کے
الفاظ سن رکھے ہوں گے۔ اگر میں نے تمہیں ان کی عملی
جھلک دکھا دی تو دن میں تارے اور رات میں سورج
تمہاری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے گا۔“

میز کی سخت سطح سے قدیر کا سر ٹکرانے سے ایک
بھیا تک نتیجہ برآمد ہوا تھا اور وہ یہ کہ وہ چہرے کے رخ میز کی
طرف آیا تھا اور اس خوف ناک ٹکراؤ میں اس کے ہونٹ
شدید زخمی ہو گئے تھے۔ گھائل ہونٹوں سے باقاعدہ خون بھی
رس رہا تھا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے خون صاف کرتے ہوئے
مجھ سے ملتس ہوا۔ اس کی آواز سے فدیہ یا نہ پن جھلکتا تھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ میری بات کا یقین
کریں۔ میں اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے بڑی
سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں.....“

”دیکھو قدیر! تھانے دار پکھری میں قسمیں اٹھانے
سے بات نہیں بنا کرتی۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں
کہا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں کہ حوالدار دلاور خان کتنا جابر
پولیس والا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آنے سے پہلے یہ
قصاب ہوا کرتا تھا۔ قصاب کا مطلب سمجھتے ہوتا.....؟“

”جی.....“ وہ منمنایا۔ ”قسائی.....!“
”ہاں قسائی!“ میں نے اپنی آواز میں زور بھرتے
ہوئے کہا۔ ”یہ ایک منٹ میں جانور کو الٹا ٹانگ کر اس کی
کھال کھینچ لیا کرتا تھا اور اب.....“ میں نے دانستہ جملہ
ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اسے خوف زدہ
کرنے کی خاطر کہا۔ ”اب یہ انسانوں کے ساتھ بھی وہی

جانوروں والا سلوک کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ جو مجرم شرافت سے زبان نہیں کھولتا، اس کی کھال کھینچنے میں کسی حیل و حجت سے کام نہیں لیتا۔ ابھی تو اس نے تمہیں اپنے اسٹائل کا ایک معمولی سا نمونہ دکھایا ہے اور تمہارے ہونٹ خون اگلنے لگے ہیں۔ اگر میں نے تمہیں مکمل طور پر دلا اور خان کے حوالے کر دیا تو تم خود ہی تصور کر لو کہ یہ تمہارا کیا حشر کرے گا۔“

”تھانے دار صاحب! آپ خدا کے واسطے میری بات کا یقین کر لیں۔“ وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں نہ تو کوئی مجرم ہوں اور نہ ہی آسیہ کو پیش آنے والے حالات میں میرا ہاتھ ہے۔ میں تو پچھلے ایک ہفتے سے اس سے ملا بھی نہیں تھا۔“

میں ”مارنے“ سے ”ڈرانے“ کی حکمت عملی کا قائل ہوں اور میں نے قدیر کو خوف زدہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن اس کے آخری الفاظ مجھے ہضم نہیں ہوئے تھے۔ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں اس پر واضح کر دیا۔ ”قدیر! میں تمہیں سچ بولنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا آخری موقع دے رہا ہوں اس لیے اب میرے سوالات کے جوابات بہت سوچ سمجھ کر دینا۔ تمہاری ایک ذرا سی غلطی تمہیں سیدھا سیدھا دلاور خان کی تحویل یعنی نفیش کے جہنم میں پہنچا سکتی ہے۔“

وہ سرا سیمہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جی پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”تمہارا دعویٰ ہے کہ تم پچھلے ایک ہفتے میں آسیہ سے نہیں ملے ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرے پاس یہی اطلاع ہے کہ تم کل دوپہر کو چھپر پر آسیہ سے ملے تھے۔ پھر تم اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے اور وہاں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا تھانے دار صاحب!.....!“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو کس نے میرے بارے میں ایسی غلط سلط باتیں بتائی ہیں؟“

”خالدہ نے..... آسیہ کی سب سے رازدار سہیلی خالدہ نے۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”اس کے علاوہ میرے پاس تمہارے جرم کی ایک واقعی شہادت بھی موجود ہے۔“

”خالدہ نے آپ کو کیا بتایا ہے.....؟“ وہ الجھن

زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور وہ واقعی شہادت کیا ہے.....؟“

”اگر تم اتنے ہی بھولے بادشاہ ہو تو سنو۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”کل دوپہر میں آسیہ اور خالدہ ایک ساتھ مٹی نکالنے چھپر پر پہنچی تھیں۔ جب ان کی واپسی کا وقت آیا تو آسیہ یہ کہہ کر وہیں رک گئی کہ آج اس کی تم سے ملاقات ملے ہے اور.....!“

”مگر میں نے تو آسیہ کو ایسی کوئی اطلاع نہیں بھجوائی تھی۔“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

”تو اس کا مطلب ہے، تم ملاقات کے حوالے سے مقتولہ کو کوئی اطلاع وغیرہ بھی بھجوا کر تھے؟“ موقع ہاتھ لگتے ہی میں نے کاری وار کر دیا۔

”جی ہاں.....!“ اس نے بڑے تحمل سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جب ہماری ملاقاتیں راز نہیں رہیں تو میں یہ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ ہم دونوں کو جب ملنا ہوتا تھا تو ہم گوشی کے ذریعے ایک دوسرے کو پیغام بھجوا کر کرتے تھے۔“

”یہ گوشی کون ہے؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”گوشی کا اصل نام تو نصیر ہے جناب۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کی عمر لگ بھگ آٹھ سال رہی ہوگی۔ یہ بچہ محل پورہ ہی میں رہتا ہے۔ میں گا ہے بہ گا ہے گوشی کو چیز کے لیے پیسے دے دیا کرتا تھا جس کے بدلے میں وہ بڑی رازداری کے ساتھ ہمارے درمیان پیغام رسانی کا فرض انجام دیتا تھا۔“

”تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کل کی ملاقات کے لیے تم نے آسیہ کو یا آسیہ نے تمہیں کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا؟“ میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں جناب..... بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں جواب دیا۔

”ایک بات ذہن میں رکھنا قدیر! میں نے تنبیہ انداز میں کہا۔ ”میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا بلکہ گوشی کو تھانے بلا کر اس سے تمہارے بیان کی تصدیق بھی کروں گا۔“

”جی ضرور..... آپ کے ایسا کرنے سے میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”مجھے پکا یقین ہے کہ گوشی صاف انکار کر دے گا کہ میں نے

یا آسیہ نے کل کی ملاقات کے حوالے سے اس سے کوئی بات کی تھی۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر قدیر سے پوچھا۔ ”تم مجھے گوشہ گھر کے بارے میں بتاؤ۔ میں ابھی اسے تھانے بلانا چاہتا ہوں۔“

قدیر نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں مجھے گوشہ گھر کی لوکیشن اور محل وقوع بتا دیا۔ میں نے دلاور خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم اس بچے کو فی الفور یہاں بلوانے کے لیے کسی اہلکار کو مغل پورہ کی طرف روانہ کر دو۔“

”او کے ملک صاحب!“ یہ کہتے ہوئے دلاور خان میرے کمرے سے نکل گیا۔

قدیر نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی۔ دلاور خان کے رخصت ہوتے ہی اس نے سکھ کی سانس لی تھی اگر قدیر سچا تھا اور آسیہ کی موت میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا تو پھر آسیہ کا قاتل کون ہو سکتا تھا.....؟

اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے قدیر کو ذرا مختلف زاویے سے گھستا شروع کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”قدیر! تو تم اس بات پر ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے ہو کہ نہ تو تم کل آسیہ سے ملنے چھپڑ کی طرف گئے تھے اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ جنگل کے اندر لے گئے تھے؟“

”بالکل جناب، حقیقت یہی ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”ابھی گوشہ یہاں آکر اس بات کی تصدیق کر دے گا۔“

”گوشہ کو یہاں پہنچنے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب تک میں ایک اور اہم امر کی تصدیق کر لیتا ہوں.....“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے نکلے لگا۔

میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”قدیر! مغل پورہ کے نصف درجن افراد نے مجھے بتایا ہے کہ تم اپنی کلائی میں جھل کا ایک مٹھل کڑا پہنے رہے ہو لیکن اس وقت مجھے تمہاری دونوں کلائیاں خالی نظر آ رہی ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کڑا کہاں گیا؟“

”وہ جناب.....!“ وہ مایوسی اور افسوس سے... میریز آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”وہ کڑا چند روز پہلے کہیں گم ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی گمشدگی کا سخت دکھ ہے تھانے دار صاحب۔“

”کلائی میں پہنے پہنے کڑا کیسے گم ہو سکتا ہے قدیر۔“ میں نے اسے حیرانہ نظر سے گھورا۔ ”اپنی بات کی وضاحت تو کرو.....؟“

”وہ کڑا کلائی میں سے گم نہیں ہوا تھانے دار صاحب!“

”پھر..... پھر کہاں سے گم ہوا تھا؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”چند روز قبل میں ٹیوب ویل پر نہا رہا تھا تو میں نے وہ کڑا اپنی کلائی سے اتار کر کپڑے کے ساتھ رکھ دیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نہاتے وقت کڑے کو

ہمیشہ اتار لیا کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ نہاتے وقت یہ میری کلائی سے نکل کر ٹیوب ویل کے پانی میں بہہ کر کافی آگے نکل گیا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے تلاش کیا تھا۔ پھر میں

بہت احتیاط کرنے لگا تھا۔ صابن لگے ہاتھوں سے اس کے پھسل کر کلائی سے نکل جانے کا امکان بہر حال موجود رہتا ہے۔ اسی خوف سے میں کڑا اتار کر اپنے لباس کے ساتھ رکھ

لیا کرتا تھا مگر.....“ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک رنجیدہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”مگر چند روز پہلے جب میں ٹیوب ویل پر نہانے کے بعد اپنے کپڑوں کی طرف آیا تو کڑا وہاں سے غائب تھا اور..... آج تک غائب ہے۔“

”تم مجھے کوئی نئی کہانی سنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے قدیر۔“ میں نے شک بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یاد رکھو، اگر تم نے اپنے کسی جھوٹ کی مدد سے مجھے گمراہ

کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا وہ حشر نشر کروں گا کہ دنیا تمہارا تماشا دیکھنے کے لیے جوق در جوق مغل پورہ پہنچے گی۔“

”میں نے آپ کو جو بھی بتایا وہ سو فیصد سچ ہے تھانے دار صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر بعد میں میرا کہا ہوا ایک لفظ بھی غلط نکلے تو میں سخت سے سخت

سزا پانے کو تیار ہوں..... میں تو ابھی تک اس کڑے کی گمشدگی پر پریشان ہوں اور ہر ممکنہ جگہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

ان لمحات میں قدیر مجھے ایک سچا اور کھرا شخص نظر آیا۔ مجرموں سے نمٹتے ہوئے میری عمر بیت گئی تھی۔ کوئی کچا مجرم ہو یا پکا عادی مجرم..... میں اس کے انداز ہی سے پہچان جاتا تھا۔

”قدیر!“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”جہیں اس جھل کے مٹھل کڑے کے لیے مزید غمزدہ یا

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”جج..... جی..... کیا مطلب؟“ وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

”مطلب یہ کہ..... میں نے تمہارا گشہ کڑا ڈھونڈ نکالا ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے مذکورہ کڑا اپنی میز کی دراز میں سے نکال کر اس کی سست بڑھا دیا۔

کڑے پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور اس کے حلق سے ایک ناقابل یقین سی آواز خارج ہوئی۔

”یہ..... یہ..... آپ کو..... کہاں سے ملا ہے.....؟“

”جنگل میں سے!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”یہ ادھر آسہ کی لاش کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔“

”اس کا تو یہ مطلب ہوا تھا نے دار صاحب.....“ وہ

سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”جس شخص نے بھی میرا یہ کڑا

چرایا تھا وہی آسہ کا قاتل بھی ہے۔“

”تمہارا اندازہ درست نظر آتا ہے قدیر!“ میں نے

تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس سے یہ

بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص تمہارا دشمن بھی ہے۔ اس نے

منصوبہ بندی کے ساتھ آسہ کو اس طرح قتل کیا کہ اس کے قتل

کا شک سیدھا سیدھا تم پر جائے۔“

”اس دنیا میں میرا تو صرف ایک ہی دشمن ہے تھانے

دار صاحب!“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”کون ہے وہ؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”لیاقت علی..... آسہ کا منگیتر۔“ اس نے بڑے

اعتماد سے جواب دیا۔ ”آسہ اکثر مجھے بتاتی رہتی تھی کہ

لیاقت مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے اور اسے بھی میرے

خلاف اکسانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔“

ادھر قدیر کی بات ختم ہوئی ادھر حوالدار دلاور خان

نے میرے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

”ملک صاحب! نصیر عرف گوشتی تھانے پہنچ گیا ہے۔“

☆☆☆

گوشتی آٹھ سال کا ایک گول مٹول بچہ تھا لیکن اس کی

آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں ایک خاص قسم کی

عماری اور چالاکی دکھائی دیتی تھی۔ تھانے میں آنے کا اسے

پہلی بار اتفاق ہوا تھا لہذا اس کی ساری ہوشیاری اور تیزی

و طراری کا فور ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے پوچھ گچھ سے پہلے

اسے حوالات میں بند قیدیوں کا بھی نظارہ کرایا اور اس پر

واضح کر دیا کہ اگر اس نے ذرا سی غلط بیانی کی تو میں اسے

بھی انہی قیدیوں کے ساتھ حوالات میں بند کر دوں گا۔

وہ میری خطرناک باتیں سن کر سہم گیا اور اس نے مجھ

سے پکا وعدہ کیا کہ وہ ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولے گا۔

میں نے گوشتی کو بلا یا تو قدیر کے بیان کی تصدیق کے

لیے تھا لیکن جب میں نے اس سے طریقے سلیقے سے پوچھ

گچھ کی تو اس نے ایسے ایسے انکشافات کیے کہ آسہ کے قتل کا

معما چٹکی بجاتے میں حل ہو گیا۔

گوشتی کی تصدیق نے قدیر کو بے گناہ اور لیاقت کو گناہ

گار ثابت کر دیا تھا۔ لیاقت نے زیادہ پیسوں کا لالچ دے

کر گوشتی سے اپنا کام نکلوایا تھا۔ لیاقت کو کسی طرح پتا چل گیا

تھا کہ گوشتی آسہ اور قدیر کے درمیان ایک ڈاکے کا کردار ادا

کر رہا ہے۔ اس نے گوشتی کی مدد ہی سے قدیر کا کڑا چوری

کرایا تھا اور چند روز بعد گوشتی ہی کے ذریعے اس نے آسہ

تک یہ پیغام بھجوایا تھا کہ قدیر وقوعہ کی دوپہر جنگل میں اس

سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ آسہ چونکہ گوشتی پر پورا بھروسہ

کرتی تھی۔ وہ اس کی طرف سے دھوکے کا تصور بھی نہیں

کر سکتی تھی لہذا وہ قدیر سے ملنے جنگل میں پہنچ گئی جہاں

لیاقت علی چھپ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد جنگل

کے اندر آسہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا اسے سمجھنے کے

لیے کسی خاص قسم کی عقل کی قطعاً ضرورت نہیں۔

بعد ازاں جب میں نے لیاقت علی کو لاہور سے گرفتار

کر کے اس سے کڑی گفتیش کی تو اس نے زبان کھولنے میں

کسی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ وہ اپنی مخالفت میں چلنے

والی ہوا کو محسوس کر چکا تھا لہذا اس نے عافیت اسی میں جانی

کہ اپنے جرم کا اعتراف کر لے۔

میں نے آخر میں اس فرزند دروغ سے ایک سادہ سا

سوال کیا۔ ”تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”میں آسہ کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا۔“ وہ نفرت

بھرے لہجے میں بولا۔ ”مگر وہ کسی بھی طور قدیر کو اپنے دل

و دماغ سے نکالنے کے لیے تیار نہیں تھی اور میں کسی زندہ لاش

سے کیوں کر شادی کر سکتا تھا؟“

”اس لیے تم نے فریب کا ایک جال بچھا کر آسہ کو

موت کے گھاٹ اتار دیا۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری.....؟“

اس نے میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

خاموشی سے گردن جھکا دی۔ یہ جھکی ہوئی گردن اس کی

پشیمانی اور اقبال جرم کی روشن دلیل تھی۔

(تحریر: حسام بت)

گھاؤ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

انسان عہدِ قدیم کا ہو یا عہدِ جدید کا... غربت اور امارت کا فرق نمایاں رہتا ہے... ایک ہی ملک میں ترقی یافتہ علاقے جن سہولتوں کے حقدار ہوتے ہیں، پسماندگی کے شکار لوگ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے... یاسیت کے حصار میں قید اس کی زندگی بھی آسائشوں سے دور تھی لیکن جب قدرت مہربان ہو جائے تو علاج چل کر خود مریض کے پاس پہنچتا ہے... اس کی زندگی نے بھی یاسیت کا چولا اتار پھینکا تھا۔

ایک کھائل روح کے غموں کا مداوا... قدرت کی مہربانیوں کا قصہ



یہ سید حاسادہ اسقاطِ حمل کا کیس نہیں تھا۔
لو اب شاہ کے سول اسپتال میں اسقاطِ حمل کے ساتھ
بہت سارے مریض آتے ہیں۔ اسقاطِ حمل ایک عام بات
ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں کو تو پتا بھی نہیں چلتا کہ ان کا
حمل ضائع ہو گیا ہے۔ قدرت کا نظام ہی اس قسم کا ہے کہ

ہونے والے بچے میں اگر ایسی خرابی ہو جس کے ساتھ زندہ
رہنا ممکن ہی نہ ہو تو حمل خود بخود ضائع ہو جاتا ہے۔ اس حمل کو
ضائع کرنے کے لیے، اس بچے کو گرانے کے لیے کسی داکٹر،
نرس، مڈوائف یا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ قدرت
کے اپنے اصول ہیں، اپنا نظام۔ وہ اس بحث میں پڑتی ہی

نہیں ہے، کوکھ کے اندر حیات کب انگڑائی لیتی ہے۔

مگر اس اسقاطِ حمل کا مسئلہ اتنا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ وہ نواب شاہ کے قریبی شہر دولت پور کے آس پاس کے ایک گاؤں سے لائی گئی تھی۔ دیکھتے ہی ایسا لگا جیسے وہ مر جائے گی۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں، تھمتاتا ہوا سرخ چہرہ، ہونٹوں پر چھڑی سی جمی ہوئی۔ غنودگی کی سی کیفیت میں وہ آہستہ آہستہ اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتی تھی۔

”میں مرجاؤں گی، ہائے میں مرجاؤں گی۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ مجھے بچالو، بچالو مجھے۔ مجھ سے گناہ ہو گیا۔“ اسے فوری طور پر داخل کر لیا گیا تھا، اس کے ساتھ صحیح بات بتانے والا کوئی بھی نہیں تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ ہاری شوہر نے صرف یہی بتایا کہ گزشتہ چار پانچ دنوں سے اس کی طبیعت خراب ہے۔ قاضی احمد شہر کی ایک دائی کے پاس یہ گئی تھی پھر جب واپس آئی تو اس کے پیٹ میں درد تھا۔ دولت پور کے میڈیکل اسٹور سے اس نے اسے درد کی دوا لا کر دی مگر درد تو ختم نہیں ہوا بلکہ اسے الٹیاں شروع ہو گئیں، پھر بخار آ گیا۔ حکیم کو بھی دکھایا اور مسجد سے پانی بھی لا کر پلایا مگر طبیعت صحیح ہونے کے بجائے خراب سے خراب تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دولت پور میں موجود لیڈی ہیلتھ ورکر دیکھنے آئی تو اس نے اسے فوراً نواب شاہ کے سول اسپتال لے جانے کے لیے کہا۔ گاؤں سے اسے تیل گاڑی پر ڈال کر دولت پور اور پھر دولت پور سے ایک گاڑی والے کو منہ مانگے پیسے دیے تو اس نے نواب شاہ پہنچا دیا تھا۔

اس کی حالت خطرناک حد تک خراب تھی۔

اس کا شوہر غلام علی لیے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی اگی ہوئی، چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر سیاہ گھنی پلکیں، نمایاں ستواں ناک، چوڑی پیشانی اور چہرے کے خطوط جیسے کسی نے چھیل چھیل کر بنائے ہوں۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت آدمی تھا مجھے ہالی وڈ کی ایک فلم میں نمایاں کردار ادا کرنے والا چارلٹن۔ سٹن یاد آ گیا تھا۔ کھردرے موٹے موٹے سے ہاتھ اور مضبوط شانے بتا رہے تھے کہ اس نے زندگی میں محنت کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اس کے پاس کوئی تعلیم نہیں تھی۔ وہ صدیوں پرانے سندھی کسانوں ہاریوں کا تسلسل تھا جنہوں نے زمینوں کی چھاتی کو کوٹ کوٹ کر، دریا سے پانی نہوڑ کر اپنی جوانی کو اپنے مالکوں کی بھینٹ چڑھا کر ان کے لیے غلہ اگایا۔ ان کے گھروں حویلیوں، محلوں کو سجا یا۔ ان کے لیے جنگیں لڑی تھیں اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی جانوں کا نذرانہ دیا تھا۔ سو ہجودڑو سے بھی سالوں سال قبل اور سو ہجودڑو کے

بعد بھی، گوتم بدھ کے پیروکاروں کے زمانے میں بھی اور محمد بن قاسم کے قتل ہونے کے بعد بھی، مغلوں، کلہوڑوں، تالپوروں، سومروں کے وقت میں بھی اور انگریزوں کی حکمرانی کے زمانے میں بھی، پاکستان بننے کے بعد بھی اور ون یونٹ کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے سرداروں، پیروں، وڈیروں، جاگیرداروں، زمینداروں اور سیدوں کی زمینوں کو آباد کریں، ان کی خدمت کے لیے اپنی نسل میں اضافہ کریں اور وقت سے بہت پہلے ملیریا، ٹائیفائیڈ، کالرا، پلگ، چچک یا اسی قسم کے کسی مرض میں مبتلا ہو کر مرجائیں۔

کہتے ہیں کہ اب چچک ختم ہو گئی ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں نے اس کا خاتمہ کر دیا ہے۔ چچک ختم ہو گئی تو کیا ہوا، موجودہ نسلوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کالا یرقان ہے۔ دنیا شاید کبھی نہیں بدلے گی۔

اسے ایک سو چار بخار تھا، اس کی نبض بہت ہلکی تھی اور ایک منٹ میں ایک سو چالیس پچاس دفعہ چل رہی تھی، بلڈ پریشر بہت ہی کم تھا، اوپر کا ستر اور نیچے کا چالیس۔ وہ ایک منٹ میں اٹھائیس تیس دفعہ سانس لے رہی تھی۔ اس کا ہیموگلوبن سات تھا۔ جانے وہ زندہ کیسے تھی۔ گاؤں دیہات کی یہ مزدور ہاری عورتیں مرنے میں دیر بھی بہت لگاتی ہیں۔ اسے فوری طور پر ڈرپ لگائی گئی تاکہ بخار اور سانس سے ضائع ہونے والا پانی فوری طور پر جسم میں پہنچایا جاسکے۔ ناک پر آکسیجن کی ٹنکی لگا دی گئی تاکہ سانس لینے میں آسانی ہو۔ دو بہت ہی طاقتور قسم کی اینٹی بائیوٹک شروع کی گئی تاکہ جسم میں جو انفیکشن پھیل گیا ہے اس کے خلاف یہ دوا کام شروع کر دے۔ تھوڑا سا خون نکال کر بھیج دیا گیا تاکہ کم از کم دو بوتلیں خون کا انتظام ہو جائے۔ اگر آپریشن کی ضرورت پڑ جائے گی تو اس کے لیے خون کا ہونا ضروری تھا، مریضہ کا ہیموگلوبن بہت کم تھا۔

جب اندرونی معائنہ کیا گیا تو صورت حال بہت خوف ناک تھی۔ مریضہ کی بچہ دانی میں سوراخ تھا اور اس سوراخ کے ذریعے سے آنتیں باہر نکل رہی تھیں جن میں کئی جگہ پر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن سے فضلہ رس رس کر نکل رہا تھا۔ پیشاب کی تھیلی کے نچلے حصے پر کالا سا نشان تھا جس کے چاروں طرف جمع ہوا خون تھا۔

مریضہ تقریباً بے ہوش تھی اور کچھ بھی بتانے کے قابل نہیں تھی مگر اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ وہ اپنا بچہ ضائع کرانے کے لیے کسی کے پاس گئی تھی جہاں پر اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہوگا۔

غریب لوگوں کے لیے بچہ ضائع کرانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ امیر لڑکیاں اور عورتیں جائز اور ناجائز بچہ ضائع کرانے کے لیے شہر کی قابل ترین گائنا کالوجسٹ کے پاس چلی جاتی ہیں، مناسب فیس دے کر یہ کام نہایت احتیاط اور مہارت کے ساتھ کرایا جاتا ہے۔ وزیروں، سفیروں، بڑے بڑے سرکاری افسروں اور حکمرانوں کے خاندان کی عورتیں یہی کام سرکار کے خرچے پر انگلینڈ یورپ اور امریکا کے اسپتال میں کرا کر آ جاتی ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا ان سے..... مسئلہ تو غریب لڑکیوں کا ہے۔ ان کا ہے جو دیہاتوں میں ہیں اور شہر کی مکی آبادیوں میں رہتی ہیں۔

وہ غریب لڑکیاں جنہیں زبردستی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جو حاملہ ہو جاتی ہیں، وہ کہاں جائیں۔ وہ غریب بچیاں جنہیں مرد بے وقوف بنا کر اور ان کی نادانی کا فائدہ اٹھا کر حاملہ کر دیتے ہیں، وہ کس کے پاس شکایت کریں، مدد کے لیے جائیں۔ یہ عورت جو پہلے ہی سات بچوں کی ماں ہے اور اب حاملہ نہیں ہونا چاہتی ہے مگر حمل سے ہے تو اپنا حمل ضائع کرانے کے لیے کس کے پاس جائے؟

سماج کے پاس اس قسم کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا بلکہ اس قسم کے سوالوں کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ سماج تو دہشت گردی کے خلاف جنگ کر رہا ہے، سماج تو اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، سماج تو جمہوریت کی جنگ لڑ رہا ہے، سماج تو کشمیر کی آزادی کے لیے تیاری کر رہا ہے، سماج وہ سب کچھ کر رہا ہے جو سماج کے لیے اہم ہے۔ یہ نازک اندام، غریب بے کس مجبور لڑکیاں، عورتیں، سماج کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ جن لڑکیوں کی عزت لوٹی جاتی ہے اس کی شکایت پر پولیس والے بھی اس کی اور اس کے خاندان والوں کی عزت لوٹتے ہیں۔ کنواری ماؤں کو سماج، کاری اور غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے اور رانی جیسی عورتیں دایوں کے ہاتھوں ادھ مری ہونے کے بعد سرکاری اسپتالوں میں پہنچ جاتی ہیں جہاں انہیں خیرات کے نام پر دوا نہیں دی جاتی ہیں، رحم کے نام پر خون ملتا ہے، امداد کے طور پر بستر ملتا ہے اور ڈاکٹروں، نرسوں کے رحم و کرم پر ان کی زندگی ہوتی ہے۔ رانی کے لیے بھی کچھ دوایں اسپتال سے ملی تھیں،

میرے نسوان حسن کا راز

ہلوسم بریسٹ ڈولپنگ ایڈڈ ٹائٹنگ کریم (ہرٹل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

قیمتی جزی بوشیوں کے اجزاء اور عریقات سے تیار
کر دہ۔ بدقسمت وادح و صیوں، مہاسوں کو بھی مٹا
کے کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔

یونانی کریم
گلیسی

- | | | | |
|---|--|---|---|
| □ قویہ اسٹور ایپریس مارکیٹ صدر کراچی | □ ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور | □ صیبت پشاور شین بازار کالونل | □ حاکم پشاور شین بازار کالونل |
| □ صدر میڈیکل اسٹور ایپریس مارکیٹ صدر کراچی | □ صدیقی دواخانہ صرافہ بازار گورنمنٹ | □ انعام پشاور پشاور | □ کلاسک پشاور پشاور |
| □ مسلم بزنس اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی | □ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد | □ عظیم پشاور گورنمنٹ بازار دواخانہ آباد | □ محمل دواخانہ اسلام آباد 2278463 |
| □ ایم ایم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی | □ زمان دواخانہ پشاور دواخانہ | □ حق سائیں دواخانہ ملیر پشاور | □ علی ہوسٹو اسٹور ملیر کراچی |
| □ واکس میڈیکل اسٹور آصف اسکوائر ان 22 کراچی | □ قدیمی چینی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا | □ شانی دواخانہ اندرون فریڈ مارکیٹ ملیر بازار بہاولپور | □ ایس ایس انکر 22 علامہ اقبال روڈ لاہور |
| □ قمری اسٹور ملیر اسٹور پشاور پشاور | □ جان سینہ پشاور پشاور | □ علی ہوسٹو کچہری روڈ ملتان | □ حق القیوم ملیر اسٹور پشاور |
| □ نوری دواخانہ کراچی پشاور | □ شامی ملیر دواخانہ چھوٹ بازار لعل آباد | □ ان جیٹا اسٹور گھنٹہ گھر بازار پشاور | □ ہوسٹو پشاور صدر بازار ملیر پشاور |
| □ ایٹان ہوسٹو چھوٹ بازار لعل آباد | □ بھٹری دواخانہ ملیر مارکیٹ ملیر | □ ایٹان ملیر اسٹور گورنمنٹ بازار کول پشاور | □ عظیم ملیر پشاور پشاور |

بادشاہ دی مہی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹر بچہ مفت منگوائیں
□ عظیم الدین پشاور ملیر کراچی 2433682 ریاض محمد 69 عظیم الدین پشاور ملیر کراچی 042-7666264
پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کی یا اضافہ کے بارے میں مفت ملیر مشورے کے لیے عظیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ
اطلاع آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Website: wwwdevapk.com Cell: 0333-5203553

نواب شاہ کی لڑکیوں کے میڈیکل کالج کی طالبات نے اسے اپنا خون دیا اور وارڈ میں لیڈی ڈاکٹروں نے خیرات زکوٰۃ کی مد میں جو رقم جمع کی تھی، اس سے اس کے لیے قیمتی اینٹی بائیوٹک خریدی اور آپریشن کے لیے کچھ سامان حاصل کیا گیا تھا۔

اس کا آپریشن کرنا پڑ گیا۔ پیٹ کھول کر تقریباً سڑی ہوئی بچہ دانی کو نکال دیا گیا اور چھوٹی آنت میں کئی سوراخ تھے۔ ان سوراخ زدہ آنتوں کے حصوں کو نکال کر بقیہ آنتوں کو جوڑ دیا گیا۔ اسے چھ بوتلیں خون کی لگائی گئیں۔ آپریشن چھ گھنٹے تک ہوتا رہا۔ وہ زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان جھولا جھولتی رہی۔

پتا نہیں وہ کیسے بچ گئی۔ عام طور پر ایسے مریض بچتے نہیں ہیں۔ شاید اس کے اندر کی ہمت تھی، جینے کی لگن، زندہ رہنے کی خواہش، یہ شدید احساس کہ اگر وہ مر گئی تو گھر پر رہ جانے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا۔ جسمانی زخموں کو اس نے شکست دے دی تھی۔ مجروح زخمی روح کے زخموں کو کون گنتا ہے، کس کے پاس وقت ہے جو غریب کے درد کو محسوس کرے۔

آپریشن کے دس دن کے بعد یکا یک اس کا بستر گھلا ہوا شروع ہو گیا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ پیشاب کی تحصیل میں لگے ہوئے کالے نشان جن پر خون جما ہوا تھا، وہ گل کر جھڑ گئے ہیں اور اسے فسطیو لا بھی ہو گیا ہے، پیشاب کی تحصیل میں سوراخ جہاں سے پیشاب مسلسل بہتا رہتا ہے۔

جب دائیاں شہر کی مچی آبادیوں اور چھوٹے شہروں میں، قصبوں میں چوری چھپے اپنے رنگ زدہ اوزاروں سے بچہ گراتی ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ بچہ دانی میں بھی سوراخ کر دیتی ہیں بلکہ پیشاب کی تحصیل بھی محفوظ نہیں رہتی ہے۔ رانی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ زندگی کے گھاؤ کتنے گہرتے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ رانی کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کے مزید بچے نہ ہوں مگر ہمارے نظام نے اسے تقریباً مار دیا تھا۔ اس کی بچہ دانی نکال لی گئی، اس کی آنتوں کو کاٹنا پڑا اور اس کی پیشاب کی تحصیل میں سوراخ ہو گیا۔ اس کے جسم سے چلتے پھرتے پیشاب کی بدبو آنے لگی۔

تین ہفتوں کے بعد اسے گھر بھیج دیا گیا، اس مشورے کے بعد کہ وہ آٹھ ہفتوں کے بعد دوبارہ آئے تو پھر اس کے پیشاب کی تحصیل کے سوراخ کو ایک آپریشن سے بند کر دیا جائے گا۔

وہ آٹھ ہفتوں میں نہیں چار مہینے کے بعد آئی، اپنے

بڑے بیٹے کے ساتھ۔ وہ پندرہ سولہ سال کا جوان ہوتا ہوا لڑکا تھا۔ میرے پوچھنے پر پتا چلا کہ جب اس کے آنے کا وقت ہوا تو فصلیں کٹنے کو تیار تھیں اور ہاریوں کے سارے خاندان اس وقت مصروف ہو جاتے ہیں۔ کیا صحت مند کیا بیمار، کیا چھوٹے کیا بڑے، کیا مرد کیا عورت، ہر ایک کو کام کرنا ہوتا ہے۔ پیٹ کھانا مانگتا ہے، روٹی اور قرض دینے والے قرض واپس مانگتے ہیں جو فصل کے بعد ہی دیا جاسکتا ہے۔ فسطیو لا ہے تو کیا ہوا، پیشاب بہہ رہا ہے تو بہتا رہے۔ فصل کٹنی ضروری ہے۔

اس نے بھی خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ فصل کے بعد آپریشن کرانے جائے گی۔ ویسے ہی بیماری سے قرض چڑھ چکا ہے اسے کون اتارتا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کس طرح سے اس نے کام کیا ہوگا۔

فسٹیو لا کا آپریشن آسان تھا۔ آپریشن کے بعد اسے چودہ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ چودھویں دن جب پیشاب کی ٹنگی نکالی گئی تو پیشاب کی تحصیل میں ہونے والا سوراخ بند ہو چکا تھا۔ وہ واپس اپنے گاؤں جانے کے لیے تیار تھی۔

دوپہر دو بجے جب میں اسپتال سے باہر نکلا تو وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وارڈ کے باہر میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اور اس کا بیٹا دونوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں سو سو روپے کے پانچ مڑے مڑے نوٹ تھے جو وہ مجھے دینا چاہ رہی تھی۔

”تو نے میری جان بچائی ہے، مجھے زندہ کر دیا ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے سندھی میں کہا۔ اس کے بیٹے نے کہا کہ ماں نے فصل پر کام کر کے یہ روپے تمہارے لیے بچائے ہیں۔ بڑا احسان ہے تمہارا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ اخلاقاً نہیں بلکہ اس کے دل میں بھی یہی ہے۔

میں وہ نوٹ کیسے لے سکتا تھا، ایک غریب کسان کی لٹی ہوئی بیوی سے۔ جو میں نے کیا اس کی تو سرکار مجھے تنخواہ دیتی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ بڑی مشکلوں سے ان دونوں نے روپے واپس لیے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ پیسے وہ اپنے آپ پر خرچ کرے، اپنے خاندان پر خرچ کرے۔

اس نے میرا ہاتھ چوما اور اس کا بیٹا میرے گلے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل رورہا تھا۔ جانے کب ان غیرت مند غریبوں کے سروں سے بے حس حکمرانوں کا سایہ چھٹے گا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔





بندوبست

تنویر ریاض

دنیا میں سب سے زیادہ گہرا رشتہ شاید غرض کا ہوتا ہے، غرض کی بنیاد پر چاہے جان پہچان اور کوئی تعلق ہو یا نہ ہو بس ایک دوسرے کی ضرورتوں کے محتاج دو انسان لوگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں... یہاں بھی اسی غرض کی بدولت انتہائی دشمنی بھی بہت پیاری دوستی میں ڈھل گئی تھی۔

کمزور لمحات میں سہاروں کے سلاشی ایک جوڑے کی جرات

سردی کی وجہ سے اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری تھی لیکن اس کی منزل ابھی دور تھی جہاں پہنچ کر وہ اپنے کانپتے جسم کو تھوڑی بہت حرارت پہنچا سکتی تھی۔ جنگل کے بیچ کھلے میدان میں پہنچ کر وہ ایک درخت کے پیچھے رک گئی۔ کہیں کوئی حرکت نہیں دکھائی دی۔ آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی چمنیاں ٹھنڈی اور

ورخسوں کے جھنڈ سے ایک تاریک سایہ برآمد ہوا۔ فضا میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چاندنی نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور اس کی روشنی میں سب کچھ بہت صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف احتیاط سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ سخت

ساکت تھیں اور دھومیں کی کوئی لکیر آسمان کی طرف جاتی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس عالم میں تو وہ بوڑھا منحصر کر رہ گیا ہوگا۔ وہ دیر تک بچن کی کھڑکی کو دیکھتی رہی لیکن اسے وہاں کوئی حرکت نہیں دکھائی دی۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں شینڈ کی طرف بڑھی اور لکڑیوں کے ڈھیر پر پڑی پوری کھینچ لی۔

سردی کی شدت سے بوڑھے کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ اس نے جو کھیل اوڑھ رکھا تھا وہ اس کڑکڑاتی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اسے اپنے پورے بدن میں شدید اینٹھن محسوس ہوئی۔ وہ زور زور سے کراہنے اور کھانسنے لگا۔ پھر گہری گہری سانس لیتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کی نگاہیں وال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور نحیف آواز میں بولا۔ ”ہلکی!“

ایک لمبی چوہے کے عقب سے نمودار ہوئی۔ اس نے تیزی سے کودتے ہوئے باورچی خانے کے دو چکر لگائے اور بوڑھے کے سینے پر دراز ہو گئی۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم روز بروز موتی ہوتی جا رہی ہو۔“

لمبی کے جسم سے پھوٹی حرارت بوڑھے کے جسم کو گرمی پہنچا رہی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنے سینے کے درد میں آفاقہ محسوس ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی دم سادھے لیٹا رہا۔ پھر اسے رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس کا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے بستر چھوڑنے کے لیے ہمت کر لی۔ پھر اچانک لکڑی کے باکس سے ایک سرسرائی ہوئی آواز آئی جسے سنتے ہی لمبی نے چھلانگ ماری اور چوہے کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔ اس دوران بوڑھا بے حس و حرکت بستر پر پڑا چوہے لمبی کے کھیل سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

یہ تماشا زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ بوڑھے کی ضرورت نے اسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور باہر کے منظر پر نظریں جما دیں۔ گہری کہہ نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور چاند ستاروں کی روشنی میں برف کے چھوٹے موٹے ذرے چمک رہے تھے۔

ابھی وہ اس نظارے سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ سردی کی لہر ایک بار پھر اس کے پیچھے پھڑوں میں گھس گئی اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ اس نے منہ کی خوب صورتی سے مزید لطف اندوز ہونے کا ارادہ ملتوی کیا اور گھر کی جانب واپس ہو لیا۔ اس نے پوری طرح میں لگا ہوا بلب اور مگن کی لائٹ چلائی تو روشنی میں اس کی آنکھیں چمک چمکاتے

لگیں۔ اس نے تل کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور چولہا جلانے کے لیے ماچس تلاش کرنے لگا۔ سردی کی وجہ سے اس کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو رہا تھا۔ اس نے ٹارچ اور ٹوکری اٹھائی اور شینڈ کی جانب بڑھنے لگا جہاں لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے دروازے کی کنڈی ہٹائی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ کچھ دیر پہلے اس شینڈ میں کوئی موجود تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں لکڑیوں کے ڈھیر کا جائزہ لیا جنہیں اس نے بڑی احتیاط سے کاٹ کر ترتیب سے رکھا تھا۔ یہ لکڑیاں چولہا جلانے میں استعمال ہوتی تھیں اور ان کا سائز اتنا رکھا گیا تھا کہ وہ بہ آسانی باورچی خانے کے چولہے میں فٹ ہو سکیں۔ اس نے مختلف اقسام کی لکڑیوں کے ڈھیر بنا رکھے تھے۔ جب ٹارچ کی روشنی صنوبر کے ڈھیر پر گئی تو وہ چونک پڑا۔ وہ تیزی سے ڈھیر کی جانب لپکا اور ہاتھوں سے لکڑیوں کو ٹٹولنے لگا۔ اس کی نظر سے کوئی چیز اوجھل ہو سکتی تھی لیکن ہاتھ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ اسے لکڑیوں میں اندازہ ہو گیا کہ لکڑیوں کے کچھ ٹکڑے غائب ہیں۔ غصے اور بے بسی کی وجہ سے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اس نے درد کی شدت پر قابو پانے کے لیے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس نے کتنی محنت سے گزشتہ موسم بہار میں صنوبر کے درخت کاٹ کر یہ لکڑیاں جمع کی تھیں۔ یہ وہی جانتا تھا کہ اس درخت کے تنے کو جنگل سے مٹھیت کر لانے میں اسے کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہار کا سارا موسم اسی کام کی نذر ہو گیا لیکن اس کی ساری محنت رائگاں چلی گئی۔ کسی بد بخت کو اس ذخیرے کا علم ہو گیا تھا اور وہ یہاں سے لکڑیاں چھرا رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

”میں زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہروں گی۔“ انیکا نے پیار سے اپنی دادی کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

دادی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا دی۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موقع پر انیکا کہیں جائے لیکن وہ اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھی۔ اس لیے اسے سمجھانا یا روکنے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ انیکا نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکایا اور پلاسٹک کی ٹوکری اٹھا کر چل دی۔ باہر نکل کر اس نے آسمان پر سردیوں کے جھکتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ جمیل کا پانی جم چکا تھا اور اگر سردی کی شدت یونہی برقرار رہتی تو وہ کمرس کے بعد آکس اسکیٹنگ کے لیے جاسکتی تھی۔ فی الوقت وہ ایک اور

اہم کام کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ بوڑھا گستاو پگڈنڈی کے دوسرے سرے پر آرامیٹھیں سے متصل ایک کالج میں رہتا تھا اور وہ ہر سال کرسک کے موقع پر اس سے ملنے جاتی تھی۔

وہ جنگل کے ساتھ والی پگڈنڈی پر تیز تیز قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ یہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا اور وہ ہمیشہ مل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی ساری زندگی اسی علاقے میں گزری تھی۔ البتہ گزشتہ دو ماہ سے وہ اسٹاک ہوم کے ایک اخبار کے لیے کام کر رہی تھی اور مصروفیت کے سبب لگ رہا تھا کہ شاید کچھ عرصے تک وہ گھر نہ آ سکے گی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اپنا کام وقت پر مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اسے اپنی دادی کے ساتھ کرسک گزرنے کا موقع مل گیا۔

دور سے وہ جگہ ایک چھوٹے سے ہیرے کے مانند جھلکاتی محسوس ہو رہی تھی لیکن جیسے جیسے انیکا اس سے قریب ہوتی گئی، زوال کے آثار بھی نمایاں ہوتے گئے۔ باغ اب جھاڑ جھنکار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بیرونی دیواروں کی حالت بھی شکستہ تھی۔ لگتا تھا کہ ان پر عرصے سے رنگ و روغن نہیں ہوا تھا۔ انیکا نے گہری سانس لیتے ہوئے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دوبارہ دستک دیتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔ ”اگل گستاو!“

ایک سیاہیلی درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ انیکا نے جھک کر اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ”ہیلو ہیلو! کیا تمہارے ڈیڑی گھر پر نہیں ہیں؟“

اس نے دروازے کا ہینڈل کھمایا اور اندر داخل ہو گئی۔ روشنی سے اندھیرے میں آنے کے سبب اس کی آنکھیں چندھیا نے لگی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک ڈبل بیرل شاٹ گن کا رخ اس کی جانب تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی اور چلاتے ہوئے بولی۔

”اگل! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

بوڑھے نے گن نیچے کر لی اور اٹھتے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کا لباس میلا اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ انیکا تین فٹ کے قاصدے سے بھی اس کے جسم سے پھوٹی ہوئی بدبو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کا چہرہ سو جا ہوا تھا اور آنکھیں بوجھل معلوم ہو رہی تھیں۔

”گستاو! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ انیکا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”مار یا انیکا!“ بوڑھے نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اب اس کے لہجے میں خوف کی جگہ غصہ نمایاں

ہو گیا تھا۔ ”تم یہاں شاٹ گن لیے کیوں کھڑے ہو؟“

بوڑھا مڑا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔ انیکا بھی اس کے پیچھے تھی۔۔۔ وہ جگہ نسبتاً گرم تھی۔ گستاو میز کے ساتھ رکھی ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا اور گن اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھ لی۔ انیکا نے بھی اپنا سامان نیچے فرش پر رکھ دیا۔ پھر وہ اس کے پاس گئی اور آہستہ سے گن اٹھالی۔ بوڑھے نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ انیکا نے گن کھول کر دیکھی اس میں کارتوس نہیں تھے۔ انیکا نے وہ گن بستر کے نیچے دھکیل دی۔

”اب بتاؤ۔“ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

بوڑھے نے یہ سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔ اس کے کندھے جھک گئے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

انیکا نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اگل! بتاؤ تو کسی۔ کیا ہوا ہے؟“

”چور۔۔۔۔۔۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہاں، وہ لکڑی چور ہی ہے۔“

”کیا کوئی تمہاری لکڑیاں چور رہا ہے؟“ انیکا نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انیکا کو اس پر ترس آنے لگا۔ گستاو نے کئی برس اس جنگل میں کام کیا تھا اور اپنی ساری زندگی اسی چھوٹی سی جمونپڑی میں گزار دی تھی۔ اب اس کا گزارہ معمولی سی پنشن پر ہو رہا تھا۔ اسے حکومت کی طرف سے اجازت تھی کہ وہ ہوا سے گرنے والے درخت اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ گستاو نے اپنی زندگی انہی درختوں کے نام کر دی تھی۔ اس کے شیلے میں ایسے کئی درخت موجود تھے جن سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔

”کیا میں تمہارے شیلے پر ایک نظر ڈال سکتی ہوں؟“ انیکا نے پوچھا۔

وہ بے دلی سے اٹھا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ”یہ سلسلہ تین ہفتے سے چل رہا ہے۔ مجھے اس کا علم اسی وقت ہو گیا تھا۔“ اس نے شیلے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

شیلے کے اندر لکڑی کے ڈھیر جھیت تک گئے ہوئے تھے۔ انیکا کے لیے یہ محض جلانے کی لکڑی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ شیلے کے باہر بہت سے قدموں کے نشانات تھے جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس راستے پر انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کی بھی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر بوڑھے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم نے کبھی کسی کا ریا

موٹر بائیک کی آواز سنی یا اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا؟“
 بوڑھے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظر کمزور ہو چکی
 تھی لیکن سماعت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انیکا نے ایک
 مرتبہ پھر غور سے زمین کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”مجھے یہاں کسی
 گاڑی یا موٹر بائیک کے نشان نظر نہیں آ رہے۔ اس کا مطلب
 ہے کہ چور پیدل چل کر آتا ہے اور کوئی بھی شخص لکڑی سیٹ
 دو سو گز سے زیادہ کا فاصلہ نہیں طے کر سکتا۔ جس سے ظاہر ہوتا
 ہے کہ چور کا تعلق ہیڈ برگا سے ہے۔“
 انیکا کا جملہ ختم ہوتے ہی دونوں کی نظریں اس پگھلنے والی
 پر جم گئیں جو ہیڈ برگا نامی گاؤں کی طرف جارہی تھی۔

☆☆☆

انیکا اپنے ساتھ بہت سا سامان لے کر آئی تھی۔ اس
 نے وہ سب بوڑھے گستاو کے حوالے کیا اور اسے کرسمس کی
 مبارکباد دے کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اب اس کا رخ
 ہیڈ برگا کی جانب تھا۔ چند منٹ بعد ہی وہ گاؤں میں داخل
 ہو چکی تھی۔ وہاں زیادہ تر مکانات لکڑی سے بنے ہوئے تھے
 جنہیں کرسمس کی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔ وہ اس گاؤں کے
 بہت سے لوگوں کو جانتی تھی اور تقریباً سب کے ساتھ ہی اس
 کے ذاتی تعلقات تھے۔ اس گاؤں کے سب سے بڑے گھر
 میں انکل کارل سن رہتے تھے۔ اس کے برابر والے مکان میں
 آستا اور فوک اپنے بیٹے پیٹر کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ پیٹر
 اس سے دو سال بڑا تھا۔ اس سے کافی فاصلے پر ٹرین ہاؤس تھا
 جس میں پادری پیٹر سن اور اس کی بیوی ایلسا رہتی تھی۔ انیکا کو
 وہ پادری بھی اچھا نہیں لگا شاید اس لیے کہ اس نے انیکا کی ماں
 کو طلاق ہونے کے بعد اس پر تنقید کی تھی۔ گاؤں کے آخری
 کنارے پر واقع فارم میں کیرن اور اینڈرس اپنے تین بچوں
 کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ انیکا اور کیرن ایک ہی کلاس میں
 پڑھتی تھیں۔ کچھ فاصلے پر انجیلا جاسن کا کالج تھا جو اسے اپنی
 ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ اس وقت وہاں اندھیرا اور گہری
 خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انیکا نے ایک نظر اس پر ڈالی اور آگے
 بڑھی۔ کونے والا مکان ایلیکس کا تھا جس کے پانچ بچے تھے۔
 جب بھی انیکا کے پاس فرصت ہوتی تو وہ ان کے بچوں کے
 ساتھ وقت گزارتی تھی۔ انہی لوگوں میں سے کوئی گستاو کے
 شیڈ سے لکڑیاں چوری کر رہا تھا۔ انیکا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چور کا
 پتا چلا کر ہی دم لے گی۔ اس فیصلے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی اور
 اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ اسے احساس تھا کہ بہت دیر
 ہو گئی ہے۔ دادی انتظار کر رہی ہوں گی۔

☆☆☆

فلوڈا میں کرسمس کی دعائیہ تقریب صبح چھ بجے شروع
 ہو گئی تھی۔ انیکا اور اس کی دادی بیس منٹ قبل ہی وہاں پہنچ گئی
 تھیں۔ گاؤں کے سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ انیکا نے اپنی
 آنکھیں بند کر لیں اور عقیدت و احترام سے دعائیہ نظم سننے لگی
 پھر اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب دعا ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔
 وہ جلدی سے انہی اور دادی کا ہاتھ تھام کر باہر آ گئی۔ سردی
 بہت زیادہ تھی اور برف باری کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔
 اس نے دادی کو کار میں بٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ
 گر ان ہیڈ کے پاس سے گزر رہی تھی اور ہیڈ برگا کا گاؤں اس
 کی بائیں جانب تھا، ابھی انیکا کی نظر ایک سائے پر گئی اور وہ
 چوکتے ہوئے دادی سے بولی۔ ”تم نے کچھ دیکھا؟“

”کیا؟“ دادی نے چوکتے ہوئے پوچھا۔

”جنگل کے کنارے پر کوئی کھڑا ہے۔“

”مجھے تو صاف نظر نہیں آ رہا۔ ممکن ہے کہ کوئی ہرن ہو۔“

”اس نے ٹوپی پہن رکھی ہے۔“ انیکا نے الجھتے ہوئے کہا۔

دادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے خیال میں
 یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ ون نکل آیا تھا اور لوگوں کی
 آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ اگر کوئی شخص جنگل کے
 کنارے پر کھڑا ہوا تھا تو اس میں حیران ہونے والی کیا
 بات تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد انیکا نے دادی کو اس کے
 کمرے میں پہنچایا اور بولی۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے
 باہر جارہی ہوں۔“

”اس وقت۔ خیریت تو ہے؟ ایسا کیا ضروری کام یاد
 آ گیا؟“ دادی نے پوچھا۔

”میں گستاو کو دیکھنے جارہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے
 اپنے بیگ سے نارچ نکالی اور روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

انیکا کو یقین تھا کہ چور کا تعلق ہیڈ برگا سے ہی ہے
 چنانچہ اس نے بھی گستاو کے کالج تک جانے کے لیے وہی
 راستہ اختیار کیا جو گاؤں کے پاس سے گزرتا تھا۔ تھوڑی
 دور چلنے کے بعد ہی اس کے شیشے کی تصدیق ہو گئی۔ برف
 پر قدموں کے نشان بڑے واضح تھے جو سیدھے گستاو
 کے شیڈ تک جا رہے تھے۔ اس نے ان نشانات کا تعاقب
 کیا اور شیڈ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ یہاں تک پہنچنے کے
 بعد قدموں کے نشان ختم ہو گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا
 کہ چور اب بھی شیڈ کے اندر ہی ہے۔ اس کا دماغ
 جھکانے لگا۔ اگر وہ پیٹر یا اینڈرس جیسا طاقتور مرد ہوا تو
 وہ اس کا مقابلہ کیسے کر پائے گی۔ اس نے سر کو جھٹک کر

اپنا خوف دور کرنا چاہا اور دبے قدموں شینڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ وہاں سیاہ لباس پہنے ایک دروازہ قد شخص موجود تھا۔ آہٹ سن کر وہ پلٹا۔ انیکا نے فوراً ہی ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی اور چوکتے ہوئے بولی۔ ”تم؟“
وہ انجیلا جاسن تھی۔ اس نے روشنی سے بچنے کے لیے اپنا بازو اوپر اٹھایا اور چلائی۔ ”اے بھادو۔“

انیکا اس کا مطالبہ نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھی اور بولی۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس کی آواز میں غصے کی وجہ سے ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ ”تمہیں اس بوڑھے کے یہاں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آتی جس سے ضعیفی کے سبب چلا بھی نہیں جاتا۔ تمہیں احساس ہے کہ اس نے کتنی محنت سے یہ لکڑیاں جمع کی ہوں گی؟“

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور دوسرے ہی لمحے اس کے پیٹ پر ایک ضرب لگی۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور لڑکھڑاتی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر پر جا گری۔ انجیلا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ہی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ انجیلا چلاتے ہوئے پیچھے کی طرف ہٹی اور بولی۔ ”وہ یا گل بوڑھا ہم پر گولیاں برسا رہا ہے۔“

دوسری گولی دروازے پر لگی اور اس کی لکڑی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ انیکا ایک بار پھر چلائی اور چاروں ہاتھ پاؤں سے ریختی ہوئی لکڑی کے ڈھیر کے درمیان دبک کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح سمیٹ لیا تھا کہ جسم کا کوئی حصہ باہر نہ رہے۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ اس دوران انجیلا بھی ریختی ہوئی اس کے پاس آگئی۔ انیکا کو اس کے کراہنے اور سسکیاں لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ انجیلا تکلیف میں ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا تم زخمی ہو؟“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ اندھیرے میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”مجھے اس سے بات کرنا ہوگی۔“ انیکا نے کہا۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹولتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر بہ آواز بلند بولی۔ ”گستا دو! یہ میں ہوں انیکا۔ میں نے تمہارے چور کو پکڑ لیا ہے۔ کیا ہم آپس میں بات کر سکتے ہیں؟“

باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پہلے سے بھی ادنیٰ آواز میں بولی۔ ”گستا دو!“

میں انیکا بول رہی ہوں۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ میں باہر آرہی ہوں۔“
اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ پہلے کی طرح خاموشی چھائی رہی۔

”خدا کے واسطے کچھ کرو۔ اگر یہ خون اسی طرح بہتا رہا تو میں مرجاؤں گی۔“ انجیلا کراہتے ہوئے بولی۔

انیکا نے گہرا سانس لیتے ہوئے دروازہ پورا کھول دیا۔ فوراً ہی گولیاں برسنے لگیں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا میں رقص کرنے لگے۔ انیکا پیچھے کی جانب لڑھکی اور انجیلا پر جا گری۔

”اندھی ہو گئی ہے موٹی۔“ انجیلا اس کے بوجھ تلے کراہتی ہوئی بولی۔

”اپنی زبان بند رکھ، بے وقوف عورت۔“ انیکا چلاتے ہوئے بولی۔

انجیلا نے آہستہ سے اسے اپنے اوپر سے ہٹایا اور منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ”تم نے مجھے بے وقوف کہا جبکہ لوگ نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے پکارتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ ایسی باتیں سن کر مجھ پر کیا گزرتی ہوگی؟“

”تم اسی کی مستحق ہو۔“ انیکا غصے سے بولی۔ ”تم... بے وقوف ہی نہیں بلکہ آوارہ بھی ہو۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ تم نے میرے بوائے فرینڈ کو بھی چھیننے کی کوشش کی تھی۔“

”میں سیون سے محبت کرتی تھی اور وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ اب تک ہماری سنگینی ہو چکی ہوتی اگر تم بیچ میں نہ آ جاتیں۔“

”اس بازی میں کسی کی بھی جیت ہو سکتی ہے۔“ انیکا فاتحانہ انداز میں بولی۔

انجیلا نے رونا شروع کر دیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میرے چہرے سے خون بہہ رہا ہے۔“

اسی لمحے انیکا کا ہاتھ اپنی ٹارچ پر جا پڑا۔ اس نے سوچ آن کر کے دیکھا۔ وہ ابھی تک کام کر رہی تھی۔ اس نے انجیلا کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں گولی نہیں لگی بلکہ لکڑی کی ایک بڑی پھانس تمہاری آنکھ کے نیچے کھس گئی ہے۔ میں ابھی نکالے دیتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے بڑی مہارت سے پھانس کا ٹکڑا ہوا سرا پکڑا اور بڑی صفائی سے اسے نکال لیا۔ انجیلا بولی۔ ”کہیں زخم بڑھ نہ جائے۔“

”جسہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہو۔“

”ہاں۔ بشرطیکہ وہ بوڑھا عجیلی ہم دونوں کو گولی کا نشانہ نہ بنادے۔“

انیکا نے اندھیرے میں ٹٹول کر ایک بڑی لکڑی تلاش کی تاکہ اس کی مدد سے دروازہ کھول سکے۔ فوراً ہی ایک اور فائر ہوا۔ انیکا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تمام لیا اور بولی۔

”لگتا ہے کہ ہمیں کچھ دیر یہیں بیٹھنا پڑے گا۔“

سردیوں کا سورج ست روی سے نمودار ہوا اور اس کی روشنی دھیرے دھیرے شیڈ میں پہنچنے لگی۔

انیکا اور انجیلا لکڑی کے ڈھیر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ انیکا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس سے پوچھا۔

”تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ میرا مطلب ہے کہ اس بوڑھے کی لکڑیاں کیوں چراتی رہیں؟“

”میں سردی سے بچنا چاہ رہی تھی۔“ انجیلا نے اپنا منہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

”اس کا حل تم نے یہ نکالا کہ اس بوڑھے آدمی کی لکڑیاں چراتا شروع کر دوں۔“

”تم کبھی نہیں سمجھ سکو گی۔“ انجیلا نے افسردگی سے کہا۔

”کیونکہ زندگی میں جسہیں کبھی مشکلات سے واسطہ نہیں پڑا۔“

انیکا زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کے قبضوں کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔

”تم قہقہے لگا سکتی ہو۔“ انجیلا نے کہا۔ ”کیونکہ تمہارے پاس ابھی ملازمت ہے اور اسٹاک ہوم جانے کے مواقع بھی ہیں۔“

”تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“ انیکا نرمی سے بولی۔ ”جسہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“

ان باتوں کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔“

”میرے گھر کی بجلی اور ٹیلی فون دونوں ہی کٹ گئے ہیں۔ سوشل سیکورٹی سے بھی مجھے کچھ نہیں مل رہا۔ میں پیسے کے لیے محتاج ہو گئی ہوں۔“

”جسہیں کوئی ملازمت کر لینی چاہیے لیکن لگتا ہے کہ تم نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔“ انیکا نے تلخی سے کہا۔

”زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے خیال میں یہاں اس گاؤں میں مجھے کون سی ملازمت مل سکتی ہے؟“

”یہاں نہیں تو کسی اور جگہ تو ملازمت مل سکتی ہے۔ اس کے لیے جسہیں یہ گاؤں چھوڑنا ہوگا۔“

”پھر میں کہاں رہوں گی؟ میرا گھر تو یہاں ہے۔“

”اے بچ دو۔“ انیکا نے مشورہ دیا۔

”اس پرانی جھونپڑی کا مجھے کیا ملے گا۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”ٹھیک ہے پھر اسی طرح روتے دھوتے زندگی گزارتی رہو۔ لگتا ہے جسہیں ناکامیوں سے پیار ہو گیا ہے۔“

انجیلا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ اب اس سے انیکا کی جلی کٹی۔ باتیں برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ جھلا کر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ دو فائر اور ہوئے۔

”مردود بوڑھے۔“ وہ زور سے چلائی۔

گستاخوں نے اپنی گن دوبارہ لوڈ کی اور مزید دو فائر کر دیے۔

”کیا تم نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی؟“ انیکا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

انجیلا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ ”ہاں ایک مرتبہ جاب کی تھی۔ مجھے ہوم کیئر سروس میں کام مل گیا تھا لیکن تین سال پہلے چھانٹی ہوئی تو نکال دی گئی۔“

”تم اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ کوئی ڈگری... یا ڈپلوما لے لو گی تو ابھی ملازمت مل سکتی ہے۔“

”اس کے لیے مجھے کار کی ضرورت ہوگی جو میں افورڈ نہیں کر سکتی۔“

ابھی اس نے کار کا نام ہی لیا تھا کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ چوکتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا خیال ہے یہ گاڑی اسی طرف آرہی ہے؟“

انیکا نے چند سیکنڈ تک غور سے اس آواز کو سنا پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، وہ تقریباً یہاں پہنچ چکی ہے۔“

وہ دونوں شیڈ کے تختوں کے بیچ بنی ہوئی جھری سے جھانک کر دیکھنے لگیں۔ نیلے اور سفید رنگ کی سرکاری گاڑی آہستہ آہستہ نزدیک آرہی تھی۔

”یہ تو پولیس کا رہے۔“ انیکا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

وہ گاڑی کانسٹیبل کے پاس آ کر رک گئی اور اس میں سے یونیفارم میں ملبوس ایک مرد اور ایک عورت نمودار ہوئے۔

”میں انہیں جانتی ہوں۔“ انیکا آہستہ سے بولی۔

”ان کے نام ہینسن اور پیٹرسن ہیں۔ میں ان کے ساتھ ایک اسٹوری کے سلسلے میں کام کر چکی ہوں۔“

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مکان کے قریب آئے۔ انیکا نے سنا۔ عورت کہہ رہی تھی۔ ”میری کمرس.....

یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

جواب میں گستاو کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ انیکا تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی اور باہر آگئی۔ اس نے دیکھا کہ مرد پولیس آفیسر نے گستاو سے بندوق لے کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ انجیلا جاسن بھی اس کے پیچھے چلاتی ہوئی باہر آئی۔

”یہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے ہمیں مارنے کی کوشش کی تھی۔“

پولیس والوں نے شیڈ کی جانب دیکھا جیسے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گستاو نے اپنی شاٹ گن چھیننے کی کوشش کی اور چیختے ہوئے بولا۔ ”یہ دونوں چور ہیں، میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔“

پولیس والوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور دھکیلتے ہوئے پولیس کار تک لے گئے۔ گستاو نے پوری قوت سے مزاحمت کی لیکن پولیس کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اس کے پیچھے پیچھے انجیلا بھی اسے برا بھلا کہتی ہوئی چل رہی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے انیکا کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اسے لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی چنانچہ وہ کچن میں آگئی۔ اس نے چولہے میں آگ جلائی اور ایک کرسی ٹھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے جوڑ کھلنے لگے اور اس نے چولہے میں مزید لکڑیاں ڈال دیں۔

خاتون پولیس آفیسر ہینسن بھی وہیں آگئی اور دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”یہ سب کیا ہے؟ یہاں کیا ہو رہا تھا؟“

”انجیلا جاسن کافی دنوں سے لکڑیاں چرا رہی تھی۔ آج گستاو کو پتا چل گیا تو اس نے شیڈ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔“

”ہمیں گاؤں والوں نے فون کر کے بتایا تھا کہ یہاں جنگل میں بہت زیادہ فائرنگ ہو رہی ہے۔“ ہینسن نے کہا اور آگے کی طرف جھک کر غور سے انیکا کو دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”کیا تم سمجھتی ہو کہ گستاو کا ارادہ تمہیں مارنے کا تھا؟“

”یقیناً نہیں۔“ انیکا نے کہا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے دروازہ کھول کر اندر آتا اور ہم دونوں کو گولی مار دیتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ صرف ہمیں ڈرانا چاہ رہا تھا۔“

”مگر انجیلا جاسن تو اس پر قتل اور دہشت پھیلانے کی کوشش کا الزام لگا رہی ہے؟“

”ابھی وہ خود دہشت زدہ ہے۔ تھوڑی دیر میں

پر سکون ہو جائے گی۔“

پولیس آفیسر نے تنقیدی نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”کتنی گندی جگہ ہے، وہ یہاں کس طرح رہتا ہے۔“

انیکا نے بوڑھے کی وکالت کی اور بولی۔ ”وہ خود تو بڑا صفائی پسند ہے لیکن اپنی ضعفی کے سبب سارے کام نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ چوروں نے اس کے شیڈ کا راستہ دیکھ لیا ہے۔“

”میں سوشل سروس کو فون کرتی ہوں۔ اس بوڑھے کو مدد کی ضرورت ہے۔“

یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی اور اس کے جاتے ہی انجیلا اندر چلی آئی۔ وہ بھی سردی سے کانپ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ اس بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

انیکا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد انجیلا بولی۔ ”کچھ بھی ہو۔ ہم پر فائرنگ کرنے کے الزام میں اسے سزا تو ملنی چاہیے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کی بقیہ عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔“

”ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔“ انیکا غصے سے بولی۔ ”گستاو میرے لیے دادا کے برابر ہے اور میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔“

انجیلا کھسیانی ہو گئی لیکن کچھ بولی نہیں۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

”اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔“ انیکا طنز کرتے ہوئے بولی۔

”میں یہ لکڑیاں اپنے لیے نہیں چراتی تھی۔ دراصل کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ پہلے میں اپنے آتش دان کو گرم رکھنے کے لیے بازار سے لکڑیاں خریدتی تھی لیکن پھر یہ میرے بس سے باہر ہو گیا اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔“

انیکا نے اسے نفرت سے دیکھا اور بولی۔ ”لکڑیاں چرا نے کے لیے تمہیں اسی بوڑھے کا گھر ملا تھا؟ کاش تم جان سکتیں کہ اس غریب نے کتنی محنت و مشقت سے یہ لکڑیاں جمع کی تھیں۔ تم یہ شوق کسی دوسری جگہ سے بھی پورا کر سکتی تھیں۔“

”میرا خیال تھا کہ بوڑھے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ویسے بھی اس کی نظر کمزور ہے۔ فوری طور پر اس کی توجہ اس جانب نہیں جائے گی۔ یہ جگہ میرے گھر سے قریب

ہے۔ اس لیے میں نے لکڑیاں چرانے کے لیے اس کا انتخاب کیا۔“

انیکا کورہ رہ کر اس عورت پر غصہ آ رہا تھا جو چرائی ہوئی لکڑیوں سے اپنا گھر گرم کر کے محبوب کے پاس بیٹھ کر اظہارِ محبت کیا کرتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی سخت جواب دیتی، کسی کے بھاری قدموں کی آواز آئی۔ ایک بھاری بھر کم عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں خاتون پولیس آفیسر بھی نظر آرہی تھی۔ اس عورت پر نظر پڑتے ہی انجیلا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”ماریا!“

”انجیلا!“ وہ عورت اسے دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”انجیلا! تم..... کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد تمہیں دیکھا ہے۔“

”ماریا ایک ہوم کیئر سروس چلاتی ہے۔“ انجیلا نے انیکا کو بتایا۔

”جانتی ہوں۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔“ انیکا اس عورت سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔

ماریا بولی۔ ”وہ پرانی بات ہے۔ اب میں سوشل سروس سے وابستہ ہوں۔“ اس نے تنقیدی انداز میں کچن کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”میں حیران ہوں کہ کوئی شخص اس گندگی میں کیسے رہ سکتا ہے؟“

”اس کا نام گستاو ہے۔“ انیکا احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

”جانتی ہوں۔“ ماریا نے کہا۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ کچھ لوگ اب بھی ایسی حالت میں رہ رہے ہیں۔“

اس نے جھک کر دیکھا۔ وہاں ایک مرا ہوا چوہا پڑا ہوا تھا۔ اس نے ناک سکیڑی اور بولی۔ ”ہمیں اس جگہ کو انسانوں کے رہنے کے قابل بنانا ہوگا۔“

انیکا کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، بالآخر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ پھٹ پڑی۔ ”ایک منٹ! کیا تم لوگوں نے گستاو سے بات کر لی ہے؟ اس نے ساری زندگی یہیں گزاری ہے۔ اس عمر میں اسے یہاں سے ہٹانا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ یہیں رہتے ہوئے اس کی وقتاً فوقتاً مدد کی جائے۔“

ماریا بولی۔ ”اسے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اچھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے تھوڑی بہت مدد ہی کافی ہے۔“

ماریا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس ماحول کو کسی طرح

بھی قابل قبول قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

”ہم اس کی تھوڑی سی مدد کر کے اس جگہ کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مقامی عورت دن میں ایک مرتبہ آ کر اس گھر کی صفائی اور دوسرے کام کر دے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ہمیں کسی ایسی عورت کو تلاش کرنا ہوگا جو قریب ہی رہتی ہو اور اسے اس کام کا تجربہ بھی ہو۔“

اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ دوسرا پولیس آفیسر پیٹرن بوڑھے گستاو کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی انجیلا چلائی۔ ”اس منحوس کو میری نظروں سے دور کر دو۔“ گستاو نے جب انجیلا کو اپنے کچن میں کھڑا دیکھا تو دروازے میں جم کر رہ گیا اور بولا۔ ”اس لکڑی چور کو میرے گھر سے باہر نکالو۔ میں ایسے لوگوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔“

”چپ ہو جاؤ۔“ انیکا چلائی۔ ”چپ ہو جاؤ اور ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔“

تھوڑی دیر کے لیے کچن میں خاموشی چھا گئی۔ اب سب کی نظریں انیکا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے بوڑھے گستاو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کرکس کا دن ہے۔ مجھے جہیں معلوم کہ تم خدا پر یقین رکھتے ہو یا نہیں لیکن آج کے دن کی رعایت سے اگر تم تھوڑی سی سمجھ بوجھ اور برداشت کا مظاہرہ کرو تو اس مسئلے کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ ورنہ تم دونوں ہی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ انجیلا بولی۔

”تمہیں ملازمت کی ضرورت ہے اور تمہارے پاس ہوم کیئر سروس کا تجربہ بھی ہے۔ تمہارا گھر بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تم سوشل سروس والوں کی شرائط پر پوری اترتی ہو۔ گستاو کی مدد کے لیے تم سے زیادہ مناسب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں تم دونوں ہی ایک دوسرے کا مسئلہ حل کر سکتے ہو۔“

ماریا اور دونوں پولیس آفیسرز نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ماریا بولی۔ ”اگر تم دونوں کو کوئی اعتراض نہیں تو میری طرف سے انجیلا آج اور ابھی سے اپنی ڈیوٹی سنبھال سکتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تینوں وہاں سے چل دیے۔ انیکا نے باری باری انجیلا اور گستاو کو دیکھا اور بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو اس بندوبست پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے کچن کا دروازہ بند کیا اور خود بھی باہر چلی آئی۔

مذہب شہر و سخن

✽ ایم عمران قاسم..... سہل کرسیداں
دل فقیری پہ اتر آئے تو
الجہ پڑتا ہے بادشاہوں سے
✽ وزیر محمد خان..... بل ہزارہ
بے اعتبار وقت پہ جھنجھلا کے رو پڑے
کھو کر کبھی اسے تو کبھی پاکے رو پڑے
خوشیاں ہمارے ساتھ کہاں مستقل رہیں
باہر کبھی بسے کبھی گھر آ کے رو پڑے
✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... خانوال
تیری کہانی ساری دنیا
میرا خلاصہ بس اک تو



✽ در شہوار پیرزادہ..... بہاولپور
بہر آئیں نہ آنکھیں تو اک بات کہوں
اب تم سے بچھڑنے کا امکان بہت ہے
✽ عتیق الرحمن..... فیصل آباد
اے کاش تجھے ایسا زخم جدلی دوں
جب میں کوئی جگے میں تجھ کو دکھائی دوں
✽ طالب حسین طلحہ..... نوسینٹرل جیل ملتان
طوفاں سے جو ڈرجائے وہ سمندر نہیں ہوتا
حالات سے جو گھبرائے وہ قلندر نہیں ہوتا
ہوتا ہے کوئی ایک ہی قسمت کا دہنی بھی
ہر کوئی مقدر کا سکندر نہیں ہوتا
✽ عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور
تو بڑا آدمی سونے کے پیالے تیرے
کچے برتن کی مگر اپنی کھنک ہوتی ہے
✽ محمد حنیف گبول..... نوسینٹرل جیل ملتان
وقت ہی بتائے گا کہ میں زندہ ہوں ابھی
کب مرتا ہے زندہ رہے جو کردار کے ساتھ
آدیکہ میرے دوست میں ہارا تو نہیں
میرا سر بھی تو پڑا ہے میری دستار کے ساتھ

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے تمہیں مجھ سے دشمنی ہو جائے
✽ ناصر علی صدیقی..... عباسیہ ٹاؤن، رحیم یار خان
میں آج اگر زد پہ ہوں خوش گماں نہ ہو
چراغ شب کے بجائیں گے ہوا کسی کی نہیں
✽ شمیم رضا..... میرپور خاص
وہ مسکرائیں تو ہنس ہنس پڑیں کئی موسم
وہ گنگنائے تو باد صبا ٹھہر جائے
وہ ہونٹ ہونٹوں پہ رکھ دے دم آخر
مجھے گمان ہے کہ آتی قضا ٹھہر جائے
✽ مہرین ناز..... حیدر آباد
عنوان زندگی پر بس اتنا ہی لکھ پائی ہوں
بہت کمزور رشتے تھے، بہت مضبوط لوگوں سے

✽ اعجاز احمد راحیل، ماہی..... حیدر آباد

ابھی نئی وادیوں، نئے منظروں میں رہ لو مگر میری جاں
یہ سارے اک اک کر کے جب تم کو چھوڑ جائیں تو لوٹ آنا
میری وہ باتیں تو جن پر بے اختیار ہنستا تھا کھلکھلا کر
چمکھڑنے والے میری وہ باتیں کبھی رلا میں تو لوٹ آنا

✽ محمد شہباز اکرم نوٹی..... پاک پتن شریف

ہمارے پاس رہے یا کنارہ کر جائے
اداسیوں کا کوئی تو چارہ کر جائے
ونشیں پی تو لیا ہے خوشی سے زہر فراق
خدا کرے اب طبیعت گوارا کر جائے

✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ

اب توجہ کا تقاضا ہی غلط ہے ان سے
دل کی قیمت تو فقط ایک نظر ہوتی ہے
یوں دھڑکتا ہے کسی وقت عدم دل میرا
جیسے ان کو میری حالت کی خبر ہوتی ہے

✽ رعنا رضوی..... ماچسٹر، یو کے

تیرا خلوص پرکھنے کا وقت ہی نہ ملا
کہ میں اسیر تیری نفرتوں کے جال میں تھا

✽ محمد امجد ریاض..... چیچو پٹنی، اقبال نگر

رسوا کرے گی یہ جو نئی چشم تر میں ہے
پی جاؤ اشک، بات ابھی گھر کی گھر میں ہے

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

لاکھ سہار کیے جائیں زمانے والے
آہی جاتے ہیں نیا شہر بسانے والے
اس کی زد پر وہ کبھی خود بھی تو آسکتے ہیں
یہ کہاں جانتے ہیں آگ لگانے والے

✽ محمد رشید سیال..... روہڑی، ضلع سکھر

میں اور اس کو بھولوں نا صبر کیسی بات کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی پیارا لگتا ہے

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال

جب کوئی شخص کہیں ذکر وفا کرتا ہے
دل کو اے دوست، تکلیف بڑی ہوتی ہے

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

نذر کرتا رہا میں پھول سے جذبات اُسے
جس نے پتھر کے کھلوں سے مجھے بہلایا

✽ شوکت علی..... لاہور

اس کے بعد اور ابھی سخت مقام آئے گا
حوصلہ یوں نہ گنوا یہ ترے کام آئے گا
اتنا مایوس نہ ہو گردش افلاک سے تو
صبح نکلا جو ستارہ سرشام آئے گا

✽ این اے میمن..... چوہڑ جہالی، بہاول

بدل گیا ہے سبھی کچھ اس ایک ساعت میں
ذرا سی دیر ہمیں ہوگئی تھی عجلت میں
محبت اپنے لیے جن کو منتخب کر لے
وہ لوگ مر کے بھی مرتے نہیں محبت میں

✽ عبدالرحمن..... میرپ

میں جنہیں کھینچتا رہتا ہوں یونہی کاغذ پر
ان لیکروں سے بھی چہرہ ابھر آتا ہے کوئی
آگ کی طرح بھڑکتی چلی جاتی ہے جو پیاس
ابر کی طرح برستا چلا جاتا ہے کوئی

✽ زرین نیازی..... راولپنڈی

کیسا بھید چھپا ہے آخر اس کے من کے اندر!
وحشت ہے سوچوں میں میری بھید یہ کیسے کھولوں
ہو جائے معلوم اگر اس ہار میں جیت ملے گی
جیون بھر میں زہر غموں کا اپنی ذات میں گھولوں

✽ منور علی..... گلشن حدید، کراچی

نظر جھکا کے وہ اپنی ادا یہ شرمائے
خدا کرے کہ یہ منظر یہیں ٹھہر جائے

✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

برا ہو عشق کا جس نے ہمیں برباد کر ڈالا
کوئی کہتا ہے سودا کی کوئی کہتا ہے دیوانہ

✽ مدحت..... کراچی

تیرے وجود کی خوشبو بسی ہے سانسوں میں
یہ اور بات ہے کہ نظروں سے دور رہتے ہو

✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص

تیرے کوچے میں تیری دید کی خاطر جاں
ہم کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

✽ ادیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

ضبط کرتا ہوں تو گھٹتا ہے نفس میں میرا دم
آہ کرتا ہوں تو صیاد خفا ہوتا ہے

✽ احمد حسن عرضی خان.....قبولہ باکی پاس
 میں تو سائل تھا صدا دے کر گزرتا تھا مجھے
 تو نے کیوں شام تک بند درپچہ نہ کیا
 ✽ ظہور احمد فاح.....نامعلوم
 میں روزِ ازل سے ہی پیاسا ہوں محبت کا
 فاح ذرا چاہت کی آغوش کشا کردو
 ✽ محمد سلطان.....فیصل آباد
 اور کوئی نہ ملا مونس و ہمدرد مجھے
 اپنا ہمراز وہی قلبِ حزین ہے کہ جو تھا
 ✽ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
 اس نے ہر چند کہ جلوہ نہ دکھایا ہرگز
 اپنا دلدار وہی پردہ نقیش ہے کہ جو تھا
 ✽ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانوال
 یونہی تو پلکوں پہ یاقوت نہیں آویزاں
 کچھ تو ہے جو میرے سینے میں پکھلتا ہوگا
 ✽ علی رضا.....کمالیہ شوگر ملز
 آنکھیں برس پڑیں گی پل میں
 چہرہ بہہ جائے گا جل میں
 ✽ اسد عباس.....سرگودھا
 یوں گرداب سے جب نکلے
 پھنس جاؤ گے اس دلدل میں
 ✽ احمد خان توحیدی.....پاکستان اسٹیل، کراچی
 یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ کتب کی کرامت تھی
 سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندگی
 ✽ قیصر علی گل، ساحل وٹو.....سینٹرل جیل ساہیوال
 سوچ جانی ہی نہیں تھم سے آگے
 تو میری آخری سرحد ہو جیسے
 ✽ محمد جاوید.....تحصیل علی پور
 میرے محبوب کے آرام میں خلل پڑتا ہے
 کلیں سے کہو دیر سے چٹکا کریں

✽ سکندر لودھی.....ملتان
 خوش منہی ہماری تھی کہ اپنا نہیں سمجھا
 ہم سے جو یہ کہتے تھے سمجھدار بہت ہو
 ✽ شعیب خان.....راولپنڈی
 ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
 کہ لہروں کی طرح ساحل سے نکلایا نہیں کرتے
 ✽ محمد طلحہ.....کراچی
 کیا پھر کوئی مظلوم یہاں مارا گیا ہے
 زنداں میں ہنگامہ ماتم ہے یہ کیسا
 ✽ محمد یونس چودھری.....سلطان پورہ، لاہور
 ضرورت توڑ دیتی ہے غرور بے نیازی کو
 نہ ہوتی کوئی مجبوری تو ہر بندہ خدا ہوتا
 ✽ نبیل احمد.....میانوالی
 مری سوچوں میں کیوں تالاب کی صورت وہ ٹھہرے ہیں
 ان آنکھوں سے بھی دریا بن کے بہہ جاتے تو اچھا تھا
 ✽ شازیہ کمال.....کراچی
 خوابوں کی راہ گزر میں، جذبوں کے امتحاں میں
 ہم جی رہے ہیں لوگو! اک شہر بدگماں میں
 ✽ لبنی علیم.....نارتھ کراچی
 تعبیر ڈوب جائے اشکِ رواں میں جس کی
 آنکھوں میں اپنی ایسے ہم خواب کیوں سجائیں
 ✽ محمد حذیفہ.....ناظم آباد، کراچی
 سنو اے دلربا ساتھی مجھے اک کام کرنا ہے
 سفر یہ زندگانی کا تمہارے نام کرنا ہے
 ✽ محمد زربان سلطان.....اردو بازار، کراچی
 نازاں ہے کس عیاری پر او جابر انسان
 پورب پچھم فتح کیے، نہ فتح کیے اذہان
 ✽ مونا رضوان.....کورنگی، کراچی
 دل فہم کر ہر دکھ سہ لے گا، ہے شرط تمہارا ساتھ ملے
 تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ

محفل شاعر و سخن

نام: _____
 پتا: _____

کوین

برائے

شمارہ

مئی

2015

کونر نے اپنے سر کو اتنی تیزی سے حرکت دی جیسے کسی نے اسے چھڑ مار دیا ہو۔ اس کے چاروں طرف لوگوں کا...
 جم غفیر تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جانب دیکھنے لگا جہاں سے وہ آواز آئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی موجودہ زندگی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ پہلے کا وقت قریب آ گیا ہے لیکن اس سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ بچار کرنا چاہ رہا تھا۔ ماضی میں وہ ایک غلطی کر چکا تھا جس کی کٹک آج بھی اسے بے چین کیے دیتی تھی لیکن اس آواز نے

بزدل

شیر عباس

وعدہ کرنا آسان تو ہے مگر... اس کا نبھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ وہ جو یک جان دو قالب تھے، ایک دوسرے کے بغیر چل نہیں پاتے تھے اچانک منزلوں کے تعین میں ان سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ ایسے اختلاف میں کیسے کوئی ایک ہی درپر دستک دے سکتا تھا۔ لہذا جب سفر کی سمت بدلی تو زندگی کا رخ بھی پہلے جیسا نہ رہا۔

قیامت کے عادی اور خواہشوں کے ایک غلام کا عبرت اثر ماجرا



اس کی سوچوں کا سلسلہ منقطع کر دیا جسے سن کر وہ بے چین ہو گیا تھا۔ اس کے بالکل قریب ہی کسی قہقہے کی گونج سنائی دی تھی۔

ایئرپورٹ کا شاندار اور مصروف لاؤنج مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد چھٹیاں گزارنے والے.... کاروباری لوگوں کی تھی۔ ان میں سے کچھ تیز قدموں سے چل رہے تھے اور چند ایک کرسیوں پر بیٹھے جہاز کی روانگی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اپنے سیل فون پر تیز تیز آواز میں باتیں کر رہا تھا جیسے سخت غصے میں ہو۔ اسی اثنا میں کسی جہاز کی آمد ہوئی اور اس کے مسافر بھی باہر آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاؤنج میں ہجوم بڑھ گیا۔ آنے والے مسافروں کو ایرپورٹ سے باہر جانے کی جلدی تھی۔ اس جھج و پکار میں وہ قہقہہ کہیں دب کر رہ گیا جس نے کونز کی سوچوں کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اس کے علاوہ شاید کسی اور نے اس قہقہے پر توجہ نہیں دی اور اسے بھی اس بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا کہ کرسی پر کھڑے ہو کر دیکھنے کی کوشش کرے کہ قہقہے کی آواز کہاں سے آئی تھی کیونکہ ایرپورٹ سیکیورٹی والے ایسی کوئی حرکت بالکل برداشت نہ کرتے۔

کچھ دیر بعد مجمع چھٹنا شروع ہو گیا۔ زیادہ تر مسافر اس زمین دوز ٹرین کی طرف بڑھ گئے جس کے ذریعے وہ گمشدہ سامان کے کاؤنٹر تک جاسکتے تھے۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اب اس نے فون بند کر کے لیپ ٹاپ کھول لیا تھا۔ کونز بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ کئی منٹ گزر گئے لیکن وہ آواز دوبارہ نہیں سنائی دی۔ کونز سوچنے لگا کہ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور مصروف راہداری کے پار کافی شاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ہی قہقہے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس بار اس میں خوشی اور حیرت کا تاثر نمایاں تھا۔ کونز کے ارد گرد کی بھیڑ چھٹ چکی تھی اور وہ بہ آسانی دور تک دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نظریں فوراً ہی اس جانب گئیں جہاں سے قہقہے کی آواز آئی تھی اور یوں لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو اور اس کے قدموں کے نیچے سے زمین ٹھسکتی جا رہی ہو۔ اس کا سانس گلے میں اٹک کر رہ گیا۔ اس نے یہ مشکل تمام اپنی حالت پر قابو پایا اور اپنی نظریں اس دہلی خلی نازک نقش و نگار والی عورت پر جمادیں جو ایک مرد پر جھکی ہوئی تھی اور وہ قریبی بار کے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس مرد کی پشت کونز کی طرف تھی اس

لے وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عورت اس مرد کے کان میں کچھ سرگوشیاں کر رہی ہو۔ اس نے مضبوطی سے مرد کی لمبیں کی آستین پکڑ رکھی تھی۔

وہ شخص بھی دبلا پتلا تھا اور اس کے بال کونز کی طرح گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا اور پھر گھوم کر برابر والے اسٹول پر بیٹھے ہوئے اپنے سامنے سے کچھ کہنے لگا۔ اس نے جانے ایسی کیا بات کہہ دی تھی کہ دونوں کھٹکھٹا کر ہنس پڑے۔ کونز کا جھس بڑھ گیا۔ اس نے تھوڑا سا آگے بڑھ کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کی لیکن لوگوں کی آوازوں کے شور کی وجہ سے اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

سیاہ بالوں والے شخص نے اس عورت سے کچھ دل لگی کرنے کے بعد ہارٹینڈر کوڈ رنگ کا آرڈر دے دیا۔

لوگوں کی بھیڑ میں مزید کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس عورت نے پلٹ کر کونز کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک دلچسپ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کی براؤن آنکھوں میں چمک ابھری جیسے وہ اسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کونز کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسل کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ عورت جینیفر تھی اور اسی کے قہقہے کچھ دیر پہلے فضا میں گونج رہے تھے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ جینیفر تو تیرہ سال پہلے مر چکی تھی۔

☆☆☆

وہ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ شاید پہلی نظر کی محبت اسی کو کہتے ہیں۔ کونز کی جونیئر کلاسیں شروع ہو چکی تھیں جبکہ وہ سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کونز اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اس کا بیشتر وقت جینیفر کے ساتھ ہی گزرنے لگا۔ وہ دونوں گھنٹوں لائبریری میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ جینیفر کی آنکھوں میں جادو تھا۔ وہ جب بولتی تو اس کی آواز کونز کی سماعت میں رس گھولنے لگتی۔ وہ قہقہہ لگاتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے فضا میں جلتی بج بج اٹھے ہوں۔ اب اسے جینیفر کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس کی بھوک پیاس سب ختم ہو چکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ہر وقت جینیفر کا مسکراتا چہرہ گھومتا رہتا تھا۔

کلاسیں چھوڑنے کی وجہ سے اس کے نمبر کم آئے۔ یہ صورت حال اس کے والدین کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ فون کرتے تو کونز فون نہیں اٹھاتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں بھی وہ گھر نہیں گیا بلکہ اس نے ایک عارضی ملازمت کر لی تاکہ وہ اور جینیفر مل کر اپنا گھر سیٹ کر سکیں۔ انہوں نے چھوٹا سا

ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا جس کے اطراف کے فلیٹوں میں طالب علموں، عارضی قیام کرنے والوں اور... بے روزگاروں کا جھکٹا لگا رہتا تھا۔ اس اپارٹمنٹ میں ایک ہی کھڑکی تھی جس سے سورج کی روشنی گرم اور پڑوسیوں کے شور و غل اور قہقہوں کی آوازیں زیادہ آیا کرتی تھیں۔

کونز کو اس ماحول سے وحشت ہونے لگتی۔ وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ جب باہر سے آنے والی آوازوں کا شور سن کر وہ بیزار ہونے لگتا تو جینیفر اسے اپنی ہانہوں میں سیٹ لیتی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ کونز کا دھیان بنا سکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی سب کچھ بھلا کر اس کی حشر سامانیوں میں کھو جاتا اور جینیفر کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔

اگلا سال کونز کے لیے اور بھی برا ثابت ہوا۔ اب وہ صرف وہی کلاسیں لیتا جو بہت ضروری ہوتیں اور بغض اوقات انہیں بھی چھوڑ دیتا۔ اس کے نمبر خطرناک حد تک کم ہو رہے تھے جس پر ڈین کو اسے وارننگ جاری کرنا پڑی۔ اس کی ایک نقل اس کے والدین کو بھی بھیجی گئی جسے دیکھ کر اس کا باپ چراغ پا ہو گیا اور اس نے کونز کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دی اور جینی سے چھٹکارا حاصل نہ کیا تو وہ اسے پیسے بھیجنا بند کر دے گا۔ کونز پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت بھی جینی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ادھر جینی کو بھی پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کونز کو بتایا کہ وہ موسم بہار کے سیشن میں داخلہ نہیں لے رہی۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں اور وہ جو چاہتی ہے اسے مل جاتا ہے۔ اس لیے وہ پڑھائی میں وقت ضائع کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔

اس کے باپ نے بھی محض ڈرانے کے لیے ہی دھمکی دی تھی جب فیس دینے کا وقت آیا تو اس نے خاموشی سے کونز کو پیسے بھیج دیے۔ اس کا باپ سمجھ رہا تھا کہ یہ آخری سمسٹر ہے جس میں ہے کہ کونز سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے... مگر رجسٹریشن مکمل کر لے لیکن جینی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ کونز پر ناراض ہوئی اور الزام لگایا کہ اس میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس نے کونز کو چیلنج کیا کہ اگر اس میں ہمت ہے تو وہ اپنے والدین اور اسکول دونوں کو چھوڑ دے جیسا کہ وہ کئی ماہ پہلے کر چکی ہے۔ پہلی بار کونز کو معلوم ہوا کہ اسی وجہ سے جینی نے اپنے والدین سے بھی بات چیت بند کر رکھی ہے۔

سمسٹر کے آغاز میں ہی کونز کو مسلسل غیر حاضر رہنے کی بنا پر ایک کلاس سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ ایک اختیاری

مضمون تھا جس کی تیاری موسم گرم میں بھی کی جاسکتی تھی لیکن وہ یہ بھول گیا کہ اس مضمون کو پہلے مرحلے میں پاس کرنے کے لیے منتخب کر چکا ہے اور اس کے بغیر وہ دوسرے مضامین کا امتحان نہیں دے سکتا چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ فاسٹ امتحان ہونے تک اسے جینی سے الگ رہنا ہوگا ورنہ وہ قیامت تک بھی گریجویشن نہیں کر سکتا۔

ایک رات جب جینی کیمپس اسٹیک بار میں اپنی ڈیوٹی پر تھی، کونز نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اس چھوٹے سے دڑباز نما اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ رات اس نے اپنے پرانے دوست کے پاس گزاری جو اس کے آبائی قصبے میں رہتا تھا۔ والدین اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اسے سمجھایا کہ بہتر مستقبل کی خاطر وہ جینی سے دور ہو جائے۔ کونز کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ جینی کے ساتھ رہ کر اسے تکلیف اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں ملا اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر ملنے والے عیش و آرام سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جینی سے فیصلہ کن بات کرنے کے لیے اس دڑباز نما اپارٹمنٹ سے متصل میدان کو منتخب کیا جو چاروں طرف سے فلیٹوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اور ان کی موجودگی میں جینی کے لیے کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا ممکن نہ تھا۔

اس نے رک رک کر بڑے درد انگیز انداز میں جینی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تعلق ان دونوں میں سے کسی کے لیے بھی سودمند نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی جینی بری طرح بھڑک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی تقریر ختم ہوتی، جینی کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور کونز کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ جینی نے اسے بزدل ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ وہ اپنے تہمتاتے ہوئے چہرے اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے چل دی۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ اب ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے نہیں کہ یہ فیصلہ کونز نے کیا تھا بلکہ خود اسے بھی احساس ہو گیا ہے کہ وہ ایسے شخص سے محبت نہیں کر سکتی جسے اپنے بازوؤں پر بھروسہ نہ ہو۔ کونز کو امید نہیں تھی کہ معاملہ اتنی آسانی سے نمٹ جائے گا لیکن وہ غلط سوچ رہا تھا۔ یہ معاملہ اتنی جلدی کیسے ختم ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن وہ کلاس ختم کر کے باہر آیا تو جینی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے روتے ہوئے اپنی نازک ہانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ اس نے گزشتہ روز کے رویے پر معافی مانگی اور گھر چلنے پر اصرار

کرنے لگی لیکن کونز نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے جینی کو سمجھایا کہ انہیں سوچنے بھننے کے لیے کچھ وقت چاہیے شاید اس کے بعد انہیں کوئی بہتر فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

جینی نے اس کے سینے پر مکتا مارتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو مجھے مار ڈالو۔“

کونز نے اسے ہلکے سے دھکا دیا تو وہ گھاس پر جا گری۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کالج میں اس کا تماشا بنے اور بات اس کے گھر والوں تک پہنچ جائے چنانچہ وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کر وہاں سے چل دیا۔ جینی کی آنکھیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں لیکن اس نے اپنے کان بند کر لیے۔

اگلے دو ہفتوں تک اس نے جینی کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ ان دونوں کے درمیان سیاہ رات جیسی خاموشی حائل ہو چکی تھی۔ ایسی خاموشی جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ یہ خاموشی اس وقت ختم ہوئی جب اسے کیسپس پولیس کی جانب سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ دوسری جانب سے کوئی کہہ رہا تھا۔ ”کیا تم مس جینیفر آرمسٹرانگ کے ساتھ ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہو؟“

کونز کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کہیں جینی نے اس کے خلاف کوئی جھوٹی رپورٹ تو درج نہیں کروادی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”پہلے رہتا تھا لیکن اب نہیں۔ ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔“

”لیکن کرائے نامے میں تو ابھی تک تمہارا نام موجود ہے۔“ آفیسر نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

اب کونز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جب وہ اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ چکا تھا تو اسے یہ اطلاع متعلقہ لوگوں کو دے دینی چاہیے تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے حواس قابو میں کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”بات کیا ہے؟“

”وہ کسی فون کا جواب نہیں دے رہی اور نہ ہی دروازہ کھول رہی ہے۔ اس کے والدین نے پولیس کو فون کیا ہے کہ اسے چیک کریں۔ ہم صرف ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ کیا تم انہیں اپارٹمنٹ کے اندر جانے کی اجازت دیتے ہو؟“

خطرے کی گھنٹیاں جو کئی ماہ سے کونز کے دماغ میں بج رہی تھیں، اب ایک سائرن کی شکل میں گونجنے لگیں۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔“

وہ منظر کونز کی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بستر پر خون پھیلا ہوا تھا اور جینی ایک

شوہن کی طرح اس کے وسط میں لیٹی ہوئی تھی۔ کونز کو اپنے تعلق کے اس بھیانک انجام کی توقع نہیں تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جینی کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھتا رہا۔ ایک پولیس والے نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا اور خود معاملے کی نوعیت جاننے کے لیے اندر چلا گیا۔

وہ جینی کے والدین کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ان کے ہمراہ اسپتال نہیں گیا۔ بعد میں جب اس نے فون کر کے جینی کی خیریت معلوم کرنا چاہی تو ڈیوٹی پر موجود نرس نے خالص پیشہ ورانہ اور روکھے انداز میں اسے بتایا کہ وہ ایک غیر متعلقہ شخص کو جینی کی صحت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دے سکتی۔

دوسرے روز کیسپس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جینی کی موت واقع ہو چکی ہے اور والدین اس کی لاش ادھائی گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ خوفزدہ ہو گیا کیونکہ جینی لہو لہان حالت میں اس اپارٹمنٹ میں پائی گئی تھی جو اس نے کرائے پر لیا تھا۔ اس لیے پولیس اس سے بھی پوچھ گچھ کرتی اور عین ممکن تھا کہ اس کے والدین جینی کی موت کا ذمے دار اسے ٹھہراتے لہذا اس نے جینی کی تدفین میں شرکت کرنے یا اس کے والدین سے تعزیت کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ شاید یہ اس کے دل کا چور تھا جو اسے سامنے آنے سے روک رہا تھا۔ اسے جینی کی موت کا افسوس ضرور ہوا تھا لیکن یہ ایک وقتی کیفیت تھی۔ بہت جلد وہ پہلے کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا اور اسے یاد بھی نہیں رہا کہ اس کی زندگی میں جینی نام کی کوئی لڑکی آئی تھی۔

☆☆☆

کونز لوگوں کو ہجوم میں سے راستہ بتاتا ہوا بار کے دروازے تک پہنچ گیا لیکن جینی کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ جن دو آدمیوں سے باتیں کر رہی تھی، ان میں سے ایک نے کونز پر اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ کونز اس سے جینی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ کسی نے اس کی آستین کو پکڑ رکھا ہے پھر اس کی سماعت سے ایک گھبراہٹ ہوئی آواز نکلائی۔ ”کونز!“

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ جینی تھی جس نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ کونز نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ لاؤنج میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ البتہ ان میں سے کئی ایک ان کے گرد کھڑے ہو کر کسی نئے تماشے کے شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جینی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے

تھے لیکن بظاہر اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ پہلے کی طرح اب بھی اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے البتہ آنکھوں کے نیچے گہری سیاہ لکیریں نمایاں ہو گئی تھیں۔ یہ جینی ہی تھی، اتنے عرصے بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر کونز بھی جذباتی ہو گیا۔

”کونز!“ اس نے سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔ ”یہ تم ہی ہوتا؟ میں تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی۔“

کونز نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”جینی!“

وہ دونوں آدمی بھی مڑ کر انہیں دیکھنے لگے جن سے کچھ دیر پہلے وہ بار میں باتیں کر رہی تھی۔ ان میں سے گہرے سیاہ بالوں والا بناوٹی انداز میں مسکرایا پھر اپنے ساتھی سے کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں قہقہہ لگانے لگے اور انہوں نے ایک بار پھر مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ کونز کن آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے لیے کوئی نئی پریشانی پیدا کرنا نہیں چاہ رہا تھا اور اس کی نگاہوں کا مرکز صرف جینی تھی۔

ایک دوسرے سے چنے ہوئے وہ خالی کرسیوں کی تلاش میں گیٹ کی طرف بڑھے تاکہ سکون سے بیٹھ کر بات کر سکیں۔ کونز جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں تبدیلی ضروری ہے۔ اسے یہ موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ اب وہ جینی کو نہیں کھوٹا چاہتا تھا جو معجزانہ طور پر اسے مل گئی تھی۔ اس کی ازدواجی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے ہمیشہ یہ شبہ ہی رہا کہ وہ اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا ہے لیکن اب اس کے دل یا دماغ میں کوئی شک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ جینی سے محبت کرتا تھا اور اس سے ملنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ہی جینی سے محبت کرتا آ رہا ہے۔

”کونز!“ وہ چپکھاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ تم بالآخر مل ہی گئے۔“

”جینی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہی ہو۔ اتنا عرصہ میں تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا۔“ اس سفید جھوٹ پر اسے کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ جینی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بتایا گیا تھا کہ تم مر چکی ہو۔“

جینی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ گوکہ میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

”میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ جہاں جہاں میں جاسکتی تھی، وہاں تمہیں ہی ڈھونڈتی رہی۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں جینی۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہارے پاس میرا فون نمبر تھا۔ تم مجھے فون کر سکتی تھیں۔“ یہ سنتے ہی جینی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”اوہ، مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ شاید تمہارا نمبر مجھ سے گم ہو گیا تھا۔ میں اپنے طور پر ہی تمہیں ڈھونڈتی رہی۔“

کونز نے بات بتاتے ہوئے کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم مل گئی ہو اور ہم ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے۔“

اسے خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ بول گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جینی کی شادی ہو گئی ہو۔ اس نے دیکھا کہ جینی نے شادی کی انگلی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور بھی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی اہم شخص.....“

”صرف تم۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں۔“

کونز کا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ائر پورٹ کے لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان ہوا کہ اس کی پرواز روانگی کے لیے تیار ہے لہذا تمام مسافر یورڈ تک کارڈ حاصل کر لیں۔

”جنہم میں جاؤ۔“ اس نے ہنکارا بھرا پھر وہ اچانک ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اب بھی جینی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا میرا جہاز روانگی کے لیے تیار ہے۔ تم مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اگلی پرواز میں جگہ مل جائے۔ اس طرح ہمیں مستقبل کا پروگرام طے کرنے کے لیے کچھ وقت مل جائے گا۔“

جینی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں وہ دونوں دوبارہ نہ بچھڑ جائیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”تم فکر مت کرو۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ بس یہیں رک کر میرا انتظار کرنا۔“

یہ کہہ کر اس نے جینی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جیسے ہی وہ آگے کی جانب بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی انہی دونوں آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا جو کچھ دیر پہلے جینی سے فکرٹ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کونز کی جانب

اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں گیٹ پر کھڑا دربان اسے اندر جانے کا راستہ دے چکا تھا۔ کونز نے پلٹ کر جینی کی طرف دیکھا اور بہ آواز بلند بولا۔ ”وہیں رہنا، میں ابھی واپس آ رہا ہوں۔“

نکٹ تبدیل کر دانے میں اسے توقع سے زیادہ دیر لگ گئی۔ اس دوران وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا لیکن وہ اس جگہ سے کافی دور تھا جہاں جینی کو چھوڑ کر آیا تھا اور درمیان میں کئی لوگوں کے آ جانے سے وہ اسے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ نکٹ تبدیل ہو گئے تو وہ تیزی سے پلٹا جہاں جینی کو چھوڑ کر گیا تھا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ کونز کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ کیا واقعی جینی اسے ملی تھی یا یہ اس کا وہم تھا؟ کیا اسے اس ملاقات کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھلا دینا چاہیے؟ اس نے ایک گہری سانس لے کر ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سوچنے لگا کہ اسے فضول دماغوں کو دل میں جگہ دینے کے بجائے اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ ممکن ہے کہ جینی اس ہجوم میں کہیں کم ہو گئی ہو۔

اچانک ہی جینی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اسی کا نام لے کر پکار رہی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والے اعلانات، لوگوں کے قدموں کی آواز اور مسافروں کی آوازوں کے شور کے باوجود جینی کی آواز اس تک پہنچ گئی۔ اس نے اس جانب مڑ کر دیکھا، جینی اسے نظر آ گئی۔ وہ فوراً ہی اس کی جانب لپکا۔ اس ہجوم میں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ جینی کسی دوسری جانب نہ چلی جائے لہذا چلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ جینی کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اس نے کسی اور شخص کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اسے دیکھتے ہی وہ خوشی سے چلائی۔ ”کونز!“

اس کی آواز سن کر وہ رک گیا اور بولا۔ ”جینی! سب کچھ ٹھیک ہے نا؟“

دبے پتلے سیاہ بالوں والے شخص نے کونز کو دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم اس عورت کو جانتے ہو؟“

اس نے جینی کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”شاید اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے، حالانکہ میں وہ نہیں ہوں جو یہ سمجھ رہی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اچانک ہی پلٹا اور تیزی سے ہجوم میں گم ہو گیا۔

جینی اب ہلکے ہلکے سسکیاں لے رہی تھی۔ کونز نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جینی نے پلٹ کر

اسے دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم ہی بدل گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو غائب ہو گئے اور چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ وہ چڑیا کی طرح چہچہاتے ہوئے بولی۔ ”کونز!“ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بار بار اس کا نام دہرا رہی تھی، اس نے جینی کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور بولا۔ ”میں نے تمہیں اسی جگہ رکنے کے لیے کہا تھا پھر وہاں سے کیوں چلی آئیں؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اچانک ہی وہ بوڑھا آدمی سامنے آ گیا جو کچھ دیر پہلے ان دونوں آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اس بوڑھے کو دیکھتے ہی جینی کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور چند منٹ پہلے جو رونق نظر آرہی تھی، وہ غائب ہو گئی۔ وہ جھکے جھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے بھی اس کے برابر والی نشست سنبھال لی اور اس کے ہاتھوں کو پیار سے تھپتھپانے لگا۔

کونز حیرت سے اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شخص کون ہے اور جینی کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے کیوں پیش آ رہا ہے۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ”معاف کرنا۔“

بوڑھے آدمی نے کونز کو غور سے دیکھا۔ اسے شاید کونز کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟“

”ہاں، یہ میری بیٹی ہے۔“ بوڑھے کے چہرے پر مختلف نوعیت کے تاثرات نمودار ہوئے جن میں جذبات، غصہ، افسوس اور جھکن سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ”معافی چاہتا ہوں۔ اس نے تمہیں جھگ تو نہیں کیا؟“

کونز نے غیر یقینی انداز میں سر ہلایا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی جینی کے باپ سے اس کا سامنا ہو جائے گا۔ ان دونوں کی شکلوں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ اس لیے اسے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ بوڑھا اس کا باپ ہے لیکن جینی اسے دیکھ کر ہم کیوں گئی تھی؟ اس کا چہرہ پیلا کیوں پڑ گیا تھا؟ کہیں وہ اپنے باپ سے جھٹکارا حاصل کرنا تو نہیں چاہ رہی۔ اس نے ایک بار پھر غیر یقینی انداز میں بوڑھے کی طرف دیکھا۔

”یہ کچھ دیر پہلے مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”جب سے اس کی ماں مری ہے، میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اتنے بڑے ہجوم میں اسے تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ اسی لیے مجھے

خوش کن تحریروں سے آراستہ اور گل رنگ
سلسلوں سے مزین اپریل 2015ء کا سالگرہ نمبر

پاکستان

کراچی ماہنامہ

نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے خوب صورت ناول

زاہدہ پروین کا دلکش مٹی ناول جنگل کا پھول اپنے اختتام کی طرف گامزن

زمر نعیم نے اسیر وفا میں پھیلائے خوشیوں کے رنگ

میں شانزے ہوں رفعت سراج کی ایک اور پُر لطف تحریر

ہردلعزیز رائٹر اور پاکیزہ کی دیرینہ پرستار **عنیزہ سید** نے بخشی ہماری بزم کو نئی رونق

شمع ہدایت میں پڑھے اختر شجاعت کا ایک پُر فکر و پُر روح مضمون

اس کے ساتھ ساتھ رضوانہ پرنس، صبیحہ شاد شیریں حیدر،

نگہت اعظمی، عظمیٰ افتخار، قرۃ العین خرم،

دیگر کہنے شق رائٹرز کی خصوصی تحریریں بطور خاص سالگرہ نمبر کے لیے

حسب معمول مختلف دلچسپ و دلکش مستقل سلسلوں کا پُرسرت و فریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

اس کو ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اگر اس نے تمہیں پریشان کیا ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی پشت کرسی سے ٹکادی۔

"تم کہیں جا رہے ہو؟" کونز نے پوچھا۔ یہ ایک احمقانہ سوال تھا۔ ظاہر ہے کہ بوڑھا اپنی بیٹی کو لے کر اتر پورٹ گھومنے تو نہیں آیا ہوگا لیکن کونز ان کی منزل مقصود کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔

"کنساس....." بوڑھے نے جواب دیا۔ "وہاں اس کا بھائی رہتا ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اس کی مستقل نگرانی نہیں کر سکتا۔" "اچھا۔" کونز نے کہا۔ بوڑھے سے باتیں کرنے کے بعد یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اسے نہیں پہچان سکا ہے۔ ویسے وہ بھی جینی کے باپ سے نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے جینی کے پاس کونز کی کوئی تصویر دیکھی ہو لیکن اس وقت وہ اس کے ساتھ بالکل اجنبیوں کی طرح پیش آرہا تھا۔ اس نے جینی کے زرد اور ستے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا اور بوڑھے کو کریدنے کی خاطر بولا۔ "کونز کون ہے جسے یہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔"

بوڑھے کے چہرے پر سختی آگئی اور وہ تیز آواز میں بولا۔ "اسی نے اسے اس حال کو پہنچایا۔ یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ جس سیاہ بالوں والے اور کونز کی عمر سے ملتی جلتی شخصیت کو دیکھ لیتی ہے، اسے ہی کونز سمجھ لیتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں بھی کونز ہی سمجھ رہی ہے۔"

کونز کے سینے میں ایک پھانس سی چھ گئی اور وہ تاسف آمیز انداز میں بولا۔ "کیا میں بوجھ سکتا ہوں کہ یہ کونز کون ہے اور تمہاری بیٹی سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور جینی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "یہ کالج میں اس کے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ اس نے میری بیٹی کو محبت کا جھانسا دیا اور یہ اس کے جال میں پھنس گئی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ اپارٹمنٹ میں رہنے لگی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ جوان لڑکیوں کو درغلانا کتنا آسان ہوتا ہے اور وہ پیار میں پاگل ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں۔ اپنا دل، جسم اور دولت سب کچھ۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "وہ لڑکا اپنے والدین کے دباؤ میں آکر اسے چھوڑ کر چلا گیا اور پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی۔ یہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور اس نے جذبات میں آکر اپنی

کھائیاں کاٹ ڈالیں۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ آج کے دور میں ایسا ممکن ہے لیکن ہم کیسے ٹھوٹے ہیں اور ہماری لڑکیاں صرف ایک بار کسی مرد سے محبت کرتی ہیں۔"

کونز نے تائید میں سر ہلایا جیسے وہ اس کی کہی ہوئی ہر بات سے متفق ہو۔

"پولیس والے اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن نہ جانے جینی کو کس کی بددعا لگ گئی کہ اس نے دوبارہ کسی مرد کا نام نہیں لیا اور آج تک اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔"

"جینی کے پاس اس کا فون نمبر یا ایڈریس نہیں تھا؟" "نہیں۔ وہ لڑکا اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا، شاید اسی لیے اس نے جینی کو اپنا پتا اور فون نمبر نہیں دیا۔ وہ تو اسے اسپتال دیکھنے بھی نہیں آیا۔"

کونز کو یقین ہو گیا کہ بوڑھے کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیونکہ وہ جینی کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا لیکن اسپتال والوں نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کسی غیر متعلقہ شخص کو مریضہ کی صحت کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتے تھے۔

بوڑھے نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر اچانک ہی وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو اس لڑکے کو جان سے مار دیتا۔ اس نے میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

"ہاں۔" کونز نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔"

"پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک عارضی کیفیت ہے۔" بوڑھے نے کہا۔ "وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اسے بھول جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس کی جدائی میں نیم پاگل ہو چکی ہے اور اس کی نظریں ہر وقت کونز کو ڈھونڈتی رہتی ہیں اور یہ اس سے مشابہت رکھنے والے ہر شخص کو کونز سمجھنے لگتی ہے۔"

جینی کے باپ نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جینی کو بھی ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا اور بولا۔ "بورڈنگ میں بیس منٹ رہ گئے ہیں اور ہمارا گیٹ بھی ٹرمینل کی دوسری طرف ہے۔ جینی کی وجہ سے تمہیں جو زحمت ہوئی اس کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں۔"

کونز انہیں راستہ دینے کے لیے پیچھے ہٹ گیا۔ جب جینی اس کے سامنے آئی تو وہ فرش پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "امید ہے کہ تمہارا سفر اچھا گزرے گا۔"

الجہن

بیٹا باپ سے۔ ”ڈیڈی! آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟“

باپ۔ ”نیویارک میں۔“

بیٹا۔ ”اور مئی کہاں پیدا ہوئی تھیں؟“

باپ۔ ”واشنگٹن میں۔“

بیٹا۔ ”اور میں کہاں پیدا ہوا تھا؟“

باپ۔ ”ہوائی میں۔“

بیٹا حیرانی سے۔ ”تو ہم تینوں ایک جگہ کیسے اکٹھے ہو گئے؟“

مرسلہ۔ عزیز ناصر، کراچی

زحمت

جنازے کے ساتھ دو نہایت معمر افراد قبرستان پہنچے۔ تدفین سے فارغ ہو کر ایک صاحب نے دوسرے سے پوچھا۔ ”خیر سے عمر عزیز کیا ہوگی؟“

”یہی کوئی ننانوے سال۔“

”کیا خیال ہے کہ گھر جانے کی زحمت کی جائے یا نہیں؟“ دوسرے صاحب بولے۔

مرسلہ۔ عبد الجبار روی انصاری، چوہنگ ملتان روڈ لاہور

کونز نے ایک نگاہ اپنے نکلٹ اور پاس پر ڈالی۔ ابھی اس کی فلائٹ میں چھ گھنٹے باقی تھے۔ جس کی خاطر اس نے نکلٹ تبدیل کر دیا تھا، وہ جا چکی تھی۔ اب وہ ان چھ گھنٹوں میں کیا کرے؟ اس نے گھر واپس جانے اور ان لوگوں کے درمیان وقت گزارنے کے بارے میں سوچا جو اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ جینی کو تو کھو چکا تھا لیکن انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

ایک بار پھر اس کے کانوں میں وہی قہقہہ گونجا جس نے اس کا صبر و قرار چھین لیا تھا لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے اپنے قدم لاؤنج کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا دیے جہاں سے اسے گھر جانے کے لیے ٹیکسی مل سکتی تھی۔ جب وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا تو اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی سرگوشی ابھری۔ ”بزدل.....!“ اس نے سر کو زور سے جھٹک دیا اور سامنے کھڑی ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

جینی کے قدم زمین پر گر گئے۔ اس نے بے چین ہو کر کونز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک فریاد تھی جیسے کہہ رہی ہو، مجھے روک لو۔ اس نے باپ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کونز کی طرف بڑھی لیکن پوڑھے نے لپک کر اسے دوبارہ پکڑ لیا اور اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ”چلو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جینی کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔ کونز بے بسی سے جینی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جو اپنے باپ کے بازوؤں میں جھول رہی تھی اور دائیں بائیں نظریں گھما کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اب یہ تلاش کبھی ختم نہیں ہوگی۔

کونز کا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر جینی کا راستہ روک لے اور اس کے باپ کو بتا دے کہ وہ ہی کونز ہے جس کی وجہ سے اس کی بیٹی کی زندگی تباہ ہوئی اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ اس لیے ہر سیاہ بالوں والے شخص کو اپنا محبوب سمجھ کر اس کی جانب لپکتی ہے لیکن اب وہ اپنی غلطی کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہے۔ جینی جیسی بھی ہے، اسے قبول ہے۔ ایک بار اسے یقین آ جائے کہ وہی اس کا کونز ہے تو اس کی ذہنی کیفیت اعتدال پر آ جائے گی لیکن یہاں بھی اس کی فطری بزدلی آڑے آگئی۔ وہ کوئی ایسا جذباتی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جس میں اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔ چند منٹ پہلے جینی کے باپ نے اس کے بارے میں جن عزائم کا اظہار کیا تھا، انہیں سننے کے بعد تو اس بات کی بالکل بھی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے ظاہر کر دے۔ جینی کا باپ اس کے خون کا پیاسا تھا اور کونز ایک نیم پاگل اور جذباتی لڑکی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

جینی کے چہرے پر امید و یاس کی پرچھائیاں دیکھ کر اسے اپنی بیوی اور بیٹیاں یاد آنے لگیں جو اس کے لیے اجنبی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ جب کبھی کسی کاروباری دورے سے واپس آتا تو اس کے سرد روپے اور بے رخی کو محسوس کر کے ان کے چہرے بچھ جاتے۔ شاید یہ اس کے ماضی کی چھین تھی جس نے بھی اسے اپنی بیوی اور بچوں سے قریب نہیں ہونے دیا۔ جینی سے بچھڑنے کی خلش اسے ہمیشہ تر پاتی رہی۔ کاش وہ بزدل نہ ہوتا۔ اس میں اپنے باپ کی دھمکیوں کا سامنا کرنے کی ہمت ہوتی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی کو لات مار کر اپنی محبت کو حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ غلطی اس کی تھی لیکن سزا جینی کو ملی اور اب یہی کچھ وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کر رہا تھا جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔



محی الدین نواب

سترھویں قسط

WWW.PAKSOCIETY.COM

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو... اسے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پروردگار کی روایت... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قیوسِ قریم کی رنگ... درخت زمین کی پرتیں ہو یا بلند آسمان کے سداوت پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا بادوباروں کی موفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور... کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی چمک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ دکھادی ہیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجیب کھیل ہے کہ نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک لاکھ روپے کی چھاؤں کی روپے کی قیمت کی مقدار، جو خاتون اور بچوں کا ایک گول روبا سلسلہ





یہ داستان ہے دور جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی سنگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا بھرا اور چاہی نئی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا ڈیرا حشمت جلالی ایک بد نیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی سنگی تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا ڈیرا حشمت کی غشی گیری کرتا تھا۔ ڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جامدادی بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ ملی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضامنی علاقے میں گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاہی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس مانیکیون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کر لی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے عی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے سخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشت خور بن گیا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکرٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے سرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جیم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران جل بسی لیکن ڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجہ جانتی تھی لیکن مراد سے تالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے انوار کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سبکی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، ہیرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے بھانسا دیتے ہوئے اس کے قہقہے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے قتل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاہی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھاو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت مٹ جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے راز داری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسائی کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے گا۔ راجہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ IMET فیسر بن گئی تھی مراد نے سر جری کے ماہر ڈاکٹر ٹینیسن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب یونا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بونا دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک آنکھ لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی تاہم اس نے ڈاکٹر یکر جزل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹینیسن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتا دیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں سکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے سکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ لندن ایئر پورٹ پر سکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ ادھر مراد اور عبداللہ پاکستان پہنچ گئے اور عبداللہ کو مراد بتا دینے کے لیے ڈراما لے ہوئے لگا۔

کے سامنے آ گیا ہوں۔ مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہے گا کہ میں وہی گن چلانے والا ایک مفرور مجرم ہوں۔“

وہ تمام افراد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں سچ سچ مجرموں کی دنیا سے نکل آیا ہوں۔ جن دشمنوں نے مجھے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا تھا اب وہ مجھے مراد علی منلی تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ میں جرائم کی دنیا سے چپ چاپ نکل آیا ہوں۔ اب آپ مجھے کیا کہیں گے؟“

محبوب نے کہا۔ ”تم پر قیامت گزر گئی۔ اب اس بحث کو جانے دو کہ تم مجرم اور گناہ گار ہو یا نہیں؟“

ماروی نے سمیرا سے الگ ہو کر محبوب سے کہا۔ ”پھر بھی آپ اپنی زبان سے تسلیم کریں کہ یہ نہ گن اٹھانے کے قابل ہے اور نہ ہی اب مجرم رہا ہے۔“

اس نے کبڑی کو دیکھ کر کہا۔ ”بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جرائم کی دلدل سے نکل آیا ہے۔“

”آپ یہ بھی تسلیم کریں کہ مرینہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اب یہ گناہ گار نہیں ہے۔“

محبوب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”ماروی! ہم دونوں تمہارے طلب گار ہیں۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ ہم میں سے جو پارسا ہوگا، تم اسی کی منکوحہ بنو گی۔“

وہ بڑے فخر سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”یہ سب جانتے ہیں کہ میں بے داغ ہوں۔ مراد دو بار داغ دار ہو چکا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ ہم سب اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ مراد کے گناہوں کو درگزر کر سکتے ہیں لیکن۔۔۔“

وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ”لیکن تمہیں منکوحہ بنانے کے سوال پر میں ہی پارسا کہلاؤں گا۔“

ماروی نے کہا۔ ”ابھی آپ نکاح کی بات نہ کریں۔ مراد پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میں ایسے میں شادی کی خوشیاں نہیں مناؤں گی۔“

وہ یلکھت اچھل پڑا۔ چیختے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں۔۔۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہا ہوں۔ اب نکاح کو پانچ دن رہ گئے ہیں تو تم وعدے سے مکر رہی ہو؟“

اس نے التجا کی۔ ”پلیز میرے حالات کو سمجھیں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔ مراد کے ساتھ جو ہو چکا ہے، اس کا افسوس ہم سب کو ہے اور تمام عمر رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کھانا پینا، ہنسا بولنا اور خوشیاں منانا چھوڑ دیں۔ جو لوگ عادات بات بات پر روتے ہیں، وہ بھی خوشی کے وقت خوشیاں مناتے ہیں۔“

کیا خوب تماشا تھا۔ تماشا کرنے والوں نے دیکھنے والوں کو بھی قائل کر دیا تھا کہ وہ یونانی مراد ہے۔

نخشا شہزاد ماروی کے بازوؤں میں تھا۔ وہ اسے کبڑی کی گود میں دیتے ہوئے بولی۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے۔ تم ہی اس کے باپ ہو۔“

کبڑی، شہزاد کو سینے سے لگائے رونے لگا۔ ماروی دوڑتی ہوئی آ کر منی سے لپٹ گئی۔ ”ہائے چاچی! یہ مراد کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا ہے چاچی! اسے پہلے کی طرح بتادو، بولو چاچی! کیا یہ پہلے جیسا نہیں ہو سکے گا؟“

منی نے اسے تھپک کر کہا۔ ”بیٹی! صبر کرو، تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔“

نخشا شہزاد اس مائمی ماحول میں رو رہا تھا۔ وہ کھینے کے موڈ میں تھا۔ چاچا اسے کبڑی کی گود سے لے کر کھلونوں والے کمرے میں لے گیا، سمیرا، محبوب اور معروف بڑے دکھ سے ماروی کو روتے اور بولتے دیکھ رہے تھے۔

وہ بول رہی تھی۔ ”تم جانتی ہو چاچی! میں اس کے انتظار میں کیسے ایک دن ایک ایک لمحہ گزار رہی تھی۔ یہ تقدیر کا کیسا مذاق ہے۔“

وہ چاچی سے الگ ہو کر سمیرا سے آ کر لپٹ گئی۔ ”ہائے سمیرا۔۔۔! میرے مراد کے لیے کچھ کرو۔ تم نے بہت پڑھا لکھا ہے۔ اسے پہلے کی طرح بتادو۔“

پھر وہ محبوب کی طرف گھوم کر بولی۔ ”محبوب! آپ نے ہم پر دن رات احسانات کیے ہیں۔ یہ آخری احسان اور کر دیں۔ یورپ اور امریکا کے بڑے ڈاکٹر قد بڑھانے کی دوائیں دے سکتے ہیں۔ ابھی ان سے بات کریں، ابھی مراد کو ان کے پاس لے جائیں۔“

کبڑی نے سختی سے کہا۔ ”ماروی! چپ ہو جاؤ، تم ایسے رو رہی ہو جیسے میں مر چکا ہوں۔“ وہ تن کر بولا۔ ”میں زندہ ہوں، یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ میرا کوئی علاج نہیں ہے۔ میں علاج کے لیے ہی لندن گیا تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے مجھے مایوس کیا ہے۔ جس جادوگر نے مجھ پر یہ قلم کیا ہے، وہ مر چکا ہے۔ دوسرے جادوگر اس کا توڑ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“ وہ ماروی کی طرف گھوم کر بولا۔ ”میں نے صبر کر لیا ہے۔ تمہیں بھی صبر کرنا ہوگا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ جیسا بھی ہوں، زندہ سلامت تمہارے پاس آ گیا ہوں۔“

وہ محبوب کو دیکھ کر بولا۔ ”سامیں! یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ نہ میں مجرم رہا ہوں، نہ گناہ گار۔ یہ لیں، میں آپ

وہ بولی۔ ”اگر آپ کو مراد سے دلی ہمدردی ہے تو بے داغ تھا۔

اس نے ماروی سے کہا۔ ”جو داغ لگ چکا ہے اور جو کبھی مٹنے والا نہیں ہے، اسے تم نے مٹانے کے لیے دو تاریخ تک مہلت لی تھی۔ پانچ دنوں کے بعد یہ مہلت ختم ہو جائے گی۔“

وہ ماروی کے رو برو ہو کر بولا۔ ”کیا تمہارا دین ایمان یہ نہیں کہتا کہ مہلت ختم ہوتے ہی اپنے وعدے کے مطابق میرے نکاح میں آنا چاہیے؟“

وہ باتیں بنا کر دو تاریخ کے وعدے کو ٹالنا چاہتی تھی لیکن اب بات نہیں بن رہی تھی۔ اس نے سہارا حاصل کرنے کے لیے چور نظروں سے اپنے مراد کو دیکھا۔ ان لمحات میں دل کہہ رہا تھا کہ دلدار کے پاس جائے اور اس سے لپٹ کر رونا شروع کر دے۔ وہ مجبور تھا۔ ابھی اس کا ایمان علی بن کر رہنا ضروری تھا۔ وہ قانونی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے سہولتیں حاصل ہو رہی تھیں۔ فی الحال اتنی خوش نصیبی بہت تھی کہ اپنی ماروی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کب تک اسی بہروپ میں اس کے قریب رہنے والا تھا۔ اسے جس حال میں بھی ہو ماروی کو حاصل کرنے کے لیے وہاں رہنا ہی تھا۔

آدی سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے۔ وہ بڑی پلاننگ کے ساتھ دو تاریخ سے پہلے آیا تھا لیکن شادی کو روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ پانچوں وقت کا نمازی دین دار اور دیانت دار ہو گیا ہے اور اپنے ایمان کی پچھلی کے باعث گناہوں سے دامن بچاتا آرہا ہے۔ اس کے پاس اپنی دیانت داری کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔

محبوب نے کہا۔ ”ماروی! تم چپ ہو۔ تمہارا سر جھکا ہوا ہے۔ تمہارے دل میں چور ہے۔ آج اس چور کو باہر نکالو۔ پوری سچائی سے کہو کہ مجھ سے نکاح منظور نہیں ہے۔ تم میرے احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہو۔ بہت مجبور ہو کر کہتی ہو کہ میرے نکاح میں آؤ گی۔“

”ماروی...! میرا عشق میری دیوانگی کوئی کھیل تماشا نہیں ہے اور اب میں تمہیں اپنے جذبات سے کھیلنے نہیں دوں گا۔“

”آج اعتراف کرو کہ تم مجھے مالتی آرہی ہو اور تمہارا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”یہ سچ ہے کہ آپ کے احسانات نے میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔ میں آپ کو بہت چاہتی ہوں۔ آپ کی بہت عزت کرتی ہوں لیکن کیا کروں؟ وہ

آپ مجھ سے شادی کے لیے جلدی نہیں کریں گے۔“

”شادی کے معنی ہیں خوشی۔ نئی سزتیں۔ چلو ہم دو تاریخ کو کسی طرح کی خوشی نہیں منا سکیں گے۔ صرف نکاح پر حوا لیں گے۔ میں تمہیں اپنے نام کر لوں گا تو مجھے اطمینان رہے گا۔“

”آپ سمجھتے کیوں نہیں مراد ایک بہت بڑا صدمہ اٹھا رہا ہے، یہ مجھے آپ کی دہن بننے دیکھے گا تو اسے دوسرا بڑا صدمہ پہنچے گا۔“

”یہ جذباتی باتیں ہیں۔ صدمہ آج بھی پہنچے گا اور ایک ماہ یا ایک برس کے بعد بھی پہنچے گا۔“

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”ماروی...! دو تاریخ اٹل ہے۔ میں کوئی دوسری بات نہیں سنوں گا۔“

وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے دل میں کیا ہے؟ ابھی سب کے سامنے کہہ دو۔ قبول نہ کرنے کے لیے باتیں بنا رہی ہو؟“

”آپ میرے متعلق جو بھی رائے قائم کریں۔ فی الحال مراد کو ایسی حالت میں دیکھ کر میرا دل رو رہا ہے۔“

معروف جگلی نے کہا۔ ”محبوب! ہماری آنکھوں کے سامنے مراد ہے۔ یہ بونا ہو گیا ہے۔ ماروی کو اس سے محبت ہے، ہمدردی ہے لیکن اب عشق نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ تم سے منہ پھیر کر بونے سے شادی کر کے تماشا بنے گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”پلیز معروف صاحب! آپ اسے بونا نہ کہیں، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہم میں سے کوئی یہ لفظ استعمال نہیں کرے گا۔ تم ابھی محبوب کو ٹالنے والی باتیں نہ کرو۔“

اس نے کبڈی سے کہا۔ ”اور مراد! تم بھی کہو کیا موجودہ حالت میں تم ماروی سے شادی کرنا چاہو گے؟“

کبڈی نے کہا۔ ”میں ماروی کے لیے ہی جرائم کی دلدل سے نکل کر آیا ہوں۔ میں قد آور نہیں رہا۔ کوئی بات نہیں، ماروی بچپن سے میری تھی میری ہی رہے گی۔“

معروف نے پوچھا۔ ”کیا اس سے شادی کرو گے؟ خود تماشا بن گئے ہو اسے بھی تماشا بناؤ گے؟“

محبوب نے کہا۔ ”اور کیسے شادی کرو گے؟ ماروی کے اپنے فیصلے کے مطابق تم پارسا نہیں رہے تمہارے منہ پر دوبار گناہ کی کالک لگ چکی ہے۔“

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو داغ لگ چکا تھا وہ دھلنے والا نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں محبوب...

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو داغ لگ چکا تھا وہ دھلنے والا نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں محبوب...

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو داغ لگ چکا تھا وہ دھلنے والا نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں محبوب...

محبت کبھی نہیں دے سکوں گی جو مراد کے لیے ہے۔ آپ مجھے سر سے پاؤں تک جیت لیں گے لیکن دل تو مرتے دم تک مراد کا ہی نام لیتا رہے گا۔ میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اب آپ ہی سوچیں کیا مجھے شریک حیات بنانا دانشمندی ہوگی؟

محبوب نے کہا۔ ”حشمت میں سوچنے کے لیے دماغ نہیں ہوتا۔ اس لیے دانش مندی نہیں ہوتی۔ میں نے اس کوٹھی میں تمہیں قید نہیں کیا ہے۔ لیکن مہربانیوں کی اور احسانات کی نادریدہ زنجیر پہنا دی ہے۔

”اور یہ تو خدا جانتا ہے کہ میں نے زنجیریں پہنانے کے لیے احسانات نہیں کیے ہیں لیکن تم اخلاقاً گرفت میں آگئی ہو۔ جب مراد جیل کی چار دیواری میں بے بس اور مجبور تھا، تب میں تمہاری عزت آبرو کا محافظ بن کر رہا۔ آج تک تمہاری آبرو سلامت ہے۔ اس سے بڑی میری نیک نیتی کا ثبوت اور کیا ہوگا؟

”لیکن مجھے نیک نیتی کا صلہ نہیں مل رہا ہے۔ میں اوندھے منہ پڑا ہوں اور مراد مجھ پر سے گزر کر تمہارے پاس پہنچ رہا ہے۔“

وہ بول رہا تھا اور غصے اور جذبات سے ہانپ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کسی کو اس کی ایمانداری کا اور نیک نیتی کا صلہ نہیں ملے گا تو وہ کیا کرے گا؟ وہ باغی ہو جائے گا۔ جیسے میں ہو رہا ہوں۔ یہ صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ اب تم سے اس ہاتھ دے دو اور اس ہاتھ لے والا سودا ہوگا۔ میں نے جو دیا ہے۔ اس کے عوض تمہیں لوں گا۔ تم میری نیک نیتی کے عوض نہیں ملو گی۔ میری پارسائی کی قدر نہیں کرو گی، جو داغ دار ہے، اس کا کلمہ پڑھتی رہو گی۔ اس لیے میں بھی خود غرض بن رہا ہوں۔

”ویسے اب بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ اگر... ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے ساتھ یہ ثابت کر دیا جائے گا کہ مراد گناہوں سے توبہ کر چکا ہے تو میں اس کی پارسائی کا انعام دوں گا۔ تمہاری طلب سے باز آ جاؤں گا اور اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ میں بھی پارسا نہیں ہوں اور اپنے گناہوں کا داغ چھپائے رکھتا ہوں تو میں تسلیم کر لوں گا۔ داغ دار مراد کی طرح خود کو گناہ گار مان لوں گا اور ایسا کبھی ہو نہیں سکے گا۔ جو سیاہ ہے وہ سیاہ رہے گا۔ جو سفید ہے۔ وہ ہمیشہ اُجلا ہی دکھائی دیتا رہے گا۔“

پھر وہ معروف اور سمیرا سے بولا۔ ”یہاں سے چلیں۔ اب ہم دو تاریخ کو قاضی صاحب کے ساتھ آئیں گے۔“

وہ ماروی سے کوئی جواب نہ دے بغیر چلا گیا۔ اب کہنا سنا ضروری نہیں رہا تھا۔ دو تاریخ اٹل تھی۔ وہ گیا تو اس کے ساتھ سمیرا اور معروف بھی چلے گئے۔ منتی نے کہا۔ ”وہ اپنا فیصلہ بنا کر گئے ہیں۔ مٹی ایمان کی کہتی ہوں، محبوب کی ہر بات درست ہے۔“

چاچا نے مراد سے کہا۔ ”بیٹے! تم بڑی تیاریوں کے ساتھ یہاں آئے ہو۔ قانون کی گرفت میں نہیں آؤ گے۔ یہاں ماروی کے ساتھ رہ سکو گے لیکن تم نے اپنی پارسائی ثابت کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔“

”چاچا! میں جیسے نیک نیتی سے رہتا ہوں، یہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔ یہاں میں کیسے ثابت کر سکتا ہوں کہ گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں۔ کون میری زبان پر بھروسہ کرے گا۔ جب میں کچھ عرصے یہاں رہوں گا اور مجھے آزمایا جائے گا، تب ہی حقیقت معلوم ہوگی۔“

ماروی بے چین تھی۔ مراد کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے ابھی ہاتھ دے لٹکا جا رہا ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ اس نے کہا۔ ”چاچا! آپ لوگ یہاں سے جائیں، میڈم روزی آج نہیں آئی ہیں۔ تم ملازمہ کو ادھر نہ آنے دینا۔“

وہ سب جانے لگے۔ منتی نے کہا۔ ”ادھر کسی کو آنے نہیں دوں گی۔ تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں شہزاد کو لے جا رہی ہوں۔“

منتی شہزاد کو لے گئی۔ ماروی اور مراد کمرے میں آگئے پھر وہ یکبارگی روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے پکڑ لو مراد! مجھے چھپالو۔ میں تمہارے انتظار میں پل پل مرنے جیتی رہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”اپنے دل پر اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تمہیں چھوٹنے کا مطلب ہے کہ جذبات بے قابو ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ نہ بھولو کہ گناہ اسی طرح سرزد ہوتے ہیں۔ پلیز فاصلہ رہنے دو۔“

اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھو اور یہ دیکھو کہ جب مراد اپنی ماروی کی تنہائی میں نہیں بہک رہا ہے پھر دنیا کی کوئی اور عورت اسے کیسے بہکائے گی۔ میں نے اپنے خدا سے ثابت قدم رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں تمہارا ہوں۔ صرف تمہارا ہی رہوں گا۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میرے کیسے رہو گے؟ دو تاریخ کو کیا ہوگا؟ تم اپنی پارسائی ثابت کر سکو گے اور نہ ہی

محبوب کو گناہ گار کہا جاسکتا ہے۔ وہ واقعی فرشتہ ہے۔ اس پر انگلی اٹھائی نہیں جاسکتی۔

”کیا ہوگا مراد؟ صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔“
وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ پھر مٹھیاں میچ کر بولا۔
”میں تمہیں اس کی منکوحہ بننے نہیں دوں گا۔ اس سے پہلے خود کو ظاہر کر دوں گا۔ مجھے پھر اسلحہ اٹھانا ہوگا۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو۔ خود کو ظاہر کرو گے تو قانون کے شکنجے میں حلے جاؤ گے۔“ وہ تیسہسہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔ ”یاد رکھو۔ محبوب ہمارا ایسا فرشتہ صفت محسن ہے جس کے خلاف تمہیں ہتھیار اٹھانے نہیں دوں گی۔ جوش میں آؤ گے تو مجھے حاصل نہیں کر سکو گے پھر ایک بار جیل کی چار دیواری تمہارا مقدر بن جائے گی۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر پاؤں میچ کر بولا۔ ”کیا کروں؟ ہم رات کی تاریکی میں تمہیں جا کر کتنے دلوں تک چھپ کر رہ سکیں گے؟“ وہ ماروی کو دیکھتے ہوئے سوچتے ہوئے بولا۔ ”میں ماسٹر کو بو بو سے بات کروں گا۔ وہ ہمیں یہاں سے نکال سکے گا۔“

”مراد! مجرمانہ ذہن سے نہ سوچو۔ ہم کہیں پکڑے جائیں گے تو میری عزت بھی دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ محبوب نے یہاں کتنی عزت سے رکھا ہے، پھر میرا ضمیر کہتا ہے کہ میرے فیصلے کے مطابق محبوب کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ میری طرح پاک دامن ہے۔ مجھے اپنے فیصلے پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کے تمام احسانات کا بدلہ چکانا چاہیے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا اس سے نکاح قبول کر لو گی؟“
”نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن میرے فیصلے اور میرے وعدے کے مطابق وہ مجھ سے نکاح پڑھانے کا مستحق ہے۔ اگر اس کا پلڑا تم سے بھاری نہ ہو، کسی طرح ہلکا ہو جائے تو پھر جیت تمہاری ہوگی۔ کوئی تدبیر کرو۔“

اس نے سوچتے ہوئے ماروی کو دیکھا۔ پھر کہا۔
”ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ دو تاریخ کو شادی کیسے روکی جائے؟ تم مجھے ہتھیار اٹھانے اور جارحانہ انداز اختیار کرنے نہیں دو گی۔ ایسا کرو، کسی طرح شادی کو دو تاریخ سے آگے لے جاؤ۔ مجھے کچھ سوچنے بچھنے کا وقت ملے گا تو شاید میں اپنی ماروی کو حاصل کر سکوں گا۔“

ماروی نے کوشش کی۔ اس رات محبوب کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ”میں جانتا تھا، تم مجھے کسی وقت

کال کر دو گی۔“

ماروی نے پوچھا۔ ”آپ کو یہ یقین کیوں تھا؟“
”یہ نہ پوچھو۔ اپنی بات کہو لیکن کچھ بھی کہنے سے پہلے سن لو۔ دو تاریخ کو میرا فیصلہ اٹل رہے۔ تم بھی سب کے سامنے اپنا اٹل فیصلہ سنا چکی ہو کہ مراد بھی تمہارے دل سے نہیں جائے گا۔“

”میرے دل کی بات جانے دیں۔ میں انصافاً آپ سے شادی کے لیے راضی ہوں۔ اب تو آپ کو میری بھی بات ماننی چاہیے۔ میں کوئی بہت بڑی بات نہیں منواؤں گی۔“

”تم مجھ سے دنیا کی ہر چھوٹی بڑی بات منوالو۔۔۔ میں اپنی زمین جائیداد کا روبرو سب تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔ لیکن شادی کی دو تاریخ کو آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ اب بولو، تم مجھ سے کیا منوانا چاہتی ہو؟“

”یہی کہ مجھ پر بھروسہ کرو۔ ضد نہ کرو۔ میں ایک ماہ بعد نکاح قبول کر دوں گی۔“

”سوری، میں صاف کہتا ہوں کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے۔ تم ایک بونے کی خاطر مجھ سے کترار ہی ہو۔ میں حیران ہوں ماروی۔۔۔! میری ایک بات کا جواب دے کر حیرانی دور کرو۔ اگر مجھ سے نکاح قبول نہیں کر دو گی تو کیا اس بونے کو مجازی خدا بناؤ گی؟“

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ”ابھی میں نے صرف اتنا سوچا ہے کہ تمہاری دلہن بن کر مراد کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ آپ مجھے وقت دیں گے تو میں اسے سمجھاؤں گی کہ اب ہمارا جوڑ نہیں رہا ہے اسے کسی بونی سے دل لگانا چاہیے۔“

”وہ نادان نہیں ہے۔ تمہارا سمجھانا ضروری نہیں ہے۔ اسے اتنی تو عقل ہونی چاہیے کہ وہ تمہارا شوہر نہیں بن سکے گا۔ ازدواجی زندگی ناکام رہے گی اگر وہ مجھ سے ملنا اور بات کرنا چاہے گا تو میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ اپنے قد سے اونچی کسی بھی لڑکی سے شادی کر کے شرمندہ کیوں ہونا چاہتا ہے؟“

”میں نہیں چاہتی کہ آپ اس سے ایسی کوئی بات کریں۔“
”ٹھیک ہے نہیں کروں گا۔ کوئی دوسری بات کرو۔ یہ بتاؤ دو تاریخ کے لیے دلہن کا جوڑا خرید لیا ہے؟ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے جاؤ گی؟“

ماروی نے فون بند کر دیا۔ اس نے دوسرے دن سمیرا کو فون پر کہا۔ ”میرے لیے کچھ کرو۔ میں مراد کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔“

سمیرا خود بے چین تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مراد بونا ہو یا جیسا بھی ہو، ماروی اس کی ہو جائے۔ کسی بھی طرح کوئی مجبور ہو جائے اور وہ محبوب کے لیے پرائی ہو جائے۔

اس نے کہا۔ ”خدا جانتا ہے تمہاری طرح میں بھی پریشان ہوں۔ تمہارے اور مراد کے حق میں مجھ سے زیادہ کوئی دعا نہیں مانگے گا۔ تم جانتی ہو کہ میں محبوب سے اس لگائے بیٹھی ہوں۔ چلتے پھرتے دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔“

”تم کسی بھی طرح مراد کی ہو جاؤ گی تو وہ پھر میری طرف مائل ہوں گے لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔“

”تم محبوب کو کسی طرح سمجھاؤ۔ کسی بھی طرح انہیں راضی کرو کہ وہ مجھ سے شادی کی جلدی نہ کریں۔“

”اب تو اور جلدی کریں گے۔ مراد آ گیا ہے۔ وہ بونا

ہی سہی۔ ایک ہی چھت کے نیچے تمہارے ساتھ رہے گا تو محبوب سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔ یہ لکھ لو کہ وہ دو تاریخ کو ہر حال میں تمہیں اس کوٹھی سے نکال کر اپنی کوٹھی میں لے آئیں گے۔“

ماروی کو کہیں سے کوئی سہارا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ مراد اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن ماروی اسے مجرمانہ اعمال سے روک رہی تھی۔

وہ خدا کو پکارتا رہتا تھا۔ نمازیں پڑھتا رہتا تھا۔

اب اور اپنی ذات کے اندر ڈوب کر سجدے کر رہا تھا۔

اسی نماز نے اسے کئی بار گناہوں سے بچایا تھا۔ اس کا دل

کہتا تھا کہ اس بار مایوسی نہیں ہوگی لیکن وسوسے اور

اندیشے مایوس کرتے رہتے تھے۔ اور دل میں ایمان بھی

تھا کہ نماز ہی اس کی ماروی کو نا محرم ہونے نہیں دے گی۔

وہ بچپن سے اس کی ہے اسی کی رہے گی۔ پہلی اور دوسری

تاریخ کی درمیانی شب ایسی تھی جیسے دوسرے دن

قیامت آنے والی ہو۔ ماروی اور منی وہ رات نمازیں

پڑھتے ہوئے اور کلام پاک کی تلاوت کرتے ہوئے

گزار رہی تھیں۔ چاچا بھی نماز نہیں پڑھتا تھا۔ وہ بھی قبلہ

رو ہو کر تسبیح پڑھ رہا تھا۔

قیامت کا وہ دن آ ہی گیا۔

محبوب صبح دس بجے قاضی صاحب کے ساتھ آ گیا۔

سمیرا اور معروف جگہ بھی آئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں فرشی

نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی

تھی۔ وہ سب وہاں بیٹھ گئے۔ مراد بھی کبڈی کے ساتھ وہاں

آ کر دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

وہ بے ظاہر وہاں موجود تھا مگر اپنی ذات میں گم تھا۔

سپین ڈائجسٹ

منی اور میڈم روزی دہن کو دونوں طرف سے تھام کر لائیں۔ اس نے دہن کا جوڑا نہیں پہنا تھا۔ بدن پر ایک معمولی سا لباس تھا۔ اس نے دوپٹے کو گھونگٹ بنا کر اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔ وہ منی اور روزی کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئی۔ قاضی صاحب نے نکاح نامہ کی خانہ پڑی کی۔ پھر کلام پاک کی ایک آیت کی تلاوت کرنے لگے۔ گزرتے ہوئے وقت کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ تلاوت کے بعد نکاح قبول کرانے والے تھے۔ ان لمحات میں محبوب، ماروی پر جبر نہیں کر رہا تھا، وہ اپنا جائز حق حاصل کرنے آیا تھا۔ اور مراد نظریں نیچی کیے چشم تصور میں خانہ کعبہ پہنچ گیا تھا۔ وہ دنیا سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ڈوبتی ہوئی گشتی اللہ کے حوالے کر دی تھی اور وہی پاک پروردگار آنے والے پل کی خبر رکھتا ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے اگر بہتری محبوب کے لیے ہے تو ماروی محبوب کو ملے گی اور اگر مراد کے لیے ہے تو اس کے قریب بیٹھی ہوئی ماروی کبھی پرائی نہیں ہوگی۔ اسی کی رہے گی۔

نکاح خوانی شروع ہو چکی تھی ایسے وقت کیا ہو سکتا

تھا؟ دنیا کی کوئی طاقت ماروی کو پرائی ہونے سے نہیں روک

سکتی تھی۔ قاضی صاحب نے ماروی سے پوچھا۔ ”آٹھ

ماروی بانو...! تمہارا نکاح محبوب علی چانڈیو سے.....“

قاضی صاحب ٹھٹک گئے۔ یکلفت چپ ہو گئے۔

کعبہ کی فضا سے قبولیت کی ہوا چلی تھی۔

ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے پر کال بیل چیخنے

لگی اور ایسے چیخنے لگی جیسے قیامت آگئی ہو اور وہ آنے والی

قیامت کال بیل کے جن سے انگلی نہیں ہٹا رہی تھی۔ کالنگ

بیل پورے ڈرائنگ روم میں گونج رہی تھی۔ نکاح خوانی

رک گئی تھی۔ نکاح پڑھاتے پڑھاتے ماروی ایک نعمت کی

طرح میسر ہونے ہی والی تھی کہ کال بیل کی آواز نے قاضی

صاحب کی آواز کو چل دیا...

سب ہی سرگھما کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

اس وقت کون آ سکتا تھا۔ کوئی بن بلایا اور نا پسندیدہ مہمان

ہوگا۔ محبوب نے بڑی بے چینی سے ماروی کو دیکھا۔ ابھی وہ

”قبول ہے“ کہہ کر اس کی ہونے والی تھی۔

محبوب نے قاضی صاحب سے کہا۔ ”جو بھی آیا ہے

آنے دیں۔ آپ نکاح پڑھا کریں۔“

قاضی صاحب پھر شروع ہونے والے تھے۔ منی چاچی

نے کہا۔ ”ڈرائنگ منٹ۔ دیکھیں تو کسی کون آیا ہے۔“

میڈم روزی دروازہ کھولنے کے لیے اٹھنے لگی۔

اس سے پہلے ملازمہ نے جا کر دروازے کو کھولا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک جوان عورت نظر آئی۔ ایک بہت ہی خوب صورت سی بچی اس خاتون کی انگلی پکڑے کھڑی تھی۔ محبوب اس خاتون کو دیکھتے ہی شدید حیرانی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جیسے بے یقینی سے بولا۔

”فیروزہ! تم.....؟“
فیروزہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”بڑی مشکلوں سے تمہارا پتا معلوم کیا ہے۔ تمہاری ڈیٹس والی کوٹھی میں گئی تو سیکورٹی گارڈ نے کہا تم اس کوٹھی میں ہو اور آج اپنی دلہن یہاں سے لے جانے والے ہو۔“

وہ فرشی نشست کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”واقعی ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری شادی خانہ آبادی ہو رہی ہے۔“
محبوب نے کہا۔ ”آؤ یہاں بیٹھو۔“

وہ بولی۔ ”میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ بہت الجھنوں میں ہوں۔ دس ماہ پہلے تمہارے دوست نفیس احمد کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”او گاڈ! تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟“
”تمہارا فون نمبر کم ہو گیا تھا۔ میں دس ماہ سے ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اب ایک ریکس زادے سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ میں پھر سے اپنا فیوچر پلٹ کرنے والی ہوں لیکن پرا بکم یہ ہے کہ وہ اس بچی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

سب نے اس معصوم سی گڑیا جیسی بچی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”میں اس بچی کی خاطر ایک شاندار مستقبل کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ اس لیے تمہاری امانت تمہیں واپس کرنے آئی ہوں۔“

محبوب کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک چونکا دینے والا انکشاف ہونے والا تھا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر فوراً ہی ماروی کی طرف دیکھا۔ فیروزہ نے ایسی بات کہی تھی کہ وہ دلہن بھی دوپٹے کا گھونگٹ اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ سب ہی سوالیہ نظروں سے اس بچی اور محبوب کو تنگ رہے تھے۔ پلک جھپکتے ہی وہ کنوارا باپ بن گیا تھا۔

وہ اچکچاتے ہوئے بولا۔ ”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“
”جو سچ ہے، وہ کہہ رہی ہوں۔ جب تک تمہارا دوست نفیس احمد زندہ رہا، تب تک اس گڑیا کا باپ کہلاتا رہا لیکن اس معصوم کے باپ تو تم ہی ہو۔“

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا زبردست دھماکا ہوگا۔ فیروزہ کے الفاظ دھماکے سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔

مراد نے اس کے آگے کچھ نہیں سنا۔ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوائی وی لائن میں آیا پھر ایک جگہ قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر پڑا۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ وہ معبود ناممکن کو ممکن بنا کر عبادت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ اب کسی شبہ کے بغیر محبوب بھی پارسا نہیں تھا۔ داغدار تھا دونوں کا پلڑا برابر ہو گیا تھا۔ اب وہ ماروی سے نکاح پڑھوانے کا مستحق نہیں رہا تھا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی کرم نوازی تھی کہ وہ سجدے میں بے اختیار رو رہا تھا۔ اپنے معبود کا شکر ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے صرف آنسو رہ گئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں ایسا انکشاف ہوا تھا کہ فوراً ہی کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ محبوب بلاشبہ..... ایک فرشتہ تھا۔ وہ سستے جذبات کا حامل نہیں تھا۔ یہ یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ کوئی حسینہ تنہائی میں اسے گناہ گار نہیں بنا سکے گی۔ ماروی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظریں محبوب سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”فیروزہ! کیوں مجھے ذلیل کرنے آئی ہو؟ اس کا باپ تمہارا شوہر نفیس احمد تھا۔“

فیروزہ نے کہا۔ ”تم جانتے ہو وہ باپ بننے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی میڈیکل رپورٹ میرے پاس ہے یہ سب ہی مانتے ہیں کہ تم سچے اور دیانت دار ہو۔ پلیز... آج سچائی سے انکار نہ کرو۔ باپ تم ہی ہو۔“

سمیرا نے کہا۔ ”تم ایک انتہائی شریف انسان کو بہت ہی شرمناک الزام دے رہی ہو۔ کیا تم ثابت کر سکتی ہو کہ یہ محبوب صاحب کی بیٹی ہے؟“

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”یہ باپ ہو کر اپنی بیٹی کو تسلیم نہیں کریں گے تو کچھ ایسے کاغذات پیش کروں گی جنہیں پڑھ کر میری سچائی کا یقین ہو جائے گا۔“

ماروی نے آگے بڑھ کر محبوب سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا ان کے پاس ایسے کاغذات ہیں؟ کیا آپ ان کاغذات کو جھٹلا سکیں گے؟“

محبوب نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”ماروی! میں بہت بد نصیب ہوں۔ تم سے جتنا قریب ہونا چاہتا ہوں تقدیر مجھے اتنا ہی دور کر دیتی ہے۔ میں تم سب سے ابھی جو سچ کہوں گا اس پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔“

معروف تجلی نے پوچھا۔ ”ایسی کیا پتی بات ہے کہ ہم یقین نہیں کریں گے؟“

محبوب نے ماروی کو دیکھا پھر اچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ... یہ میری بیٹی ہے لیکن میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں ہوس کا پھاری نہیں ہوں۔ میں نے فیروزہ کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

مختی چاچی نے ہاتھ مچا کر کہا۔ "ارے واہ...! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور بچی پیدا ہو گئی؟"

فیروزہ نے کہا۔ "محبوب درست کہہ رہے ہیں۔ ہم لندن میں تھے۔ لیکن کبھی تنہائی میں نہیں ملے۔ میں حیادالی ہوں اور یہ انتہائی شریف انسان ہیں۔" وہ بچی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ گڑیا محبوب بے بی ہے۔"

یہ دوسرا دھماکا تھا۔ "محبوب بے بی...؟" سب کی نظریں گڑیا پر مرکوز ہو گئیں۔ "محبوب بے بی...؟"

وہ ماں کے قریب ایک صوفے پر چڑھ کر اچھل رہی تھی۔ فیروزہ کہہ رہی تھی۔ "جب میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا کہ نفیس احمد بانجھ ہیں۔ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے تو انہوں نے کہا، مجھے محبوب کے ذریعے ماں بننا چاہیے۔ وہ ایک بیٹا چاہتے تھے۔"

محبوب نے کہا۔ "اسکی اولاد کے لیے رازداری ضروری تھی۔ نفیس نے مجھے رازدار بنایا۔ میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ یہ گناہ ہے۔"

"اس نے کہا کہ گناہ اس وقت ہوگا، جب تم میری بیوی کے بدن کو ہاتھ لگاؤ گے۔ تم تو اس کے قریب بھی نہیں جاؤ گے۔ یہ سب کچھ محبوب سسٹم کے پردس کے مطابق ہوگا۔"

"میں کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں زخمی ہوا تھا۔ مجھے خون کی ضرورت تھی۔ نفیس نے مجھے اپنا خون دیا تھا۔ میں اس کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے سوچنے لگا۔"

"مجھے ایک ایسے میڈیکل پردس سے گزرنا تھا، جہاں فیروزہ میرے قریب بھی نہ آئی۔ جب کسی کے ساتھ گناہ نہ کرتا تو گناہ گار بھی نہ کہلاتا۔ میں ہر پہلو سے سوچنے کے بعد راضی ہو گیا۔"

فیروزہ نے کہا۔ "میں نے نو ماہ کے بعد محبوب کی اس بیٹی کو جنم دیا۔ آج تک نفیس احمد اس کے باپ کہلاتے رہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات یوں بدل جائیں گے۔ نفیس احمد وفات پا گئے۔ ان کے بعد لندن میں میرا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی۔ بینک میں صرف اسی ہزار پاؤنڈ زرہ گئے تھے۔ ایسے

وقت ایک رئیس اعظم ملک حیات محمد نے مجھے پروپوز کیا ہے۔ وہ اس شرط پر مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں کہ میں بچی کو ساتھ نہ لاؤں۔ اسے کسی رشتے دار کے ہاں چھوڑ دوں۔ وہ صرف اپنی اولاد چاہتے ہیں۔"

وہ محبوب کو دیکھ کر بولی۔ "میں بہت مجبور ہو کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ حقیقتاً ہم عورتیں مجبور ہوتی ہیں۔ پہلے شوہر نے کہا۔ محبوب کے ذریعے بچہ پیدا کرو۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ دوسرا شوہر کہتا ہے۔ پرانی اولاد کو چھوڑ دو۔ اس لیے میں چھوڑنے آ گئی ہوں۔ سوری محبوب! مجھے افسوس ہے۔ میں بہت مجبور ہو کر آئی ہوں۔"

محبوب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "یہ میرے ساتھ زیادتی ہوگی۔ تم نے اور نفیس نے وعدہ کیا تھا کہ اس بچی کو کبھی میرا نام نہیں دیا جائے گا۔ بولو وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ میں نے تم لوگوں کے ساتھ نیکی کی تھی۔ میری نیکی کا صلہ یوں نہ دو۔ بچی کو میرے پاس نہ چھوڑو۔"

"پھر ایک بار سوری کہتی ہوں! مجھے نئے سرے سے نئی ازدواجی زندگی گزارنی ہے۔"

"میں ایک امیر کبیر گھرانے میں جا رہی ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں ملک حیات محمد سے شادی نہ کروں۔ بچی کی پرورش کرتی رہوں تو پھر ایک اور راستہ ہے۔"

"پرورش صرف ماں کو نہیں باپ کو بھی کرنی چاہیے۔ ایک سیدھا سارا راستہ ہے۔ تم اس کے باپ ہو۔ اس کی ماں کے شوہر بھی بن جاؤ۔ مجھ سے شادی کرلو۔"

سمیرا نے گھور کر اسے دیکھا۔ ماروی زیر لب مسکرانے لگی۔ وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھی۔ جو غلطی مراد سے ہوئی تھی، وہی محبوب سے بھی ہو چکی تھی، وہ بھی مراد کی طرح کنوارا باپ بن چکا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اپنے رب کے آگے سجدے کر رہی تھی۔ کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا تھا وہی سامنے آرہا تھا۔ محبوب کی ظالم دو تار بخ ہوا ہو گئی تھی۔

محبوب عجیب حالات سے دوچار تھا۔ اس وقت قاضی صاحب ماروی کا نکاح اس سے پڑھانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے میں ایک اور دلہن آگئی تھی۔

فیروزہ بھی نکاح پڑھانے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے ماروی کو دیکھا پھر فیروزہ سے بولا۔ "میں نے تمہارے ساتھ نیکی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب مجھ سے دوسری غلطی کی امید نہ رکھو۔ جاؤ یہاں سے اور اس امیر کبیر سے شادی کرلو۔ میں ظالم نہیں ہوں۔ یہ معصوم میری

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ میں آج تک کسی عورت کی تنہائی میں نہیں گیا۔ میں نے فیروزہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔" متی چاچی نے پوچھا۔ "پھر بیٹی کیسے پیدا ہو گئی؟" "یہ ٹیوب بے بی ہے۔"

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ "مرد کا تخلیقی جوہر عورت کے رحم میں جاتا ہے، تب ہی ایک بچہ تشکیل پاتا ہے۔ تم نے فیروزہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن تمہارا تخلیقی جوہر ایک پرانی عورت کے اندر پہنچ گیا۔ یہ تو چھو لینے سے بھی بڑا گناہ ہے۔" محبوب نے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ تمہیں تو اب میرے خلاف بولنے کا موقع مل گیا ہے۔ تمہاری تو یہ کوشش ہوگی کہ مجھے عیاش اور گناہ گار ثابت کرو۔"

کبڈی نے کہا۔ "جو سچ سامنے ہے وہی کہہ رہا ہوں۔ یہاں تمہارے خلاف ثبوت اور گواہ دونوں ہی موجود ہیں۔"

پھر اس نے قاضی صاحب سے کہا۔ "محترم...! آپ دینی معاملات کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ فرمائیں کیا ہمارا دین ٹیوب بے بی کو وجود میں لانے کی اجازت دیتا ہے؟"

قاضی صاحب نے کہا۔ "اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں فتویٰ دینے والا مفتی نہیں ہوں۔ آپ حضرات کسی عالم دین سے رجوع کریں۔ میری موتی سی عقل کہتی ہے کہ گناہ چوری چھپے ہوتا ہے۔ یہ ٹیوب بے بی نکاح کے بغیر وجود میں آئی ہے۔ اس لیے یہ سراسر گناہ ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "میں نہیں مانتا۔ میں کسی بڑے عالم دین سے فتویٰ حاصل کروں گا۔"

قاضی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے محبوب صاحب! میں آپ کا نکاح نہیں پڑھاؤں گا۔"

وہ نکاح کے رجسٹر کو ایک تھیلے میں ڈال کر وہاں سے جانے لگے۔ محبوب نے کہا۔ "آپ ہی ایک نکاح پڑھانے والے نہیں ہیں۔ آپ کے جیسے بہت مل جاتے ہیں۔ میں ابھی دوسرے قاضی کو بلالوں گا۔ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے فیروزہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میں بے داغ ہوں۔"

مرادنی وی لاؤنج سے واپس آ گیا تھا اور بڑی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے عبداللہ کبڈی کو اشارہ کیا۔ کبڈی نے کہا۔ "سائیں! مجھے کہا جا رہا تھا کہ میں اپنی پارسائی ثابت کروں۔ اب میں آپ سے کہتا ہوں پہلے اپنی پارسائی ثابت کریں پھر ماروی کو منکوحہ بنانے کے خواب دیکھیں۔"

وہ بولا۔ "مراد! رقیب بن کر نہ بولو۔ میں نے

بیٹی ہے۔ میرے سائے میں پرورش پائے گی۔" سمیرا نے یہ سنتے ہی گڑیا کے پاس آ کر اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔ پھر اسے جوم کر بولی۔ "میں اسے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ میں اس کی پرورش کروں گی۔"

ماروی اور متی چاچی مسکراتے تھیں۔ ماروی نے مراد کے بیٹے کو کلیجے سے لگا رکھا تھا۔ سمیرا بھی موقع سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ محبوب کی بیٹی کی کنواری ماں بن رہی تھی۔

محبوب نے سمیرا کی گود میں اپنی بیٹی کو دیکھا پھر ایک نظر ماروی پر ڈالی۔ اس کی نظروں میں یہ شکایت تھی کہ اس نے سب کے سامنے مراد کے بیٹے کو گود میں لیا تھا۔ اسے سینے سے لگایا تھا۔ لیکن اس کی بیٹی کے قریب بھی نہیں گئی تھی۔

یہ رویہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مراد سے کتنی گہری اپنایت رکھتی ہے۔ آئندہ اسی کے بچے کی ماں بننا چاہے گی۔

فیروزہ نے سمیرا سے کہا۔ "گڑیا کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ، یہ مجھے جاتے دیکھے گی تو رو دے گی۔"

سمیرا اسے گود میں لے کر ڈرائنگ روم سے باہر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس دوران ملازمہ نے ناشتے اور مشروب کی ٹرالی فیروزہ کے سامنے لا کر رکھی تھی۔ وہ جلدی میں تھی۔ اس نے صرف پانی پیا پھر اٹھ کر بولی۔ "شکر یہ محبوب! تم نے میرے سر سے بوجھ اتار دیا ہے، میں جب بھی پاکستان آؤں گی تو بیٹی سے ملنے ضرور یہاں آیا کروں گی۔"

محبوب اسے دروازے کے باہر چھوڑنے آیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "تم نے میرے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔"

وہ بولی "ہماری مصحوم بیٹی میرے لیے بھی مسائل پیدا کر رہی تھی۔ میں بڑی امیدیں لے کر آئی تھی کہ بیٹی کے ساتھ مجھے بھی قبول کر لو گے۔"

وہ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "مگر افسوس! دیر سے آئی۔ تم یہاں کسی اور کے ہو رہے ہو۔۔۔۔۔ بہر حال میرے لیے ایک دروازہ کھلا ہے۔"

اس نے ٹیکسی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ ٹیکسی وہاں سے چلی گئی۔ وہ اندر آیا تو معروف نے دروازے پر ہی دھمکی سرگوشی میں پوچھا۔ "محبوب یہ کیا ہو گیا؟ کیا یہ شادی ہو سکے گی؟ ماروی نکاح قبول کرے گی؟"

اس نے پوچھا۔ "قبول کیوں نہیں کرے گی؟"

"خود ہی سمجھو، تم بھی گناہ گار بن چکے ہو۔"

وہ سرگوشی بھول گیا۔ ٹپ کر اوپنی آواز میں بولا۔

تمہاری طرح دو عورتوں سے منہ کالا نہیں کیا ہے اور اب بھی تم چوری چھپے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہو۔ میں تو دھوپ میں کھڑی ہونی فیروزہ کے سائے میں بھی نہیں گیا۔ خدا جانتا ہے میرا دامن پاک ہے، میں بے داغ ہوں۔

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ ”تم انصاف سے بولو۔ میں آج تک عورتوں سے دور رہا ہوں۔ تم میری نیکی اور شرافت کو دیکھتی آرہی ہو۔ کیا میں گناہ گار کہلا سکتا ہوں؟“ وہ منہ پھیر کر بولی۔ ”قاضی صاحب نے بڑی وضاحت سے کہہ دیا ہے کہ آپ کا لہو دوسری عورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ گڑیا آپ کا لہو ہے، آپ کے گناہ کا جینا جاگتا ثبوت ہے۔“

وہ ایک دم سے چچ پڑا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس دو تاریخ کا انتظار کرتے کرتے جیسے میری جوانی گزر گئی ہے۔“ وہ پاؤں پٹختا ہوا اس کے قریب آ کر بولا۔ ”تم میرے نکاح میں آنے سے انکار کر رہی ہو۔ اور میرے اندر دھماکے ہو رہے ہیں۔“ وہ جنون میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ”میں چچ چچ کر کہتا ہوں کہ تمہیں ہر حال میں حاصل کر کے رہوں گا۔ تم میری شرافت پر تھوک کر کسی اور کی نہیں بن سکو گی۔“

وہ نیسبہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولا۔ ”آج یہ صاف صاف کہتا ہوں کہ میری شریک حیات بن کر تمہیں میرے تمام قرضے ادا کرنے ہوں گے۔ جب تک نکاح کی صورت میں قرض ادا نہیں کرو گی، تمہیں اس کو نکھی سے جانے نہیں دوں گا۔“

وہ پہلی بار ماروی سے اتنی سخت باتیں کہہ رہا تھا۔ اسے ہاتھ سے نکتے دیکھ کر اپنی نیکی اور شرافت کو بھول رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ پھر بولا۔ ”میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ میری برداشت جواب دے چکی ہے۔ تم جب تک قرض ادا نہیں کرو گی اس کو نکھی میں قید رہو گی۔ تمہارا یہ بونا عاشق تمہیں یہاں سے نہیں لے جاسکے گا۔“

وہ چیخ کرتا ہوا، دروازہ کھول کر باہر چلا گیا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے کو خاموش لگا ہوں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر معروف نے ماروی سے کہا۔ ”محبوب تم سے مسلسل محروم ہوتا آرہا ہے۔ آج وہ پھٹ پڑا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔ وہ غصے میں کہہ گیا ہے کہ تم سے قرض

وصول کرے گا۔ اس کا مزاج ایسا نہیں ہے۔ وہ کسی پر جبر نہیں کرتا ہے۔ تمہیں بھی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔ اسے آج یا کل تمہیں سوری کہنا چاہیے۔“

ماروی نے کہا۔ ”وہ سوری بولیں یا نہ بولیں، آج ان کی اصل صورت سامنے آگئی ہے۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آج سے میں ان کا کوئی احسان نہیں لوں گی۔“

اس نے روزی سے کہا۔ ”میڈم! آپ محبوب کے پاس واپس جائیں۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔“

میڈم روزی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ماروی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پلیز، میں کچھ نہیں سنوں گی۔ مجھ سے بحث نہ کریں۔ آپ جائیں اور اپنا سامان پیک کریں۔“

پھر اس نے منی سے کہا۔ ”چاچی! ملازمہ کو بولو، وہ بھی چھٹی کرے۔ تم آج سے گھر کے اخراجات کے لیے محبوب سے ایک پیسا بھی نہیں لو گی۔ ہمیں ابھی بہت کچھ سوچنا۔۔۔ سمجھتا ہے کہ محبوب کا قرض کس طرح ادا کرنا ہے۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”میں تو مر جاؤں گی مگر ان سے نکاح قبول نہیں کروں گی۔ میں آج ہی یہ کوئی چھوڑ جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ وہ مجھے کیسے قیدی بنا کر رکھیں گے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”پلیز ماروی! تم اس طرح غصے میں نہ آؤ۔ محبوب صاحب کا غصہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

ماروی نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عبداللہ کبڈی سے کہا۔ ”مراد! تم ابھی جاؤ اور کوئی اچھا سامان کرائے پر حاصل کرو۔ ہم آج ہی یہ کوئی چھوڑ دیں گے۔“

معروف نے کہا۔ ”ایسا نہ کرو ماروی! تم یہاں سے کہیں جاؤ گی، تو محبوب پاگل ہو جائے گا۔ اس نے جنون میں اپنے مزاج کے خلاف بے ٹکلی باتیں کی ہیں۔ تم خود جانتی ہو وہ ایسا نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم یہاں قیدی بن کر نہیں رہو گی۔ محبوب جلد ہی آکر تمہیں سوری کہے گا۔“

معروف صاحب۔۔۔ کیا ان کے سوری کہہ دینے سے یہ حقیقت بدل جائے گی کہ وہ مجھے حاصل کرنے کی نیت سے احسانات کرتے رہے ہیں؟“ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں تو نہیں بھولوں گی کہ ان کا قرض ادا کرنا ہے۔ میں ان سے پوچھوں گی کہ وہ قرض کس طرح وصول کر سکیں گے؟ جبکہ مجھے بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں مراد کی ہوں۔ مراد کی ہی رہوں گی۔“

منی نے کہا۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ محبوب کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے لیکن ماروی اب کس رشتے سے یہاں

سپنس ڈائجسٹ 190 اپریل 2015ء

رہے گی؟ ان کی جو بے لوث مہربانیاں تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں۔" چاچی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم یہاں سے جانے کے بعد بھی محبوب کے احسان مند رہیں گے۔ ہم۔۔۔ بے ضمیر اور احسان فراموش نہیں ہیں۔ انہوں نے جو نیکیاں کی ہیں ان کے سامنے سر جھکاتے رہیں گے۔"

ماروی نے کہا۔ "اور آئندہ اس معاملے پر بحث ہوتی رہے گی کہ میں ان کا قرضہ کیسے ادا کروں گی۔۔۔؟ مجھ سے شادی کرنے کا خیال تو انہیں دماغ سے نکالنا ہی ہوگا۔" معروف نے کہا۔ "بات بگڑ رہی ہے۔ ہمیں دانش مندی سے بگڑی کو بنانا چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہم میں سے کسی کو کسی کی ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

پھر اس نے سمیرا سے کہا۔ "آؤ سمیرا۔۔۔ ہم چلیں۔" میڈم روزی اپنا مختصر سا سامان لے آئی۔ معروف نے اس سے کہا۔ "آؤ ہم جہاں کہو گی ڈراپ کر دوں گا۔" وہ باہر چلا گیا۔ سمیرا نے گڑیا کو بازوؤں میں اٹھا کر ماروی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "محبوب صاحب اور معروف صاحب کے خیال میں بات بگڑ رہی ہے جبکہ تمہاری بات بن گئی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مبارک ہو۔ اب تمہاری زندگی میں صرف مراد ہی ہوگا۔ ایک اتار کا دوسرا بیمار نہیں رہے گا۔" پھر وہ گڑیا کو چوم کر بولی۔ "میری بھی بگڑی بن رہی ہے۔ میرے لیے بھی دعا کرتی رہو۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ملازمہ کو بھی رخصت کر دیا گیا۔

☆☆☆

محبوب غصے سے تھلا تے ہوئے کارڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ماروی سے ہر بار محروم ہونے کے بعد سوچتا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اس کی طرف مائل ہو جائے گی لیکن اب قصہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ٹیوب بے بی کے حوالے سے جو نیکی یا غلطی کی تھی وہ غلطی گناہ بن گئی تھی۔ وہ بھی داغ دار ہو گیا تھا۔ مراد کے ساتھ پلڑا برابر ہو گیا تھا۔

مگر کیا اس نے ماروی کے ساتھ کم نیکیاں کی تھیں؟ جب تک مراد گدھا گاڑی والا رہا اور جیل میں رہ کر سزائے موت کی طرف جاتا رہا، تب تک اس کے ساتھ بھی نیکیوں کی انتہا کر دی۔ اس کی جگہ سزائے موت پانے کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اب تک کسی ایک نیکی کا بھی صلہ کبھی کیوں نہیں ملا؟ لوگ اپنے مفادات کے سامنے دوسروں کی محبتوں اور قربانیوں کو بکسر بھول جاتے ہیں۔

دنیا اسے بھول جاتی تو کوئی غم نہ ہوتا۔ ماروی اسے بھلا کر صدمہ پہنچا رہی تھی۔ اس نے سب کے سامنے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس کی شریک حیات نہیں بنے گی۔ اس کے بعد ہی پہلی بار صبر کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔

کار کی تیز رفتاری بتا رہی تھی کہ ابھی غصہ کم نہیں ہوا ہے۔ اب وہ ماروی کو سو طرح سے گھبرنے اور اسے طرح طرح سے مجبور کرنے والا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے احسانات کا بدلا چکائے بغیر کوشی سے نہیں جائے گی۔ وہ ڈرائیو کرتا ہوا ہائی وے پر آ گیا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے؟ بس کہیں دور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھولنے کے لیے ہائی وے پر بھاگا جا رہا تھا۔ ماروی سے دور بھاگنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن کیسے نہیں تھا؟ ذریعہ تھا۔۔۔ ایسے وقت سمیرا اس کے خیالوں میں آ گئی۔ یہ جنون اور انتقامی جذبات کی کارستانی تھی۔ ماروی اور سمیرا۔۔۔ سمیرا اور ماروی دونوں کی نفسیاتی خیالوں میں گڈمڈ ہونے لگی تھی۔

اب سوچنے کا اندازہ بدل گیا تھا۔ یہ طے تھا کہ ماروی لائف ٹائم پارٹنر کبھی نہیں بنے گی۔ اسے پارٹ ٹائم قرضے کے طور پر وصول کرنا ہوگا۔

معروف ججلی نے اسے کال کی۔ "محبوب! کہاں ہو؟ غصے میں بنتی ہوئی بات کو نہ بگاڑو۔ مانا کہ اس نے ابھی نکاح سے انکار کیا ہے مگر سوچو، کیا وہ بونے مراد کو گلے سے لٹکا کر رہ سکے گی۔ پلیز بحقل سے سوچو۔ واپس آؤ۔"

"محبوب۔۔۔! ذرا صبر کرو۔ وہ آخر پچھتا کر تمہاری ہی طرف لوٹے گی۔ فارگا ڈسک، غصے کو دماغ سے نکالو۔"

وہ بولا۔ "آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں اور ہمیشہ مجھے نقصانات سے بچاتے ہیں لیکن ماروی نے اس بونے کی خاطر سب کے سامنے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ سوری میں ابھی آپ سے بات نہیں کر سکوں گا۔ کل ضرور آپ سے ملوں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ زیر لب کہنے لگا۔ "کیا میں ایک بونے سے کیا گزرا ہوں۔ وہ مجھے سمجھتی کیا ہے؟"

اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی اونچی حیثیت سے گر کر اسے چاہتا رہا۔ اس نے مجھے اور گرا دیا۔ کوئی بات نہیں میں بھی گرا نا جانتا ہوں۔"

وہ واپسی کے لیے کار کو ایک یوٹرن پر لے آیا۔ بڑی لمبی ڈرائیو تک کرتا رہا تھا۔ غصہ کتنا ہی آئے۔ خواہ کتنی ہی

میشن ہو بھوک تو لگتی ہے لیکن ابھی کچھ بھی کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر صرف جوس پینے پر اکتفا کیا۔
شام کے بعد اندھیرا پھیل رہا تھا گھر پہنچ کر پینے کے دوران کھانے کا ارادہ تھا۔ وہ ایک چرغہ لے کر کوشی میں آگیا۔ وہاں پورچ میں کار سے اترتے ہوئے دل کو پھر صدمہ پہنچا۔

آج وہ اپنی دلہن کے ساتھ کار سے اترنے والا تھا۔ اسے بڑے ارمالوں سے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر خواب کی تعبیر تک خواب گاہ تک لے جانے والا تھا۔

وہ خالی کار کو اور کوشی کے خاموش دروازے کو دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔ "ماروی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔" وہ بڑبڑاتا ہوا بیڈروم میں آیا۔ رقیب کو اس کی قربت حاصل ہو رہی تھی اور وہ اس سے دور خالی ہاتھ آگیا تھا۔ اس کا بیڈ ماروی کے وجود سے محروم تھا۔ وہ خواب گاہ اسے اور صدمہ پہنچا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک خوب صورت سے کینٹ کے پاس آیا۔ وہاں اس کے غموں کا علاج تھا۔ اس نے کینٹ کے سلائڈنگ پٹ کو ایک طرف ہٹایا تو سامنے شیشے کی دیوار تھی۔ اس دیوار کے پیچھے امپورٹڈ وٹسکی ڈائن ڈاکا اور بیئر کی بوتلیں اور کین نظر آرہے تھے۔ یہی ہے وہ آٹم انجیٹ جو سارے غم بھلا دیتی ہے اور بے وفا کو دل سے نوج کر پھینک دیتی ہے۔

وہ شیشے کا ایک جام اور بلیک لیبل کی ایک بوتل نکال کر بیڈ کے سرہانے والی میز پر آگیا۔ ایک ملازم دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ دوڑ کر کچن میں گیا وہاں سے پلیٹ چھج اور فورک لے آیا۔ پیک کیے ہوئے چرغے اور سلاڈ کو نکال کر پلیٹ میں رکھا۔ پھر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے آیا۔ وہ اپنے صاحب کو پلانے کے محالے میں مستعد رہتا تھا۔ اس نے بوتل کھول کر ایک پیگ بنایا۔ محبوب نے کہا۔ "ڈبل پیگ۔"

اس نے بوتل کھولی پھر ایک پیگ کو ڈبل کر دیا۔ محبوب نے جام کو اٹھا کر سنہری شراب کو شیلی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ پینے سے پہلے نشے کو حاوی کر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک چسکی لی پھر ایک گھونٹ پیا۔ اسی وقت فون چیخنے لگا۔ اس نے اور ایک گھونٹ پی کر نمبر پڑھے۔ بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا پھر بولا۔ "ہاں سمیرا...! بولو، کچھ بھی بولو۔"

لیکن مجھ سے ہمدردی نہ کرنا اور اس بے وفا کا نام نہ لینا۔
"میں کسی کا نام نہیں لوں گی۔ صرف آپ کے لیے پریشان ہوں۔ ایسے وقت آپ کو تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ آپ

کہاں ہیں؟"

"میں اپنے بیڈروم میں ہوں۔"

"میں آنا چاہتی ہوں۔ پلیز انکار نہ کریں۔"

اس نے شیشے کے جام میں سنہری سمیرا کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "ہاں میں تنہا ہو گیا ہوں آجاؤ لیکن میں پی رہا ہوں۔"

"میں آرہی ہوں۔ آپ وعدہ کریں، چار پیگ سے زیادہ نہیں لیں گے۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ فون بند کر دیا۔ یقین تھا کہ وہ اس کی دیوانی ہے ضرور آئے گی۔ اس نے ملازم سے کہا۔ "تم جاؤ اپنے کوارٹر میں رہو۔ ضرورت ہوگی تو کال کر لوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ اس نے جام خالی کیا تو سرور چھانے لگا۔ وہ موڈ میں آگیا۔ بہت آہستہ آہستہ سرگھوم رہا تھا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ایسے وقت سمیرا آگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا سا ڈمگایا پھر بولا۔ "بہت اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں نے ابھی ابھی اسے بھلا دیا ہے۔ اب یاد آئے گی تولات مار کر بھگا دوں گا۔"

وہ بولی۔ "چلیں اچھا ہے۔ اسی طرح اسے بھگاتے رہا کریں۔ اپنا غم غلط کرتے رہیں۔"

وہ ڈمگاتے ہوئے بولا۔ "اس کی اوقات یہی ہے۔ اسے ٹھوکروں میں رکھنا چاہیے۔"

سمیرا نے زیر و پا اور کالپب آن کر کے باقی لائنیں بجا دیں۔ ہلکی نیلی خواب آور روشنی میں ماحول خواب خواب سا ہو گیا۔ وہ ہلکے گلابی لباس میں تھی۔ وہ جام ہاتھ میں لیے کھڑا تھا، اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوابوں میں آنے والی دوشیزہ لگ رہی تھی۔ سمیرا نے قریب آ کر اس کے ہاتھ سے جام لے کر میز پر رکھا۔ پھر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، آپ نے زیادہ پی لی ہے۔ یہاں آرام سے بیٹھیں۔"

وہ اسے بیڈ کے سرے پر بٹھانا چاہتی تھی۔ ایسے وقت وہ اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ "اچھا ہوا تم آگئیں اب وہ نہیں آئے گی۔ میں نے تو اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اسے بھول گیا ہوں۔ خبردار! اب یہاں نہ آنا۔ جب میں یاد کروں گا ہی نہیں تو وہ کیسے آئے گی؟"

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس کی گرفت میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی شرابی سانسیں اسے آج دے رہی تھیں۔ کمرے میں اسے سی کی ٹھنڈک تھی لیکن اس

کنواری کے اندر موسم بدل رہا تھا۔

وہ اس کی گردن اور شانے پر ہونٹوں کو رکھتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہوا تم آگئیں۔ اب وہ نہیں آئے گی۔" وہ کسماتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے وہ نہیں آئے گی، آپ مجھے چھوڑیں ہمارے درمیان فاصلہ رہنا چاہیے۔" وہ بولا۔ "ہرگز نہیں فاصلہ رکھو گی تو وہ ہمارے درمیان چھم سے آجائے گی۔ اسے آنے کی جگہ نہ دو۔" وہ تڑپ کر ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔ محبوب نے پہلی بار اسے پکڑا تھا۔ اسے دھڑکنوں سے لگایا تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے آئی تھی۔ لیکن ہاتھ آنے سے پہلے ذرا تڑپانا چاہتی تھی۔

محبوب نے اسے پکڑ لیا۔ وہ خود کو پھپھانے کے لیے اس کی گردن میں دونوں ہاتھیں ڈال کر ہار مان گئی۔ وہ شہرِ تمنا میں بھٹکتے ہوئے بڑی آسودگی سے بولا۔ "آہ... ماروی! آخر تم آ ہی گئیں۔ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔"

وہ جذبات سے لرزتی ہوئی بولی۔ "میں سمیرا ہوں۔" وہ جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ زیر و پاور کی روشنی میں سمیرا سمجھ گئی تھی۔ وہ ماروی لگ رہی تھی۔ سمیرا چپ ہو گئی۔ معاملہ فہم تھی۔ اسے بھٹکنے اور بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ ماروی کے نام سے ہی کسی آتو گیا تھا۔ اس کی پارسائی کا بت ایک بار اوندھے منہ کرتا تو پھر گرتا ہی چلا جاتا۔

کمرے میں اسے سی کی ٹھنڈک بھی تھی اور جذبوں کی حرارت بھی۔ خاموشی بھی تھی اور ہلچل بھی۔ کبھی کبھی اس کے بڑبڑانے کی آواز ابھرتی پھر ڈوب جاتی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد طویل خاموشی چھا گئی۔ وہ نشے اور نیند میں غافل ہو گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اسے سی کے باوجود چھت پر پٹکھا گردش میں تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ پی رہا تھا اور سمیرا اس کے ساتھ بیڈ پر تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کے پاس اجڑی ہوئی حالت میں نظر آئی۔

اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ پٹا ہوا لباس ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ اسے ایسی حالت میں دیکھ کر ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کچھ کچھ دھندلا دھندلا سا یاد آنے لگا کہ پچھلی رات کیا کچھ ہوتا رہا تھا؟ وہ فوراً ہی منہ پھیر کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلی بات یہی دماغ میں آئی کہ پارسائی رخصت ہو چکی ہے۔

پھر یہ شاک پہنچا کہ وہ بھی مراد کی طرح ڈبل گناہ گار ہو گیا ہے۔ فیروزہ کے بعد سمیرا کا نام گناہ کی فہرست میں

آ گیا تھا۔ سمیرا ایسی حالت میں پڑی ہوئی تھی کہ وہ شرمندگی سے سر جھکا کر اسے دیکھ بھی نہیں پارہا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ عزت آبرو اور شرم و حیا والی تھی۔ محبوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اتنی شدت سے چاہتی ہے کہ اپنا قیمتی سرمایہ اس کے حوالے کر چکی تھی۔

اب تو اسے ماروی کی جگہ دے یا نہ دے۔ پیار سے اس کی قدر کرنی ہی تھی۔ وہ اسے پہلے کی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ محبت اور توجہ کی مستحق ہو گئی تھی۔ محبوب کی زندگی میں وہ پہلی صبح تھی، اس نے جاگتے ہی ماروی کو یاد نہیں کیا تھا۔ سمیرا نے اپنے سٹے میں اسے جکڑ لیا تھا۔ بلکہ وہ خود ہی ٹھنکے میں آ گیا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی محبت کا جواب محبت سے کیسے دے گا؟

اس کے سامنے ماروی سے کیسے تقاضا کرے گا کہ وہ احسانات کے عوض اس سے نکاح قبول کرے۔ آئندہ سمیرا بھی تقاضا کرنے والی تھی کہ اس کا قیمتی سرمایہ حاصل کرنے کے بعد وہ اسے اپنی منکوہ بنائے۔ یہ سوال اس کے ذہن میں چھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے گا؟ اب تو وہ ماروی کو جبراً حاصل کرنے کے معاملے میں کمزور ہو گیا تھا۔ سمیرا ذہین اور تعلیم یافتہ تھی۔ خاموش احتجاج کرتے ہوئے اس کے لیے عذاب بننے والی تھی۔

پھر اسے اپنے پیچھے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہی تھی۔ یہ خاموش احتجاج تھا اور آنسو چھ رہے تھے، دوسروں کے سامنے بھی آنسو نکل پڑتے تو ایک رات کی رنگین و سنگین داستان سب ہی کی سمجھ میں آ جاتی۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سمیرا...! میں شرمندہ ہوں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آگے کیا بولے؟ کیا کرے؟ ماروی ہوتی تو فوراً اس کے آنسو پونچھتا۔ اسے چومتا اور سینے سے لگا کر تسلیاں دیتا اور کہتا۔ "میری جان! جو ہو گیا اس پر آنسو نہ بہاؤ، میں ہوں نا۔"

"میں ہوں نا۔" سمیرا سے کہتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ تمام عمر اسی کا ہو کر رہنے والا ہے لیکن ابھی وہ اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ ابھی تک ماروی دل میں پھانس کی طرح گڑی ہوئی تھی۔

اس کی سسکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ ہلکے ہلکے کر رہی تھی۔ وہ مجبور ہو کر اس کی طرف گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "چپ ہو جاؤ۔ غلطی دونوں سے ہوئی ہے۔"

وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "مجھ سے نہیں ہوئی ہے۔ آپ کو یاد نہیں ہے۔ میں آپ کو روکتی رہی۔ سمجھاتی رہی لیکن

آپ جنون میں تھے، میرے لباس کو پھاڑ ڈالا تھا۔“
 وہ ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام کر بولا۔ ”میں اور کیا
 کہوں؟ جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔“
 ”کیا بھول جانے سے لٹی ہوئی عزت واپس مل
 جائے گی؟ اب تو آپ ہی اس کے ہمدار ہو گئے ہیں۔ آپ
 لٹی رہے نہیں ہیں۔ آپ ہی اس کے امین ہیں۔“
 وہ اپنی شرافت کے باعث قائل ہو کر بولا۔ ”مجھے
 اس سلسلے میں بہت سوچنا اور سمجھنا ہوگا۔“
 ”آپ پیار سے سوچیں گے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں
 ہوگا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں ضرور سوچوں گا۔ پلیز ابھی
 اٹھو۔ اپنی حالت درست کرو۔“
 ایسے لمحات میں عورت نہیں مانتی۔ اپنی منوائی ہے۔
 اس نے ضد کی۔ ”میں نہیں اٹھوں گی۔ جب تک آپ پیار
 نہیں کریں گے مجھے تسلیاں نہیں دیں گے۔ میں یہیں پڑی
 رہوں گی۔ آپ کی قسم کھاتی ہوں۔ آپ کا پیار ہی مجھے
 یہاں سے اٹھائے گا۔“
 وہ کوئی گئی گزری نہیں تھی۔ اس نے اپنا ایک سوشل
 اسٹیش بنا رکھا تھا۔ اس کے اربوں کے کاروبار کو سنبھال رہی
 تھی۔ اب حالات کہہ رہے تھے کہ محبوب اسے سنبھالے۔
 وہ مجبور ہو کر اس پر جھک گیا۔ وہ بے شک حسین
 اسٹارٹ اور بہت ہی پرکشش تھی۔ ماڈلنگ کی دنیا میں دھوم
 مچا رکھی تھی۔ حالات نے کروٹ لی تھی۔ اب وہ محبوب کی
 زندگی میں دھوم مچانے والی تھی۔
 وہ اسے آغوش میں لے کر تسلیاں دینے لگا۔

☆☆☆

محبوب کی سمجھ میں یہ اچھی طرح آ گیا تھا کہ ماروی
 بچپن سے مراد کی ہے۔ وہ یونا بن جائے، فتا ہو جائے، تب
 بھی اسی کے نام سے جیسے گی۔ وہ اس پر مزید لاکھوں روپے
 لٹاتا رہے۔ اس کے لیے خون بہائے اور طرح طرح کی
 قربانیاں دیتا رہے۔ تب بھی اسے مراد کی جگہ نہیں دے
 گی۔ اسی بات پر وہ اپنی توہین محسوس کر رہا تھا۔ اس کے
 خلاف انتقام بہت کچھ کر سکتا تھا اور کرنے والا تھا لیکن اس کی
 فطری شرافت اور اعلیٰ ظرفی اسے روک رہی تھی۔

مراد یونا بن کر آیا تھا تاکہ کوئی اسے عالی جناب کا
 قاتل مراد علی منگی نہ سمجھے۔ محبوب اس کے خلاف بہت کچھ کر
 سکتا تھا۔ یہ راز انٹیلی جنس کے حامد صدیقی کو بتا سکتا تھا۔ مراد
 کو قاتل کوئی گرفت میں پہنچا کر اسے ماروی سے دور کر سکتا تھا۔

اگرچہ یہ ثابت نہ ہوتا کہ وہ یونا ہی مراد علی منگی ہے اور
 عدالت یہ تسلیم نہ کرتی کہ اسے جادو کے ذریعے یونا بنا دیا گیا
 ہے۔ تاہم جتنے عرصے تک مقدمے کو طول دیا جاتا اتنے عرصے
 تک ماروی پھر اپنے یار سے دور ہو جاتی لیکن محبوب پر خدا
 کی رحمت تھی۔ وہ نیکی اور شرافت سے باز نہیں آ سکتا تھا۔
 ماروی کی صاف گوئی نے اور نکاح سے انکار نے
 اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی لیکن اب تک اس کے مزاج
 کے مطابق یہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ماروی کو نقصان پہنچانے
 والا قدم نہیں اٹھائے گا۔

ہاں۔ اب بھی ایک امید اس کے اندر روشن تھی۔ یہ
 نظر آ رہا تھا کہ وہ بونے سے لاکھ محبت کرے لیکن اس کے
 ساتھ میاں بیوی والی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ امید کہہ رہی
 تھی جب ناکامی ہوگی تو یونا مراد بھی نادم ہوگا۔ یہ بڑی خوش
 گوار اور حوصلہ افزا امید تھی۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ بلکہ ایسا ہی
 ہونے والا تھا۔

وہ اس امید کے سہارے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماروی
 اور مراد آئندہ کیسی زندگی گزاریں گے۔ صرف وہی نہیں سمجھا
 اور معروف بھی یہ تماشا دیکھنے کے منتظر تھے۔

اس نے سمجھا سہا سہا کہا۔ ”تم بہت اچھی ہو۔ معروف
 صاحب بھی ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ میری بہترین شریک
 حیات ثابت ہوتی رہو گی۔ میں بھی مانتا ہوں اور اب تو
 تمہاری عزت آبرو کا امین بن چکا ہوں، لیکن...“

وہ ڈراچپ ہوا۔ سمجھا سہا پوچھا۔ ”لیکن...؟“
 اس نے کہا۔ ”ابھی مجھ سے شادی کے لیے نہ کہنا۔
 میں اس بات کی ضمانت دوں گا کہ تم میری بیوی لیکن
 دوسری بیوی۔“

”تعجب ہے۔ کیا اب بھی آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ
 ماروی آپ کی منکوحہ بنے گی؟“

”ہاں، وہ بونے کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزار
 سکے گی۔ میری طرف لوٹ کر آئے گی۔ میں اس کا انتظار
 کروں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی۔“

”میں ماروی کے معاملے میں کسی بات پر اختلاف
 نہیں کروں گی۔ آپ زبان کے دھنی ہیں۔ میں آپ کا
 انتظار کروں گی لیکن ایک شرط پر...“

”میں تمہاری ہر معقول شرط کو مان لیا کروں گا۔“
 ”آپ نے چنگاری بھڑکا دی ہے۔ میں آپ کے
 بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ ہم چوری چھپے ملتے رہیں گے۔“
 اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی شرط معقول بھی تھی اور

ہیرا اور کنکر

ایک قافلہ اندھیری سرنگ سے گزر رہا تھا کہ ان کے پیروں میں کنکریاں چبھیں۔ کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ پیچھے آنے والوں کو نہ چبھ جائیں، نیکی کی خاطر وہ کنکریاں اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیں۔ کچھ نے زیادہ اٹھا لیں، کچھ نے کم۔ جب وہ اندھیری سرنگ سے باہر آئے تو دیکھا ان کے پاس کنکریاں نہیں بلکہ ہیرے ہیں۔

جنہوں نے کم اٹھا لیں، وہ پچھتائے کم کیوں اٹھا لیں۔ جنہوں نے بالکل نہیں اٹھا لیں، وہ بہت زیادہ پچھتائے۔ دنیا کی اس زندگی کی مثال بھی اسی اندھیری سرنگ کی طرح ہے اور نیکیاں یہاں کے ہیرے موتی ہیں۔ اس زندگی میں جو نیکی کی، وہ آخرت میں ہیرے جیسی قیمتی ہوگی اور انسان ترے گا کہ اور زیادہ کیوں نہیں کی۔ سو نیکی چاہے کسی پیاسے کی پیاس بجھا دینا ہی سہی، ہیرے جیسی قیمت رکھتی ہے۔

مرسلہ۔ محمد عثمان انصاری، نیو سینٹرل جیل ملتان

کیو پڈ

محبت کے اس دیوتا کو یونانی اور رومن کیو پڈ کہتے ہیں لیکن اس کا رومن نام زیادہ معروف ہوا۔

یہ اٹھارواں صدی کی آوارگیوں کا نتیجہ تھا اور اس کے مارس سے تعلقات کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اسے محبت کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دیوتا اندھا تھا۔ اس کی تصویر ایک معصوم بچے کی برہنہ تصویر ہوتی ہے جس کے ساتھ ایک ترکش اور ہاتھ میں کمان بنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے ترکش میں دو طرح کے تیر ہوتے تھے۔ ایک سنہرا دوسرا آہنی۔ ان تیروں سے کیو پڈ دیوی دیوتاؤں اور انسانوں کے سپنوں کا نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کیو پڈ کے سنہری تیروں کا نشانہ بننے والے اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتے ہیں جبکہ لوہے کا نشانہ بننے والے ناکام رہتے ہیں۔ کیو پڈ سائیکی سے محبت کرتا تھا لیکن اس کے پاس صرف رات کو جایا کرتا تھا کیونکہ دن بھر ماں اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ اسے پندرہ اوپنر دیوتاؤں کا آخری دیوتا تصور کیا جاتا ہے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ اوپنر کی تعداد بارہ تھی جبکہ باقی ان کے ماتحت دیوتا تھے اور ان کی طاقت وحیثیت اوپنر کی نسبت بے حد کم تھی۔

مرسلہ۔ پرویز احمد۔ میانوالی

نامعقول بھی۔ معقول اس لیے کہ ایک کنواری کو چھیڑ دیا گیا تھا اس کے لیے ایک جیون سا بھی ضروری ہو گیا تھا لیکن وہ انتظار کرنے کو کہہ رہا تھا۔ یہ آگ ایسی ہوتی ہے کہ آگ لگانے والا ہی بجھاتا ہے اور وہ سامنے ہو تو انتظار نہیں ہوتا۔ اور ایک غلطی کرنے کے بعد اسے چھپائے رکھنے کے لیے آئندہ چھپ کر ملتے رہنا گویا ایک غلطی کے بعد غلطیاں کرتے ہی رہنا تھا۔ یہ بات تہذیب اور شرم و حیا کے منافی تھی۔

سمیرا نے کہا۔ ”ہم دین اور ایمان کے حوالے سے گناہ گار بننے رہیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ رازداری سے مجھے منکوحہ بنالیں۔ آپ کی طرف آنے والی ماروی کو یہ کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ آپ مجھ سے شادی کر چکے ہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”آپ اربوں روپے کے کاروبار میں مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ پلیز بھروسہ کریں اور مجھ سے نکاح پڑھالیں۔ میں اپنے والدین کو بھی اتنی بڑی خوش خبری کی خبر نہیں ہونے دوں گی۔“

”میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔ تم بھی مجھ پر بھروسہ کرو۔ صرف ایک ماہ تک صبر کرو۔ پھر جیسے بھی حالات ہوں گے، میں رازداری سے تمہیں دلہن بنالوں گا۔“

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ محبوب نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا پھر خوش ہو کر سمیرا سے کہا۔ ”ماروی کال کر رہی ہے۔“

اس نے مٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بڑے ترنگ میں کہا۔ ”ہاں ماروی! بولو۔“

دوسری طرف سے بہت ہی سرد آواز سنائی دی۔ ”میں چاچی بول رہی ہوں۔“

وہ بھجھ سا گیا۔ اس نے مایوس ہو کر سمیرا کو دیکھا۔ چاچی نے کہا۔ ”ہم نے کرائے کی کوٹھی دیکھ لی ہے، چھٹی رقم بھی ادا کر دی ہے۔ کل یہاں سے جانے والے ہیں۔ تمہیں اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے۔“

”آپ ماروی سے بات کرائیں۔“

”تم جس طرح دھمکیاں دے کر گئے تھے۔ اس کے بعد اس سے بات کرنے کا کوئی رشتہ نہیں رہ جاتا۔ وہ تمہارے احسانات کا بدلہ چکا دے گی لیکن تم سے شادی نہیں کرے گی اور ہم زیادہ بائیں بھی نہیں کرنا چاہتے۔“

رابطہ ختم کر دیا گیا۔ محبوب نے فون کو دیکھا پھر فوراً ہی اس کے نمبر پر کال کی۔ فون کو... کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جاری تھی پھر لائن کاٹ دی گئی۔ محبوب نے پھر

نمبر بچ کے۔ پھر لائن کاٹ دی گئی۔ ایسا تین بار ہوا۔ چوتھی بار ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں؟“

”ایک بار مجھ سے بات تو کر لو۔ پھر چاہو تو کبھی نہ کرنا۔ ماروی...! ہم سب انسان ہیں۔ ہم سب سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی کل بہت بڑی غلطی ہو گئی میں نے فحشے میں الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں۔ خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ میرے تمام احسانات کو بھول جاؤ۔ میں ان کا صلہ نہیں چاہتا اور سچ کہتا ہوں تمہاری مرضی کے بغیر تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مراد تمہیں مبارک ہو۔ ماروی! مجھے کوئی صلہ نہ دو۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے منہ نہ پھیرو۔“

وہ اس سے سمجھوتا کرنے کے لیے پھر سے اس کا دل جیتنے کے لیے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا کہ اب اس کی طلب سے باز آ رہا ہے۔

یعنی آئندہ اس کا طالب نہیں صرف ایک اچھا دوست بن کر رہے گا۔ ایسے وقت دماغ میں یہ بات تھی کہ وہ مراد کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ لوٹ کر اسی کے پاس آئے گی۔ اس لیے پہلے جیسے تعلقات بحال کر رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا، تم مراد کے ساتھ کسی زندگی گزارو گی؟ جیسی بھی گزارو گی میں ہمیشہ کی طرح کسی لالچ یا غرض کے بغیر تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

”اب یہ ساتھ نہیں رہے گا۔ میں کوٹھی چھوڑ کر جارہی ہوں۔“

”بے شک جاؤ اور مراد کے ساتھ جہاں بھی رہو خوش رہو۔ کیا میری نیکیوں کا اتنا سا صلہ بھی نہیں دو گی کہ پہلے کی طرح مجھ پر اعتماد کرو اور دوستی رکھو؟“

بے شک وہ اپنے بہترین رویے سے متاثر کرتا تھا۔ وہ متاثر ہو کر بولی۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔ اپنی نیکیوں سے اور باتوں سے دل جیت لیتے ہیں۔“ وہ بڑی سچائی سے بولی۔ ”آپ میرے اپنوں سے زیادہ اپنے ہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں ہمیشہ کی طرح آپ کی عزت کرتی رہوں گی۔ جب آپ ملنا چاہیں گے ملوں گی جب باتیں کرنا چاہیں گے باتیں کروں گی۔“

”شکریہ۔ اس سے زیادہ تم سے اور کچھ نہیں چاہوں گا۔“

ماروی نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔ پھر سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مراد اور کبڈی کودکھ کر کہا۔ ”محبوب

پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ وہ صحیح معنوں میں فرشتہ ہیں۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں؟“

”وہ تمہارے رقیب نہیں بنیں گے۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔ انہوں نے جو احسانات کیے ہیں اس کے عوض چاہتے ہیں کہ ہماری دوستی اور اپنائیت پہلے کی طرح برقرار رہے۔“

منی نے کہا۔ ”یعنی وہ پھر تمہارے قریب آتے جاتے رہنا چاہتے ہیں۔ کیا مصیبت ہے کیا وہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے؟ کیا ان کی نیت نہیں بدلے گی؟“

ماروی نے کہا۔ ”وہ بدنیت نہیں ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ انہوں نے مراد کی عدم موجودگی سے اور میری مجبوریوں سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایسے نیک انسان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ہمیں ان سے ناراض نہیں رہنا چاہیے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں ان کی نیکی اور شرافت کو دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ ہم پہلے کی طرح ان سے اپنائیت رکھیں گے لیکن فی الحال اپنے نکاح.... میں انہیں شریک نہیں کریں گے۔ کیونکہ تمہارا نکاح مجھ سے پڑھایا جائے گا اور انہیں بتانا ہے کہ تم نے بونے مراد سے نکاح قبول کر لیا ہے۔“

منی نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ نکاح رازداری سے ہوگا اور بعد نماز مغرب ہوگا۔ تمہارے چاچا قاضی صاحب کو لینے گئے ہیں۔ پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔“

ماروی نے جھکی جھکی نظروں سے مراد کو دیکھا۔ وہ ایک طویل انتظار کے بعد جرائم کی دلدل سے نکل کر آیا تھا۔ اب وہ ایک ہی چھت کے نیچے ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ تنہائی میں بھکنے والے تھے۔ اس سے پہلے نکاح پڑھالینا چاہتے تھے اور یہی دانش مندی تھی۔

چاچا قاضی صاحب کو لے آئے۔ پھولوں کے ہار اور مٹھائی بھی لے کر آئے تھے۔ منی نے ایک ہار ماروی کے گلے میں اور ایک مراد کے گلے میں ڈالا۔ قاضی صاحب نے نکاح نامے کی خانہ پری کی۔ پھر انہوں نے دونوں سے نکاح قبول کر لیا۔ نکاح چند منٹوں میں ہو گیا۔ اگر حساب کیا جائے تو وہ کئی صدیوں سے ٹھوکریں کھانے اور مایوس ہوتے رہنے کے بعد منزل مقصود تک پہنچے تھا۔

اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی مراد ماروی منی اور عبداللہ کبڈی نے پہلی بار ایک ساتھ نماز قائم کی۔ اپنے معبود کا شکریہ ادا کیا۔ وہ سب موجودہ حالات سے مطمئن تھے۔ وہ معبود وہ پاک پروردگار رفتہ رفتہ ان کی مشکلیں

ابھی آگے اور مسائل تھے۔ دشمن ختم نہیں ہوئے تھے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی اسے تلاش کر رہے تھے اور وہ تمام مخالفین ان کی ازدواجی زندگی کو منتشر کرنے والے تھے۔ ایک اللہ ہی تھا۔ ایک نماز ہی تھی جو مراد پر سایہ فلکں رہنے والی تھی۔

اس نے نماز کے بعد ماسٹر کو بوکو خوش خبری سنائی۔ ”ماسٹر! میری مرادیں پوری ہو گئی ہیں۔ آج میں نے اپنی ماروی کو اپنی دلہن بتالیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”مبارک ہو۔ تمہاری ہر خوشی میری خوشی ہے۔ میں تم دونوں کی سلامتی چاہتا ہوں۔“

پھر اس نے سمجھایا۔ ”مراد! تم پاکستان میں ہونے مراد کا کھیل ہمیشہ نہیں کھیل سکو گے۔ اپنی محبت کو پالنے کی خوشی میں دشمنوں کو نہ بھولو۔ تمہیں وہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہنا چاہیے۔“

”میں ماننا ہوں۔ زیادہ دنوں تک ہونے مراد کے پیچھے چھپ کر نہیں رہ سکوں گا۔ یہاں آستین کے سانپ ہو سکتے ہیں۔ مگر کیا کروں؟ مجھے اپنے وطن کی مٹی سے پیار ہے۔ میں کسی بھی طرح یہاں رہنا چاہتا ہوں۔“

”وہاں ضرور رہو لیکن حالات سے باخبر رہ کر جگہ بدلتے رہو۔ تم میاں بیوی کو ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا چاہیے۔ اپنی ماروی کو ایک محدود ماحول سے نکالو۔ میں تین ٹکٹیں بھیج رہا ہوں۔ پہلے وہاں سے لندن جاؤ۔ عبداللہ کبڈی کو لندن میں چھوڑ کر شریک حیات کے ساتھ سوئٹزرلینڈ جاؤ۔“

وہ ان کے ہنی مون کے لیے پروگرام بنا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”وہاں کے سیون اسٹار ہوٹل میں تمہارے لیے ایک سویٹ بک رہے گا۔ اپنی ماروی کو دنیا دکھاؤ۔ دوسرے ملکوں میں بھی جاؤ۔ پھر جب چاہو پاکستان جاتے رہا کرو۔“

”او کے ماسٹر! میں دو چار دنوں میں یہاں سے نکل جانا چاہوں گا۔ لندن کے لیے یہاں شیپ کنفرم کرا لوں گا۔ آپ وہاں سے سوئٹزرلینڈ کے لیے انتظامات کریں۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ منی نے کہا۔ ”یہ اچھا ہے تم کچھ عرصے کے لیے ماروی کو یہاں سے لے جاؤ۔“

چاہانے کہا۔ ”ہم نے بہت مہنگی کوٹھی کرائے پر لی ہے۔ یہ دونوں چلے جائیں گے تو کیا ہم اکیلے رہیں گے؟“

منی نے اسے بچوں کی طرح ہچکارتے ہوئے کہا۔ ”تم وہاں اکیلے میں نہ رنا۔ میں رہوں گی نا۔“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ماروی نے شہزاد کو پیار کیا پھر اسے مراد کی گود میں دے کر کہا۔ ”یہ میرے لیے لگی ہے، بیٹے کے آتے ہی اس کا باپ بھی میری زندگی میں آگیا۔ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

منی نے کہا۔ ”نہیں بیٹی! ابھی نئی زندگی شروع کر رہی ہو۔ بیٹے کو کچھ دنوں کے لیے بھول جاؤ۔ یہ میرے پاس رہے گا۔“

مراد نے چاچی کی تائید کی۔ منی وہاں سے اٹھ کر بولی۔ ”میں محبوب کو شادی خانہ آبادی کی اطلاع دینے جا رہی ہوں۔“

اس نے کن آنکھوں سے مراد کو دیکھا پھر وہاں سے جانے لگی۔ وہ بھی شہزاد کو چاچی کے حوالے کر کے اس کے پیچھے بیڈ روم میں آگیا۔ وہ فون اٹھا کر نمبر شیخ کرنا چاہتی تھی۔ مراد نے فون کو چھین کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر کر بولا۔ ”پہلے سہاگ رات...“

کتنے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ رات آئی تھی۔ اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ یہ طویل سفر زیادہ تر ایک رقیب کے سائے میں کرتی رہی تھی۔

دیکھا جائے تو اس رقیب کی مہربانیوں نے اور دیانت دار کرنے اسے عزت آبرو کے ساتھ مراد کی آغوش میں پہنچایا تھا۔

وہ ایک اتار اور دو پیار کا قصہ ختم ہو چکا تھا۔ ماروی ازدواجی مسرتوں کی ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اب ایک سہاگن ماروی کی زندگی نئے ہنگاموں سے گزرنے والی تھی۔

☆☆☆

سمیرا صبح اپنے گھر گئی تھی لیکن دل محبوب کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس کی خدمت گزاری کے بہانے اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ محبوب کو کھانے میں مچھلیاں اور جھینگے پسند تھے۔ وہ اپنی ماں سے پکوا کر اس کے لیے رات کا کھانا لے آئی۔ شام کے سات بجے تھے اس نے وقت اور موسم کی مناسبت سے بہت ہی دیدہ زیب لباس زیب تن کیا تھا۔ یوں بھی وہ ماڈلنگ کی دنیا میں ملبوسات کی شہزادی کہلاتی تھی۔ محبوب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہت خوب صورت لگ رہی ہو تمہیں دل میں گھسنے کا ہنر آتا ہے۔“

وہ قریب ہو کر اس کے بازوؤں میں گھس گئی۔ ایک باس اور پرسل سیکریٹری کا فاصلہ ختم ہو چکا تھا۔ محبوب کی

سجیدگی اور محتاط رہنے والی عادت ہوا ہو گئی تھی۔

سمیرا واقعی ہوا کا رخ بدلنا جانتی تھی۔

فون سے ابھرنے والی رنگ ٹون نے محبوب کا رخ بدل دیا۔ ننھی سی اسکرین ماروی کا نام لے رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی اسے اٹھا کر کان سے لگانا چاہا تو سمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر مسکرا کر وائڈ اسمیلر کو آن کر دیا۔

اب وہ محبوب کے ایسے معاملات میں مداخلت کی حق دار ... ہو گئی تھی۔ اس نے مٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا تو مایوسی ہوئی۔ چاچی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”محبوب میاں! ایک خوش خبری سن رہی ہوں۔ امید ہے آپ سن کر خوش ہوں گے۔“

وہ بولا۔ ”خوش خبری بھی کو خوش کرتی ہے۔ آپ خوش کرنا چاہتی ہیں تو ماروی سے بات کرا لیں۔“

”وہ برائی ہو چکی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”لڑکیاں دلہن بن کر پرانی ہو جاتی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے مراد سے اس کا نکاح پڑھا دیا ہے۔“

محبوب کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے سمیرا کو دیکھا۔ وہ سن رہی تھی اور فون کو تنک رہی تھی۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ آخر ہونے والی سوکن اپنے ٹھکانے لگ گئی تھی۔

محبوب نے پوچھا۔ ”کیا واقعی...؟“

”کیا تمہیں یقین نہیں ہو رہا ہے؟“

”ہاں۔ یا۔ یا۔ یقین کیوں نہیں ہوگا...“

وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ”لیکن... یہ... اچانک اتنی جلدی...؟ میرا مطلب ہے... مجھے تو نکاح میں شریک کرنا چاہیے تھا۔ چا... جی...! میں کوئی دشمن تو نہیں ہوں۔“

منی نے کہا۔ ”دشمن نہیں ہو لیکن مراد کے رقیب رہ چکے ہو۔ پچھلی بار تلخیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کی عدم موجودگی میں یہ کام ہو جائے۔“

محبوب نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”وہ باڈی بچپن سے اسی کی تھی۔ میں ابھی اسے دلہا کے پاس سہاگ کی بیج پر پہنچا کر آئی ہوں۔“

وہ یکبارگی انگاروں کی بیج پر پہنچ گیا۔ سمیرا کے پاس چپ چاپ پہلو بدلنے لگا۔ چاچی نے کہا۔ ”فون میرے پاس ہے۔ وہ کل صبح بات کر سکے گی۔“

محبوب نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس نے فون کو اتنی سختی سے منہ میں جکڑا تھا جیسے وہ مراد کی گردن ہو۔ اس سے پہلے

کہ وہ اسے ٹھٹھ سے پھینکتا۔ سمیرا نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر اس سے لگ کر بولی۔ ”آپ آرام سے بیٹھیں، کچھ نہیں ہوا ہے۔“

وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔ ”ابھی ایک ایسی بات کہوں گی کہ آپ یہ صدمہ بھول جائیں گے۔“

”یہ صدمہ تو بھی دل سے نہیں جائے گا۔“

”جائے گا... آپ... ہتھ سے نہیں عقل سے سوچیں! یہ ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔“

وہ اسے شانے سے الگ کرتے ہوئے تعجب سے بولا۔ ”شادی نہیں ہوئی ہے...؟ کیا کہہ رہی ہو؟“

”یہ سمجھنے کی بات ہے۔ آپ سمجھیں۔ مراد سے ماروی کے عشق کا یہ آخری سین ہے۔ وہ صبح سے پہلے بونے کو سہاگ کی بیج سے نیچے پھینک دے گی۔“

جیسے ڈوبنے والے کو سہارا مل گیا۔ اس نے چونک کر سمیرا کو دیکھا۔ پھر خوشی سے چیخ پڑا۔ اسے آغوش میں بھر کر بولا۔ ”واہ...! کیا بات کہہ دی ہے تم نے... میں غصے میں بھول گیا تھا کہ وہ بونا ہے۔ بونا...“

وہ تہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”کل صبح ہی اس معتمد خیز شادی کا نتیجہ سب کے سامنے ہوگا۔“

وہ دل کھول کر ہنسنے لگا۔ سمیرا کو بھینچ کر پیار کرنے لگا۔

”تم بہت اچھی ہو۔ میرے مزاج کو گہرائیوں تک سمجھتی ہو۔“

وہ اسے ایسے چوم رہا تھا جیسے آغوش میں ماروی آگئی ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم میری بہترین شریک حیات ثابت ہوگی۔ ذرا صبر کرو۔ کل دیکھتے ہیں کیا تماشا ہوگا؟“

”جو کہہ رہی ہوں وہی ہوگا۔“

وہ اسے جکڑ کر بولا۔ ”ایک بار وہ پلٹ کر میرے پاس آ جائے۔ میری دیوانگی کو سکون حاصل ہو جائے۔ اور۔ اور میرا جنون ختم جائے۔ پھر...“

اس نے پوچھا۔ ”پھر...؟“

”اس کے بعد وہ گھر میں عام بیوی کی طرح پڑی رہے گی۔ تم اونچی سوسائٹی میں میرے شانہ بشانہ رہا کرو گی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”اور ایک مشورہ دوں؟“

”ہاں، بولو؟“

”ابھی فون پر منی چاچی کو مبارک باد دیں۔ ماروی کی شادی پر خوشی کا اظہار کریں۔ ان سے بولیں کہ کل صبح آپ میاں بیوی کے لیے تحفے لے کر آئیں گے۔“

وہ انکار میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ بولی۔ ”اس طرح آپ کل ماروی کو رو برو دیکھ کر اس کے

چند سے اور اس کے لہجے سے معلوم کر سکیں گے کہ بونے مراد کے ساتھ اس کی سہاگ رات کیسی گزری ہے؟" وہ پھر ایک بار خوشی سے ہل گیا۔ کل ماروی کو دیکھ سکے گا۔ وہ اسے چوم کر بولا۔ "واہ کیا بات ہے سمیرا...! تم نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں تجھے پیش کرنے کے بہانے جاؤں گا اور اسے قریب سے پرکھ سکوں گا۔"

اس نے چاچی کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں، لائن کٹ گئی تھی۔ پوری بات نہ کہہ سکا۔ میں ماروی کی خوشی میں خوش ہوں۔ کل صبح دونوں میاں بیوی کو مبارکباد دینے اور تجھے پیش کرنے آؤں گا اور انہیں دل سے دعائیں دوں گا۔"

ممتی نے کہا۔ "آپ آئیں، ہمیں خوشی ہوگی لیکن ماروی اب آپ سے تجھے کے نام پر کوئی چیز نہیں لے گی۔ آپ اس کے لیے صرف ایک پھول لے آئیں... اوہو... یہ شہزاد پریشان کر رہا ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ ممتی چاچی کا انداز ایسا ہی تھا جیسے پیچھا چھڑا کر گئی ہو۔ محبوب اتنا خوش تھا کہ اس نے مانتہ نہیں کیا۔

سمیرا نے کہا۔ "چلیں، سستے چھوٹ رہے ہیں۔ وہ تجھے کے طور پر صرف پھول قبول کرے گی۔ میں چاہتی ہوں آپ اسے گلاب کی ایک کلی پیش کریں۔"

"وہ اب کلی کہاں رہی ہے کہ اسے کلی پیش کروں گا۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ "آپ اس کے ہاتھ میں کلی دیں گے۔ وہ کلی زبان بے زبانی سے پوچھے گی کہ اس بونے کی سچ پر پھول بن چکی ہو یا ابھی تک کلی ہو۔"

وہ جنتے ہوئے سمیرا کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "واہ تم نے اشاروں میں کہنے والی کیا بات کی ہے۔"

میں اسے گلاب کی سرخ کلی پیش کروں گا۔"

کال بیل کی آواز سنائی دی۔ سمیرا اس سے الگ ہو کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ محبوب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

معروف جگہ آیا تھا۔ وہ اندر آنے سے پہلے ذرا ٹھنک گیا۔ اس نے ایک نظر محبوب پر ڈالی۔ پھر دور بیٹھی ہوئی سمیرا کو دیکھا۔

محبوب نے پوچھا۔ "آپ رک کیوں گئے؟ اندر آئیں۔"

وہ بولا۔ "میں تو اندر آؤں گا لیکن تم پہلے اپنے کمرے میں جاؤ اور آئینہ دیکھو۔"

اس نے اپنے آپ کو ٹٹولنے والے انداز میں ادھر ادھر سے چھو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے معروف صاحب؟"

"میں نے کہا تھا۔ کمرے میں جاؤ۔ معلوم ہو جائے گا۔"

وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سمیرا خود

کو چھوٹے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کی الالی درست کر رہی تھی۔ اس نے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آج سنڈے ہے۔ پھر بھی چلی آئی۔ محبوب صاحب سے چیک پر دستخط لینے تھے۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم صفائی کیوں پیش کر رہی ہو؟ کیا میں نے یہاں آنے کی وجہ پوچھی ہے؟ ہم تم دن رات کسی وقت بھی محبوب سے ملتے رہتے ہیں۔"

پھر وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ "یہ میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ تم نے اسے جیت لیا ہے۔ اب وہ بزنس کی طرف پوری توجہ دے گا۔ تم اسے بہت ایزی لی ہینڈل کر سکو گی۔ چلو صاف صاف بولو۔ کہاں تک پہنچی ہو؟"

وہ اسے بتانے لگی۔ محبوب نے کمرے میں آ کر آئینے میں خود کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ معروف کے سامنے بھید کھیل گیا ہے۔ سمیرا کے لبوں کی لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر منتقل ہو گئی تھی اور شرٹ کے سنے پر بھی سرخ دھبے تھے۔ سمیرا کے سر کے دو بال شرٹ کے بٹن سے الجھ کر وہیں رہ گئے تھے۔

اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔ میں معروف صاحب سے چھپانا چاہتا تھا۔ وہ تو کب سے چاہتے ہیں کہ میں سمیرا کو شریک حیات بنالوں۔"

اب وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میں اتنی جلدی اس سے شادی نہیں کروں گا۔ ہر حال میں اس بے وفا کا انتظار کروں گا۔"

اس نے داش روم میں آ کر منہ کو اچھی طرح دھویا پھر شرٹ تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ معروف نے کہا۔ "محبوب! آج تم نے اس بوڑھے کو بہت بڑی خوشی دی ہے۔"

محبوب نے ایک گہری سانس لی۔ بھید کھل چکا تھا۔ معروف کہہ رہا تھا۔ "تم دانائی کی طرف آرہے ہو۔ نادانی کو تھوک دو محبوب! تم نے ایک طویل عرصے تک نیکیاں کر کے دیکھ لیں۔ وہ شروع سے بے وفا تھی۔ بے وفا ہے اور بے وفار ہے گی۔"

وہ ماروی کے خلاف ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوراً خاموش تھا۔ معروف نے کہا۔ "ابھی سمیرا نے بتایا ہے۔ کل تم... سے نکاح نہ قبول کرنے والی نے آج اس بونے مراد سے نکاح قبول کیا ہے۔ وہ کھل کر تمہاری انسلٹ کر رہی ہے۔ تمہارے تمام احسانات اور نیکیوں کو مٹی دھول کر رہی ہے۔"

اس نے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے

سامنے بیٹھی ہے، تم دیکھو گے کہ یہ کس طرح بزنس منڈل کرے گی اور منافع کے گراف کو اوپر لے جائے گی۔ اب تم نے صحیح معنوں میں اپنی ذہنی سطح پر، تعلیمی سطح پر اور ادنیٰ سماجی سطح پر آکر سمیرا کا ہاتھ تھاما ہے۔ میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "معروف صاحب! میں ہمیشہ سے مانتا آ رہا ہوں کہ آپ اور سمیرا دن رات میری بھلائی کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ لیکن میں سمیرا کو جلدی شریک حیات نہیں بنا سکوں گا۔"

"مجھے سمیرا نے بتایا ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ بے شک اپنے جنون کو سرد کرنے کے لیے ماروی کو ضرور حاصل کرو۔ خدا کرے بونے سے اس کی شادی ناکام رہے اور وہ تمہاری طرف لوٹ آئے۔ سمیرا کو اس کی سوکن بننے پر اعتراض نہیں ہے۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میرا دعویٰ ہے آئندہ تم خود ہی دیکھو گے کہ سمیرا کے مقابلے میں ماروی ایک ناکام شریک حیات ثابت ہوگی۔"

سمیرا نے کہا۔ معروف صاحب! کل ہم بھی ماروی کو مبارک باد دینے جا ئیں گے۔"

ان تینوں کے دلوں میں کھلبلی سی تھی۔ آنے والا دن بڑی دلچسپیاں لانے والا تھا۔

☆☆☆

وہ بچپن کی آرزو تھی اور برسوں کی تمنا تھی۔ اسے پا کر وہ اپنی قسمت پر فخر کرتا رہا۔ ساری رات سو نہ سکا۔ ماروی اس کے سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ تب یلکھت مرینہ یاد آئی۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماروی کی موجودگی میں وہ کیوں یاد آ رہی ہے؟

اس نے سینے سے لگ کر سونے والی کو دیکھا۔ تب یہ فرق سمجھ میں آیا کہ مرینہ تھک ہار کر سونا نہیں جانتی تھی۔ جاگتی تھی اور ہمیشہ ایکشن میں رہنے والی بڑی دلچسپیاں پیدا کرتے ہوئے جگاتی رہتی تھی۔ اس نے جلد ہی اسے ذہن سے نکال دیا۔ خوابیدہ ماروی کو دیکھتے دیکھتے سو گیا۔ دوسری صبح وہ دونوں خوش تھے۔ مراد نے لاشعوری طور پر کوئی کمی محسوس کی تھی لیکن اسے شعوری طور پر سمجھ نہیں پایا تھا۔

صبح میں انہوں نے چاچی اور چاچا کو سلام کیا۔ ان سے دعائیں لیں، عبداللہ کبڈی نے مراد سے مصالحت کرتے ہوئے کہا۔ "اب پوزیشن تبدیل کرو، میں ماروی کے ساتھ رہوں گا۔ محبوب وغیرہ کسی وقت بھی آنے والے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "میں باہر جا رہا ہوں۔ کل کسی فلائٹ میں سیٹیں حاصل کروں گا، کچھ ضروری شاپنگ کروں گا۔ مجھے ذرا دیر ہوگی۔ دوپہر تک واپس آؤں گا۔"

ماروی نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میرے اکاؤنٹ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے ہیں، تم انڈیا سے جو بھیجتے رہے وہی بینک میں پڑے ہیں۔"

وہ بولا۔ "پڑے رہنے دو اور رقم آجائے گی۔ ہم جو ہنی مون کے لیے جا رہے ہیں اس کے تمام اخراجات ماسٹر برداشت کرے گا۔ میرا ارادہ ہے یہاں واپس آکر کوئی کاروبار شروع کروں گا۔"

کاروبار نہ اس نے کبھی کیا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ محض سماجی زندگی گزارنے کے لیے اپنی ذات پر ایک بزنس مین کا لیبل لگانا چاہتا تھا۔ حقیقتاً اسے کبھی دشمنوں سے نجات مل ہی نہیں سکتی تھی۔

کاروبار میں مشینیں چلتی رہیں تو دولت آتی رہتی ہے وہ گن چلاتا رہتا تو اس کا بینک اکاؤنٹ ہمیشہ کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا۔

مراد نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ماروی کو پیار سے دیکھا پھر ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماروی اور منی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ عبداللہ کبڈی نے کہا۔ "میں لباس چھینج کرنے جا رہا ہوں۔ ابھی مجھے دلہے کی شان سے رہنا چاہیے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہ چلا گیا۔ منی نے ماروی کو بڑی محبت سے دیکھا پھر پوچھا۔ "بیٹی! خوش تو ہونا؟"

وہ چاچی کے گلے لگ کر بولی۔ "میں بیان نہیں کر سکتی کہ کتنی خوش ہوں۔ انتظار کرتے کرتے کتنے زمانے گزر گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جہنم سے سزائیں پانے کے بعد جنت میں آگئی ہوں۔ اب تو مراد کو کہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"خدا نہ کرے وہ تمہیں چھوڑ کر اب کہیں جائے۔ ہم سب ساتھ رہا کریں گے۔"

مراد کی قربت سے دل نہیں بھرا تھا۔ وہ اسے تصور میں دیکھ رہی تھی اور وہ ڈرائیو کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ "میری ماروی مجھے مل ہی گئی۔ اس پہلی رات تک پہنچنے کے لیے میں گن اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ آئے دن آگ اور خون کے دریا سے گزرتا رہا۔ عشق کے مراحل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آزمائشوں سے گزرتے رہنا پڑتا ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ اچانک ہی ونڈ اسکرین پر مرینہ انگڑائی لینے لگی۔ وہ پتا نہیں کیوں اچانک خیالوں میں آنے لگی تھی۔

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ پچھلی رات اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ ماروی کی بیج پر مرینہ کیوں یاد آئی تھی؟

ماروی کی سادگی اور مرینہ کی ہنگامہ خیزی کا فرق معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دھوپ تھی اور یہ چھاؤں... ماروی سیدھی سادی دھمی سی تھی۔ اسی بیج پر مرینہ آندھی بن کر اڑا لے جاتی تھی۔ وہ ماروی سے مطمئن تھا۔ آسودہ تھا۔ لیکن موسم سرما میں انگاروں سے نہیں شعلوں سے حرارت ملتی ہے۔

وہ سوچنے لگا۔ "میری ماروی ایک سیدھی سی گھر گرہستی والی لڑکی ہے۔ میں اسے رفتہ رفتہ شعلہ بننا سکھاتا رہوں گا۔"

اس نے ذہن سے مرینہ کو جھٹک دیا۔ وہ ونڈ اسکرین سے غائب ہو گئی۔ فی الحال کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

محبوب، سمیرا اور معروف ٹھیک دس بجے آگئے۔ چاچا اور چاچا نے ان کا استقبال کیا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں سرخ گلاب کی دودھ کلیاں تھیں۔

معروف نے ممتی اور چاچا بھروسے شکایت کی۔ "ہم آپ کے اپنے ہی ہیں۔ ایک ذرا سی رنجش پیدا ہو گئی تھی اور آپ نے اسے دل پر لے لیا۔ ہمیں ماروی کی خوشی میں نہیں بلایا۔"

ممتی نے محبوب کو دیکھ کر کہا۔ "یہ بات نامناسب ہوتی کہ ماروی نے جس کے ساتھ نکاح سے انکار کیا اسے اور اس کے عزیزوں کو اپنے نکاح میں بلایا جائے۔ ہم نے بعد میں اطلاع دی۔ یہ آپ کا بڑا اپنا ہے کہ مبارک باد دینے آئے ہیں۔"

عبداللہ کبڈی ڈرائنگ روم کے دروازے پر آیا اور دو لمبے کی شان سے آیا۔ اس نے ریشمی کڑھائی کی ہوئی قمیص اور چست پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا۔ کلائیوں میں موتیوں کا گجرا خوشبودار رہا تھا۔

اسے دیکھنے والے یہ سوچ کر آئے تھے کہ ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح اس کا سر جھکا ہوا ہوگا لیکن وہ ان کی توقع کے خلاف سینہ تان کر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا آیا اور سلام کرتے ہوئے ان سے مصافحہ کرنے لگا۔ وہ تینوں حیران تھے اور اسے گلاب کی ایک ایک سرخ کلی پیش کرتے ہوئے مبارک باد دے رہے تھے۔ اسے بڑی توجہ سے دیکھتے

بھی جا رہے تھے۔

دیکھنا کیا تھا؟ اس کا انداز ایسا تھا کہ ابھی میدان مار کر آ رہا ہو۔ چہک چہک کر بول رہا تھا۔ "خدا کا شکر ہے، میں نے برسوں تک ترستے رہنے کے بعد اپنی ماروی کو دلہن بنا ہی لیا۔ میرے جیسا خوش نصیب کوئی نہ ہوگا۔"

سمیرا کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اس نے بیڈروم کی سمت جانے والے دروازے کو دیکھتے ہوئے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ "ماروی کہاں ہے؟"

"میرے مٹے کو سنبھال رہی ہے۔"

سمیرا نے مسکرا کر محبوب کو دیکھا۔ ممتی نے اٹھ کر کہا۔ "میں جا کر شہزاد کو سنبھالتی ہوں۔ ماروی کو ابھی بھیجتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد محبوب نے طنزیہ انداز میں کبڈی کو دیکھا پھر کہا۔ "میں نے دیکھا ہے ماروی کا بیڈ بہت اونچا ہے۔ تم اس پر چڑھ جاتے ہو؟"

وہ بولا۔ "میں نے جمناسٹک کے کرتب سیکھے ہیں۔ فضا میں قلابازی کھا کر بیڈ پر پہنچ گیا تھا۔"

محبوب نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے جمناسٹک کے کرتب بھی سیکھ لیے ہیں۔"

"ابھی یقین دلاتا ہوں۔ سانچ کو آئینچ کیا ہے یہ لو۔"

اس نے پنجنوں کے بل اچھلتے ہوئے "ہا۔ ہپ۔ ہپ۔" کی آواز نکالی پھر فضا میں اچھل کر محبوب کے سر پر سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔

تینوں نے حیرانی سے گھوم کر اسے دیکھا۔ ایسی قلابازی ایسی چھلانگ انہوں نے کبھی فلموں میں دیکھی تھی۔ وہ پنجنوں کے بل اچھل رہا تھا۔ اس نے پھر اسی طرح کی آواز نکالی۔ فضا میں اچھل کر وہی تماشا دکھایا۔ محبوب کے سر پر سے گزرتا ہوا اپنی پہلی جگہ واپس آ کر کھڑا ہو گیا۔ داد و وصول کرنے کے انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "سائیں! جب میں ضد میں آ کر بددوق اٹھا کر خطرناک مجرموں کے پسینے چھڑا دیتا ہوں تو یہ جمناسٹک کیا چیز ہے؟ آدمی کو جتنا ہنر آئے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں تو جوڈو کراٹے اور تلواری بازی بھی سیکھ رہا ہوں۔"

وہ تینوں اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ کبڈی ہنستے ہوئے اچھل کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا بتاؤں ماروی کتنی حیران ہو رہی تھی۔ سچ کہتا ہوں... وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "ایسی جمناسٹک والی رات اس دنیا کی کسی دلہن نے نہیں منائی ہوگی۔ وہ بہت

نے فون کیا ہے۔ کل صبح دس بجے لندن کی فلائٹ ہے۔
ماروی نے کہا۔ ”تم نے تو کہا تھا، ہم ہنی مون
سوئٹرز لینڈ میں منائیں گے۔“

”ہاں مگر ایمان علی کے ڈیڑی ہم میاں بیوی کو اپنے
گھر انوائٹ کر رہے ہیں۔ ہم وہاں ایک دن رہ کر دوسرے
دن سوئٹرز لینڈ چلے جائیں گے۔“

وہ تینوں ان کی باتیں سن رہے تھے اور ماروی کا
سرتوں سے کھلا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس کی ہنسی
سرتوں کا یقین اس طرح بھی ہو رہا تھا کہ وہ ہنی مون کے
لیے جانے والی تھی۔

چاچا کھانے کی ٹرالی ان کے سامنے لے آیا۔
معروف نے کہا۔ ”یہ کوئی کھانے کا وقت نہیں ہے۔“

ماروی اٹھ کر ٹرالی کے پاس آئی۔ مٹھائی کی پلیٹ اٹھا
کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”کھانے کا وقت نہ
سہی میری شادی کی خوشی میں منہ تو میٹھا کریں۔“

محبوب نے اسے حیرت اور حسرت سے دیکھا۔ وہ
اپنی شادی کی مٹھائی کھانا چاہتا تھا۔ اس کی ہونے والی دلہن
پر اپنی ہو کر اسے اپنی.... از دوامی زندگی کی مٹھائی پیش کر
رہی تھی۔

وہ اخلاقاً انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہت مجبور ہو کر
مٹھائی کا ایک پیس اٹھاتے ہوئے چور نظروں سے اسے
دیکھا۔ ان لمحات میں اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”یہ
نہیں ہو سکتا... یہ کیسے ہو گیا...؟“

”گیند کی طرح فضا میں اڑنے اور قلابازی کھانے
والے نے چھکا کیسے مارا ہے...؟“

وہ تماشاً دیکھنے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں جو دیکھنا چاہتی
تھیں وہ تماشاً نظر نہیں آ رہا تھا۔ خلاف توقع شادی خانہ
آبادی ہوئی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ماروی! خوش
رہو میں مبارک باد دینے آیا تھا۔ اب مجھے جانا چاہیے۔ پھر
کبھی آؤں گا۔“

وہ جواب نے بغیر اس سے منہ پھیر کر تیزی سے چلتا ہوا
باہر چلا آیا۔ سمیرا اور معروف بھی اس کے پیچھے آ گئے۔ معروف
اپنی کار میں سمیرا کے ساتھ آیا تھا تا کہ وہ محبوب کے ساتھ کار
میں نہ بیٹھے اور نہ ہی کوئی ان کے متعلق باتیں بتائے۔

وہ معروف کی کار کی طرف جانے لگی تو محبوب نے
اپنی کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کہا۔ ”یہاں آؤ۔“
وہ خوشی سے کھل گئی۔ اس کی کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ معروف

محبوب سن رہا تھا کہ ماروی خوش ہے۔ یہ خبر اسے
مایوس کر رہی تھی۔ اس وقت کبڈی کے فون سے رنگ ٹون
ابھرنے لگی۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں بولو
ایمان علی! کہاں ہو؟ کیا ٹکٹیں ہو گئیں؟“

اس نے دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ ”اچھا ہے
پہلے ہم لندن جائیں گے پھر سوئٹرز لینڈ...“

وہ فون پر بول رہا تھا۔ معروف محبوب کی طرف جھک
کر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ ”تمہیں مایوس نہیں ہونا
چاہیے۔ ماروی اس کے ساتھ خوش ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ہونا
ڈیٹیکٹس مار رہا ہے۔“

اسی وقت وہ آگئی۔ اس نے گوری رنگت پر گہرے
رنگ کا لباس پہنا تھا۔ چہرے کی شادابی کہہ رہی تھی کہ وہ کلی
سے پھول بن گئی ہے۔ اس نے مسکرا کر انہیں سلام کیا۔ پھر
آگے بڑھ کر سمیرا کے گلے لگ گئی۔ سمیرا نے اس کے کان
میں کہا۔ ”میرے اندر ہلچل سی مچی ہے۔ پلیز اکیلے میں کچھ
باتیں کر لو۔“

ماروی نے مسکرا کر کہا۔ ”ادھر دروازے کی طرف چلو۔“
وہ دونوں وہاں سے ذرا دور ڈرائنگ روم کے
دوسرے دروازے کے پاس آ گئیں۔ سمیرا نے سرگوشی میں
کہا۔ ”مانسڈ نہ کرو تو ایک بات کہوں گی۔“

وہ بولی۔ ”میں بہت خوش ہوں۔ جو بولنا چاہتی
ہوں، بولو۔“

اس نے کہا۔ ”میں سوچ رہی تھی ایک بونے کے
ساتھ تمہاری سہاگ رات ناکام رہے گی۔“

ماروی گلے لگ کر بولی۔ ”ناکامی کا تو سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ مجھے صرف ایک مراد ہی نہیں ملا ہے۔ گن گن
کر من کی مرادیں بھی ملی ہیں۔“

وہ بے یقینی سے پھر کان میں بولی۔ ”ماروی...! وہ
وہ آدمی سے بھی آدھا ہو گیا ہے۔ پوری خوشیاں کیسے مل
سکتی ہیں؟“

وہ بھی اس کے کان میں بولی۔ ”یقین کرو سہاگ
رات کے کسی ایک پل میں بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ ہونا
ہو گیا ہے۔ جیسے پہاڑ تھا، ویسا ہی لگ رہا تھا۔“

وہ حیرانی سے بے یقینی سے منہ کھول کر اسے دیکھنے
لگی۔ ماروی یقین نہ کرنے والی بات کر رہی تھی۔

وہ مسکراتی ہوئی اس سے الگ ہو کر کبڈی کے پاس
گئی۔ پھر صوفے پر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ بولا۔ ”ابھی ایمان

نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "محبوب! یہ کیا کر رہے ہو؟"
وہ اپنی اسٹیرنگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔
"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ آپ آفس
جائیں! میں شام کو سمیرا کے ساتھ آؤں گا۔"

اس نے کار میں بیٹھ کر اسے اشارت کیا۔ پھر تیزی
سے ڈرائیو کرتا ہوا ماروی سے دور جانے لگا۔ اس وقت اس
کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے اپنے عشق پر اپنی دیوانگی پر لعنت بھیج
کر جا رہا ہو۔

سمیرا نے اسے دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔ پھر چپ
رہی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ غصے میں بھرا بیٹھا
تھا۔ ایسے وقت بولنے والی پر پھٹ پڑے گا۔

وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ پھر اسٹیرنگ پر
ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "عقل نہیں مان رہی ہے۔ میں
کیسے جان لوں کہ ایک بوٹا اپنے سائز سے دوگنی سائز والی کو
سر کر چکا ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "میں نے اسے الگ لے جا کر پوچھا
تھا کہ ایک بونے کے ساتھ سہاگ رات کیسی گزری۔ اس
نے جواب دیا کہ رات کے کسی ایک پل میں بھی محسوس نہیں
ہوا کہ وہ بوٹا ہے۔ جیسے پہلے پہاڑ تھا، ویسا ہی لگ رہا تھا۔"
"میں کیسے مان لوں؟" وہ اس کی طرف منہ کر کے چیخ
پڑا۔ "عقل کیسے مانے گی؟"

اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالا پھر دوسرا
ہاتھ سمیرا کے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔ "کیا تم مانتی ہو کہ
وہ سچ کہہ رہی ہے؟ کیا تمہاری عقل تسلیم کر رہی ہے؟"
"وہ جھوٹ کیوں بولے گی؟"

"اس لیے بولے گی کہ بونے سے شادی کر کے بہت
بڑی غلطی کی ہے۔ اب اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہمارے
سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔"

"نہیں محبوب! کیا تم نے اس کے چہرے کی شادابی،
اس کی مسرتیں نہیں دیکھیں۔ اس کے کھلتے ہوئے اور چمکتے
ہوئے لب و لہجہ کو نہیں سنا۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "وہ ایک چلو
پانی ہے اور ماروی ایسے مطمئن اور سرشار ہے جیسے سمندر پی لیا
ہو۔ یہ پاگل کر دینے والی بات ہے سمیرا!... میں کیسے یقین
کر لوں؟ بے یقینی کی پھانس میرے اندر سے نہیں نکلے گی۔"
"ابھی یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ وہ
آپ کے دماغ میں پھنسی ہوئی ہے۔ ابھی مضبوط قوت
ارادی سے فیصلہ کریں اور اسے دماغ سے نکال کر پھینک

دیں تو آپ کو ذہنی سکون مل جائے گا۔"
وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "آپ خود کو
سمجھائیں کہ وہ بے وفا ہے۔ اتنی خود غرض ہے کہ اس بونے
کی خاطر اس نے آپ کی تمام محبتوں اور نیکیوں کو ٹھکرا دیا۔ وہ
ایک گری ہوئی لڑکی ہے۔ آپ کو اس کے سامنے نہیں گرنا
چاہیے۔"

وہ ونڈا سکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ سمیرا
نے دل میں کہا۔ "سوری ماروی! تم گری ہوئی نہیں ہو۔ تم
بہت عظیم ہو۔ میں نے تمہیں مار ڈالنے کی کوشش کی اور تم نے
محبوب کے سامنے میری عزت رکھ لی۔ آج تم نے اس
بونے کو قبول کر کے میرے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔"

اس کا ہاتھ محبوب کے شانے پر تھا۔ وہ بڑے اعتماد
سے سوچ رہی تھی۔ "میں تقریباً انہیں حاصل کر چکی ہوں۔
بس نکاح پڑھوانے کی دیر ہے۔ میں تمہارا احسان بھی نہیں
بھولوں گی ماروی! ابھی بہت مجبور ہو کر اپنا الو سیدھا کرنے
کے لیے تمہارے خلاف بول رہی ہوں۔"

حالات ایسے تھے کہ محبوب ڈوب رہا تھا۔ وہ ابھر
رہی تھی۔ سرتوں سے سرشار ہو کر سوچ رہی تھی۔ "میں بہت
بڑی بازی چیت رہی ہوں ماروی!...! تم جیو ہزاروں
سال... میں کبھی نہ کبھی تمہارے احسانات کا بدلہ ضرور
چکاؤں گی۔"

محبوب نے کوٹھی کے پورچ میں آ کر گاڑی روک کر
کہا۔ "اب معلوم ہو رہا ہے۔ وہ کبھی مجھے دل سے نہیں
چاہتی تھی۔ میرے احسانات کی وجہ سے جھوٹے پیار کا ٹانک
گرتی رہتی تھی۔"

سمیرا نے کہا۔ "یہی حقیقت ہے۔"
"میں یقین سے کہتا ہوں اس نے دکھاوے کے لیے
بونے سے شادی کی ہے۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے
اپنی ازدواجی زندگی کو داؤ پر لگایا ہے۔"

وہ بھی کار سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "نہیں محبوب!
میں عورت ہوں اور دوسری عورت کو اس کے اندر سے سمجھ
رہی ہوں۔ اس نے بھرپور سہاگ رات منائی ہے۔ وہ
سب ہی کو الجھا رہی ہے۔ پلیز اندر چلیں۔"

وہ کار سے نکل کر کوٹھی کے اندر آئے۔ سمیرا نے ڈرائنگ
روم میں آ کر اپنے بیگ میں سے سرخ گلاب کی دو کلیاں نکالیں
اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب ماروی آئی تو ہم اسے دیکھنے
سمجھنے میں ایسے محو ہو گئے کہ یہ تحفہ دینا بھول گئے۔"

محبوب نے دو کلیوں کو ناگواری سے دیکھا۔ پھر اس

سے ایک کلی کو لے کر اسے مٹی میں بھیج کر اسے بے دردی سے ملتے ہوئے کہا۔ "شادی خانہ بربادی۔ آئی ہیٹ ہر..." اس نے دوسری کلی کو لے کر ذرا سوچا۔ پھر سمیرا کو پیش کرتے ہوئے بولا۔ "مگر قبول افتد زہے عز و شرف..." وہ خوشی سے لہرا گئی۔ پھول لے کر گلے لگ گئی۔ وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وقت کا منہ زور دریا اب اسے سمیرا کی سمت بہانے لگا تھا۔

☆☆☆

موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ نہیں تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ مراد نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش ہو سکتی تھی۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے دوسرے دن لندن جانے کے لیے سیٹیں حاصل کر لی تھیں۔ اب ذرا سکون سے تنہا رہنے کے لیے ساحل سمندر کی طرف جانے لگا۔ بہت عرصے تک تڑپتے رہنے کے بعد ماروی حاصل ہوئی تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اس سے دور بٹھکتا ہوا سمندر کے کنارے آ گیا تھا۔ میکڈونلڈ میں بیٹھ کر سنیما اسکوپ کھڑکی سے سمندر کی لہروں کو تڑپتے پھلتے دیکھ رہا تھا۔

ماروی سے دور آنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایک ہی رات میں اس سے اکتا گیا ہے۔ وہ ساری عمر اسے نگاہوں کے سامنے رکھ کر اسے دیکھ دیکھ کر جینے والا تھا۔ ازدواجی رشتے کا کوئی بھی مسئلہ کوئی بھی رکاوٹ حالات کی کوئی بھی نئی کر دہ اس کی محبت کو کم نہیں کر سکتی تھی پھر بھی وہ دو چار گھنٹے جو ماروی کے ساتھ گزار سکتا تھا وہ وقت ساحل پر گزارنے آ گیا تھا۔ وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ "مرینہ میری زندگی میں نہ آتی تو اچھا ہوتا۔ وہ زبردست کھلاڑی ہے۔" ماروی ایک سیدھا سا پرہیزگار کھانا لگ رہی ہے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر سوچنے لگا۔ کوئی بات نہیں میں اسے سمجھاؤں گا۔ سکھاؤں گا۔

بے چاری گوٹھ کے ماحول سے نکل کر کراچی آکر بھی ایک بہت ہی محدود ماحول میں زندگی گزارتی آرہی ہے۔ چاہیے کہ اسے رازداری سے سمجھایا ہوگا کہ میاں کے سامنے شرم و حیا کونہ بھولنا۔

وہ اس کی سادگی پر مسکرانے لگا۔ فون کی رنگ ٹون سمجھنے لگی۔ اسکرین نے ماروی کا نام بتایا۔ وہ بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "بولو میری جان! کیا میری یاد آ رہی ہے؟"

"تمہاری یاد نہیں آئے گی تو اور کس کی آئے گی؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "محبوب کی..."

ماروی نے کہا۔ "وہ سمیرا اور معروف صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ میں ایک بونے کی دلہن بن کر بری طرح پچھتاؤں گی۔ وہ سہاگ رات کا رد عمل دیکھنے آئے تھے اور بہت مایوس ہو کر گئے ہیں۔"

وہ اس بات پر ہنسنے لگا۔ ماروی نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ تم کہاں ہو؟ اور کب آرہے ہو؟"

"میں نے کہا تھا دیر ہوگی۔ باہر سے لنچ کر کے آؤں گا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے باہر لنچ کرنے والی بات نہیں کہی تھی، کس کے ساتھ لنچ کر رہے ہو۔ سچ بولو؟"

"میری جان! ماسٹر کو بوبو کا ایک خاص آدی یہاں ہے

اس سے بہت اہم کام کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم جہاں بھی

ہنی مون منانے جائیں گے وہاں ماسٹر ہمیں سکیورٹی فراہم

کرے گا۔ اب سکھڑ بیویوں کی طرح انتظار کرنا اور صبر کرنا

سیکھو۔ میں تین یا چار بجے تک آ جاؤں گا۔"

اس نے جھوٹ بول کر اسے مطمئن کر کے فون بند

کر دیا۔ سچ بولتا تو اس کے بغیر تنہا وقت گزارنے پر ناراض

ہو جاتی۔ ویسے لندن جانے سے پہلے وہاں کی خبر رکھنا لازمی

تھا، اس نے تلے سے رابطہ کیا۔ پھر پوچھا۔ "ایک بہت

بڑی خوشخبری سنو گے؟"

"ارے... کیا پوچھ کر خوش خبری سناؤ گے؟"

وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ "ماروی میری دلہن بن چکی ہے۔"

وہ جیسے خوشی سے جھوم کر بولا۔ "واہ میرے یار! آخر تمہیں

منزل مل ہی گئی۔ تم کو اور ماروی کو بہت بہت مبارک باد۔"

پھر اس نے آواز دی۔ "بلی! کہاں ہو؟ جلدی

آؤ... اوئے اپنے یار نے ماروی کو دلہن بنا لیا ہے۔ اس

بارود بھری لعنتی زندگی میں پھول کھل رہے ہیں۔"

بلی کی آواز سنائی دی۔ "بھائی صاحب! السلام علیکم

بہت بہت مبارک ہو۔ میں ساؤتھ افریقا میں تھی اب لندن

میں ہوں۔ اجنبی لوگ ہیں۔ اجنبی ماحول ہے۔ یا اللہ...!

کتنے عرصے بعد ایک پاکستانی خوشی مل رہی ہے۔"

وہ دل سے خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔ "میں گھونگٹ

میں ماروی کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ مایوں بیٹھی ہوگی۔ شرماتی

رہی ہوگی۔ اس کے ہاتھوں پیروں میں مہندی رچائی گئی

ہوگی۔ ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت لہراتے رہے

ہوں گے۔ ہائے ہمارا پاکستان، ہماری مشرقی تہذیب کتنی

خوب صورت ہے۔ دل آپ ہی آپ اپنی دھرتی کی طرف

کھنچا جاتا ہے۔“
 بچے کی آواز سنائی دی۔ ”ارے ارے کتو تو رونے لگی ہے۔“

وہ بولی۔ ”بھائی صاحب! یہاں بچے ہزاروں پاؤنڈز یعنی ہر ماہ لاکھوں روپے کماتا ہے۔ ہم رئیسوں کی طرح عیش و عشرت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن قسم سے کہتی ہوں یہاں دل نہیں لگتا۔ ہمارے سروں پر سے قانون کی کھواریں بہت جائیں تو میں تمام عیش و عشرت کو ٹھکرا کر اپنے وطن آؤں گی اور وہاں قدم رکھتے ہی سجدہ کروں گی۔“

مراد نے کہا۔ ”تم بہت اچھی ہو بشری! تمہارے سینے میں پاکستان دھڑکتا رہتا ہے۔ نمازیں پڑھا کرو۔ دعائیں مانگتی رہا کرو۔ اللہ بڑا کارساز ہے وہ ضرور ہمارے لیے پاکستان میں رہنے کی راہیں ہموار کرے گا۔“

وہ بولی۔ ”آپ وعدہ کریں۔ آپ ماروی کو لندن لائیں گے اور ہمارے گھر آئیں گے۔“

”میں کل ماروی کے ساتھ آرہا ہوں لیکن اپنے گھر بلانے کی ضد نہ کرنا۔ ہم دشمنوں کے شہر میں کبھی کھل کر ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے۔ بچے! اب تم باتیں کرو۔ یہ تو سن لیا ہے کہ میں کل آرہا ہوں۔ تم وہاں کے حالات بتاؤ۔“

”یہاں بڑی مستعدی سے اور بڑی شدت سے جمہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ یعنی میں یہاں مراد علی منگی ہوں اس لیے مجھے ڈھونڈا جا رہا ہے۔ جرائم کی دنیا میں ریڈارٹ ایک بڑا نام ہے کئی خطرناک تنظیمیں اس کی اور منگی براؤن کی اتحادی ہیں۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”میں نے اس کے بیٹے کو گولی مار کر تھلکہ مچا دیا ہے۔ پولیس، ایس ایچ جی، اسکات لینڈ یارڈ کے جاسوس اور مجرموں کی فوج پورے لندن میں مراد علی منگی کی بوسہ چھنتی پھر رہی ہے۔“

”بچے! تم حالات کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ ابھی کچھ عرصے تک کوئی واردات نہ کرنا۔ ورنہ اسکات لینڈ والے بہت شارپ ہیں۔ دوسری واردات سے کڑیاں ملاتے ہوئے تمہاری شہرگ تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں محتاط ہوں۔ ماسٹر نے بھی یہی سمجھایا ہے کہ ابھی مجھے خاموش رہ کر گم ہو جانا چاہیے۔ اطمینان رکھو کسی کو میرے وجود کا سراغ نہیں ملے گا۔“

اس نے مشورہ دیا۔ ”اگر ہو سکے تو مرینہ سے بات کرو۔ اسے لندن میٹ ڈیپارٹمنٹ اور اسکات لینڈ یارڈ

کے اندر کی بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ ہمیں اس سے راہنمائی مل سکتی ہے۔“

”میں ابھی بات کروں گا۔“

بچے سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ مرینہ پچھلی رات سے اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھی اور وہ اسے ذہن سے باہر جھٹکتا جا رہا تھا۔ اب بچے کا یہ معقول مشورہ تھا کہ مرینہ سے صحیح معلومات حاصل ہوں گی۔

وہ یقیناً سی آئی اے، ایف بی آئی، انٹرپول، میٹ ڈیپارٹمنٹ اور اسکات لینڈ یارڈ کے اندر پہنچ کر معلوم کر رہی ہوگی کہ لندن میں مراد کو پکڑنے کے سلسلے میں کیسی کیسی پلاننگ کی جا رہی ہے۔

مراد نے ایک گہری سانس لی پھر فون کو اٹھا کر اس آفت جاں سے رابطہ کیا۔ ادھر سے سرتوں بھری کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اوگاڈ! مراد...! تم نے مجھے کال کی ہے؟ ہائے میں مرجاؤں۔ بولو کیا کروں؟ کہاں آؤں؟“

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے شادی کر لی ہے۔ ماروی میری دلہن بن گئی ہے۔“

اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”کیا واقعی تم نے میدان مار لیا ہے؟ آخر ماروی کو پا ہی لیا۔ وہاٹ اے پی نیوز۔ کونگریجو لیشن، ہنی مون منانے کہاں جاؤ گے؟“

”ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یعنی ابھی پاکستان میں رہو گے؟“

”یہ ابھی کہہ نہیں سکتا کہ کہاں جانا ہے اور کہاں ماروی کے ساتھ ٹھکانا بنانا ہے۔“

”تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے پیچھے نہیں آؤں گی۔“

”یہ تمہاری دانشمندی ہوگی۔“

”پہلے میں ثابت کروں گی کہ تمہاری وقار ہوں۔ تمہارے سر کا سودا کرنے والوں کی جانی دشمن ہوں۔ میں جلد ہی تمہارا اعتماد حاصل کر لوں گی۔“

مراد نے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”نہ اپنے بارے میں بتاؤ، نہ میرے بارے میں پوچھو۔“

”مجھے تم سے ضروری کام ہے۔“

”ہاں بولو، میری جان حاضر ہے۔“

”میں براؤن کے بیٹے کے مرڈر کے بعد لندن میں تھلکہ مچ گیا ہے۔ جاسوسوں اور مجرموں کی درجنوں جمیں وہاں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ تم سی آئی اے، ایف بی آئی،

انٹرنیٹ، اسکاٹ لینڈ اور اپنے میٹ کے ادارے کے اندر کی باتیں معلوم کر سکتی ہو۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے کیسی کیسی پلاننگ کر رہے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”اب میں ان کے اندرونی معاملات تک پہنچ نہیں پاؤں گی۔ ان تمام اداروں کو اچھی طرح یقین ہو گیا ہے کہ میں تمہاری گرل فرینڈ ہوں۔“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔ سب ہی ہمارے خفیہ گہرے تعلقات کو سمجھ رہے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں کبھی تمہیں دشمنوں کے یا قانون کے محافظوں کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گی۔ ابھی سب کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی ہوں۔ سب ہی خیالی آنکھوں سے میرے پیچھے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے بلکہ انہیں یقین ہے کہ تم بھی نہ بھی میرے ساتھ ہی پکڑے جاؤ گے۔“

وہ بولا۔ ”ہاں یہ تو میں نے قتل ایب میں دیکھا ہے۔ وہاں ایک گانڈ تمہارے ساتھ تھا۔ دشمنوں نے اسے مراد سمجھ کر تم پر حملے کیے تھے۔ یہ اچھا ہے کہ تم نے مجھ سے دور رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمارا صرف فون سے رابطہ رہے گا۔“

”ماسٹر کو بوبو سے کہو۔ ریڈارٹ کے میکی براؤن نے اس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے اور بیان دیا ہے کہ ماسٹر کو بوبو برسوں سے دشمنی کرتا آ رہا ہے۔ مراد علی منگی ماسٹر کا سب سے خطرناک شوٹر ہے۔ اس نے ماسٹر کے حکم سے پہلے برٹانڈ کو پاکستان میں گولی ماری، پھر ریڈارٹ کے سابقہ سربراہ جیک البرٹ کو انڈیا میں ہلاک کیا اور اب میکی براؤن کے بیٹے کو لندن میں مار ڈالا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”ماسٹر جانتا ہے۔ وہ اپنے خلاف اس کے بیانات سن چکا ہے۔ اس نے اپنی بیوی، بیٹوں اور بیٹیوں کے اطراف سیکورٹی سخت کر دی ہے۔“

”تمہیں ایک مشورہ دیتی ہوں۔ ماروی کے ساتھ گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلنا۔ نہ ہی ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک جانا۔ تمام ٹارگٹ کلرز کے پاس ماروی کی تصویر ہے۔“

یہ ایک اہم تشویش ناک بات تھی جس کو ابھی زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔ مرچہ نے کہا۔ ”وہ اب تک اس لیے محفوظ ہے کہ کراچی کے ایک محلہ د علاقے میں رہتی ہے۔ کوٹھی سے باہر نہیں نکلتی ہے۔ اس کے اطراف بھی سخت سیکورٹی ہے۔“

وہ پریشان ہو گیا۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ ماروی کی تصویر دشمنوں تک پہنچی ہوگی۔ پھر اس خیال کو ذہن سے

جھٹک دیتا تھا۔ لیکن اب خطرے کی بو آ رہی تھی۔

اب وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اس کے تمام دشمن ماروی کو اس کے چہرے سے پہچانتے ہیں اور وہ انجانے میں اسے بڑی آزادی سے لندن اور سویٹزر لینڈ کی طرف لے جانے والا تھا۔

مرینہ نے پوچھا۔ ”چپ کیوں ہو گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟ کیا میری کوئی بات دل کو ٹھہری ہے؟“

ہاں۔ ”تمہاری بات پر غور کر رہا ہوں۔ ماروی کو تفریح کے لیے بھی کوٹھی سے باہر نہیں جانا چاہیے۔“

وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اور ہنی مون کے لیے بھی نہیں۔“

وہ ہلکے پکچاتے ہوئے بولا۔ ”آں، ہاں تم درست کہتی ہو۔“

”مراد...! میں باتوں سے اور لہجے سے پکڑ لیتی ہوں۔ میں سمجھ رہی ہوں، اسے کہیں ہنی مون کے لیے لے جانا چاہتے ہو اور مجھ سے یہ بات چھپا رہے ہو۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”مرینہ! مجھے کچھ سوچنے سمجھنے دو۔ میں تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔“

وہ فون بند کر کے فکر میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ دشمن ماروی کو اس کی کمزوری سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے چہرے سے بھی پہچانتے ہیں۔

اسے ایک آدھ بار یہ خیال آیا تھا اور اس نے بے پروائی سے یہ سوچ کر ٹال دیا تھا کہ ماروی کی تصویر کسی کے ہاتھ نہیں لگے گی۔ لہذا زیادہ اندیشوں میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔

وہ چاہتا تھا اس کی ماروی کے سراپا حسن کو، ملبوسات کو، سولہ سنکار کو اور دل موہ لینے والے ناز و انداز کو ساری دنیا اس کے شانہ بشانہ دیکھے لیکن دنیا سے پہلے دشمن دیکھنے والے تھے پھر موت دیکھتی اور اسے اپنے ساتھ شانہ بشانہ لے جاتی۔

وہ میکڈونلڈ سے نکل کر کار میں آیا۔ پھر اسے اشارت کر کے آگے بڑھانے کے بعد فون پر مرینہ کو مخاطب کیا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم کال کرتے ہو مراد...! تمہارا فون پکارتا ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے اندر مسترتیں بھر جاتی ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میں بہت الجھ گیا ہوں۔ ماروی کے ساتھ آزادی سے زندگی نہیں گزار سکوں گا۔“

مرینہ نے کہا۔ ”اور کب تک اسے چار دیواری میں قید کر کے رکھ سکو گے؟ اپنی ماروی سے پوچھو ایک چھت کے نیچے چھپی رہنا چاہتی ہے یا ہماری طرح خم ٹھونک کر دشمنوں کی

بھیڑ سے گزرتا چاہتی ہے۔“

”وہ دشمنوں کے مقابلے پر کھلی فضاؤں میں سانس نہیں لے سکے گی۔ نہ چالبازی جانتی ہے نہ گن چلانا جانتی ہے۔“

”تم بھی چالباز نہیں تھے۔ کبھی تم نے بھی گن نہیں پکڑی تھی۔ آج دیکھو کیا ہو؟ اگر آج ماروی کی جگہ میں تمہاری شریک حیات ہوتی تو کیا تم فکر مند ہوتے؟ ہرگز نہیں، دشمنوں کو اور زیادہ للکار تے۔ تمہارے سامنے دو چوائس ہیں، ایک تو یہ کہ ماروی کے اندر بھی بارود بھر دو۔ اس کے ہاتھوں میں گن پکڑاؤ اور اسے ٹریننگ دو۔ یا پھر ایک گھر گزرتی والی بیوی کی طرح اسے چار دیواری میں ہی رہنے دو۔ یاد رکھو تم ہمیشہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکو گے۔“

”تمہارے پیروں میں چکر ہے۔ کبھی دشمن تمہیں دوڑائیں گے کبھی تم انہیں رگیدتے رہو گے۔ کبھی کبھی ماروی سے ملنے جاسکو گے۔ ان تمام حالات پر غور کرو اور مجھے سچ سچ بتاؤ کیا وہاں سے ماروی کے ساتھ نکلنے والے ہو؟“

اس نے پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے تاکید کی۔

”دیکھو مراد...! اپنی اور ماروی کی بہتری کے لیے سچ بولو۔“

اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ ذرا چپ رہا۔ وہ بولی۔ ”مراد! میں تمہارا احما دیکھو کر پچھتا رہی ہوں۔ اور تم اعتماد نہیں کرو گے، سچ نہیں بولو گے اور چھپ کر ماروی کے ساتھ کہیں جاؤ گے تو میں فکر میں مبتلا رہوں گی۔“

اس نے التجا کی۔ ”تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ صرف ایک بار بھروسہ سا کرو۔ بتاؤ کیا کرنے والے ہو۔ تمہارے پیار کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ تم دیکھو گے کہ دور ہی دور سے ماروی کو بھی سیکورٹی دیتی رہوں گی۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں پھر اندھا بچا کھیلوں گا۔ پھر ایک بار تم پر بھروسہ سا کروں گا۔“

”تھینکس اے لائٹ۔ میری ساکھ بحال کر رہے ہو۔ تم دیکھو گے کہ میں کیا کرتی ہوں جہاں ہم دونوں ہوں گے، وہاں دشمنوں کی لاشیں گرتی رہیں گی مراد...!“

مراد نے کہا۔ ”کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے ماروی کے ساتھ لندن جانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ کبڈی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ لندن میں رہے گا۔ میں ماروی کے ساتھ سویٹزر لینڈ جاؤں گا۔“

وہ اپنے موجودہ حالات بتانے لگا۔ ”یہاں کے حالات یہ ہیں کہ محبوب وغیرہ کے سامنے کبڈی بونا مراد بن کر رہتا ہے۔ ہماری پلاننگ کے مطابق بونے مراد سے ماروی کا نکاح ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ دیر پر وہ میری منکوحہ ہے۔“

وہ اسے تمام باتیں تفصیل سے بتانے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”نکاح کے کاغذات میں اور پاسپورٹ میں ماروی زوجہ مراد علی منگی لکھا ہوگا؟“

”ہاں نکاح تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ وہ میری ہی زوجہ کہلائے گی۔ نام تو میرا ہی لکھا گیا ہے۔“

”مراد! تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ اتر پورٹ اور کسٹم میں انٹیلی جنس کے لوگ ہوتے ہیں۔ کاغذات پر ماروی زوجہ مراد علی منگی پڑھتے ہی جان کو آجائیں گے۔ تم ماروی کو حاصل کرنے کی دھن میں اس قابل گرفت بات کو کیسے بھول گئے؟“

یہ اتنی اہم بات تھی جس کی طرف مراد نے دھیان نہیں دیا تھا۔ اس نے کار کی رفتار سست کر کے سڑک کے کنارے روک دی۔ پھر کہا۔ ”واقعی یہ بات ذہن میں نہیں آئی تھی۔ یہاں اتر پورٹ میں کاغذات کی چیکنگ کے دوران ہی ماروی سے پوچھا جائے گا کہ اس کا شوہر مراد علی منگی کہاں ہے؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”وہ لوگ شبہ کریں گے۔ ماروی سے پوچھیں گے، وہ اکیلی لندن جا رہی ہے یا عبداللہ کبڈی اور ایمان علی کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ اگر ان کے ساتھ سفر کر رہی ہے تو ان میں سے کوئی مراد ہے اور کبڈی تو مراد کا ہم شکل ہے ہی۔“

مرینہ نے کہا۔ ”پھر انٹیلی جنس والے ماروی کو حراست میں لے کر اس کے شوہر مراد کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کریں گے۔ نکاح نامہ میں شادی کی تاریخ درج ہوگی۔ جس سے ثابت ہوگا کہ مراد کراچی میں موجود ہے اور اس نے ایک روز پہلے ماروی سے نکاح پڑھوایا ہے۔“

مراد کو پسینا آنے لگا۔ وہ بہت بڑی غلطی کرتے ہوئے خود کو اور ماروی کو قانون کے شکنجے میں لانے والا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں ابھی جا رہا ہوں۔ جہاز کی سینیٹس کینسل کراؤں گا۔“

”جسٹ اے منٹ۔ جلدی نہ کرو۔ یہ سوچو ماروی وہاں تمہاری منکوحہ بن کر محفوظ نہیں ہے۔ کسی دن بھی بھید کھل سکتا ہے کہ تم پاکستان میں آ کر اس سے نکاح پڑھا چکے ہو۔ قانون کے محافظ اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”یا میرے خدا...! میں کیا کروں؟“

”میری عقل کہتی ہے ایک ہی راستہ ہے۔ اسے وہاں سے نکالو۔ وہ فی الحال ماسٹر کو بو بو کی سن سٹی میں

تمہارے ساتھ آزادی سے رہ سکے گی۔ کوئی دشمن اس کے سائے تک نہیں پہنچ سکے گا۔

”درست کہتی ہو۔ وہ فی الحال ماسٹر کے سائے میں محفوظ رہے گی۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ماروی یہاں چیکنگ کے وقت کسی کو نکاح نامہ نہ دکھائے۔ یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ پاسپورٹ ایک ماہ پہلے بن گیا تھا۔ اس میں شوہر کا نام نہیں ہے۔ یہی ظاہر ہوگا کہ وہ تنہا لندن جا رہی ہے۔ میں اور کبڈی اس سے دور رہیں گے۔“

”ہاں یہ ہوئی نا بات؟ یہی کرو۔ کل رپورٹ سے لندن تک اپنی بیوی سے لا تعلق رہو۔ وہ دشمنوں سے چھپنے کے لیے عیا یا اور نقاب میں یہاں سے جائے گی۔ ماسٹر سے ابھی بولو کہ وہ لندن سے فوراً ہی تم دونوں کو اپنے پاس بلائے۔“

”میری جان! تم نے آدمی سے زیادہ پریشانی دور کر دی ہے۔ آئی لو یو۔۔۔“

وہ مسرتوں سے سرشار ہو کر بولی۔ ”آئی لو یو۔۔۔“ اس نے کہا۔ ”میں ابھی ماسٹر سے بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں کال کروں گا۔“

اس نے ماسٹر سے رابطہ کیا اور اسے تمام موجودہ مشکلات سے آگاہ کیا۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”یہ کوئی پر اہم نہیں ہے۔ لندن سے سن سٹی جانے والی کسی فلائٹ میں دو سٹیں ہو جائیں گی۔ یہ میرے لیے انتہائی خوشی کی بات ہے کہ تم میرے پاس آرہے ہو۔ یہاں تمہاری ماروی آزادی سے رہے گی۔ کل وہاں سے کسی طرح نکل آؤ۔“

اس نے پھر مرینہ سے رابطہ کیا۔ موجودہ حالات کے مطابق اب وہ اہم ہو گئی تھی اور دل کے چور کو کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ وہ پچھلی رات سے ہی اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ”ماسٹر کے پاس کام بن رہا ہے۔ ہمیں سن سٹی جانے کے لیے لندن سے شاید کل ہی کسی فلائٹ میں سٹیں مل جائیں گی۔ اب بتاؤ تم کہاں ہو؟“

”میں لندن میں ہوں، لیکن تم مجھے پہچان نہیں سکو گے میں نے چہرہ بدل لیا ہے۔ میرے ڈیپارٹمنٹ والے بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل نے وارننگ دی ہے کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر آ کر ڈیوٹی کی رپورٹ پیش نہیں کروں گی تو مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔“

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ”اور تم دیکھو گے کہ میں تمہاری خاطر میٹ آفسر کے عہدے کو ٹھکرا دوں گی۔ جو

تمہارے سر کا سودا کرنا چاہتے ہیں ان کی ملازمت نہیں کروں گی۔“

”کیا واقعی...؟“

”مراد! یہ وہ لوگ ہیں، جو چاہتے تھے کہ میں تمہیں پیار سے ٹریپ کر کے یہاں لاؤں اور تمہیں ریڈ الارٹ کے میکی براؤن کے حوالے کر دوں۔ میں بہت آلو کی پٹنی ہوں۔ کھسک گئی تھی۔ یوں اپنی نادانی کے باعث تمہارا اعتماد کھود یا تھا۔“

”تھینکس گاڈ! میں پھر سے تمہارا دل جیتنے والی ہوں۔ تم میرے خلوص کو اور نیک نیتی کو سمجھ رہے ہونا...؟“

”ہاں میری جان...! تم پھر سے متاثر کر رہی ہو۔“

”یہ بتاؤ! میں وہاں تمہیں کیسے پہچانوں گی؟“

”کوڈ ورڈز کے ذریعے اور وہ ورڈز یہ ہیں۔ یو آر فارمی اینڈی قاریو۔“ وہ ذرا سوچ کر بولا۔ ”تمہیں۔ یہ رومانٹک کوڈ ورڈز ہیں۔“

”کیا تمہیں پسند نہیں ہیں؟“

”بہت پسند ہیں۔ پتا نہیں کیا بات ہے تم میرے دل میں گھسی آرہی ہو۔“

اس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ لہراتے ہوئے بولی۔ ”ہائے مراد! میں خوشی سے مرجاؤں گی۔“

”لیکن مرینہ! کوئی ایسی غلطی نہ کرنا کہ ماروی مجھ سے ناراض ہو کر دور چلی جائے۔“

”میں کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گی۔“

”تم میرے قریب آتی جاتی رہو گی۔ ماروی کو کبھی شبہ نہ ہو کہ تم مرینہ ہو۔ میں نے اسے بہت مشکلوں سے یقین دلایا ہے کہ تم سے میرا کوئی تعلق ہے اور نہ رہے گا۔“

”اطمینان رکھو۔ میں اسے شبہ نہیں ہونے دوں گا۔“

”تم نئے روپ میں پہلی بار آ کر یہ کوڈ ورڈز ادا کرو گی۔ مائی نیم از... ایم ایٹ یور سروس۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میرا موجودہ نام مٹلاش ہے۔“

”اوکے۔ کل ہمارا سامنا ہوگا۔ تم ماسٹر کی طرف سے میری خدمت گار بن کر آؤ گی اور یہی کوڈ ورڈز ادا کرو گی۔ مائی نیم از مٹلاش۔ ایم ایٹ یور سروس۔“

”اوکے۔ ماروی کو یہی سمجھنا چاہیے کہ میں ماسٹر کی طرف سے بھیجی ہوئی خدمت گار ہوں۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ونڈا اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مرینہ میری اہم ضرورت بن گئی ہے۔ اگرچہ شوہر بننے کے باوجود اب بھی ماروی کا

دیوانہ عاشق ہوں۔ اس کے اعتماد کو کبھی نہیں پہنچاؤں گا۔ تاہم مرینہ اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ایسے میں ایک بیوی کے اعتماد کو ضرور ٹھیس پہنچے گی۔ آئندہ اس سے ہمیشہ جھوٹ بولنا اور اسے فریب میں جتلا رکھنا ہوگا۔

وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق لپکتا ذرا بدل رہا تھا۔ محبت اور وفاداری میں ایک ذرا تبدیلی ہو تو تبدیل ہونے والا ہر جانی بے وفا اور بے ایمان کہلاتا ہے۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر مرینہ سے دوستی کر رہا ہے۔ یہ باتیں وہ ماروی کو سمجھاتا تو وہ کبھی سمجھتا نہ چاہتی۔ وہ اسے سوکن ہی سمجھتی رہتی اور وہ غلطی پر رہ جاتی۔

اس نے دلی کو سمجھایا ماروی آگے چل کر اپنے مراد کی مشکلات دیکھ کر شاید مرینہ سے سمجھوتا کر لے گی۔ ابھی تو اسے جھوٹ بول کر دھوکے میں رکھنا تھا۔ لیکن کام نکالنا تھا۔

اس نے خود کو سمجھایا اسے دھوکا دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حاصل ہونے کے بعد کھو ہو گیا ہے۔ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے برابر دنیا کی کوئی عورت نہیں ہو سکتی تھی۔

اسے دھوکا دینے کی صرف ایک وجہ تھی۔ میں خوفزدہ ہوں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ اس سے بچھڑنا نہیں چاہتا۔ مرینہ سے میرے تعلق کا علم ہوگا تو وہ مجھ سے بدظن ہو جائے گی۔ وہ بہت ضدی ہے۔ منہ پھیر لے گی تو پھر منائے نہیں مانے گی۔

وہ ایک دکان سے عبایا اور کچھ ضروری چیزیں خرید کر کوٹھی میں آیا۔ ماروی نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ اس نے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ عبایا ہے، یہ اسکارف ہے، دستانے اور جرابیں ہیں۔ تم ایسے پردے میں رہ کر یہاں سے نکلو گی کہ دشمن تو کیا دوست بھی تمہیں پہچان نہیں سکیں گے۔“

اس نے چاچی، چاچا اور عبداللہ کبڈی کو بلایا پھر انہیں موجودہ بدلتے ہوئے حالات بتائے۔ ماروی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں اتنی دور لندن اکیلی جاؤں گی؟“

مراد نے کہا۔ ”تم بہ ظاہر اکیلی رہو گی۔ میں اور کبڈی تمہارے آس پاس رہیں گے۔ لیکن تم سے لاطعلق رہیں گے۔ جہاز کے اندر بھی احتیاطاً دور رہیں گے۔ لندن پہنچ کر کبڈی ڈاکٹر ڈیڈی کے ساتھ چلا جائے گا۔ میں تمہارے قریب آ جاؤں گا۔“

وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا وہاں ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا؟“ ”مسائل کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں۔ وہاں تو دشمنوں کا میل لگا ہوگا۔ ماسٹر کو بو بو کی ایک قابل اعتماد فائٹر اور شوٹر ہماری راہنمائی کے لیے لندن انرپورٹ پر موجود رہے گی۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”ایک عورت ہمارے ساتھ کیوں رہے گی؟ کیا راہنمائی کے لیے کوئی مرد ساتھ نہیں رہ سکتا؟“

”ماسٹر بہتر جانتا ہے۔ بلاشبہ بہت خطرناک فائٹر ہے وہ ہماری باڈی گارڈ بن کر رہے گی۔“

اس نے گھور کر پوچھا۔ ”یعنی دن رات ساتھ رہے گی یا رات کو بھی پیچھا نہیں چھوڑے گی؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”کب کیا ہو سکتا ہے ہم نہیں جانتے۔ جب ہمیں ضرورت ہوگی یا حالات اسے ہمارے ساتھ رہنے پر مجبور کریں گے تب وہ ساتھ رہا کرے گی۔“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تم میری شریک حیات بن کر جرائم کی ایسی دنیا میں آگئی ہو جہاں اچھی بڑی عورتوں سے سامنا ہوتا رہے گا۔ پلیز تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا کہ میں تمہارا ہوں۔ کوئی عورت مجھے تم سے چھین کر نہیں لے جائے گی۔“

چاچی نے سمجھایا۔ ”بہنی حالات بدل رہے ہیں۔ خود کو بھی بدلتی رہو۔ اپنے مرد پر پکا بھروسہ رکھو، تب ہی ہستی کھیلی زندگی گزارتی رہو گی۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں نے انڈیا میں مراد کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے۔ وہاں تین حسین لڑکیاں اس کے پاس آئیں اور گئیں لیکن اس نے کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ تم خوش نصیب ہو۔ میرا دوست لاکھوں میں ایک ہے۔ اس پر فخر کرو اور بھروسہ کرو۔“

ماروی مراد کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اسے بچپن کی محبت پر پورا بھروسہ تھا مگر جوانی کے عشق پر آدھا اعتماد بھی نہیں تھا۔ اپنے مرد کو لگام دینے کے معاملے میں لڑکیاں پیدائشی تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ وہ اندر سے محتاط تھی۔

کال بیل کی آواز سنائی دی۔ چاچا نے اٹھ کر دروازہ کھولا، وہاں عظمت شاہ کھڑا تھا۔ چاچا نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔ اسے اندر بلایا۔ ماروی نے کہا۔ ”مراد! یہ شہزاد کی نانی مرحومہ کے بھائی عظمت شاہ ہیں۔“

ایک پورے اور ایک آدھے دونوں ہی مراد نے آگے بڑھ کر شہزاد کے نانا سے مصافحہ کیا۔ منی نے کہا۔

”بھائی صاحب! اچانک آئے ہیں سب خیریت ہے نا؟“
 عظمت شاہ نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”ویسے تو خیریت ہے لیکن انسان کے ساتھ مرنا جینا لگ رہا تھا ہے۔ میرے گھر میں کبھی اور مجھے بھی یہ صدمہ ہوا ہے۔ ایک ماہ پہلے میری زوجہ کا انتقال ہو گیا تھا۔“

چاچی، چاچا، ماروی اور دونوں مراد افسوس ظاہر کرنے لگے۔ عظمت شاہ نے کہا۔ ”افسوس تو ہوتا ہے لیکن مرحومہ اپنے بچوں کی ایک اچھی ماں تھی میری وفادار بیوی نہیں تھی۔ میں زیادہ کیا بتاؤں اس کی بد مزاجی کی وجہ سے میں نے شہزاد کو یہاں آپ کے پاس چھوڑا تھا۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”مرحومہ نے اپنے میکے سے لائی ہوئی تمام زمینیں اور ان کی آمدنی اپنے آوارہ اور عیاش بیٹے کے نام لکھ دی ہے۔ وہ بیٹا پہلے بھی مجھ سے بدظن تھا۔ اب کروڑوں کی جائداد پا کر مجھے ٹھکرا کر چلا گیا ہے۔ بیٹی بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔“

وہ اپنی اجرک سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ ”اب جو زمینیں رہ گئی ہیں وہ میری نہیں شہزاد کی زمینیں ہیں۔ صرف آم کے باغات سے سالانہ میں بیس لاکھ روپے کی آمدنی ہے کندم کی فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی الگ ہے۔“

منی چاچی دیدے پھاڑ کر عظمت شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ”آپ مجھ پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے میرے نام وصیت لکھی تھی۔ مجھے شہزاد کے بالغ اور باشعور ہونے تک زمینوں کا واحد نگہاں بنایا تھا۔ آپا نے کہا تھا اگر مراد بیٹے کی پرورش کرنا چاہے تو اسے یہاں پہنچا دوں اور میں نے یہی کیا ہے۔“

چاچا نے جوس کا جگ اور گلاس لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک گلاس میں جوس لے کر پینے لگا۔ اسی وقت شہزاد ننھے ننھے پیروں سے ایک گیند کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ بچہ اپنے نانا کو پہچانتا تھا۔ عظمت شاہ نے مسکرا کر پچکارے ہوئے دونوں بازو پھیلائے تو وہ دوڑتا ہوا اس کی گود میں آ گیا۔

نانا نے اسے چوم کر کہا۔ ”یہ دن رات میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ رات کو میرے ہی ساتھ سوتا تھا۔ میں ایک ماں بن کر اس کی پرورش کرتا رہا ہوں۔“
 منی نے کہا۔ ”آپ جب بھی کراچی آئیں تو اس سے ملنے کے لیے آ جایا کریں۔“

”میں اسے لے جانے آیا ہوں۔“
 وہ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔

”وہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ سب وہاں چل کر شہزاد کے ساتھ رہیں۔ اس کی زمین جائداد سنبھالیں۔ اس بچے کے لاکھوں روپے میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔ اس کے باپ کو وہاں ان کا حساب رکھنا چاہیے۔ کیا مراد واپس آ گیا ہے؟“

ماروی اور منی نے مراد کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”میں مراد ہوں۔ کل یہاں سے لندن جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کب واپس آؤں گا۔ اچھا ہوا جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میری ساس مرحومہ آپ پر اتنا اعتماد کرتی تھیں کہ اپنے نواسے کو تمام زمین جائداد کے ساتھ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔“

”یہ آپا کی محبت تھی بڑا پن تھا۔“
 ”بے شک ہم بھی آپ کو مانتے ہیں۔ آپ بہت معزز ہیں۔ ہم بھی آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔ آپ اپنے نواسے کو جب چاہیں لے جاسکتے ہیں اور لاسکتے ہیں۔ یہاں بھی اسے ماں باپ کا نانی نانا کا پیار مل رہا ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”یہ ہمارے ہی پاس رہے گا۔ کبھی آپ لے جانا چاہیں گے تو چاچی اور چاچا سے لے کر آپ کے ساتھ زمینوں پر رہنے چلے جائیں گے۔“

عظمت شاہ نے کہا۔ ”جب تک مراد لندن سے واپس نہ آئے، آپ سب میرے ساتھ وہاں چلیں۔ شہزاد کی زمینیں اور ان کا حساب کتاب دیکھتے رہیں۔“

ان زمینوں سے لاکھوں کی آمدنی تھی۔ منی اتنی دولت اور جائداد چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ماروی! جب تک تم دونوں واپس نہیں آ جاتے ہم شہزاد کے ساتھ وہاں جا کر رہیں گے۔ ہم اپنے بچے کی زمین جائداد یونہی تو نہیں چھوڑ سکتے۔“

مراد نے کہا۔ ”میرے بیٹے کے نصیب سے یہ اچھا ہو رہا ہے۔ عظمت انکل بہت اچھے وقت پر آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ شہزاد کی پرورش اس کی زمینوں پر ہو اور یہ ایک زمیندار کی حیثیت سے اپنا کیریئر بنائے۔“

ماروی نے خوش ہو کر کہا۔ ”وہاں اسے ننھیال اور ددھیال کی سرپرستی حاصل رہے گی۔ پھر یہ کہ چاچی چاچا زمینوں کے معاملات بھی سمجھتے رہیں گے۔“

منی نے عظمت شاہ سے کہا۔ ”ماروی اور مراد کل صبح یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہم کل شام تک شہزاد کو لے کر آپ کے ساتھ جا سکیں گے۔ آپ یہیں ہماری کوکھی میں ہمارے پاس رہیں۔“

عظمت شاہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ہوٹل میں آرام سے ہوں۔ آج ایک رات گزارنی ہے۔ کل دوپہر کو آپ کے پاس آؤں گا پھر آپ سب کو ساتھ لے جاؤں گا۔“ وہ مراد، کبڈی اور چاچا سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماروی نے شہزاد کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے تنہا تنہا کبھی نہ جانے دیتی۔ یہ چاچی کی گود میں رہا کرے گا۔ اس لیے ذرا اطمینان ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”یہ اچھا ہی ہوا۔ ہمارے پیچھے چاچی چاچا محبوب وغیرہ کی نظروں میں نہیں رہیں گے، میرا بیٹا بھی میرے رقیب سے دور رہا کرے گا۔“

فتی نے کہا۔ ”مراد! میں کروڑوں روپے کی زمینیں ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ مجھے امید ہے عظمت شاہ ایمانداری سے آمدنی کا حساب دیا کرے گا۔ پھر بھی تم واپس آؤ گے تو سیدھے زمینوں پر آؤ گے اور وہاں کا حساب کتاب سمجھو گے۔“

اس کے حالات ایسے تھے کہ وہ زمین جائداد کی الجھنوں میں نہیں پڑ سکتا تھا۔ دشمن اسے اتنا وقت دینے والے نہیں تھے۔ اس نے فی الحال ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ ”ٹھیک کہتی ہو چاچی! ہم ہنی مون سے واپس آتے ہی تمہارے اور شہزاد کے پاس آئیں گے۔ ماروی بھی شہری ہنگاموں سے دور خاموش اور پرسکون علاقے میں رہنا چاہے گی۔“

وہ بولی۔ ”میرا بیٹا جہاں رہے گا، وہاں رہوں گی۔ چاچی! ہم جلد ہی آنے کی کوشش کریں گے۔“

ان سب کی زندگی میں بڑی اہم تبدیلیاں آرہی تھیں۔ تقدیر بدل رہی تھی۔ اس لیے جگہ بدل رہی تھی۔ چاچی چاچا شہر سے دیہات کی طرف جانے والے تھے۔ ماروی اور مراد لہوا چھالنے والے ہنی مون کی سمت پرواز کرنے والے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ واپسی ہو بھی سکے گی یا نہیں؟ وہ اپنے کمروں میں جا کر سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆☆☆

دوسرے دن محبوب صبح ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کو اچھی نیند نہیں آئی تھی۔ ماروی جانے والی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، پھر واپس نہیں آئے گی۔ رپورٹ میں اس کا آخری دیدار ہوگا۔

سمیرا اس کی بے چینی کو سمجھ رہی تھی۔ رات کو اس کے پاس دیر تک رہی تھی۔ اسے خوب بلایا تھا تا کہ وہ اسے عارضی طور پر ہی سہی فراموش کر سکے لیکن وہ ڈوبنے والا پھر

صبح اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر عشق نہیں کیا تھا۔ بے اختیار ہو گیا تھا۔ عمر بھر کی بے چینی خرید لی تھی۔ یہ پیار کی زبردستی تھی وہ اس کے اندر آپ ہی آپ آ جاتی تھی۔

وہ ہاتھ روم میں جا کر شاور لے کر سوچتا رہا۔ ”اچھا ہے جارہی ہے۔ مراد اب اسے واپس نہیں لائے گا۔ نہ جانے مجھ سے کتنی دور لے جائے گا؟“

جب سمیرا اس کے پاس ہوتی تھی تو وہ بڑے عزم سے ارادہ کرتا کہ ماروی سے اب عشق نہیں کرے گا۔ بس ایک ہوس ہے کہ اسے ایک بار حاصل کرے گا۔ پھر اس سے منہ پھیر لے گا۔ بس ایک بار وہ نکاح کے سائے میں مل جائے۔ اسے گھر والی بنا کر ایسے رکھے گا جیسے استعمال شدہ چیز کو اسٹور روم میں پھینک کر رکھا جاتا ہے۔

اس کے باوجود صبح سویرے شاور لے کر، بہترین لباس پہن کر اور پرفیوم اسپرے کر کے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ فلائٹ کی روانگی سے دو گھنٹے پہلے رپورٹ جانا چاہتا تھا۔

اس نے فون پر انٹیلی جنس کے حماد صدیقی سے کہا۔ ”تم وہاں آٹھ بجے تک آ جاؤ۔ وہاں کسٹم اور پولیس والے مراد کو روک سکتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں روکا جائے۔“

حماد اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت ہی اہم مسئلے میں اس طرح مصروف رہا تھا کہ اب تک بونے مراد کو دیکھنے کا وقت نہ نکال سکا تھا۔ اب اس کی مصروفیت کم ہو گئی تھی اس نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ انہیں نہ روکا جائے آپ نے مجھے کل رات بتایا ہے کہ وہ بونا ہو گیا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کبھی کسی انسان کا قد گھٹتا نہیں ہے۔ میں بھی اسے آنکھوں سے دیکھوں گا۔“

پھر اس نے کہا۔ ”سر! ایک بات کہتا ہوں۔ آپ ایک شریف پراسن شہری ہیں۔ آپ مجرمانہ جھککنڈے نہیں جانتے۔ پلاسٹک سرجری بہت ایڈوانس ایج پر ہے، گھنٹے دو گھنٹے میں چہرے بدل دیے جاتے ہیں۔“

محبوب نے حیرانی سے فون کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا وہ مراد نہیں ہے؟“

حماد کی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ حقیقتاً بونا ہے اور اسے سرجری کے ذریعے مراد بنایا گیا ہے؟“

”بالکل یہی بات ہے۔ ہم جاسوس ہیں۔ جادو ٹونے والی بات کبھی نہیں مانیں گے۔“

”یعنی اس بونے کا مہذب شیٹے سے معائنہ کیا جائے تو سرجری ظاہر ہو جائے گی۔“

”نہیں، میں نے کہا تھا۔ یہ ٹیکنالوجی بہت آگے جا رہی ہے۔ اب صرف پلاسٹک کا نام رہ گیا ہے ورنہ پلاسٹک کو مخصوص روس سے گزار کر انسانی کھال کی طرح بنالیا گیا ہے۔ مہذب ٹھیسے سے بھی پتا نہیں چلتا کہ اصلی اور نقلی کھال گردن اور ٹھوڑی کے نیچے کہاں جا کر کس ہو گئی ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”انسان نے کیسے کیسے علوم اور مہارتیں حاصل کی ہیں۔ اب دو باتیں ہمارے سامنے ہیں۔“

”ایک تو یہ کہ وہ بہر و پیا ہے۔ مراد ثابت نہیں ہوگا اور جب ماروی کو معلوم ہوگا کہ وہ بہر و پیا ہے تو اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اسے دھتکار دے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ رات گزار چکی ہے۔ اسے مراد کہہ رہی ہے۔ کچھ تو سوچ کر پہچان کر کہہ رہی ہوگی۔“

”سرا میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیسے دھوکا کھا رہی ہوگی۔ وہ اتنی نادان نہیں ہے کہ ایک بونے سے شادی کر کے اس کے ساتھ راتیں گزارے گی۔ یہ کوئی لمبا چکر ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”لمبا چکر...؟“

”ہاں۔ ایک جاسوس کا ذہن کہتا ہے کہ مراد یہاں نہیں آیا ہے اس نے ایک بونے کو اپنا ہم شکل بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ اس سلسلے میں ماروی کو اپنا راز دار بنایا ہے۔ وہ بونا اسے بیوی بنا کر لندن مراد کے پاس لے جا رہا ہے۔“

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔ تم کہہ رہے ہو تو یہ عقل آرہی ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ اس بونے سے اگلوانی چاہیے۔“

وہ اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ساڑھے سات ہو رہے ہیں۔ جلدی کرو۔ وہ اتر پورٹ جانے کے لیے نکل گئے ہوں گے۔ حماد...! تم وہیں بونے کو پکڑو گے اور سختی سے اس کا محاسبہ کرو گے۔ ابھی فوراً نکلو! میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔“

”سر! آپ نے بتایا ہے کہ بونا تنہا نہیں آیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دوست بھی ہے۔“

”ہاں اس کا نام ایمان علی ہے۔“

محبوب فون کان سے لگائے تیزی سے باہر آیا پھر اپنی کار میں بیٹھنے لگا۔ حماد نے پوچھا۔ ”وہ ایمان علی کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا صحت مند جوان ہے؟“

وہ کار اشارت کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل میری تمہاری طرح صحت مند اور قد آور ہے۔“

”کیا آپ کی طرح؟“

”ہاں...“

”کیا قدم میں آپ کے برابر ہے؟“

”ہاں، میرے برابر ہے۔“

وہ چیخ کر بولا۔ ”سر! آستین میں سانپ ہے۔“ محبوب نے فوراً ہی بریک لگا کر کار کو ایک طرف روکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کیوں چیخ پڑے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”سر! پورا ڈراما سمجھ میں آ گیا ہے۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا سمجھ میں آ گیا ہے؟“ ”سر...! میں دعوے سے کہتا ہوں۔ وہ ایمان علی

نہیں، مراد علی منگی ہی ہے۔ آپ کا رقیب۔“

محبوب دیدے پھیلائے وڈ اسکرین کے پار خلا میں تک رہا تھا۔ حماد بول رہا تھا۔ ”آپ تھوڑی دیر کے لیے مجرمانہ ذہنیت اور چالبازی سے سوچیں۔ مراد زبردست پلاننگ کے مطابق کامیاب رہا ہے۔ ماروی کا نکاح واقعی مراد سے ہو چکا ہے اور وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کی کوٹھی کی چار دیواری میں مراد کے ساتھ دن رات گزار رہی ہے۔“

”او گاڈ...! تم بہت ہی لرزا دینے والی بات کہہ

رہے ہو اور یہ بات دل کو لگ بھی رہی ہے۔“

”ابھی اتر پورٹ میں ثابت ہو جائے گا اس بونے مراد کو صرف لیبل بنا کر لایا گیا ہے۔“

وہ سن رہا تھا اور دیدے پھیلائے خلا میں ماروی کو ایمان علی کی آغوش میں دیکھ رہا تھا۔ غصے سے دماغ گرم ہو رہا تھا۔

یہ سوچ کر انسٹ محسوس ہو رہی تھی کہ ماروی بھی مراد کی پلاننگ میں شریک رہ کر اسے دھوکا دے رہی ہے اور کتنی صفائی سے الو بنا کر ہنی مون منانے جا رہی ہے۔

وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”حماد! میں راستے

میں ہوں۔ فون بند کر رہا ہوں۔ تم فوراً اتر پورٹ پہنچو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ پھر اسٹیرنگ پر زور کا ہاتھ

مار کر اسے اشارت کیا۔ تیز رفتاری سے فرار ہونے والوں کی

سمت جانے لگا۔

ماروی مراد اور عبداللہ دو گھنٹے پہلے آگئے تھے۔ وہاں

معلوم ہوا کہ جہاز ایک گھنٹے کی تاخیر سے یعنی گیارہ بجے

پرواز کرے گا۔ لندن کے مسافروں کو ابھی اندر جانے کی

اجازت نہیں تھی۔ وہ تینوں باہر کھڑے ہوئے تھے۔

محبوب ٹھنڈا دماغ رکھنے کا عادی تھا۔ اسے کبھی کبھی

غصہ آتا تھا لیکن کوشش کرتا تھا کہ غصہ ظاہر نہ ہو۔ وہ کار سے

نکل کر تیزی سے چلتا ہوا عمارت کے اندر آیا۔ پھر لوگوں کے

ہجوم میں دور کھڑی ماروی کو دیکھ کر ڈرا رک گیا۔

وہ عبا یا اور نقاب میں تھی لیکن قریب ہی ایمان علی تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ وہی تو دل و ایمان تھی۔ ماروی کیا تھی؟ فقط پیدائشی حسن تھا اور فطری سادگی تھی۔ اس وقت وہ پریشان ہو کر مراد سے کہہ رہی تھی: "میں تنہا کبھی گوشہ سے شہر نہیں آئی۔ اتنی دور لندن کیسے جاؤں گی۔"

مراد نے کہا۔ "خواتین پریشان ہو رہی ہو۔ صرف یہاں ہم سے دور رہتا ہے۔ جیسے ابھی ہم قریب بھی ہیں اور ایک دوسرے سے انجان بھی۔ میں دوسری طرف منہ کر کے فون کان سے لگائے جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہوں۔ تم بھی یہی کر رہی ہو۔ کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے بول رہے ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "میں اندر کہاں جاؤں گی؟"

وہ بولا۔ "سامنے شیشے کے پار دیکھو۔ دوسری فلائٹوں میں جانے والے مسافر سامنے بنے ہوئے کاؤنٹروں کے پاس جا رہے ہیں۔ وہاں سے بورڈنگ کارڈ حاصل کر رہے ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ادھر ایئر پورٹ کا عملہ ہے۔ تمہیں ہر معاملے میں گائیڈ کرتا رہے گا۔"

ماروی نے چونک کر ایک سمت دیکھا۔ پھر کہا۔ "مراد...! محبوب آرہے ہیں۔"

محبوب نے نقاب میں پہچان لیا تھا۔ پھر بھی دور کھڑے ہوئے عبداللہ کے پاس آ کر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "ماروی کہاں ہے؟"

اس نے کہا۔ "وہ ادھر نقاب میں ہے۔"

"تعجب ہے، یہ کبھی پردہ تو نہیں کرتی تھی۔"

"مجبوری ہے سائیں! میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں میری زوجہ سمجھی جائے۔ میرا چہرہ دیکھتے ہی انٹیلی جنس اور پولیس والے مجھے مراد علی منگی کہیں گے۔ میری وجہ سے یہ مصیبت میں پڑ جائے گی۔ اس لیے ظاہر کر رہی ہے کہ تنہا یہاں سے جا رہی ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "ہوں اسی لیے ایمان علی بھی اس سے منہ پھیر کر کھڑا ہوا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ماروی کے پاس آیا پھر قریب آ کر بولا۔ "میں نے چھپنے کے باوجود تمہیں دور سے پہچان لیا تھا۔"

"میں آپ سے چھپ کر نہیں جا رہی ہوں۔"

"جب سے میری زندگی میں آئی ہو تب سے سامنے"

رہتے ہوئے بھی اپنا اصلی روپ نہیں دکھایا۔ اس روپ کو ہمیشہ خود غرضی کی عبا اور نقاب میں چھپاتی آئی ہو۔"

ایمان علی (مراد) نے گھوم کر دیکھا۔ محبوب سے اس کی نظریں چار ہوئیں۔ وہ سب اسے فریب دے رہے تھے اور وہ دل کو سمجھا رہا تھا۔ "مجھے طیش میں نہیں آنا چاہیے۔ اب میں دھوکا نہیں کھا رہا ہوں۔ ابھی ان سب کی رکیں سیدھی کر دوں گا۔"

اس نے ماروی سے کہا۔ "میں تھوڑی دیر تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا ایک طرف چلو۔"

ماروی نے چور نظروں سے مراد کو دیکھا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "آپ تنہائی میں جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہاں بھی کہہ سکتے ہیں۔"

وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "تنہائی ضروری ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ورنہ ابھی حماد اپنے عملے کے ساتھ آئے گا اور تم تینوں کو انکوائری کے لیے لے جائے گا۔"

یہ ایسی دھمکی تھی کہ مراد نے پریشان ہو کر محبوب کو دیکھا۔ وہ مراد سے انجان بنا ہوا تھا۔ اسے اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ ماروی نے سہارے کے لیے مراد کو دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ یعنی اجازت دے دی۔ وہ ایک طرف چل پڑی۔ مسافروں کی بھیڑ سے نکل کر ایک ستون کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے سامنے آ کر بولا۔ "بھید کھل گیا ہے۔"

ماروی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے سخت اور پختہ لہجے میں بولا۔ "وہ بونا مراد نہیں ہے۔ مراد ایمان علی کے پیچھے روپوش ہے۔"

وہ چونک کر گھبرا کر اسے دیکھنے لگی وہ بولا۔ "ابھی حماد آئے گا تو ان دونوں کو الگ الگ سیل میں لے جائے گا پھر ان کے اندر چھپے ہوئے بہرہ یوں کو باہر لے آئے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ نے حماد کو کیوں بلایا ہے کیا آپ مجھ سے دشمنی کر رہے ہیں؟"

"کیا تم دوستی کرتی آرہی ہو؟"

اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے کہا۔ "کبھی تنہائی میں میرے لیے اتنا سوچا ہے کہ میں نے پیار کی ابتدا سے اب تک کتنی نیکیاں تم سے کی ہیں؟ کس طرح اپنے اربوں روپے کے کاروبار کو خسارے میں ڈالتے ہوئے تمہارے لیے گولی کھائی ہے۔ مراد کی جگہ جیل گیا ہوں۔ کیا کوئی کسی کے لیے پھانسی کے تختے پر چڑھنے جاتا ہے؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے تمہارے عاشق کی طویل غیر موجودگی میں تمہاری آبرو پر آنچ نہیں آنے دی۔"

اس نے کہا۔ "میں آپ سے چھپ کر نہیں جا رہی ہوں۔"

ماروی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ "خدا جانتا ہے میں آپ کی کتنی عزت کرتی ہوں۔"

"واہ کیا خوب عزت کرتی ہو میری واہ... گولی میں کھاتا ہوں پیار اس سے کرتی ہو۔ جیل میں جاتا ہوں، بلائیں اس کی بھتی ہو۔"

"کیا عزت ایسے ہی کی جاتی ہے؟ جس آبرو کا محافظ میں بن کر رہا۔ اسے بچپن کے یار کو دیتی ہو۔ مراد اور بونے مراد کی دھوکے بازی میں شریک ہو کر میری توہین کر رہی ہو یا عزت بڑھا رہی ہو؟"

اس کا سر جھکا ہوا تھا، وہ بولی۔ "عشق نے آپ کو دو کوڑی کا کر دیا۔ آپ دولت عزت اور نیک نامی سب ہی کو داؤ پر لگا کر مجھے ہار چکے ہیں۔ مجھے بھی مراد کے عشق نے آپ کی نظروں میں بے وفا اور فریبی بنا دیا ہے۔ میں کیا کروں؟ میں آپ کے لیے ضروری ہوں اور مراد میرے لیے ضروری ہے۔"

"میں آپ کا دل توڑ رہی ہوں۔ آپ سیرا جیسی پیار کرنے والی کا دل توڑتے آرہے ہیں۔ عشق میں صرف اپنا یار اپنی محبوبہ دکھائی دیتی ہے۔ اربوں کا کاروبار بچانے والی کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہم سب خود غرض ہیں محبوب صاحب!"

محبوب نے ایک طرف دیکھا۔ حماد صدیقی اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ گاڑی سے اتر رہا تھا۔ اس کے آگے والی کار سے معروف جلی باہر آ رہا تھا۔ انہوں نے ایک ستون کے پاس محبوب اور ماروی کو دیکھا۔ ماروی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ "کیا آپ جانے نہیں دیں گے؟"

وہ بولا۔ "ابھی آتا ہوں۔"

وہ وہاں سے آگے بڑھ کر معروف اور حماد صدیقی کے پاس گیا۔ ان سے کچھ کہنے لگا۔ سفر کرنے والوں کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ شاید وہ نہیں جاسکیں گے۔

ماروی دور سے مراد اور کبڈی کو دیکھ رہی تھی۔ مراد بھی حماد صدیقی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ پھر محبوب ماروی کے پاس آ گیا۔ حماد اور معروف، مراد اور عبداللہ کی طرف جانے لگے۔

ماروی پریشان ہو کر مراد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے محبوب کے آتے ہی کہا۔ "آپ مراد کو کسی حد تک جانتے ہیں۔ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ ابھی اسے جانے سے روکا جائے گا تو وہ اصلی روپ میں آ جائے گا۔ یہاں قیامت آ جائے گی۔ یہ اتر پورٹ میدان جنگ بن جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ گرفتاری پیش نہیں کرے گا، مارو دھاڑ کا عادی ہو گیا ہے لیکن سراسر نقصان میں رہے گا۔ کیا یہ کم نقصان ہوگا کہ تم اس کے ساتھ نہیں جاسکو گی؟"

ادھر حماد صدیقی نے آ کر پہلے حیرانی سے بونے مراد کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ "ویل مسٹر ایمان علی تم نے زبردست ڈراما پلے کیا ہے۔ میں تمہیں ایمان کہوں یا مراد؟"

وہ بولا۔ "میں یہاں سے لندن تک ایمان علی ہوں، میرے کاغذات مستند ہیں۔ انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ ابھی ایک فون کال پر میرے ڈیڈی ڈاکٹر مینی سن تصدیق کریں گے۔ ہمارا پورا خاندان گواہی دے گا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔"

معروف نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ پلاسٹک سرجری ایسا کرشمہ دکھاتی ہے۔ ایک بونا بالکل مراد علی منگی بن گیا ہے۔"

وہ مراد کو دیکھ کر بولا۔ "اور تم مراد ہو۔"

"کوئی مائی کالال مجھے مراد ثابت نہیں کر سکے گا۔"

حماد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "میں مانتا ہوں، تمہارے چہرے پر سرجری ثابت نہیں کی جاسکے گی۔ لیکن تمہیں انگوارری کے مرحلوں سے گزارنے کے لیے روکنا پڑے گا۔ پھر جب تک اس بونے کی اصلیت معلوم نہ ہو، اسے بھی انگوارری سل میں رکھنا ہوگا۔ قانون معلوم کرنا چاہے گا کہ یہ مفروضہ اور مطلوبہ مجرم مراد علی منگی کا ہم شکل کیسے ہو گیا ہے؟"

محبوب نے ماروی سے کہا۔ "یہ مطلوبہ مجرم کا ہم شکل کیسے بن گیا اس کی ایک لمبی کہانی عدالت میں سنائی جائے گی جسے شاید مان لیا جائے لیکن جب تک مقدمہ طویل ہوتا جائے گا، مہینوں اور برسوں بھی گزر سکتے ہیں۔ پھر سوچو کہ مراد کتنے عرصے تک ایمان علی بن کر یہاں اس کا مقدمہ لڑتا رہے گا اور کس رشتے سے تمہارے قریب رہے گا؟"

وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "تم ایک مجرم کے احمقانہ عشق میں صرف نقصان اٹھاتی رہو گی۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو ابھی نہ جاسکیں تو یہاں رہ کر اس کے ساتھ ازدواجی گھریلو زندگی نہیں گزار سکو گی۔"

وہ تڑپ کر بولی۔ "خدا کے لیے دشمنی نہ کریں۔"

وہ بولا۔ "دشمنی رقیب سے ہے تم سے نہیں ہے۔ پہلی بار تم میمن گوٹھ میں نظر آئی تھیں۔ اس پہلے لمحے سے تمہارا دوست ہوں۔ تم چاہو تو اب بھی دوستی نباہ سکتی ہو۔"

"آ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

غور سے پڑھیں کہیں آپ بھی تبخیر معدہ گیس ٹریبل کے شکار تو نہیں؟

بد ہضمی۔ پیٹ کا بڑا ہو جانا۔ دل کی گھبراہٹ
دماغ کی بے چینی۔ سر کو چکر۔ قبض کی پرالہم۔
جسم کی تھکاوٹ۔ جوڑوں کا درد۔ سینے میں
جلن اور خوراک کا ہضم نہ ہونا۔ طبیعت کا ہر
وقت مایوس رہنا۔ زندگی سے بیزاری چہرے
کا بے رونق ہو جانا اور وزن کا بڑھ جانا یہ
سب تبخیر معدہ گیس ٹریبل ہی کی تو علامات ہیں
شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ اگر آپ بھی
تبخیر معدہ گیس ٹریبل کے شکار ہوں تو آج ہی
فون پر رابطہ کریں۔ گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک
دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں والا ہم
سے تبخیر معدہ گیس ٹریبل کورس منگوالیں۔

دارالشفاء المدنی

ضلع حافظ آباد پاکستان

0333-1647663

0301-8149979

اوقات رابطہ

صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

”کیا میری دوستی سے اب تک کوئی نقصان پہنچا ہے؟“
ماروی نے انکار میں سر ہلایا، وہ بولا۔ ”آئندہ بھی
نہیں پہنچے گا۔ آج ایک اہم وعدہ کرو۔ خدا کو حاضر و ناظر
جان کر پورے ایمان سے بولو کہ مراد کے بعد صرف میں ہی
تمہارا عاشق، تمہارا مطلوب اور محبوب رہوں گا۔“
ماروی نے اس عجیب و غریب دیوانے کو بڑی عقیدت
سے دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ”یہ سچے ایمان سے بولو مراد کے
بعد صرف مجھے سوچو گی اور مجھے یاد کرتی رہو گی۔“
پھر اس نے اپنے دل کی آخری بات کہی۔
”خدا نخواستہ وہ نہ رہا تو تم میری دلہن بن جاؤ گی۔“

وہ چونک کر بولی۔ ”یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟
میرا مراد کیوں نہیں رہے گا؟“
”دنیا میں کوئی بھی نہیں رہتا۔ میں بھی نہیں رہوں گا۔
ہو سکتا ہے اس سے پہلے میں مرجاؤں۔ میری دیوانگی کو کبھی تو
سمجھو۔ ابھی تو نہ جانے کب تک تمہاری آرزو میں جیتا رہوں
گا اور انتظار کرتا رہوں گا۔“

”یہ انتظار کہ آج نہیں تو کل میرے پاس لوٹ کر
آؤ گی۔ مراد بھی یہی سوچتا ہے کہ میں مرجاؤں تو تمہیں ہمیشہ
کے لیے مجھ سے نجات مل جائے گی۔ ہم رقیب ہیں۔ ایک
دوسرے کی سلامتی کے لیے نہیں سوچیں گے۔ کسی ایک کی
موت سے منافع میں تم ملو گی۔“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر
بولا۔ ”تم پرانی ہو چکی ہو۔ پھر بھی رقیب کی موت کا اور
تمہاری واپسی کا انتظار کرتا رہوں گا۔“

ماروی نے اسے بڑی عقیدت سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”یہ سوچ کر میرے اندر کی عورت خوش ہوتی ہے کہ
آپ جنون کی حد سے گزر کر میری آرزو کرتے ہیں۔
”آپ نے میرے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔
بے شک اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کسے پہلے مرنا
ہے اور کسے لمبی عمر جینا ہے؟“

”میں وعدہ کرتی ہوں اگر آپ وفات پا گئے تو آپ کے
لیے آنسو بہاتی رہوں گی۔ خدا نخواستہ مراد نہ رہا تو صرف اور
صرف آپ کے پاس آؤں گی۔ ابھی آپ ہمیں جانے دیں۔“
”پہلے مراد کی قسم کھاؤ۔“

”میں اپنے بچپن کے پیار کی، اپنے دلدار کی اپنے مراد
کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مراد کے بعد آپ ہی میرے جسم و جان
کے حقدار، میرے وجود کے مالک بن کر رہیں گے۔“

”بوڑھی ہو جاؤ گی، تب بھی آؤ گی؟“

”ہاں تب بھی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آؤں گی۔“

ماروی کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

لندن کے برن ہاؤس کے قریب ایک بہت بڑے اسٹیڈیم میں رائفل شوٹنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ صبح نشانہ میں اول دوم اور سوم آنے والوں کے لیے ہزاروں پاؤنڈز کے انعامات رکھے ہوئے تھے۔ یورپ کے کئی ممالک سے مانے ہوئے شوٹرز مقابلہ جیتنے کے لیے وہاں آئے تھے۔

ایسے وقت بلا اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہاں پھر ایک بار میکی براؤن کو نقصان پہنچانے کی پلاننگ پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ بشری عرف بلی نے کہا۔ ”میں بھی وہاں جاؤں گی۔ مجھے بھی رائفل شوٹنگ سے دلچسپی ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں وہاں تماشا دیکھنے نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے میکی پر پھر ایک بار زبردست حملہ کرنا ہے۔“

”تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل۔“

”وہاں مجھے اپنی سلامتی کی فکر ہو گی۔ میں تیری حفاظت نہیں کر سکوں گا۔“

”میں کوئی ہتھی نہیں ہوں۔ تیری انگلی پکڑ کے نہیں جاؤں گی، خود ہی کہتا ہے کہ مجھے مرینہ کی طرح زبردست فائٹر بننا چاہیے اور خود ہی ایسی جگہ جانے سے روکتا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی تو کس طرح خطرات سے کھیلنا آئے گا؟“

پلے نے اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس پر جھک گیا۔ اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر پیار کرنے لگا۔ وہ بڑی اداؤں سے مسکرا کر بولی۔ ”کیا میں پھر سے نئی لگ رہی ہوں؟“

”تو تو ہر روز نئی لگتی ہے۔ دل کہتا ہے تجھے شیشے کے شوکیس میں سنبھال کر رکھوں۔ باہر کی مٹی دھول لگنے نہ دوں۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کسی کی نظر نہ لگنے دوں۔“

وہ اسے محبت سے سمیٹ رہا تھا۔ چوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میں مجبور ہو گیا ہوں۔ عقل کہتی ہے، تو ایک گھریلو عورت بن کر نہیں رہ سکے گی۔“

”اسی لیے تو میں نے سن سٹی میں رائفل شوٹنگ کا کارڈ رائٹنگ فائیننگ اور انگلش لینگویج سیکھی ہے۔“

وہ بولی۔ ”دل پتھر کر لے۔ مجھے کالج کی عورت نہ بنا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے لیے پراہلم نہیں بنوں گی۔ اپنی حفاظت آپ کروں گی۔“

تنہائی ہو اور جذبات چنچ رہے ہوں تو عورتیں اپنی باتیں منوالیتی ہیں۔ پھر حالات کا بھی تقاضا تھا کہ آغوش میں کھلتے رہنے والی کوفل آف ایکشن بنانا ہے۔ وہ راضی ہو

”اور کبھی کبھی فون پر اپنی آواز سناؤ گی۔“

”میں دنیا کے آخری سرے سے بھی آپ کو پکاروں گی لیکن میری بھی ایک خواہش پوری کریں۔“

”ہزاروں خواہشیں پوری کروں گا۔“

”صرف ایک خواہش کر رہی ہوں۔ میری زندگی میں ایک جیون ساتھی آ گیا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی ایک شریک حیات لے آئیں۔ سمیرا بے مثال بیوی ثابت ہوگی۔“

”شادی کروں گا تو تم واپس نہیں آؤ گی۔ سوکن کو برداشت نہیں کرو گی۔“

”میں سوکن کے ساتھ رہنے نہیں آؤں گی آپ کے ساتھ الگ زندگی گزاروں گی۔“

”پھر تو تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔“

وہ ماروی کے ساتھ چلتا ہوا مراد اور حماد کے پاس آیا۔ پھر بولا۔ ”حماد! انہیں جانے دو۔ چیکنگ کے دوران کوئی رکاوٹ پیش آئے تو اسے دور کرو۔۔۔ ماروی کو ہر حال میں جانا ہے۔“

پھر اس نے ماروی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چلیے معروف صاحب! میرا دل اور دماغ ہلکا ہو گیا ہے۔ ماروی کی سچائی کو آخری بار آزمارہا ہوں۔ فی الحال خوش رہا کروں گا۔“

اس نے مراد کی طرف نہیں دیکھا۔ ماروی پر آخری مسکراتی ہوئی نظر ڈالی۔ پھر معروف کے ساتھ بوجھل قدموں سے جاتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ”ماروی! میری جان! میں بیان نہیں کر سکتا۔ صرف خدا جانتا ہے کہ کس دل سے کس حوصلے سے تیری دوری برداشت کر رہا ہوں۔ یہ دل تا حیات میرے سینے میں رہے گا۔ مگر تیرے ہی لیے دھڑکے گا۔ میں سوؤں گا تو تیرے خواب دکھائے گا۔ جاگوں گا تو تیرے دھیان میں خوابیدہ رکھے گا، تجھے کچھ ہو جائے گا تو یہ سینے کی دیوار سے سر پھوڑے گا۔ ماروی تو جارہی ہے۔ آدھی جان لے جا رہی ہے۔ جا اور جب چاہے باقی آدھی بھی لے جانا۔“

وہ اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ونڈاسکرین کے پار دیکھتے ہوئے زیر لب بولا۔ ”کہاں جاؤں؟ میرے آنے جانے کے تمام راستے ماروی لے جا رہی ہے۔ میں بے راہ بے سمت ہو گیا ہوں۔ اسے جان حیات! تیری عمر دراز ہو۔“

کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ فی الحال کوئی راستہ

گیا۔ اس نے کہا۔ ”تجھے تنہا اسٹیڈیم میں جانا ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق مسکی براؤن وہاں آنے والا ہے۔“
وہ منہ بنا کر بولی۔ ”تو میرے ساتھ کیوں نہیں جائے گا؟“
”میں ایک الگ طرح کی واردات کرنے جا رہا ہوں۔ میرا راستہ الگ ہے۔“

”کیا کوئی بڑی خطرناک واردات کرنے والا ہے؟“
”ہاں زبردست دھماکا ہوگا تو بھی آواز سنے گی۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا چاہے جیسا بھی ہنگامہ برپا ہو اسٹیڈیم کے باہر پارکنگ ایریا کی طرف ہرگز نہ جانا۔“
”بھی نہیں جاؤں گی۔“

”تو وہاں مسکی براؤن کو دیکھے گی۔ شاید اس کا بیٹا جسکی براؤن بھی باپ کے ساتھ ہوگا۔“

وہ اُچھل کر بولی۔ ”پھر تو میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔“
”جے نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔“ کیا مرنے کے لیے جا رہی ہے؟ کیا وہ لوگ چوڑیاں پہن کر آئیں گے؟ ہزاروں کی بھیڑ میں گولی چلا کر فرار ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ باپ سے بڑے سخت سکیورٹی میں ہوں گے اور وہ درجنوں سکیورٹی گارڈز عام لباس میں ہوں گے۔ تو سب ہی کو پہچان نہیں سکے گی۔ دھوکا کھا جائے گی۔ وہ تجھے گولیوں سے پھینکی کر دیں گے۔“

وہ مایوس ہو کر بولی۔ ”تو کہتا ہے تو کچھ نہیں کروں گی لیکن یہ تو بتاؤ کیا کرنے والا ہے؟“
”میری بات ابھی نہ پوچھ۔ مجھے تیری فکر ہو گئی ہے۔ اگر اُلٹی کھوپڑی سے کوئی کام کیا نا تو ٹانگیں توڑ کر گھر میں بٹھا دوں گا۔ پھر بھی باہر نہیں جاسکے گی۔“
”کہہ تو رہی ہوں کچھ نہیں کروں گی۔“

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یاد ہے نا، تو اسٹیڈیم کے باہر پارکنگ ایریا کی طرف نہیں جائے گی۔“

”پھر میں اپنی گاڑی کہاں پارک کروں گی؟“
”گاڑی میں لے جاؤں گا۔ تو ٹیکسی میں جائے گی۔ میں واپسی میں تجھے وہاں سے لے آؤں گا۔“

مرینہ بھی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ مقابلے میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ اگر مقابلہ کرتی تو تمام ٹارگٹ شوٹرز کو مات دے دیتی۔ پہلا انعام پچاس ہزار پاؤنڈ ضرور حاصل کرتی لیکن میٹ ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس اور افسران تازہ لیتے کہ وہ نئے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی مرینہ ہے۔

وہ ایک نو جوان ترکش گرل کے روپ میں تھی۔ اس کا

موجودہ نام تلاش تھا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سرانغ رسالوں اور افسروں سے چھپ رہی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو مراد کے سر کی قیمت وصول نہیں کرنے دے گی اور آئندہ کبھی ان کے سامنے نہیں آئے گی۔

اپنے ڈیپارٹمنٹ سے بغاوت کا مطلب یہ تھا کہ ان سے دشمنی مول لی تھی۔ وہ سب جانتے تھے کہ مراد اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ وہ لندن میں ہے۔ اس نے ریڈ الرٹ کے مسکی براؤن کے بیٹے کو گولی مار کر پورے لندن میں کھلبلی پیدا کر دی تھی۔

براؤن فیملی کو کوئی چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کچا یہ کہ اس نے انٹرپورٹ کی عمارت کے باہر سرعام اس کی فیملی کے ایک اہم فرد کو گولی سے اڑا دیا تھا۔

جے نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، وہ مراد کے نام ہو رہا تھا۔ کئی خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اسے ڈھونڈنے اور قتل کرنے لندن پہنچ گئے تھے اور اب مراد تک پہنچنے کے لیے مرینہ کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اسی لیے اس نے تلاش کے نام سے اپنا چہرہ اور اپنی شخصیت تبدیل کر لی تھی۔ ان سب سے چھپ رہی تھی اور ان کے آس پاس رہ کر ان کی مصروفیات کو سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ اسی مقصد کے لیے رائفل شوٹنگ کا مقابلہ دیکھنے آئی تھی۔ اس نے عارضی طور پر ایک بوائے فرینڈ کی خدمات حاصل کی تھی۔ لندن میں ایسے بے روزگار جوان کثرت سے پائے جاتے ہیں جو روزانہ اجرت پر باپ بھائی اور شوہر بن کر صبح سے رات تک ساتھ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔

اسٹیڈیم کے اندر تماشا کی ہزاروں کی تعداد میں تھے خطرناک تنظیموں کے سربراہ اپنے دوست احباب کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے آئے تھے۔ وہ اپنے مجرمانہ مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ پوائنٹس حاصل کرنے والوں کو خریدنا چاہتے تھے۔ ایسے شوٹنگ کے مقابلوں میں انہیں ماہر اور خطرناک شوٹرز مل جایا کرتے تھے۔

مسکی براؤن ابھی اپنی بیوی ہیلنا، بیٹے جسکی براؤن اور جوان بیٹی میڈونا کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے اطراف سخت سکیورٹی تھی۔ دوسری تنظیموں کے گن مین بھی ان کے محافظ بن گئے تھے۔ ان کی قیمتی کار اور دوسری گاڑیاں اسٹیڈیم کے باہر کھڑی ہوئی تھیں۔ ان خالی گاڑیوں کے آس پاس بھی دو چار مسلح گارڈز موجود تھے۔

لندن میں انڈر گراؤنڈ ڈرین سسٹم تہ خانوں کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ شہر کی تمام غلطیتیں ان تہ خانوں

کے بالوں سے گزرتی ہیں۔ انہیں تیزی سے بہا دینے کے لیے کئی ستوں سے پانی بہت تیز رفتاری سے بہتا رہتا ہے۔ بلال احمد بلا اس انڈر ڈرین سے گزر رہا تھا، اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک تھا تاکہ وہ ناقابل برداشت بدبو سے محفوظ رہے۔ اس کی پشت سے آکسیجن سلینڈر بندھا ہوا تھا۔ اس انڈر ڈرین کے اوپر اسٹیڈیم کے پاس جہاں گاڑیاں تھیں، وہاں اس کا ایک ماتحت کھڑا تھا۔ فون کے ذریعے بلے کو اوپر کے حالات بتا رہا تھا۔

بلے کا فون اس کی جیب میں تھا۔ اس کے کانوں سے ہنڈفری لگا ہوا تھا اور وہ معلوم کر رہا تھا کہ میکی براؤن کی کار کے پاس دو مسلح گارڈز ٹپلتے ہوئے دور جاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں۔

بلے نے ایک دن پہلے اس واردات کی رپورٹ کر لی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اسے انڈر ڈرین کے کتنے کوریڈور سے گزر کر اس گٹر کے ڈھکن تک پہنچنا ہے جہاں اسٹیڈیم کے باہر کئی گاڑیوں کو پارک کیا جاتا تھا۔

بعض اوقات کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے کیچڑ و لدل اور گٹر سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ وہاں بہت ہی گندا پانی بہہ رہا تھا۔ اگر اس کی ٹاک اور منہ پر گیس سلینڈر نہ ہوتا تو وہ ایک سے دوسری سانس نہ لے پاتا۔ وہیں چکرا کر گر پڑتا۔

وہ دو کوریڈور سے گزرتا ہوا تیسرے کوریڈور میں آیا۔ ایک لوہے کی پتلی سی سیڑھی اوپر چھت تک گئی تھی۔ سیڑھی کے اوپری حصے میں گٹر کا ڈھکن تھا۔ جسے کھول کر وہ باہر اسٹیڈیم کے پارکنگ ایریا میں جاسکتا تھا۔

اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ماتحت سے کہا۔ ”میں گٹر کے ڈھکن کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ گارڈز کدھر ہیں؟“ ماتحت نے کہا۔ ”میکی براؤن کی کار کے پاس ہیں۔ ذرا رک جاؤ۔ جب وہ دور جائیں گے تو میں تمہیں بتاؤں گا پھر تم ڈھکن کھولو گے۔“

”کیا میکی کی کار ڈھکن سے لگی ہے؟“ ”نہیں۔ کوئی دوسری گاڑی ہے اس کے ساتھ۔ میکی کی کار ڈھکن سے تین یا چار فٹ کے فاصلے پر ہے۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”وہ دونوں گارڈز باتیں کرتے ہوئے کار سے دور جا رہے ہیں۔ ڈھکن کھولو۔“

بلا چھت اور ڈھکن سے لگا ہوا تھا۔ ڈھکن بچ دار تھا۔ وہ ایک روز پہلے دیکھ چکا تھا۔ اسے دائیں طرف گھماتے ہوئے کھولنے لگا۔ ایک منٹ کی محنت سے وہ کھل

گیا۔ اس نے ڈھکن کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ باہر کی تازہ ہوا آرہی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے دائیں بائیں دور تک کئی گاڑیوں کے پیسے نظر آرہے تھے۔ بالکل قریب ہی میکی کی سیاہ ہنڈا اکارڈ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گارڈز جو دور گئے تھے کسی وقت بھی واپس آسکتے تھے۔ بلے نے ٹائم بم نکال کر پندرہ منٹ کا وقت مقرر کیا۔ گٹر سے ہاتھ نکال کر اسے ہنڈا اکارڈ کی طرف زمین پر رکھا۔ پھر اندر ہو کر ڈھکن کو اس کی جگہ واپس رکھ دیا۔ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر دوڑتے ہوئے وہاں سے دور جانے لگا۔

اب اسے پھر گندے پانی سے گزرنا تھا اور پندرہ منٹ سے پہلے دور جا کر دوسرے گٹر کے ڈھکن سے باہر نکل جانا تھا۔ وہ گیس ماسک اور سلینڈر کو اتار کر پھینکنا چاہتا تھا۔

اسٹیڈیم کے اندر ٹارگٹ کے مطابق شوٹنگ دلچسپ مرحلے سے گزر رہی تھی۔ بشری اسٹیڈیم کے اس حصے میں آکر بیٹھ گئی جہاں میکی براؤن اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ان کے پیچھے میکی کا پرسل اسٹنٹ برونز انو بیٹھا ہوا تھا۔ ہیلانے اپنے پرس کو کھول کر دیکھا پھر برونز انو سے کہا۔ ”پلیز باہر جاؤ۔ میں اپنا فون کار میں بھول آئی ہوں اسے لے آؤ۔“

میکی براؤن نے اسے کار کی چابی دی۔ وہ وہاں سے جانے لگا۔ وہ میکی کا قابل اعتماد سرسیدہ ملازم تھا لیکن ان دنوں اپنے آقا سے ناراض تھا۔ ملازمت چھوڑ کر جانہیں سکتا تھا۔ میکی براؤن اپنے اصولوں کے مطابق رازدار ملازموں کو سخت پابندیوں میں رکھتا تھا۔ اگر کبھی کوئی اسے چھوڑ کر جانا چاہتا تو اس کے گن مین اسے گولی مار دیتے تھے۔

وہ اپنے حالات سے مجبور تھا۔ اس وقت شکست خوردہ انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹیڈیم سے باہر آیا پھر بلیک ہنڈا اکارڈ کی طرف جانے لگا۔ اس کے پیچھے مرینہ تھی۔

وہ اپنی پلاننگ کے مطابق باہر جا کر برونز انو سے دوستی کرنا اور اس سے لمبی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس سے میکی براؤن کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ اگر وہ بوڑھا پی اے اس کی بات نہ مانتا تو اسے گن پوائنٹ پر وہاں سے دور لے جانا چاہتی تھی۔

بلا شنگ کا مقررہ وقت پورا ہو رہا تھا، برونز انو ہنڈا اکارڈ سے پانچ گز کی دوری پر تھا۔ ایسے وقت ایک زوردار دھماکا ہوا۔ بلیک ہنڈا اور اس کے قریب کھڑی ہوئی گاڑی فضا میں اڑیں پھر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی ہوئی نیچے آئیں۔

بوڑھا بروناٹو لڑکھڑا کر گرا۔ ایسا دہشت زدہ ہوا کہ بھاگنے کی سکت نہ رہی۔ مریض اس کے پیچھے تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب آ کر اسے کھینچتی ہوئی دور لے جانے لگی۔ فضا میں اڑ کر نیچے آنے والی گاڑیوں کے ٹکڑے دور تک گولیوں کی طرح جا رہے تھے۔ ایک ٹکڑا بوڑھے کو آ کر لگا۔ وہ ایک ذرا تڑپ کر بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایسی دہشت پھیلانے والا دھماکا تھا کہ اسٹیڈیم کے اندر بھگدڑ ہونے لگی، میکی براؤن اور اس کے بیوی بچے کرسیوں کے درمیان دب کر بیٹھ گئے تھے۔ درجنوں مسلح گارڈز ان کے چاروں طرف قلعے کی دیوار بن گئے تھے۔ وہیں قریب ہی بشری چند سادہ لباس والوں کو دیکھ رہی تھی۔ بھاگنے والی عورتیں اور مردان گارڈز کو بھی دھکے مارتے ہوئے گزر رہے تھے اور وہ گارڈز لوگوں کے بہتے ہوئے سیلاب کو اپنے قریب سے گزرتے وقت روک نہیں سکتے تھے۔

ایسے وقت بشری نے میکی کے بیٹے جسکی براؤن کو دیکھا۔ اچانک کھوپڑی میں بات آئی اس سیلابی ریلے میں گولی چلائے گی تو کوئی اسے دیکھ نہیں پائے گا۔ جب دشمنوں کے قریب پہنچی ہوئی ہے تو کچھ کر گزرتا چاہیے۔

اس وقت وہ بھی کرسیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی گن میں سامیلنسر لگایا۔ ایسے وقت سر اٹھا اٹھا کر آتے جاتے بھاگتے ہوئے لوگوں کو بھی دیکھتی رہی۔ وہ ٹارگٹ کلنگ کی بہت ہی مناسب سچویشن تھی۔

آگے کچھ فاصلے پر دونوں باپ بیٹے کرسیوں کے درمیان سے کبھی کبھی سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ جب بیٹے نے سر اٹھا یا تو بشری نے گولی چلا دی۔ وہ کچھ کر گزرتا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ سے زیادہ ہی کر گزری۔ جسکی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ چیخ چاروں طرف کے شور ہنگاموں میں... گڈمڈ ہو گئی۔ اس کا لباس لہو سے تر ہوا تو انہیں پتا چلا کہ کہیں سے گولی آئی تھی۔

وہ فوراً ہی بھاگنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔ عورتوں اور مردوں کے ساتھ گرتی پڑتی اور سنبھلتی جانے لگی۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہاں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

میکی براؤن پر پھر ایک بار قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کے دوسرے اور آخری بیٹے کو بھی گولی لگی تھی۔ مراد سے دشمنی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ اس کے دو گارڈز

جسکی کو اٹھائے دوڑتے جا رہے تھے۔ اسے فوراً ہی اسپتال پہنچانا چاہتے تھے۔

پلے کی سر پھری بتی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیسی قیامت برپا کر کے وہاں سے جا رہی ہے۔

میکی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کرسیوں کے درمیان تھا۔ وہ سب اس اندیشے سے نہیں نکل رہے تھے کہ دوسری تیسری گولیاں ان کی طرف آ سکتی ہیں۔

ہیلانا اپنے بیٹے کے لیے رو رہی تھی۔ میکی اسے سمجھا رہا تھا۔ "میر کرو۔ حوصلہ کرو۔ بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زندہ رہے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے دعا کرو۔"

ایسے وقت یہ اطلاع ملی کہ ان کی بلیک ہنڈا اکارڈ اور ساتھ کھڑی ہوئی گاڑی کے پرچے اڑ گئے ہیں۔ فوراً ہی ان کا دھیان مراد کی طرف گیا۔ ان کے خلاف موت کا ایسا بھیاٹک کھیل وہی کھیل سکتا تھا۔

میکی براؤن نے فون پر سیکوریٹی افسر سے کہا۔ "مراد واردات کرنے یہاں آیا ہوگا۔ ہمارے آدمی کیا کر رہے ہیں؟"

"سر! ہم سب اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ کا پی اے بروناٹو بری طرح زخمی ہوا ہے۔ شاید مر گیا ہے، اسے ایک جوان عورت اپنی گاڑی میں لے گئی ہے۔"

میکی نے کہا۔ "بڈھا مر گیا ہوگا۔ ہماری فکر کرو۔ اسٹیڈیم کے پچھلے دروازے پر دوسری گاڑیاں لے آؤ۔" ڈنچرس ریکٹ کا سربراہ ڈی بلیک اپنے گارڈز کے ساتھ کچھ فاصلے پر کرسیوں کے درمیان گھسا ہوا تھا۔ وہاں سے سر اٹھا کر بولا۔ "میری گاڑیاں پچھلے گیٹ پر آرہی ہیں۔ اپنی فیملی کو یہاں سے لے چلو۔"

وہاں تقریباً تیس گن مین تھے۔ ڈی بلیک اور میکی براؤن ان کے حصار میں اپنی فیملی کے ساتھ پچھلے گیٹ کی طرف جانے لگے۔ ڈی بلیک کا انفارم فون پر کہہ رہا تھا۔ "باس! واردات کرنے والا انڈر ڈرین کے راستے سے آیا تھا جہاں ٹائم بم بلاسٹ ہوا ہے۔ وہاں گٹر کا ڈھکن پوری طرح بند نہیں کیا گیا تھا۔ وہ وہیں سے نکل کر بم کی ٹائمنگ سیٹ کرنے کے بعد فرار ہوا ہے۔"

ڈی بلیک فون بند کر کے میکی براؤن کو بتانے لگا کہ واردات کیسی زبردست پلاننگ سے کی گئی تھی۔ میکی نے کہا۔ "مائی گاڈ! ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کتے کا بچہ زمین کی تہ سے نکل کر ہماری کار تک پہنچے گا۔"

وہ سب تیزی سے چلتے ہوئے محتاط نظروں سے

ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ ایسے وقت ہزاروں تماشاکی اسٹیڈیم کے باہر کی سمت بھاگ رہے تھے اور ایسے بھی تھے جو اندر آ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اب اور دھماکا نہیں ہوگا۔ کوئی اپنا کام کر گیا ہے، پلٹ کر نہیں آئے گا۔

میکل براؤن پچھلے دروازے سے نکل کر فیملی کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہیلنا زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ ”اوگاڈ! اگر اس وقت ہم اپنی کار میں ہوتے تو ہمارا انجام کیا ہوتا؟“

اس کی بیٹی میڈونا نے کہا۔ ”ہمارے چیتھڑے اڑ جاتے۔ ابھی اس گاڑی میں بیٹھنے کے لیے زندہ نہ ہوتے۔“

پھر وہ باپ سے بولی۔ ”وہ میرے ایک بھائی کے بعد دوسرے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ گاڈ نے چاہا تو جبکی سلامت رہے گا۔ اوگاڈ...! ہم یہاں کتنی سخت سکیورٹی میں آئے تھے۔ تقدیر سے بچ گئے۔ آپ دیکھیں کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ پہلے ہمارے شوئرز کی موت بنا ہوا تھا۔ اب ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔“

ہیلنا نے کہا۔ ”اور زمین کی تہ سے آیا تھا جیسے موت کہیں سے بھی آ جاتی ہے اور ہم بچ نہیں پاتے۔ آج تقدیر سے بچ گئے۔ ماننا پڑتا ہے وہ ہماری سوچ سے زیادہ خطرناک ہے۔“

میکل براؤن بڑبڑانے لگا۔ ”میں اسے ایک معمولی پاکستانی شہری سمجھ رہا تھا۔ اسے میرا کوئی بھی شوٹر ایک گولی میں اڑا سکتا تھا۔ لیکن درجنوں کے نشانہ باز ہمارے گئے ہیں۔ پہلے وہ ایک قطرہ لگتا تھا اب سمندر بن کر ہماری طرف چلا آیا ہے۔ کوئی تدبیر کام نہیں آ رہی ہے۔“

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”بس وہ ایک ہے۔ اسے صرف ایک گولی ماری ہے اور اتنا سا کام نہیں ہو رہا ہے۔“

ابھی تو بیٹے کو گولی لگی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے وہ اپنی خیر مناتے ہوئے اسپتال کی سمت جا رہے تھے۔

☆☆☆

بلا انڈر ڈرین سے نکل آیا تھا۔ اس نے ایک حمام میں جا کر شاور لیا اور غلاعت سے نجات حاصل کی تھی۔ اس کے ماتحت نے بتایا تھا کہ میکل کی کار کے چیتھڑے اڑ گئے ہیں۔ اسٹیڈیم میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے اور ہزاروں کی بھیڑ میں میکل براؤن کی فیملی نظر نہیں آ رہی ہے۔

اس نے کہا۔ ”وہیں قریب ہی بشری ہوگی۔ اسے تلاش کرو اور دور دور ہی دور سے اس کی نگرانی کرتے رہو۔“ اس نے فون بند کر کے اسے ڈیش بورڈ پر رکھا۔ پھر کار کو ایک ہوٹل کے سامنے لا کر روک دیا۔ وہ ایک پاکستانی ہوٹل تھا۔ یورپ کے ہوٹلوں میں مرج مسالے والی چٹ مٹی چیزیں کھانے کو نہیں ملتیں۔ وہ اس ہوٹل سے بشری کے لیے سرخ مرچوں والی مسالے دار چکن کڑھا کی لے جانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت فون نے اسے مخاطب کیا۔

وہ ننھی سی اسکرین کو دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔ ”بول میری جان...! اسٹیڈیم میں کیا ہو رہا ہے؟“ وہ بولی۔ ”ڈبل تماشا ہو رہا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ڈبل تماشا...؟“ ”ایک ٹوٹنے لگا تھا۔ دوسرا میں نے کیا ہے۔“ وہ مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”کیا پہلی بھجوا رہی ہے؟ ٹوٹنے لگا کیا ہے؟“

”پہلے بول ٹو غصہ تو نہیں کرے گا؟“ ”اری بول نا کیوں الجھا رہی ہے؟“ ”میکل براؤن کے ایک بیٹے کو ٹوٹنے اڑایا دوسرے بیٹے کو میں نے گولی ماری ہے۔“

”کیا...؟“ وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہے؟ کیا بچ گولی ماری ہے؟“ ”ریو الوڈ سے بچ بچ گولیاں ہی نکلتی ہیں۔“ ”دیکھ بشری! تو مذاق کر رہی ہے؟“

”میرے لباس میں سکس ایم ایم۔ بی بی شاٹ گن رہتی ہے اور یہ گن مذاق نہیں کرتی ہے۔“ وہ لرز گیا۔ ہڈیانی انداز میں پتچ کر بولا۔ ”میں ابھی آ کر تجھے جوتے ماروں گا۔ کہاں ہے تو؟ وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یا خدا... ابھی تو کہاں ہے...؟“

وہ فوراً ہی کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ”میری ملی حرام موت مرے گی...“ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس سر پھری نے جرائم کی دنیا کے ٹائیفون پر گولی چلائی تھی۔ کسی وقت بھی گرفت میں آ سکتی تھی۔

وہ آندھی کی رفتار سے اپنی بلی کی طرف جا رہا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز کردش ابام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

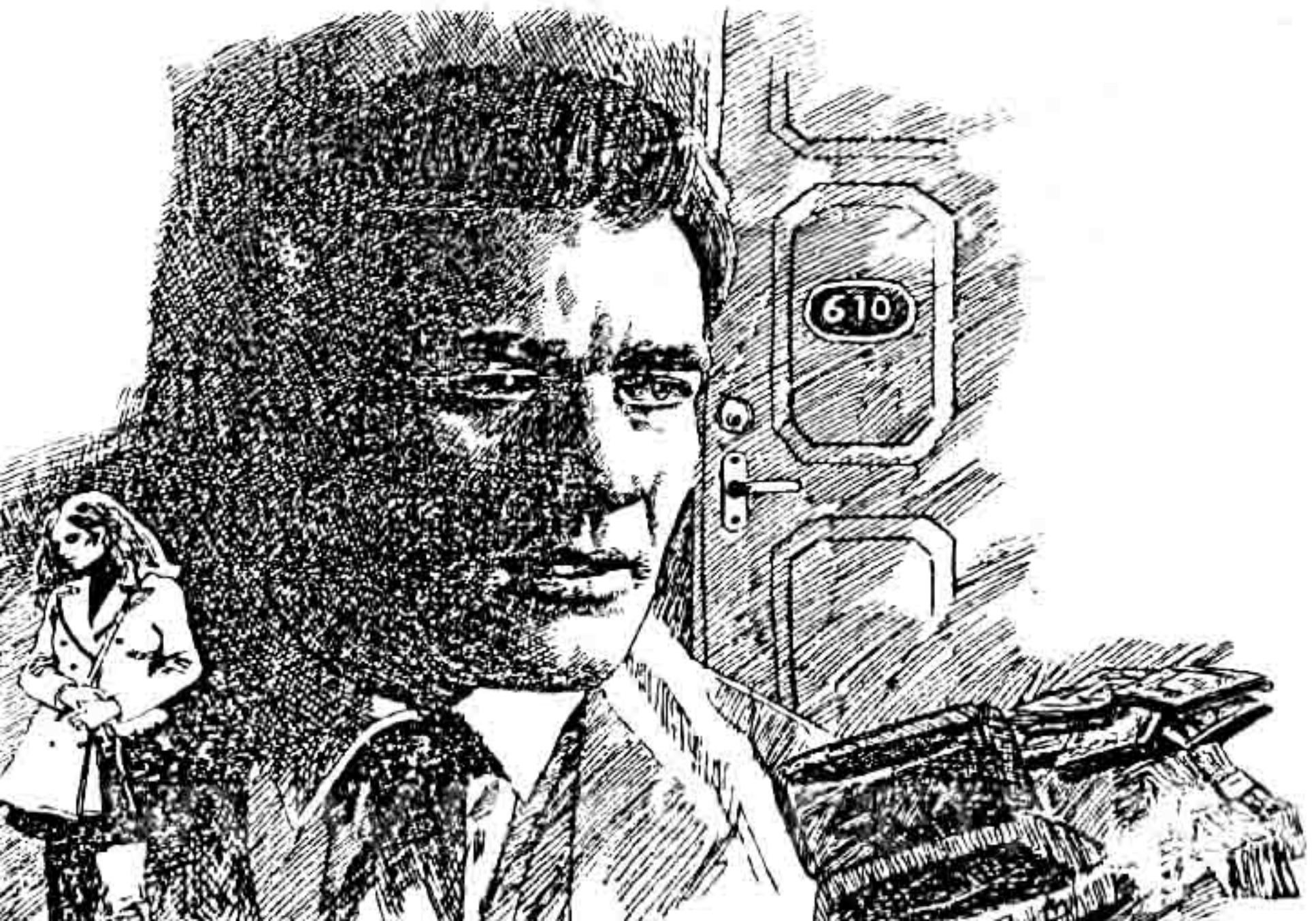
چال

سلیم انور

جس طرح زہر کو زہر مارتا ہے بالکل اسی طرح مجرمانہ ذہن تک رسائی کسی مجرم کی ہی ہو سکتی ہے لہذا اس کے پاس بھی ہر زہریلی چال کا توڑ تھا یہ اور بات کہ اس کی بچھائی ہوئی بساط پر چلنا آسان نہ تھا۔

تادیبہ چال سے نکلنے والے ایک شاطر کی کامیاب چال

جوں ہی اس نومند شخص نے دروازے سے باہر قدم رکھا، فلپ سرز کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم ست پڑ گئے اور اس کے چہرے کی رنگت پھکی ہو گئی۔
”ہیلو فلپ!“ اس بڑے کئے شخص نے فلپ سرز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بہت عرصے بعد دکھائی دیے ہو۔“
”کاش، یہ وقفہ اور لمبا ہوتا۔“ فلپ بڑبڑایا۔
”اوہ فلپ۔“ اس شخص نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک پرانے دوست سے بات کرنے کا یہ درست طریقہ نہیں ہے۔“
”تم کبھی بھی میرے دوست نہیں رہے ہو، والٹرز!“



قلب نے سجدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اور تم یہ بات خود بھی جانتے ہو۔“

والترز نے شانے اچکا دیے۔ ”چلو یوں ہی سکی۔ آؤ میرے ساتھ اندر چلو۔ جام کا ایک دور ہو جائے۔“

”نہیں۔“ قلب نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”میں گھر جا رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے قلب نے آگے بڑھنا چاہا لیکن تنومند والترز نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”میں نے کہا کہ اندر چلو اور میرے ساتھ جام کا ایک دور ہو جائے۔“ والترز کا لہجہ کٹیلا تھا۔ ”اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تمہیں افسوس ہوگا۔“ اس نے قلب کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

قلب سرز اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ قلب کو معلوم تھا کہ اس کی اس پوشیدہ دھمکی کا کیا مطلب ہے۔ وہ یہ بات والترز پر پہلی نگاہ پڑتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اب گڑے مردے اکھاڑنے بیٹھ جائے گا۔ والترز ہمیشہ اس کے لیے بری خبریں ہی لایا کرتا تھا۔

”آل رائٹ۔“ قلب نے اکتائے ہوئے لہجے میں ہامی بھر لی۔

بار میں بیٹھتے ہی والترز نے دھمکی کا آرڈر دے دیا۔ قلب نے اپنا آرڈر بیر کے ایک گلاس تک محدود رکھا۔

جب بار ٹینڈر دور چلا گیا تو قلب بولا۔ ”آل رائٹ، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

والترز نے کھانسنے کے بعد کہا۔ ”اب میں میکزی جیولری اسٹور کی ملازمت میں نہیں ہوں۔“

”میکزی بالآخر بات کی تہ تک پہنچ ہی گیا؟“ قلب نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

والترز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”نہیں، بس میری اس کے ساتھ بن نہیں پائی۔“

قلب کو والترز کی اس بات پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔ جیولری اسٹور کا مالک میکزی اپنے ملازمین کے چال چلن کے بارے میں خاصا سخت مزاج واقع ہوا تھا۔ اسٹور میں کوئی غلط عملی قدم یا یہ کہ کسی ملازم کی ذاتی زندگی کے متعلق یہ شبہ ہونا کہ وہ میکزی کے طے کردہ اصولوں کے مطابق نہیں ہے تو... اسے ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا تھا۔

قلب سرز نے میکزی جیولری اسٹور میں پانچ سال تک ملازمت کی تھی لیکن پھر میکزی کو پتا چل گیا کہ قلب کبھی

کبھار ریس کے گھوڑوں پر شرطیں لگاتا اور جوا کھیلتا ہے.....

سو اس نے قلب کو ملازمت سے برخاست کر دیا تھا۔

”تمہاری ملازمت چلے جانے کا مجھ سے کیا تعلق بنا ہے؟“ قلب نے والترز سے پوچھا۔

والترز کی نظریں اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس پر جمی رہیں۔ ”میں آج اپنی کچھ پرانی چیزوں کو دیکھ رہا تھا تو جانتے ہو... کیا شے اتفاقاً میرے ہاتھ آگئی؟ تمہاری وہ

پرانی تصویر جو ”دی گلوب“ اخبار کے ہیگرنی مانی فوٹو گرافر نے اس وقت چھینچی تھی جب پولیس نے فوری سکسٹھ اسٹریٹ پر واقع بول روم پر چھاپا مارا تھا..... جانتے ہو تصویر میں

تمہیں پولیس کی گاڑی میں لادتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔“

قلب سرز کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ”مجھے وہ تصویر یاد ہے۔ تم نے وہ تصویر اپنے اس شرابی رپورٹر

دوست سے حاصل کی تھی اور اس کے عوض تم نے مجھ سے زبردستی ایک لاکھ ڈالر بھی وصول کرنے کی کوشش کی تھی اور

جب میں تمہیں یہ رقم نہیں دے سکا تو تم نے میکزی سے میری چغل خوری کر دی۔ ویل، اس بات کی وجہ سے مجھے

قمار بازی سے نجات مل گئی۔ میں نے گزشتہ چار برسوں سے گھزدوڑ پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ اب میری شادی بھی ہو چکی

ہے اور میرے پاس اپنی رقم کو استعمال کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں۔“

”بے شک، بے شک۔“ والترز نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہاری ملازمت بھی عمدہ ہے۔ بینک میں!“

قلب نے یہ سن کر ایک جھرجھری سی لی۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“

”کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میری تم سے یہاں ملاقات اتفاق ہوئی ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟“ والترز نے کسی بھیڑیے کے مانند دانت نکالتے ہوئے کہا۔

قلب نے ٹیکسی نظروں سے والترز کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ چوہے ملی کا کھیل ختم کرو۔ تم کیا چاہتے ہو؟“

والترز نے کن آنکھوں سے بار ٹینڈر کی طرف دیکھا اور اپنی آواز دہمی کرتے ہوئے بولا۔ ”بات یہ ہے کہ

مجھے ابھی اس بات کی خبر ملی ہے کہ میکزی کے پاس اپنے اسٹور میں نا تراشیدہ ہیروں کی لاث آئی ہے۔ ان کی شناخت نہیں ہو سکتی اور ان کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر ہے۔

مجھے وہ ہیرے چاہئیں۔“

قلب کے جڑے کی رگیں تن گئیں۔ ”تم انہیں چوری کرنا چاہتے ہو..... اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری مدد

کروں؟“

”تم آئیڈیا سمجھ گئے قلب! لیکن یہ تمام کام تم کرو گے۔ یاد ہے کہ کس طرح میگزین اپنی تجوری کے تالے کا کبھی نیشن ہر ماہ تبدیل کر دیا کرتا تھا اور پھر ہمیشہ اس کبھی نیشن کو بھول جاتا تھا؟ اور پھر اسی طرح تم ہمیشہ اس تالے کو کھولنے کے عادی ہو چکے تھے۔ تمہیں اس تجوری کو کھولنے میں مہارت حاصل تھی لیکن مجھے اس میں ملکہ حاصل نہیں ہے۔ اس لیے.....“

”اس لیے تم چاہتے ہو کہ میں رات میں میگزین اسٹور میں زبردستی کھس جاؤں۔ تجوری کھولوں اور وہ ناتراشیدہ ہیرے تمہارے لیے نکال کر لے آؤں؟“ قلب نے بیزار لہجے میں کہا۔

”اتنی بلند آواز سے مت بات کرو، احمق کہیں کے!“ والٹرز نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی تو اصل حقیقت ہے۔ تم وہ ہیرے مجھے لا دو اور میں وہ تصویر اور اس کی فلم تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر تم انکار کرو گے تو میں وہ تصویر تمہارے پاس کوڈاک کے ذریعے بھیج دوں گا۔ مدعا سمجھ رہے ہونا؟“

ایک لمحے کے لیے قلب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کا جی چاہا کہ گھونسوں کے وار سے والٹرز کے چہرے کی درگت بنا دے لیکن اس نے اپنی اس خواہش پر فوراً ہی قابو پالیا۔ اس حرکت سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ والٹرز ناراض ہو کر اسے نقصان پہنچانے کی خاطر اس کی تصویر بینک بھیج دے گا..... اور یوں قلب کی نوکری کا خاتمہ ہو جائے گا۔

قلب کو اس ادائیگی کا خیال آ گیا جو اس نے اپنے مکان کی مد میں کرنا تھی۔ اسے اپنی بیوی کا بھی خیال آ گیا جو ایک ماہ بعد اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ یقینی طور پر یہ وہ وقت نہیں تھا کہ اس کی بینک کی ملازمت چھوٹ جائے۔ والٹرز بے حد کمینہ تھا۔ اس نے قلب کو اب بھی ڈھونڈ نکالا تھا اور وہ آئندہ جب بھی چاہتا، اسے تلاش کر سکتا تھا۔ اگر قلب نے کوئی اور ملازمت اختیار کر لی تو وہ دوبارہ اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ نہیں، اسے ابھی اور ہمیشہ کے لیے والٹرز سے اس معاملے کو ختم کرنا ہوگا۔

”تم واقعی مجھے وہ تصویر اور اس کی فلم دے دو گے؟“ قلب نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

والٹرز کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”جس لیے تم وہ

اپنے رب کو اللہ کہہ کر پکارو کیونکہ یہ وہ لفظ ہے جس کی ضد (opposite) نہ جمع (plural) نہ مذکر (male)

نہ مؤنث (female)

جبکہ دیگر الفاظ کی ضد، جمع، مذکر، مؤنث ہوتی ہے

مثال کے طور پر

God=Godees

Devta=Devi

Khuda=Khudaon

Lord=Lords

جبکہ اللہ احد..... یعنی ایک ہے۔ پس اپنے رب کو اللہ ہی کہہ کر پکارو۔

مرسلہ۔ علی ساجد۔ لاہور

پانی پینے کا صحیح وقت

جس وقت پانی اللہ تعالیٰ کے علم سے صحیح اثر کرتا

ہے۔

ایک گلاس صبح اٹھتے وقت اندرونی اعضا کو activate کرتا ہے۔

ایک گلاس نہانے کے بعد بلڈ پریشر کا خاتمہ کرتا ہے۔ دو گلاس کھانے سے تیس منٹ پہلے ہاضمے کو درست کرتا ہے۔

آدھا گلاس سونے سے پہلے ہارٹ اٹیک اسٹروک سے بچاتا ہے۔

مرسلہ۔ ناظم علی۔ ملتان

دنیا میں 4 دفعہ وقت رک گیا تھا

1۔ جب ہادی برحق حضرت محمد ﷺ معراج پر گئے تھے۔

2۔ جب عاشق رسول حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان نہیں دی تھی۔

3۔ جب حضرت بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہ کے سر مبارک سے دو پٹا مبارک سرک گیا تھا اور دو بال مبارک نظر آ گئے تھے۔

4۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نماز قضا ہو رہی تھی۔

مرسلہ۔ عامر خان۔ کراچی

ہیرے مجھے دو گے، میں اسی وقت دونوں چیزیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

فلپ نے بے چارگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

والٹرز اپنے اپارٹمنٹ میں فلپ کا انتظار کر رہا تھا۔ جب فلپ وہاں پہنچا، اس وقت رات کے دو بجے تھے۔

”تم ہیرے لے آئے؟“ والٹرز نے بے تابی سے پوچھا۔

فلپ نے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں سے محلی چمڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور بولا۔ ”فلم اور تصویر؟“

والٹرز نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے فلپ کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی تھیلی اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ایک منٹ..... رک جاؤ۔“ فلپ نے کہا۔ پھر لفافے میں موجود تصویر اور فلم باہر نکال کر ان کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ پھر محسوس انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آل رائٹ۔ تمہارے ہیرے یہ رہے۔“

والٹرز نے ہیروں کی تھیلی فلپ کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

فلپ نے جیب میں سے اپنا سگریٹ لائٹر نکالا اور ایک کھٹکے سے اس کا شعلہ آن کر دیا۔ اس نے تصویر اور سیلوانڈ فلم کو شعلہ دکھایا تو دونوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ فلپ نے انہیں نیچے فرش پر گرادیا اور انہیں جلتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پھر اس کے کانوں میں والٹرز کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ ”ارے..... یہ تو عام سے ہیرے ہیں۔“

فلپ نے اپنے جوتوں سے تصویر اور فلم کی راکھ رگڑ دی اور بولا۔ ”ہاں۔ میں نے یہ ایک عام سی دکان سے خریدے ہیں۔“

یہ سن کر والٹرز آگے کی جانب بڑھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ ”تم لعنتی ڈبل کراسر! تم سمجھتے ہو کہ... اس طریقے سے تم بیچ نکلو گے؟ کل صبح میں تمہارے پاس کے پاس بینک میں جاؤں گا اور اسے سب کچھ بتا دوں گا۔“

یہ سن کر فلپ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے پلان میں جو ایک خالی تھی، وہ یہی تھی کہ والٹرز کے پاس اس تصویر کی مزید کاپیاں موجود نہ ہوں اور وہ ان تصویروں کی بنیاد پر اسے مسلسل بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن

والٹرز کی دھمکی اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اس کے پاس اس تصویر کی اضافی کاپیاں موجود نہیں ہیں۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔

”والٹرز! کل صبح تم اس شہر سے میلوں دور ہو گے۔“ فلپ نے کہا۔ ”یا پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پائے جاؤ گے۔“

”کیا مطلب ہے؟“ والٹرز شپٹا گیا۔

”میرا مطلب ہے کہ میں نے جیولری اسٹور میں میکزی کے چوکیدار کوری سے باندھ دیا ہے۔ پھر میں نے جھینگی کی مدد سے تجوری پر اس طرح کے نشانات ڈال دیے ہیں جیسے کسی نے اسے کھولنے کی کوشش کی ہو لیکن کھولنے میں کامیاب نہ ہوا۔ میکزی کو یہ یقین آ جائے گا کہ یہ حرکت تمہاری ہے..... اس لیے کہ میں نے بے پروائی سے کام کرتے ہوئے تجوری کے سامنے ایک وزیٹنگ کارڈ گرادیا تھا جس پر تمہارا نام اور پتا لکھا ہوا ہے۔ یہ کارڈ میں نے گزشتہ شب ایک چھوٹی سی دکان سے چھپوایا تھا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تم میکزی اور جیوری کو اس بات سے قائل کر سکتے ہو کہ تجوری کو توڑنے کی کوشش کے دوران وہ کارڈ تمہارے پاس سے وہاں نہیں گرا تھا تو پھر تم اس شہر میں موجود رہنے کی ہمت کر لینا لیکن اگر تم ایسا نہیں سمجھتے تو..... تو بہتر ہوگا کہ تم ابھی سے اس شہر سے فرار ہونے کی تیاری کر لو۔ میں نے اسٹور کے چوکیدار کو زیادہ مضبوطی سے نہیں باندھا تھا۔ وہ غالباً اپنی ڈھیلی مشکیں کھولنے اور آزاد ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔“

والٹرز ایک لمحے کے لیے فلپ کو پاگلوں کی طرح گھورتا رہا۔ پھر جنون کی سی کیفیت میں کپڑوں کی الماری کی جانب لپکا اور اپنا کوٹ اور پینٹ نکال کر تیزی سے دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی جانب دوڑ پڑا۔

فلپ اطمینان کے ساتھ ٹہکتا ہوا والٹرز کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب وہ کبھی اس شہر واپس آنے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔“ فلپ نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ عرصے بعد وہ یہ سوچ سکتا ہے کہ آیا میں حقیقت میں میکزی کے اسٹور میں گیا بھی تھا یا نہیں لیکن اس میں اتنی جرات نہیں ہوگی کہ واپس آ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ بالآخر میری یہ ترکیب کامیاب رہی۔“





پناہ گاہ

منظرِ امام

گیڈر ہو یا شیر جب شامت آتی ہے پناہ کی تلاش میں ایڑی
چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے کیونکہ... اب شاید کانٹے کا مقابلہ
کرنے کا رواج نہیں رہا۔ ویسے سمجھداری کا تقاضا بھی
یہی تھا کہ مفاہمت کر لی جائے ورنہ معاملات کی
سنجیدگی اس پر کھل چکی تھی۔

بے کل لمحات اور بے اعتبار موسم کے دکھار ایک

نا سمجھ کا قصہ

”اچھا صاحب ادماغ مت خراب کرو، کشتی چلانے دو۔“
اسی لمحے کشتی کو ایک طرف سے لہروں نے اچھا خاصا
اوپر کر دیا۔ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی چپھیں نکل گئیں۔
میرے برابر بیٹھا ہوا شخص باقاعدہ کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ میرا ہی
دماغ خراب تھا جو اس کشتی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ یہ چھوٹی سی
بادبانی کشتی تھی جو کراچی سے منورہ جا رہی تھی۔ کراچی کے
لوگ ایسے مقامات اور ایسی کشتیوں سے اچھی طرح واقف

وہ میرے پاس ہی بیٹھا چوچلا رہا تھا۔
میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”بدبخت
انسان، یہ تو نے کشتی پر کتنے بندے بٹھالے ہیں؟“
”ابھی تو سات آٹھ کی اور گنجائش ہے صاحب۔“
”کیا بکواس کر رہا ہے، یہ کشتی ڈوبنے والی ہے۔“
”تو کیا ہوا، مجھے تو تیرنا آتا ہے نا۔“
”اے تیرنا تجھے آتا ہے۔ دوسروں کو تو نہیں آتا۔“

ہیں۔ اگر انہوں نے منوڑہ تک جانے کی زحمت کی ہو۔ میری چونکہ قسمت خراب تھی، اس لیے اس کشتی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ قسمت تو ویسے بھی خراب ہی تھی۔

زندگی میں نہ تو کوئی چارم تھا اور نہ ہی کوئی اور سبب تھا زندہ رہنے کا۔ بہت مشکلوں سے ایک جگہ سے اچھی نوکری کی آفر آگئی تھی۔ تنخواہ بھی بہت معقول تھی۔

میں نے اپنے ایک دوست سے ذکر کیا تو اس نے مشورہ دیا۔ ”دیکھو بھائی! نوکری پر جانے سے پہلے منوڑہ چلے جاؤ۔“

”کیوں، منوڑہ جانے سے کیا ہوگا؟“

”بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ پانی کراس کر لو تو نحوستیں چلی جاتی ہیں۔“

”کہاں چلی جاتی ہیں؟“

”وہ پانی میں اتر جاتی ہیں اور بندے کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ یہ بھی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم ایک مستند منحوس ہو، تمہاری ناکامیاں میرے سامنے ہیں۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ ایک اچھی زندگی تمہارے انتظار میں ہے۔ چالیس ہزار کی سٹری ہوگی۔ اکیلے آدمی ہو، عیش سے رہو گے۔“

اس کا یہ مشورہ مجھے پسند آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے منوڑہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ کپڑی پہنچا تو وہاں کئی لائیں اور بادبانی کشتیاں تھیں جو مسافروں کو منوڑہ لے جا رہی تھیں۔ پرانی فلموں اور کہانیوں نے مجھ میں بادبانی کشتیوں کی محبت پیدا کر رکھی تھی۔ ایک رومان سے بھرا ہوا سفر۔ دور افق میں ڈوبتا ہوا سورج۔ اس کے پیش منظر میں کسی کشتی کے لہراتے ہوئے بادبان اور ملاح کا گیت۔ یا کسی لڑکی کی آواز۔ ”مورے سیاں جی اتریں گے پار ہو، ندیاں دھیرے بہو۔“ یا اسی قسم کا کوئی اور گیت۔

اسی لیے میں نے لائیں کی طرف دیکھا بھی نہیں اور ایک بادبانی کشتی کی طرف متوجہ ہو گیا جو کنارے کی سڑکیوں سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔

”آؤ جی آؤ، بسم اللہ۔“ ملاح نے ہانک لگائی۔

”بھئی کتنے پیسے لو گے؟“

”آپ سے صرف سو روپے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں، صرف مجھ سے سو روپے کیوں؟ کیا میں

تمہارا کوئی رشتے دار لگتا ہوں؟“

”ارے نہیں صاحب۔“ وہ دانت نکال کر ہنس پڑا۔

”یہ تو اپنی عادت ہے۔ میں ہر ایک سے یہی کہتا ہوں۔ ان لوگوں سے پوچھ لو۔“ اس نے کشتی میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان سب سے سو لیے ہیں۔“ کشتی میں سات یا آٹھ مسافر تھے۔

میں بھی خدا کا نام لے کر اس کشتی میں بیٹھ گیا۔ وہ ملاح پھر سے دوسرے مسافروں کو پکارنے لگا۔ ”چلو جی..... منوڑہ چلو..... ہوا کی طرح چلنے والی کشتی میں..... ہوا کی طرح۔“

”ارے بھائی! تمہاری کشتی میں جگہ کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”بس اب چل دو۔“

”کشتی تو بھر لینے دو صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی سے کیسے چل دوں؟“

”کشتی بھر گئی ہے۔“

”اب بھی دس مسافر آجائیں گے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

اب میں اس ہٹ دھرمی پر کیا کہتا۔ اس کم بخت نے آٹھ مسافر اور بٹھالے تھے۔ اس کے بعد اس نے چپو اٹھایا اور بادبانی کشتی کا رومانٹک سفر شروع ہو گیا۔

میں چونکہ پہلی بار سمندر کا سفر کر رہا تھا، اس لیے سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہم دیو ہیکل جہازوں کے برابر سے گزر رہے تھے۔

بہت سی لائیں کراس کر کے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ سمندر کی ٹمکنیں مرطوب ہوا بہت اجنبی اور بہت خوش گوار لگ رہی تھی۔ کشتی کا یہ حال تھا کہ کبھی دائیں طرف جھک جاتی، کبھی بائیں طرف۔ وہ بری طرح ڈول رہی تھی۔

”ابے یہ کشتی تو ڈوب جائے گی۔“ میں نے ملاح سے کہا۔

”تو کیا ہوا بابو، مجھے تو تیرنا آتا ہے نا۔“ وہ بڑی۔۔۔ بے پروائی سے بولا۔

”ابے تجھے تو آتا ہے لیکن مجھے تو نہیں آتا نا۔“

”اب اس میں میرا کیا قصور ہوا؟“

اس نے اتنا کہا تھا کہ کشتی بری طرح اچھل پڑی۔ سب ہی چیخ اٹھے۔ ملاح اور اس کے ساتھی نے کسی طرح کشتی سنبھال لی تھی۔

”بھائی! یہ منوڑہ کب آئے گا؟“ ایک خوف زدہ مسافر نے پوچھا۔

”ابھی تک تو آ جانا چاہیے تھا۔“ ملاح نے کہا۔ ”لگتا ہے ہم راستہ بھول کر دوسری طرف نکل آئے ہیں۔“

”کیا؟“ ہم سبھی کی سائیس رکنے لگی تھیں۔ ”ابے کیا

بکواس کر رہا ہے؟

”گھبراؤ نہیں جی، سب کو پہنچا دوں گا۔“ اس نے کہا۔
اور اس کے ساتھ ہی کشتی الٹ گئی۔ کسی طاقت ور لہر
نے کشتی کو اچھال کر الٹا کر دیا تھا۔ خدا کی پناہ، کیا منظر
تھا..... کیسی قیامت تھی۔

مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ڈوبتے وقت بھی میں اس
کم بخت ملاح کو گالیاں ہی دے رہا تھا۔ پھر خدا جانے کیا
ہوا، میں نے کس طرح ہاتھ پاؤں چلائے ہوں گے۔ پانی
میں تیرتے رہنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔ کچھ بھی یاد نہیں
تھا۔ جب ہوش آیا تو کنارے پر تھا۔ سمندر کی لہروں نے
ساحل پر لا کر پھینک دیا تھا۔ بہت دیر تک آنکھیں بند کئے
سوچتا رہا، سوچتا ہی رہا۔ آہستہ آہستہ ذہن کے درتے کھلتے
گئے۔ یاد آنے لگا کہ میں سیاڑی سے منوڑہ کی طرف جا رہا
تھا کہ کشتی الٹ گئی تھی۔ تو پھر میں کہاں آ گیا تھا؟ میں کسی نہ
کسی طرح کھڑا ہو گیا۔ یہ منوڑہ تو نہیں تھا۔ سیاڑی کا ساحل
بھی نہیں تھا۔ وہاں اتنا سناٹا تو ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ تو کوئی
غیر آباد مقام تھا۔

میرے خدا! کیا میں کسی ویران جزیرے پر آ گیا
ہوں؟ اپنے شہر، اپنے ملک اور اپنے ساحلوں سے بہت دور۔
اس موضوع پر فلمیں یاد آنے لگیں۔ جن میں کوئی شخص اسی
طرح لہروں میں بہتا ہوا کسی جزیرے پر جا لگتا ہے اور وہاں
سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ برسوں اسی میں گزار دیتا
ہے۔ جیسے وہ فلم بنی تھی۔ ”کاسٹ آؤٹ“ یا اس قسم کی اور
فلمیں۔ ان فلموں میں جو جزیرے ہوتے تھے، ان میں
ٹاریل کے اونچے اونچے درخت ہوا کرتے تھے لیکن یہاں تو
نیم کے درخت اور ٹیکر کی جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔
مجھے وہ کم نعمت کشتی والا پھر یاد آ رہا تھا۔ اگر سانسے
ہوتا تو جان سے مار دیتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود تو بچ ہی گیا
ہوگا۔ البتہ دوسرے مسافر ٹھکانے لگ چکے ہوں گے۔
جس طرح میں ٹھکانے لگ رہا تھا۔

میری بہت بری حالت ہو رہی تھی۔ سمندر کے جھکین
بوجھل پانی میں نہایا ہوا جسم، بھیگے کپڑے، چہرے پر ریت
ہی ریت۔ ایک ایک قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔
دھوپ اتنی تیز تھی کہ کھال میں اتری چلی جا رہی تھی۔
میں کسی نہ کسی طرح گھسٹا ہوا ان درختوں کی طرف
چل پڑا جن کے سائے میں بیٹھ کر کچھ آرام کرتے ہوئے
سوچ سکتا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔
اچانک ایک پرندہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔

غصہ

حضور کا ارشاد گرامی ہے، غصہ ایمان کو اس
طرح خراب کرتا ہے۔ جیسے ایلا شہد کو۔ غصہ ایمان سوز
کیفیت ہے۔ جب یہ آدمی پر سوار ہوتا ہے تو وہ اللہ کی
طے کردہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، اس کی زبان سے
ایسی ایسی باتیں نکلتی ہیں اور وہ ایسی حرکات کا ارتکاب
کرتا ہے جس سے اس کا ایمان خراب اور دین برباد
ہو جاتا ہے، اب وہ اللہ کی نظر سے گر جاتا ہے اور اس
کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔
مرسلہ: ریاضِ بٹ، حسن ابدال

پرندے تو خوشی اور زندگی کی نوید ہوا کرتے ہیں لیکن وہ
کم بخت تو موت کی علامت تھا۔ یعنی ایک بڑا سا گدھ۔ جو یقیناً
مجھے مردہ سمجھ کر کھانے کے لیے آ گیا ہوگا۔

”ابے میں زندہ ہوں۔“ میں بھنا کر بولا۔ ”جھے
خوش ہونے کا موقع نہیں دوں گا..... سمجھا۔“
میں ایک جنون کے عالم میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ
اڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔

میں کسی نہ کسی طرح درختوں کے پاس پہنچ ہی گیا۔
یہاں تیز دھوپ سے نجات ملی تھی۔ میں ایک گھنے درخت
کے سائے میں بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ اگر اسی
جزیرے میں رہنا پڑ گیا تو کیسے رہوں گا؟ یہ تو بہت خطرناک
بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ایسا جزیرہ ہو جس کی طرف کسی
نے دھیان ہی نہ دیا ہو۔

اگر ایسا ہی تھا تو پھر خدا ہی حافظ تھا۔

بہت دیر کے بعد میں جب اپنے آپ میں آیا تو
جزیرے کے اور حصوں کو دیکھنے نکل پڑا۔ ہو سکتا ہے کہ
یہاں کوئی آبادی بھی ہو۔ کچھ لوگ بھی رہتے ہوں۔ اگر کوئی
مل جاتا تو پھر یہ جو پریشانی ٹوٹ پڑی تھی، یہ کسی حد تک ختم
تو ہو ہی سکتی تھی۔

یہ جھاڑیوں اور درختوں سے بھرا ہوا جزیرہ تھا۔
سورج بھی ڈوبنے والا تھا۔ کسی وقت بھی اس ویران اور ...
بجاء جزیرے میں رات اتر سکتی تھی۔ پھر میرا کیا حشر ہوگا؟
ہو سکتا ہے کہ یہاں جنگلی جانور بھی ہوں اور ایک آدھ سے
ملاقات ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا؟

میں ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ شام بہت تیزی سے
غائب ہوتی جا رہی تھی۔ جزیرے میں اندھیرا اترنے لگا
تھا۔ خدا یا! میں کس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

وہ کم بخت دوست یاد آ رہا تھا جس نے پانی کر اس

کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور کیا مشورہ تھا اس کا۔ زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔

میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو بددعائیں دیتا اور برا بھلا کہتا ہوا کہ اچانک کچھ ہوا۔ کسی کی آواز... کسی انسان کی آواز جو شاید مجھ ہی کو مخاطب کر رہا تھا۔
”اوئے رک جاؤ۔“

میں رک گیا۔ درختوں کے درمیان سے ایک آدمی نکل کر میری طرف آرہا تھا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح مسلط نہیں ہوا تھا اس لیے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا جیسا کوئی آدمی کسی ویران جزیرے پر مل سکتا ہے۔ اچھے ہوئے بڑے بڑے بال، بے ہنگم ڈاڑھی۔ اس نے ایک بنیان اور پینٹ پہن رکھی تھی جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جنگلی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ وہ اس ڈنڈے کو لہرا لہرا کر بولنے لگا۔ ”خبردار، میرے قریب مت آنا۔ میں نہیں جاؤں گا تمہارے ساتھ۔ مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے۔“ پتا نہیں، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

میں نے اسے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ ”بھائی صاحب! میری مدد کریں۔ میں اس منحوس جزیرے میں آکر پھنس گیا ہوں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے واپس لے جانے کے لیے آئے ہو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں بھائی، بالکل بھی نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”میں تو تم کو جانتا بھی نہیں ہوں۔“
”تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟“ اسے شاید میری طرف سے کچھ اطمینان ہونے لگا تھا۔

”تم یقین کرو، میں خود نہیں آیا۔ منوڑہ جاتے ہوئے کشتی الٹ گئی تھی۔ کسی طرح بہتا ہوا اس جزیرے کی طرف آ نکلا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اور پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا کہ تم مل گئے۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔“
اسے شاید میری بات کا یقین آ گیا تھا۔ اس لیے وہ میرے پاس آ گیا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“ اس نے پوچھا۔

”عامر۔“ میں نے بتایا۔ ”عامر رضوان۔“
”اور میں قدوائی ہوں۔“ اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ”جلیل قدوائی۔“
نہ جانے کیوں یہ نام مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ جلیل قدوائی... لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ نام کس سلسلے میں اور کس سے سنا ہوگا۔

”قدوائی صاحب! آپ کا نام کہیں سنا ہوا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”آپ اس جزیرے میں کیا کر رہے ہیں؟“
”یہ سب تفصیلی باتیں ہیں۔ ابھی میرے ساتھ چلو، ورنہ رات ہوتے ہی طرح طرح کے سانپ نکل آتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ مجھے راستہ بتاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ وہاں راستہ ہی کیا تھا۔ بس جھاڑیاں، پودے اور درخت تھے۔ ان ہی کے درمیان سے چلنا تھا۔
کچھ دور جانے کے بعد ایک صاف سی سطح آگئی تھی۔ زمین کا اچھا خاصا ٹکڑا تھا جہاں نہ جھاڑیاں تھیں، نہ پودے تھے بلکہ لٹری کا ایک سین ٹھرا ہوا تھا۔ انٹل نام سین کے کیمین جیسا۔ صحیح معنی میں اب جا کر کسی جزیرے کا ایڈ ونچر شروع ہوا تھا۔

قدوائی مجھے اس کیمین میں لے آیا۔
کمال ہے اس ویران جزیرے میں اتنے سلیقے کا کیمین۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز تھی جس کے ساتھ دو کرسیاں تھیں اور لکڑی کا ایک تخت بھی تھا۔ لکڑی کا ایک چولہا بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدوائی صاحب بہت دنوں سے یہیں رہتے ہوں۔

”جناب! آپ کب سے یہاں رہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھ ہی لیا۔

”صرف چھ مہینوں سے۔“ قدوائی نے جواب دیا۔
”یہ کیمین مجھے اسی حالت میں ملا تھا۔ نہ جانے کس نے یہ سب بنایا تھا اور خود کہاں چلا گیا۔ میں نہیں جانتا۔“
اور اسی وقت اچانک کوئی اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک بندر تھا۔ بڑی جسامت کا۔ جو مجھے دیکھ کر خونخیا نے لگا تھا۔ ”نہیں افلاطون، یہ دوست ہیں میرے۔“
قدوائی نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”ہاتھ ملاؤ ان سے۔“

بندر نے اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ”گھبراؤ نہیں۔“ قدوائی نے کہا۔ ”یہ کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے اسے ٹرینڈ کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ بندر ہے، انسان نہیں ہے۔ تربیت انسان کا کچھ نہیں بگاڑتی، وہ درندہ ہی رہتا ہے جبکہ درندے انسان بن جاتے ہیں۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں قدوائی صاحب۔“
”اب اس سے ہاتھ ملاؤ، ورنہ یہ ناراض ہو جائے گا۔ اس جزیرے پر یہی میرا دوست ہے۔“
میں نے ڈرتے ڈرتے اس بندر سے ہاتھ ملایا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگا تھا۔

”ہاں، ہاں..... اب مجھے یاد آ گیا۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”اور آپ نے شاید کسی ایکشن میں بھی حصہ لیا تھا۔“

”نہیں، میں نے کسی ایکشن میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ میں نے اس قوم کو صاف ستھری قیادت دینے کا فارمولا پیش کیا تھا لیکن کسی سیاسی جماعت نے میری بات نہیں مانی۔“

”ہاں، کچھ یاد تو آرہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہت زبردست فارمولا تھا آپ کا۔ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں نے اس کی تائید کی تھی۔“

”لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کی اکثریت کو پڑھے لکھے لوگوں کی قیادت نہیں چاہیے۔ کوئی ایماندار اور

”بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔“

قدوائی نے کہا۔ ”اور ہاں، اندھیرا بھی ہو گیا ہے۔ لائٹیں جلا دیتا ہوں۔“

”قدوائی صاحب! یہ سب چیزیں اس جزیرے میں آپ کے پاس کہاں سے آئیں گی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میرا ایک وفادار دوست مبینے میں ایک بار میرا راشن لے کر آ جاتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اسی لیے آج تک کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔“

”میں بہت ابھرن محسوس کر رہا ہوں۔ آخر آپ اس جنگل میں کیوں رہتے ہیں؟“

”اوہو، لیا سب ہتھ ایک ہی بار میں معلوم کر لو گے؟“

قدوائی نے کہا۔ ”پہلے مجھے رات کے کھانے کی تیاری کر لینے دو۔ اس کے بعد سب کچھ بتا دوں گا۔“

میں حیرت اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کیمین میں چاول، دال، سالے سب کچھ موجود تھا۔ قدوائی نے چولہا روشن کیا پھر کھانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

”میں تو ایک کپ چائے بھی نہیں بنا سکتا تھا۔“ اس نے جتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب سب آ گیا ہے۔“

”قدوائی صاحب! ایک بات بتائیں، جب آپ کا دوست مبینے میں ایک بار آپ کے لیے راشن لے کر آتا ہے تو وہ یقیناً کسی لانچ سے آتا ہوگا؟“

”ہاں، اس کے پاس اپنی ذاتی لانچ ہے۔“

”پھر آپ اس کے ساتھ واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ یہاں کیوں رہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ قدوائی نے کہا۔ ”پہلے کچھ کھالیں، اس کے بعد بتاتا ہوں۔“

وہ کھانا بنا تا رہا جبکہ میں اس کے بندر کی حرکتیں دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ وہ قدوائی کے اشاروں کو سمجھتا تھا۔

”جاؤ افلاطون، وہ لکڑی اٹھا کر لاؤ۔“ قدوائی اشارہ کرتا اور افلاطون وہ لکڑی اٹھا کر لے آتا۔ ”افلاطون! وہ

بالٹی اٹھاؤ۔“ اور افلاطون بالٹی اٹھا لیتا۔

”دیکھا تم نے۔ یہ ہے جانور۔“ قدوائی نے کہا۔

”جو ذرا سی ٹریننگ سے سب کچھ سمجھ جاتا ہے۔“

”واقعی کمال ہے۔“ میں نے تعریف کی۔

کھانا بہت مزے کا تھا۔ چونکہ میں بھوکا بھی تھا اسی لیے خوب پیٹ بھر کر کھا گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر قدوائی نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

”میں ایک کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔“

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا سولر فون نمبر

راہیلہ اور مزید معلومات کے لیے

ٹھکانہ عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 نیو 11 سٹیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

حصہ داران کی فہرست

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

بے داغ انسان کسی محکمے میں آجائے تو یا تو اس کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔“

”جی ہاں، یہ البتہ تو ہے۔“

”دس دفعہ ایک شخص کو آزما چکے ہوتے ہیں اس کے باوجود اسی کو ووٹ دے کر اپنے سروں پر بٹھا لیتے ہیں۔ ان کا مستقبل اور ملک چاہے جہنم میں جائے، ان کے سردار کا حکم نہیں ٹلنا چاہیے۔ جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ جس کی طرف اشارہ کر دیا، ووٹ اسی کو دینا ہے۔ چاہے اس کے مقابلے میں کوئی فرشتہ ہی کیوں نہ آ کر کھڑا ہو جائے۔“

”آپ کا فارمولا کیا تھا جناب؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت آسان..... میں نے اپنے ملک کے دس اپنی اپنی فیلڈ کے ماہرین کی ایک ٹیم بنائی تھی۔ ان میں معاشیات کے ماہرین تھے۔ سائنس اور تعلیم کے ماہرین تھے۔ ماہرین نفسیات اور ڈاکٹرز تھے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ تھے۔ یہ ایک انٹرویویشنل تھا۔ اب مثال کے طور پر کسی پارٹی نے کسی امیدوار کو ٹکٹ دیا۔ اس کی قابلیت، اس کا مزاج، اس کا بیک گراؤنڈ، اس کا کردار، پھریشنل کی سفارش پر اس شخص کو پارٹی یا تو بیٹھا دیتی یا پھر وہ شخص انتخاب میں حصہ لینے کا اہل قرار پاتا۔ اس طرح پورے ملک سے جو لوگ منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتے وہ کیسے ہوتے؟“

”ظاہر ہے۔ ہر طرح سے صاف سترے اور قابل ہوتے۔“

”یوں سمجھ لو کہ پورے ملک کی کریم اسمبلیوں میں پہنچ جاتی۔“ اس نے کہا۔ ”اسمبلی، اسمبلی سے زیادہ ایک ٹھنکر فورم بن جاتا۔“

”یہ تو بہت زبردست فارمولا تھا جناب۔“

”لیکن کسی نے قدر نہیں کی کیونکہ یہاں تو لوگ کروڑوں خرچ کر کے اسمبلیوں میں آتے ہیں تاکہ اربوں کما سکیں۔ انہیں یہ فارمولا کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ اسی لیے ہر جگہ میرا مذاق اڑایا گیا کہ یہ شخص یوٹوپیا کا خواب دیکھ رہا ہے۔ بس اس کے بعد سے میں بددل ہو گیا۔“

”اور آپ بددل ہو کر اس جزیرے پر آ گئے؟“

”نہیں بھائی، اس جزیرے پر تو ایک حادثہ لے آیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس وقت میرا وہ دوست بھی میرے ساتھ تھا جس کی لالچ تھی۔ اس میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ ہم دو دنوں تک اس جزیرے میں بھٹکتے رہے۔ ہم نے یہ کہیں دریافت کیا اور اس دوران میرا دل یہاں لگ گیا۔ دو دنوں کے بعد جب لالچ کی مرمت ہو گئی اور دوست نے مجھے واپس چلنے کے لیے کہا تو میں نے بتایا کہ ایسا پرسکون ماحول

زندگی میں پہلی بار ملا ہے۔ اس لیے میں دو چار دن یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔ تم دو چار دنوں کے بعد آ جانا۔ کھانے پینے کا اتنا سامان لالچ پر تھا کہ میں بہ آسانی دو چار دن گزار سکتا تھا۔ بہر حال جب وہ دو دنوں کے بعد مجھے لینے کے لیے آیا تو میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ وہ اپنے ساتھ چار پانچ دنوں کے اخبارات بھی لے آیا تھا۔ خدا کی پناہ۔ اتنی کرپشن، اتنی کلنگ، اتنی ڈکیتیاں، اتنے حادثے، اتنی بیان بازیاں کہ میرا تو سر گھوم کر رہ گیا۔ کمال ہے میں اب تک ایسی دنیا میں زندہ کس طرح تھا؟ بد قسمتی سے شہر تو رہنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ جہاں انسان ایک دوسرے کو تفریحاً مار رہا ہو۔ جہاں لڑکیوں پر ذرا ذرا سی بات پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہو۔ کیا وہ دنیا رہنے کے قابل تھی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ جزیرہ تو لاکھ گنا بہتر جگہ تھی۔ بس بھائی وہ دن ہے اور آج کا دن، میں واپس ہی نہیں گیا۔“

قدوائی صاحب نے اپنی کہانی ختم کر دی۔ اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ شخص شہر چھوڑ کر اس جزیرے میں کیوں رہنے لگا تھا۔

”عامریاں۔“ قدوائی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میرا دوست پرسوں اپنی لالچ لے کر آئے گا۔ تم اس کے ساتھ چلے جانا۔“

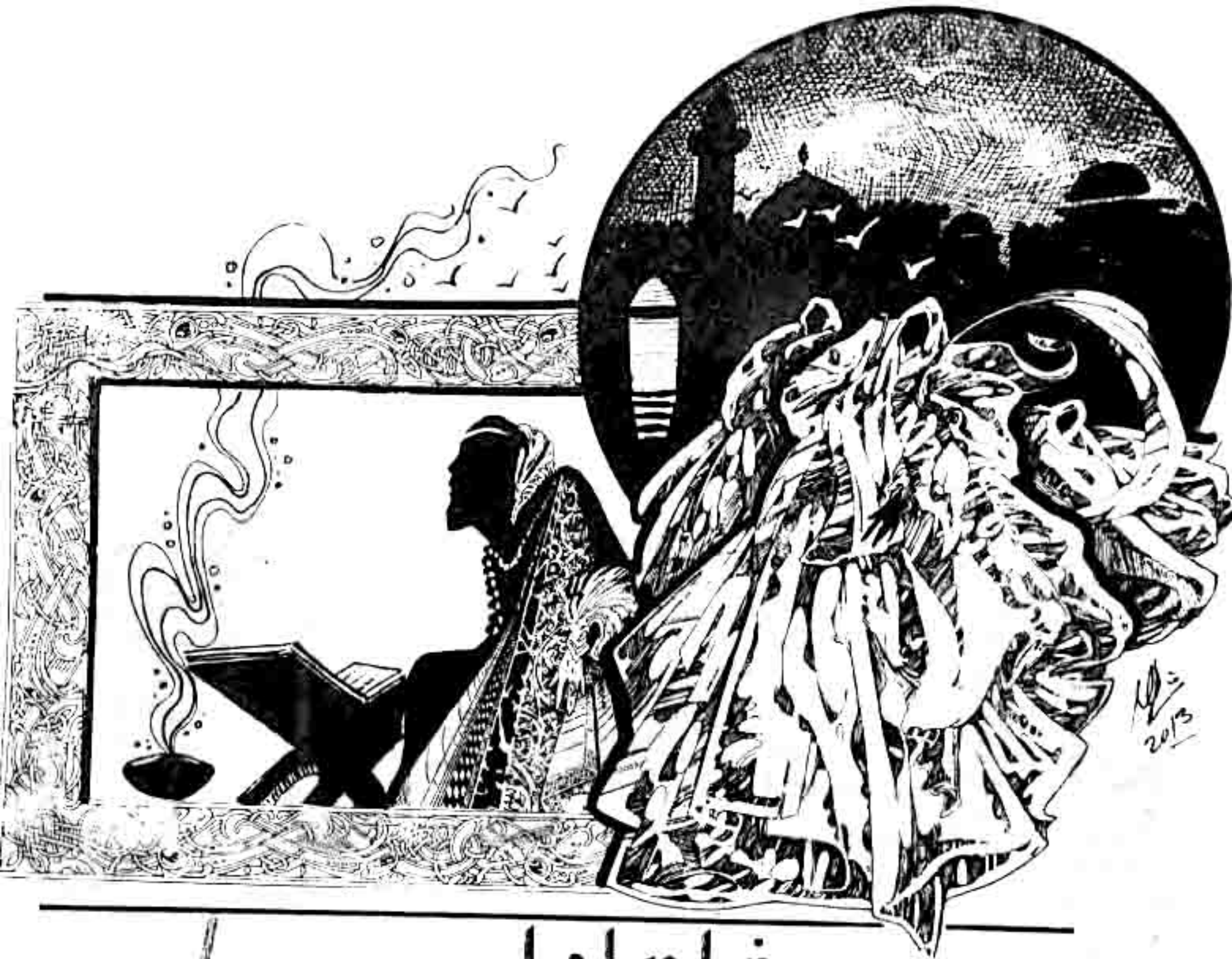
”پروفیسر صاحب! میرا دماغ خراب نہیں ہے جو میں واپس چلا جاؤں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں بھی تو آپ کی طرح اپنے شہر سے گھبرایا ہوا انسان ہوں۔ اتنی سکون کی جگہ چھوڑ کر کیوں واپس چلا جاؤں؟“

”ویلکم میرے دوست ویلکم۔“ قدوائی کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ ”ہم دوئل کر بڑی آسانی اور آرام سے رہ سکتے ہیں۔“

تو میرے پڑھنے والو! وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں بھی پروفیسر قدوائی کے ساتھ اسی جزیرے پر ہوں اور اپنی کہانی لکھ کر پروفیسر کے دوست کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ اس دعوت کے ساتھ کہ اگر وہاں سے بھی کوئی آ کر اس پرسکون جزیرے میں زندگی گزارنا چاہے تو بخوشی گزار سکتا ہے۔ میں اور پروفیسر مل کر اس کے لیے دوسرا کہین بھی بنا دیں گے۔ مگر قبول افتدز ہے عز و شرف۔



خواجہ احرار

ضیائیں بگڑی

عیاں اور نہاں کا فلسفہ اگر انسان کی سمجھ میں آجائے تو قدرت کے بہت سے راز اس پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ رب العزت کس بھیس میں کسے زمین پر اتار دے... اور اس کے پیروں تلے کون سے رستے پھیلا دے، اُس کے بھید وہ ہی جانے لیکن یہ حقیقت ہے، جو اس کی منشا کو پاگیا گویا اسی کا سفینہ پار لگا۔ مخلوق خدا کو بھی آپ کے سفر کا اندازہ آپ کے رستوں کے تعین سے ہو چلا تھا کہ حق کی راہ پر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

مال و متاع کو ٹھکرانے والے اللہ کے ایک

شکر گزار بندے کا احوال

یاغستان میں خواجہ شہاب الدین شاشی کا خاندان علمی سطح پر بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ان کے بیٹے خواجہ محمود کی شادی ایک دوسرے نامور خاندان کے خواجہ داؤد کی بیٹی سے ہو گئی۔

شادی کے بعد خواجہ محمود کی مالی حالت بگڑ گئی یہاں تک کہ جب رمضان 806 ہجری میں ان کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا تو ان کی معیشت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ خواجہ محمود بچے کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بہت فکر مند رہنے لگے۔ بچے کا نام عبید اللہ

رکھا گیا۔

پھر جیسا کہ مشاہیر کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، عبید اللہ کو بھی وہ سارے آلام جھیلنا پڑے جو بڑوں کا مقدر ہیں۔ یہاں تک کہ بارہ سال کی عمر میں وہ بے یار و مددگار ہو گئے اور ان کی معیشت اتنی برباد ہو گئی کہ روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ جو لوگ اس نامی گرامی خاندان کی بزرگی سے واقف تھے، انہوں نے اشاروں کنایوں میں امداد و اعانت کی پیشکش کی لیکن غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ ایک کوڑی بھی خرچ نہ کر سکتے تھے اور ہمت کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا، سائل یا حاجت مند کے حوالے کر دیتے۔ بارہ سالہ لڑکے عبید اللہ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اس سے کوئی سوال کرے اور وہ اس کا جواب انکار میں دے۔

ایک دن یہ بارہ سالہ لڑکا عبید اللہ بازار سے گزر رہا تھا، صاف ستھرے کپڑوں سے یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ اس لڑکے کی مالی حالت نہایت خستہ ہوگی۔ ایک موڑ پر معلوم نہیں کس طرف سے ایک فقیر نمودار ہوا اور لڑکے کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ فقیر نے نگ دھڑنگ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا پیٹ بالکل پچکا ہوا تھا۔ عبید اللہ نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ مجھ سے کوئی کام؟“

بالکل قریب سامنے طباخ اپنی دکان پر کھانے کا سامان بیچ رہا تھا۔ فقیر نے ایک بار پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہاتھ سے طباخ کی طرف اشارہ کیا۔

عبید اللہ نے پوچھا۔ ”بھوکے ہو؟ کھانا کھاؤ گے؟“

فقیر نے اثبات میں گردن ہلا دی اور التجا آمیز نظروں سے عبید اللہ کی شکل دیکھنے لگا۔

عبید اللہ کی جیب میں ایک کوڑی بھی نہ تھی اور انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مسئلے پر غور کیا اور پھر فوراً ہی طباخ کے پاس پہنچ گئے۔ اپنے سر سے صاف ستھری دستار اتاری اور طباخ کی طرف بڑھادی۔ ”بھائی! میری یہ دستار تجھ کو کیسی نظر آتی ہے؟“

طباخ نے جواب دیا۔ ”اچھی نظر آتی ہے..... کیوں؟ کیا بات ہے؟“

عبید اللہ نے کہا۔ ”میں اس کو فروخت کرنا چاہتا ہوں اور اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں لوں گا۔“

طباخ نے تذبذب سے کہا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے کہ تم اس کی زیادہ قیمت نہیں لو گے لیکن، یاں صاحبزادے! تم یہ تو بتاؤ کہ میں اس دستار کو لے کر کروں گا کیا؟“

عبید اللہ نے کہا۔ ”کچھ بھی کرنا، یہ صاف ستھری ہے پاک ہے۔“

طباخ نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ ”صاحبزادے! تم بارہ سالہ لڑکے، میں تمہاری اس دستار کو اپنے کام میں بھی تو نہیں لاسکتا۔“

عبید اللہ نے کہا۔ ”جناب! گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں اس کا مصرف بھی بتا دوں گا۔ دستار کا یہی ایک مصرف تو نہیں ہے کہ اس کو سر پر باندھ لیا جائے، اس کے اور کئی مصرف بھی ہیں۔“

طباخ نے مسکرا کر کہا۔ ”دستار کا ایک ہی مصرف میں جانتا ہوں اور وہ مصرف ہے اس کا سر پر باندھنا۔ دوسرے مصرف کیا ہیں، میں نہیں جانتا۔ غالباً رو مال کا کام بھی دستار ہی سے لیا جاسکتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لانا ہو تو وہ اس میں باندھا جاسکتا ہے۔ اس سے کمر کسی جاسکتی ہے۔ شاید یہی چند مصارف اور ہیں اس کے؟“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ مصارف بھی ہیں اس کے، لیکن اس کا ایک ایسا مصرف بھی ہے جس کا تعلق تم سے اور تمہارے پیٹ سے ہے۔“

طباخ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کون سا مصرف ہے جس کا تعلق مجھ سے اور میرے پیٹ سے ہے؟“

عبید اللہ نے خالی دیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی خالی دیکوں کے دھونے میں میری دستار استعمال کر سکتے ہو اور چونکہ میری دستار صاف ستھری اور پاک ہے اس لیے تم کو اس کے اس مصرف میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔“

طباخ عبید اللہ کے اصرار اور بحث و مباحثے سے بچ گیا۔ بولا۔ ”اچھا اگر میں یہ کہوں کہ تیری دستار تجھ سے خریدتا ہوں تو تو اس کی مجھ سے اجرت کیا لے گا؟“

عبید اللہ نے فقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس اس کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دو، یہی میری دستار کی اجرت ہے۔“

طباخ نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اور تم؟ کیا تم بھی کھانا کھاؤ گے؟“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس دستار کے عوض بس یہی ایک شخص کھانا کھائے گا۔“

طباخ نے ذرا دیر کے لیے سکوت اختیار کیا۔ پھر فقیر سے کہا۔ ”آ جاؤ بابا! میں تمہیں کھانا دیتا ہوں۔“
فقیر تنور کے پاس بیٹھ گیا، طباخ نے اس کے آگے کھانا لگا دیا اور کہا۔ ”بابا! خوب جی بھر کے کھانا کیونکہ اس لڑکے نے جتنے خلوص سے تیرا سوال پورا کیا ہے، اس کی نہ تو کوئی قیمت ہے اور نہ ہی کوئی صلہ۔ سچ کہتا ہوں، میں نے اپنی زندگی میں لڑکا تو لڑکا ایسا کوئی آدمی تک نہیں دیکھا، واللہ اس لڑکے میں بڑائی کے آثار ملتے ہیں۔“

فقیر بڑی بے صبری سے کھانا کھاتا رہا اور شکر گزار نظروں سے عبید اللہ کی طرف دیکھتا رہا۔

عبید اللہ نے اپنی دستار طباخ کے حوالے کرنا چاہی مگر طباخ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ عبید اللہ نے تلخی سے کہا۔ ”ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس فقیر نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں یہ دستار واپس نہیں لوں گا۔“

طباخ نے بڑی کوشش کی کہ دستار واپس کر دی جائے لیکن عبید اللہ نے دستار واپس لینے سے صاف انکار کر دیا۔

طباخ نے کہا۔ ”میاں صاحبزادے! کچھ مجھے بھی ثواب کما لینے دو۔“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”ثواب کمانے سے میں نے تمہیں روکا تو نہیں۔ اس کے راستے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے، ثواب کمانے کی غرض سے نہیں کیا بلکہ ان حالات میں مجھ کو یہی کرنا چاہیے تھا۔“

فقیر بڑی جلدی جلدی کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا جب وہ پوری طرح شکم سیر ہو گیا تو طباخ نے پوچھا۔ ”بابا! کچھ اور کھاؤ گے یا بس؟“

فقیر نے نفی میں گردن ہلا دی اور ایک زوردار ڈکار لے کر کھڑا ہو گیا۔

عبید اللہ نے فقیر سے پوچھا۔ ”بابا! بس یا اور کچھ؟ اب تو میں جاسکتا ہوں؟“

فقیر نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”اے ہر عالم گیر! جا، خدا تجھ کو بہت کچھ دے گا۔ تو نے اپنی دستار کے عوض ایک وقت کا کھانا ہی نہیں خریدا بلکہ معلوم نہیں کیا کچھ خریدا لیا۔ تجھ کو اس کا صلہ زندگی بھر ملتا ہی رہے گا۔“

فقیر کی باتوں نے عبید اللہ اور طباخ دونوں ہی کو حیران کر دیا۔ فقیر نے عالم جذب میں آواز لگائی۔ ”تو نے، اے لڑکے تو نے آج بہت بڑا سودا کیا ہے۔ واللہ اتنا بڑا سودا کہ تو ایک دستار کے عوض پیر عالمگیر بن گیا۔“

فقیر تو کہہ کر چلا گیا لیکن عبید اللہ کی حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ عبید اللہ نے سوچنا شروع کر دیا۔ ”اے عبید اللہ! خدا نے انسان کو اس لیے تو نہیں پیدا کیا کہ یہ اپنے آپ سے غافل ہو جائے پھر میں کیوں غافل ہوں۔ مجھ کو کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا کام جس سے میں خود بھی طمانیت حاصل کروں اور اپنے رب کو بھی راضی رکھ سکوں۔“

عبید اللہ نے گھر پہنچ کر خدا سے لولگالی اور گوشہ نشین ہو گئے۔

اس دوران آپ کی عبادت اور ریاضت کا شہرہ ہونے لگا۔ عبید اللہ کا کوئی مرشد نہیں تھا، جو کچھ تھا، اپنا تھا، خود سے کر رہے تھے لیکن پھر خیال آیا کہ اس سفر میں کسی کی راہبری بہت ضروری ہے چنانچہ انہیں مرشد کامل کی فکر لاحق ہو گئی۔

☆☆☆

چونکہ آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ آپ ہر ایک کے کام آتے ہیں اور اتنے زیادہ کام آتے ہیں کہ لوگ انہیں مشکل کشائی کا چلتا پھرتا نمونہ سمجھتے ہیں۔ آپ مراقبے میں تھے کہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ ایک ضرورت مند آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

آپ نے مراقبے کو توڑ دیا اور کہا۔ ”اس شخص کو حاضر کرو، اس کا مجھ سے کیا کام ہے؟“

اس ضرورت مند کو آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”مجھ سے کوئی خاص کام ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”جناب! میں بہت پریشان ہوں۔ ایک بیوی اور کئی بچے رکھتا ہوں۔ مالی حالت بالکل تباہ ہے۔ دو دن سے گھر میں کچھ بھی نہیں پکا۔ آپ کی بڑی شہرت ہے۔ کہا جاتا ہے آپ کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ کچھ میری بھی مدد

کیجیے، ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔“
آپ نے تسلی دی۔ ”خودکشی حرام ہے اور اس بات کی علامت کہ تو خدا کی رحمتوں سے مایوس ہو چکا ہے۔ میں تیرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔“

اس شخص نے بے تابی سے کہا۔ ”جناب! کب کیجیے گا؟ بھوک تو اس وقت لگی ہے اور آپ وعدہ مستقبل کا کر رہے ہیں۔ میرے لیے اگر کچھ کرنا ہے تو فوراً کیجیے، ورنہ میں مایوسی میں معلوم نہیں کیا کچھ کرگزروں گا۔“
آپ خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔ ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور ہرات کے حاکم کے نام ایک رقعہ لکھا۔
”حاکم ہرات کے نام اللہ کے کترین بندے عبید اللہ ابن خواجہ محمود کا مکتوب۔“

”حائل ہذا معاشی بد حالی کا شکار ہے اور یہ بد حالی اپنے نقطہ عروج کو پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک بیوی اور کئی بچوں کا کفیل ہے۔ اللہ رب العالمین نے انسان کو انسانوں کے رزق کا امین بنایا ہے۔ تو ہرات کا حاکم ہے، اس لیے تیرا یہ فرض ہے کہ یہاں کے بھوکوں کی خبر گیری کرے اور ان کے رزق کا انتظام کرے۔ تو نے اس کی معاش کا کوئی مستقل بندوبست نہ کیا تو یہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لے گا۔ اس کے بعد اس کی بیوی کیا کرے گی، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے حالات اس کو معصیت پر مجبور کر دیں، اس کی اولاد بے تربیت اور آوارہ و ناکارہ ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چور بنے گا، کوئی اچکا اور یہ سارے گناہ تیرے نامہ اعمال میں بھی شامل ہوں گے کیونکہ تو نے ایک بیوی کے شوہر اور کئی بچوں کے باپ کے معاشی معاملات پر غور و خوض اور دلچسپی سے کام نہیں کیا۔ تو نے ایک شخص کو حرام موت مر جانے کی اجازت دے دی اور مرحوم شوہر کی بیوی کو بدکاری اور حرام کاری پر مجبور کر دیا۔ بے سہارا اور بے یار و مددگار یتیموں کو در یوزہ گری اور چوری چکاری پر مجبور کر دیا۔ اے حاکم! اس دن کی پکڑ سے ڈر، جس دن کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اس دن کوئی رشتہ کام نہیں آئے گا۔ مال و زر، جائداد، دولت، اقتدار، اختیار کوئی شے کام نہ آئے گی۔ ہاں اچھے اعمال، نیکیاں، جو دوسخا اور وہ شمع برابر بھلائی جو کسی کے ساتھ کی گئی ہوگی، کام آجائے گی۔ اے حاکم! آخرت کی کمیٹی کے لیے بیج بودے تاکہ موت کے بعد تجھے کمیٹی تیار ملے۔“
”میں امید کرتا ہوں کہ تجھ پر میری نصیحتوں کا خاطر خواہ اثر ہوگا اور یہ شخص مایوسیوں کے اندھیروں سے نکل کر اللہ کی رحمت کی روشنی میں آجائے گا۔“

آپ نے اس شخص کو یہ خط دیا اور کہا۔ ”جا، حاکم ہرات کو میرا یہ خط پہنچا دے اور وہ اس کا جو بھی جواب دے، میرے پاس لے آئے۔“

اس شخص نے مایوسی سے سوال کیا۔ ”حضرت! کیا آپ کی حاکم ہرات سے اچھی یاد اللہ ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! نیکی اور بھلائی کے لیے کسی یاد اللہ کی ضرورت نہیں۔“
اس مایوس اور لاچار شخص کے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ اس کو ایک فیصلہ بھی کامیابی کا یقین نہیں تھا لیکن تین دن بعد جب وہ واپس آیا تو نہایت بشاش تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے پوچھا۔ ”حاکم ہرات کو میرا خط پہنچا دیا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جناب! پہلے تو دربانوں نے آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ میں نے انہیں خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ دیا لیکن وہ نہیں پیسے۔ آخر میں نے یہ طے کیا کہ میں حاکم کے راستے میں بیٹھ جاؤں اور جیسے ہی اس کی سواری سامنے سے گزرے، دوڑ کر آپ کا خط اس کو پیش کر دوں۔ چنانچہ میری یہ ترکیب کارگر ہوئی اور میں حاکم ہرات کو آپ کا خط دینے میں کامیاب ہو گیا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”میرا خط پڑھ کر حاکم نے کیا کہا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”اس نے خط پڑھ کر مجھ کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ سواری محل میں واپس گئی۔ مجھ سے پوچھا..... کیا تو بھوکا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ جناب! میں اپنی بھوک سے نہیں اپنے بیوی بچوں کی بھوک سے پریشان ہوں۔ اس لیے اگر میں آپ کے دسترخوان پر اپنی بھوک منا بھی لوں گا تو بیوی بچوں کی بھوک کی خلش مجھے برابر تنگ کرتی رہے گی۔“
حاکم نے اسی وقت اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ اس کو پچاس دینار دے دیے جائیں تاکہ یہ ان سے اپنے گھر کا انتظام کر سکے۔ اس کے بعد مجھ سے کہا۔ ”جاؤ، ایک مہینے بعد کام پر آ جانا۔ تجھے میں نے اپنے خزانچی کے حوالے کیا۔ اس سے کام

یکہ اور اس کی مدد کر۔ تیرا معقول مشاہرہ مقرر کر دیا جائے گا۔“

اور پھر جب میں پیچاس دینار لے کر وہاں سے چلنے لگا تو حاکم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو روکا اور کہا: ”عبید اللہ سے جا کر کہہ دینا کہ آپ کی نصیحتوں کا بہت بہت شکریہ۔ دنیا کا نظام آپ ہی جیسے لوگوں سے چل رہا ہے۔ آپ آئندہ بھی مجھ کو نصیحتیں فرماتے رہیے گا تا کہ میں ادھر ادھر ہونے سے بچا رہوں۔“

آپ نے فرمایا: ”جزاک اللہ۔ اللہ اس کو صراطِ مستقیم پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

جب اس بات کا شہرہ ہوا تو کسی حاسد نے کہا: ”حضرت! آپ نے اس شخص کا کام کر دیا، خوب کیا۔ مگر جب لوگوں نے یہ سنا کہ آپ نے مراقبے کو توڑ کر حاکم ہرات کو خط لکھا تھا تو بہت افسوس کیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

آپ نے جواب دیا: ”اے شخص! یہ تو نے کیسی بات کر دی، کیسا اعتراض کر دیا؟ میں کسی مسلمان کے کام کو اپنے مراقبے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نفل کے مقابلے میں کسی مسلمان کا کام کر دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔“

معترض نے پوچھا: ”یہ کس کی تعلیمات پر آپ چل رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا: ”یہ کسی اور کی تعلیم یا تلقین سے میں نے اخذ نہیں کیا بلکہ خدمات کے ثمرے سے یہ اخذ کیا ہے چنانچہ جب میں کسی کے کام آجاتا ہوں تو میرے ضمیر اور نفس کو بڑی فرحت اور خوشی محسوس ہونے لگتی ہے اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اللہ ہر شخص کو اپنا قرب ایک مخصوص دروازے سے عطا فرماتا ہے۔ اس نے میرے لیے مخلوق کی خدمت کا دروازہ رکھا ہے۔ چنانچہ مجھ کو مخلوق کی خدمت زیادہ محبوب ہے۔“

معترض اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

ہرات میں شیخ بہاؤ الدین عمر بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی محفل میں علماء اور فقراء تک حاضریاں دیا کرتے تھے۔ عبید اللہ بھی وقتاً فوقتاً پہنچ جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو یہ شیخ بہاؤ الدین عمر کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے سوال کیا۔

”عبید اللہ! شہر کا کیا حال ہے؟ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

عبید اللہ نے جواب دیا: ”حضرت! دواہم خبریں ہیں۔“

انہوں نے پوچھا: ”کون کون سی؟“

عبید اللہ نے جواب دیا: ”حضرت شیخ زین الدین اور ان کا حلقہ کہتا ہے ہمہ از دوست، اور سید قاسم اور ان کے پیرو کہتے ہیں، ہمہ از دوست نہیں بلکہ ہمہ از دوست۔“

شیخ بہاؤ الدین عمر نے پوچھا: ”اور تم کیا کہتے ہو؟“

عبید اللہ نے جواب دیا: ”میں ہمہ از دوست کا قائل ہوں۔“

شیخ بہاؤ الدین نے فرطِ خوشی میں کہا: ”اور درست بھی یہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے اسی سے ہے، حالانکہ درست یہ بھی ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے وہی ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اس عقیدے میں عوام کی گمراہی کا اندیشہ موجود ہے۔ اگر یہاں اس کے سوا کچھ بھی نہیں، تو کفار بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اشجار، مظاہر فطرت اور بتوں کی پرستش کہاں کرتے ہیں کیونکہ جب اس کے سوا یہاں کچھ ہے ہی نہیں اور جو کچھ بھی ہے اس میں وہی موجود ہے تو اشجار، مظاہر فطرت اور بتوں میں بھی وہی موجود ہے۔ اس طرح نہ کوئی کافر ہے نہ کوئی مسلمان۔ کفر و اسلام کا فرق ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہے، اس سے ہے تو گویا ہم خالق اور مخلوق کے درمیان ایک فعل پیدا کر دیتے ہیں اور غیر اللہ کے سجدے سے بچ جاتے ہیں۔“

ہمہ از دوست اور ہمہ از دوست کے فلسفے اور معانی و مطالب نے عبید اللہ کو بہت متاثر کیا اور انہوں نے خود کو ہمہ از دوست پر قائم کر لیا۔

یہ عبید اللہ کی جوانی کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مولانا سعد الدین کاشغری بھی ہرات ہی میں مقیم تھے اور ان کے فضل و کمال کا بڑا چرچا تھا۔ مولانا سعد الدین کاشغری عبید اللہ کے پاس ہی رہتے تھے۔ اب عبید اللہ کی معیشت خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ حاکم ہرات نے انہیں زمینیں عطا کر دی تھیں جن پر مزدوروں کی مدد سے کاشت کی جانے لگی۔ وہ مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگ جاتے۔ خدا نے انہیں بہت جلد مال مال کر دیا چنانچہ مولانا کاشغری کی تشریف آوری اور اقامت سے عبید اللہ کو فکر مند نہیں

ہونا پڑا اور وہ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ دونوں الگ الگ ریاضت کرتے اور روحانی کمال میں اضافہ کرتے رہتے۔ شام کو دونوں ایک ساتھ ادھر ادھر نکل جاتے اور مختلف طریقوں سے اپنی ہمت اور استعداد کا جائزہ لیتے رہتے۔ شہر کے بچوں بیچ میں ایک اکھاڑ تھا، جس میں شہر بھر کے پہلوان زور آزمائی کرتے تھے اور ان کشتیوں کو دیکھنے کے لیے شہر کی کثیر آبادی اکھاڑے کے چاروں طرف جمع ہو جاتی تھی۔ عبید اللہ نے مولانا کا شغریٰ سے کہا۔

”حضرت! ہم دونوں کیوں نہ اکھاڑے چلیں اور مقابلوں سے جی بہلائیں۔“

مولانا کا شغریٰ نے جواب دیا۔ ”عبید اللہ! ہم نے جو راہ پکڑی ہے اس میں جی بہلانے کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ تم نے یہ کیسی بات کر دی؟“

عبید اللہ نے کہا۔ ”حضرت! میں صرف تماش بین کی حیثیت سے نہیں جا رہا ہوں بلکہ میں وہاں اپنی ہمت اور استعداد کا امتحان کروں گا۔ مولانا! میں وہ کارنامے دکھاؤں گا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے اور لوگوں کو سکتہ ہو جائے گا۔“

مولانا کا شغریٰ نے پوچھا۔ ”کیا ہم دونوں اکھاڑے چلیں گے؟“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہم دونوں اکھاڑے چلیں گے کیونکہ ہمیں وہاں روحانی کمال کے مظاہرے کرنے میں آسانی رہے گی اور اس طرح لوگوں کو بھی وہ سب کچھ دیکھنے کا موقع ملے گا جو ہم دکھانا چاہتے ہیں۔“

چنانچہ یہ دونوں شہر کے اکھاڑے کی طرف چل دیے۔ دور ہی سے اکھاڑے کا ہجوم انہیں دکھائی دینے لگا۔ شہر کے مختلف حصوں سے مقابلے میں حصہ لینے والے پہلوان اکھاڑے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ عبید اللہ نے ایک دبلے پتلے پہلوان کو راستے ہی میں روک لیا اور اس سے پوچھا۔

”کیوں بھائی! کیا تو بھی کشتی لڑے گا؟“

پہلوان نے جواب دیا۔ ”ہاں جناب! میں بھی کشتی لڑوں گا۔ کیوں بات کیا ہے؟“

عبید اللہ نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن تیرا جٹ اور صحت تو ایسے نہیں ہیں کہ تو کسی بھی پہلوان کو پچھاڑے۔ پھر تو کس سے کشتی لڑے گا؟ یہاں تو ہر پہلوان تجھ سے بڑا اور طاقتور دکھائی دیتا ہے۔“

پہلوان نے سرد آہ کھینچی اور کہا۔ ”بس یہی خیال تو میرا دل توڑ دیتا ہے۔ میں کشتی میں نام پیدا کرنا چاہتا ہوں اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی یہی ہے کہ میں لوگوں میں پہلوان کی حیثیت سے پہچانا جاؤں۔“

عبید اللہ نے کہا۔ ”اگر میں تیری یہ خواہش پوری کر دوں تو؟“

پہلوان اچھل گیا اور بے چینی سے پوچھا۔ ”میری یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو صرف تو ہی نہیں پورا شہر دیکھ اور سن لے گا۔“

پہلوان نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! اگر آپ خدا کے خاص بندے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا نامی گرامی پہلوان بن سکتا ہوں تو خدا کے لیے میری یہ تمنا پوری کر دیجیے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔“

عبید اللہ نے پوچھا۔ ”تو کس کس پہلوان سے لڑنا چاہتا ہے؟“

پہلوان نے جواب دیا۔ ”ہر اس پہلوان سے جو اپنے اپنے مقابل کو شکست دے کر آگے آیا ہو۔“

عبید اللہ نے کہا۔ ”تب پھر میں حکم دیتا ہوں کہ تو جس جس کو زیر کرنا چاہتا ہے، اس کو مقابلے کی دعوت دے دے۔ اللہ نے چاہا تو تو ہی جیتے گا۔ کوئی بھی پہلوان تجھ کو شکست نہیں دے سکتا۔“

پہلوان نے آپ کو کچھ تحفے کے طور پر پیش کیا اور کہا۔ ”حضرت! فی الحال میں آپ کو کوئی بڑا تحفہ نہیں پیش کر سکتا اس لیے جو کچھ حاضر ہے پیش کر رہا ہوں، قبول فرمائیں۔“

عبید اللہ نے بڑے ناگوار لہجے میں کہا۔ ”اے شخص! میں نے جو یہ جتانے کی پیشکش کی ہے، اس کے پیچھے حرص و طمع اور لالچ کو کوئی دخل نہیں۔ تجھ کو جو اکرام میں اپنے روحانی تصرفات کا کمال اور ہمت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس طرح دو بڑے کام ہو جائیں گے۔ پہلا یہ کہ میں اپنے روحانی کمال اور ہمت سے واقف ہو جاؤں گا اور دوسرا یہ کہ تو اس شہر کا نامی گرامی بلکہ سب سے بڑا پہلوان بن جائے گا اور اس طرح تیری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔“

پہلوان جھوم جھوم گیا اور نشے کی کیفیت میں بہکنے لگا۔

مولانا کا شغری نے ٹھوکا دیا اور آہستہ سے کہا۔ ”عبید اللہ! یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا کسی اور طرح روحانی تصرفات اور ہمت کا اندازہ نہیں کر سکتے؟“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”فی الحال یہی کافی ہے، میں زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں اپنے اس طریقے میں کیف محسوس کر رہا ہوں۔“

مولانا کا شغری نے پہلوان کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں تو اس پہلوان میں ایک بھی ایسی کوئی بات یا خوبی نہیں محسوس کر رہا ہوں، جس سے اس کی تمام پہلوانوں پر سبقت اور برتری کی امید کر لی جائے۔“

عبید اللہ نے پہلوان سے کہا۔ ”اب تو پہلوانوں میں شامل ہو جا اور جس پہلوان سے بھی مقابلہ کرنا چاہے، مقابلہ کر..... جیت تیری ہی ہوگی۔“

پہلوان بھاگ کر پہلوانوں میں شامل ہو گیا۔ عبید اللہ اور مولانا کا شغری بعد میں پہنچے۔

کمزور پہلوان اچانک اکھاڑے میں کود پڑا اور اعلان کیا۔ ”لوگو! اس وقت میں ہرات کا سب سے بڑا پہلوان ہوں اور اس بڑائی کو ثابت کرنے کے لیے میں اس اکھاڑے میں اتر اہوں۔ جس جس کو اپنی طاقت اور داؤ بیچ پرناز ہو، وہ میرے مقابلے میں آجائے۔ اللہ نے چاہا تو میں اپنے دعوے کی صداقت ثابت کر دوں گا۔“

زور آور نامی گرامی پہلوانوں نے کمزور پہلوان کی طرف ہنس کر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ قماش بینوں میں سے بعض نے مسکرا کر کہا۔ ”غریب کی شامت ہی آگئی ہے شاید، کوئی بھی بڑا پہلوان اس کی ہڈی پکلی برابر کر دے گا۔ یہ ہے ہی کیا، ایک بھنگا۔“

عبید اللہ اور مولانا کا شغری اکھاڑے کے قریب بیٹھ گئے۔

جوڑ کا اعلان کیا جانے لگا اور آخر تک اس کمزور پہلوان کا نام تک نہ آیا۔ اس نے احتجاج کیا۔ ”میں بھی مقابلہ لڑوں گا، میں بھی کشتی لڑوں گا اور ہر اس شخص سے لڑوں گا جس کو اپنی پہلوانی پرناز ہوگا۔ آخر میرا نام کیوں نہیں لیا جا رہا؟ میں بھی تو کشتی لڑنے آیا ہوں۔“

اعلان کرنے والے نے ازراہ مذاق اعلان کیا۔ ”چونکہ اس ٹڈے پہلوان کا یہاں کوئی جوڑ ہی نہیں اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو پہلوان اول آئے گا، اس کا مقابلہ اس ٹڈے پہلوان سے کرایا جائے گا۔“

کمزور پہلوان پھولانہ پایا اور مارے خوشی کے اکھاڑے میں کئی قلابازیاں کھائیں۔ کشتیاں ہونے لگیں۔ عبید اللہ نے اپنے روحانی کمال اور ہمت کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ جو پہلوان زیر ہونے لگتا، آپ اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتے۔ توجہ کا یہ ارتکاز زیر ہونے والے کو اوپر لے آتا اور طاقتور پہلوان کمزور پڑ جاتا پھر جب دوسرا زیر ہونے لگتا تو آپ پہلے کو کمزور کر دیتے اور دوسرا حاوی آ جاتا۔ یہاں تک کہ اس آخری مقابلے نے اتنا طول کھینچا کہ گھنٹوں بعد بھی کسی کے حق میں فیصلہ نہ ہو سکا اور دونوں پہلوان سفل ہو کر پسینا پسینا ہو گئے، زور زور سے ہانپنے لگے اور یہ مقابلہ ہارجیت کے بغیر ہی ختم ہو گیا۔

دوسرا مقابلہ شروع ہوا اور آپ نے اپنی توجہ اس پہلوان پر مرکوز کر دی جو نسبتاً کمزور محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ کمزور پہلوان نے طاقتور کو ٹکست دے دی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے اور کمزور پہلوان کو تماشاخیوں نے کاندھے پر اٹھالیا۔

اس کے بعد تیسرا مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں بھی وہی جیتا جس پر عبید اللہ کی توجہ تھی۔ جب سارے مقابلے ہو گئے اور ایک پہلوان ان سب میں اول آیا تو کمزور پہلوان ایک بار پھر اکھاڑے میں اتر پڑا اور اعلان کیا۔ ”حضرات! اب میں اپنے مقابلے کا ٹکڑا ہوں اور حسب وعدہ اول آنے والے پہلوان کا مجھ سے مقابلہ کرایا جائے۔“

اعلان کرنے والے نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں نے وہ اعلان تو یوں ہی مذاق میں کر دیا تھا ورنہ کیا مجھ کو اندازہ نہیں ہے کہ کون کتنی طاقت رکھتا ہے اور کتنے داؤ بیچ جانتا ہے۔ اگر تیری شامت ہی آگئی ہے تو، تو بے شک مقابلے پر ڈنارہ۔ ورنہ میرا مشورہ مان اور اپنا راستہ لے۔ کسی بھی پہلوان کو تجھ پر غصہ آ گیا تو وہ تجھ کو اٹھا کر اکھاڑے کے باہر پھینک دے گا جس

سے تیری پسلیاں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گی۔“

کمزور پہلوان نے شور کیا۔ ”واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو لڑے بغیر اکھاڑے سے نہ نکلوں گا۔“

عبید اللہ نے بھی مداخلت کی، کہا۔ ”لوگو! یہ تو واللہ بڑی زیادتی ہے اس پہلوان کے ساتھ۔ جب اعلان کیا ہے کہ آخر میں اول آنے والے پہلوان کو اس نختی پہلوان سے مقابلہ کرنا ہوگا تو اب کیوں گریز اختیار کیا جا رہا ہے؟“

تماش بین بھی مقابلے سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، شور کیا۔ ”یہ مقابلہ ہوگا، ضرور ہوگا۔“

چنانچہ منتظم اکھاڑا نے کمزور اور اول آنے والے پہلوانوں کو یکجا کیا اور اعلان کیا۔ ”حضرات! بہ ظاہر تو ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں لیکن آپ لوگ اس کشتی پر مصر ہیں تو میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ اب ان دونوں کا مقابلہ ہوگا اور ان میں جو جیتے گا وہی آج کا فاتح کہلائے گا۔“

دونوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ طاقتور پہلوان نے غصے میں کمزور کو پختی دینا چاہی لیکن عبید اللہ کی پوری توجہ کمزور کے حق میں تھی چنانچہ کمزور پہلوان نے زور لگا کر طاقتور پہلوان کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور سر سے اونچا کر کے اکھاڑے میں دے مارا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور غیر متوقع ہوا کہ کسی کو اس نتیجے پر یقین ہی نہ آیا۔ تماشا کی پہلوان، منتظمین، ہر کوئی حیرت زدہ اور پریشان دیکھے ہوئے پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

طاقتور پہلوان نے کہا۔ ”یہ مقابلہ صحیح نہیں تھا اور اس شخص نے مجھ کو دھوکے سے زیر کر لیا ہے اس لیے یہ مقابلہ دوبارہ کرایا جائے۔“

کمزور پہلوان سے پوچھا گیا۔ ”تو کیا کہتا ہے؟ کیا یہ مقابلہ دوبارہ ہونا چاہیے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہ صرف دوبارہ بلکہ سہ بارہ کے لیے بھی میں تیار ہوں۔ مجھ کو اپنی طاقت اور داؤ بیچ پر ناز ہے، اس لیے میں دس بار مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔“

کمزور پہلوان کے اس جواب نے ہر ایک کو رطہ حیرت میں ڈال دیا اور ہارا ہوا پہلوان خوف زدہ ہو گیا۔

دونوں کا مقابلہ پھر شروع ہوا۔ اس بار عبید اللہ نے روحانی تصرف میں کمی کر دی اور مقابلے کو طول دینا شروع کر دیا۔ کبھی طاقتور اوپر آ جاتا کبھی کمزور طاقتور کو مغلوب کر لیتا۔ کافی دیر تک مقابلہ جاری رہا۔ آخر عبید اللہ نے روحانی تصرف میں اضافہ کر دیا اور کمزور نے طاقتور کو ایک بار پھر سر سے اونچا لے جا کر دے مارا اور اس بار اس کو اتنے زور سے گرایا گیا کہ وہ اٹھ نہ سکا، آنکھیں بند کیے دیر تک پڑا رہا۔ کمزور پہلوان فخر یہ اکھاڑے کے چاروں طرف چکر لگا تا رہا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی داد و تحسین کا جواب دیتا رہا۔

نتیجے کا اعلان کمزور پہلوان کے حق میں کر دیا گیا۔

کمزور پہلوان نے ایک بار پھر اعلان کیا۔ ”ہے کوئی پہلوان جو میرے مقابلے پر آئے، میں ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہوں۔“

ایک پہلوان کو دیکھ دیکھ کر غصہ آ رہا تھا بولا۔ ”میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں۔“

کمزور نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ”آ جا بھائی تو بھی آ جا اور اپنے ارمان نکال لے۔“

دوسرا پہلوان مشتعل ہو کر اکھاڑے میں اتر گیا۔

پہلا پہلوان ابھی تک اکھاڑے میں پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دوسرے پہلوان کو اکھاڑے میں اترتے دیکھا تو چپکے سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچا اور کان میں کہا۔ ”بھائی! اس کے کمزور جسم پر نہ جانا، یہ بہت طاقتور ہے اور میرا دو بار کا یہ تجربہ ہے کہ اگر اس کی گرفت میں پھنس گئے تو یہ اوپر تک لے جا کر بڑی زور سے دے مارے گا۔ بس لڑنے کے دوران یہی خیال رکھنا کہ کہیں تم اس کی پکڑ میں نہ آ جانا۔“

دوسرے نے جواب دیا۔ ”میں احتیاط کروں گا۔ میں نے بھی کچھ یہی اندازہ لگایا ہے کہ اس کی گرفت سخت ہوتی ہے اور خود کو اس کی پکڑ سے محفوظ رکھا جائے۔“

اکھاڑے میں ایک بار پھر اعلان ہوا۔ ”حضرات! ایک دوسرے پہلوان نے آخری جیتے ہوئے پہلوان کو دعوتِ مقابلہ دے دی ہے اس لیے ذرا دیر بعد دوسرا مقابلہ ہوگا۔ مزید گزارش یہ ہے کہ آپ لوگ اس دوسرے

مقابلے کو بہت غور سے دیکھیں کیونکہ بہ ظاہر کمزور مگر اس غیر معمولی پہلو ان میں یہ خاص بات دیکھی گئی ہے کہ یہ اپنے حریف کو توقع سے پہلے ہی شکست دے دیتا ہے اور تماشائی سب کچھ دیکھ کر بھی انجام کو سمجھ نہیں پاتے اور اگر سمجھ جاتے ہیں تو اس پر یقین نہیں کرتے۔“

تماشائی دم بخود اکھاڑے کی طرف دیکھنے لگے۔

مقابلہ شروع ہوا اور عبید اللہ نے آہستہ آہستہ تصرف بڑھانا شروع کیا۔ آپ نے اپنا تصرف بڑھا کر ایک دم کم کر دیا جس کے نتیجے میں کمزور پہلو ان زمین پر آ رہا۔ پہلے پہلو ان نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔ ”وہ مارا۔“

لیکن دوسرے ہی لمحے آپ نے اپنی پوری توجہ کمزور پر مرکوز کر دی۔ اس نے طاقتور پہلو ان کو اچانک دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور بیچ اکھاڑے میں دے پٹھا۔ اب دوسرے مغلوب پہلو ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ سے اٹھ سکتا۔ وہ کچھ دیر دم سادھے پڑا رہا۔

کمزور پہلو ان نے اعلان کیا۔ ”اصولی طور پر دوسرا پہلو ان بھی مجھ سے ہار چکا ہے لیکن میں حسب سابق اس سے بھی دوبارہ مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اس کا جی چاہے تو؟“

ہارا ہوا پہلو ان فوراً اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ ”میں ایک شرط پر دوبارہ لڑنے کو تیار ہوں۔“

کمزور نے پوچھا۔ ”کس شرط پر؟“

جواب ملا۔ ”یہ جو تو اوپر تک اٹھا کر شیخ دیتا ہے، کشتی میں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ تو اپنے داؤ لگاؤں گا غرضیکہ جو بھی جیتے، داؤ سے جیتے۔ میں اس اجڈ کشتی سے بالکل واقف نہیں کہ اپنے حریف کو اونچا اٹھا کر اکھاڑے میں دے مارے۔“

کمزور نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ شرط منظور ہے، چلو میں نہیں ہٹوں گا..... اور کچھ؟“

مقابلہ پھر شروع ہوا اور عبید اللہ نے روحانی تصرفات سے کام لینا شروع کر دیا۔ کبھی یہ روحانی تصرف طاقتور کے حق میں ہو جاتا اور کبھی کمزور کے حق میں۔ دونوں کا لڑتے لڑتے برا حال ہو گیا۔ کمزور پہلو ان کو پسینا آ گیا۔ اس نے عبید اللہ کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔ آپ مسکرائے اور اپنی پوری توجہ کمزور پر مرکوز کر دی۔ اس بار کمزور نے طاقتور کو اپنی پشت پر لے لیا۔ بالکل مشک کی طرح اور کئی زور زور کے جھٹکے دے کر اکھاڑے میں گرادیا۔ گرنے والے کی ریڑھ کی ہڈیاں جواب دے گئیں اور وہ دم سادھے دیر تک پڑا رہا۔

کمزور نے پھر ہاتھ ہلا ہلا کر اعلان کیا۔ ”اور کوئی ہے جو مقابلے پر آئے۔ آج میں ایک لنگوٹ پردس پہلو انوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اللہ چاہے گا تو میں کبھی کو شکست دے دوں گا۔“

اعلان کرنے والے نے یہ آواز بلند کہا۔ ”ہے کوئی اور پہلو ان جو اس عظیم پہلو ان سے مقابلہ کرے؟“

سب نے دم سادھ رکھا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھڑے ہو کر باقاعدہ مقابلے کا اعلان کر دے۔

کمزور پہلو ان نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔ ”کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔ میں آج ہرات کا عظیم پہلو ان

ہوں اگر کسی کو میرے اس دعوے پر اعتراض ہو تو میرے مقابلے پر آ جائے اور میری کتتری کو ثابت کر دے۔“

اس اعلان کے بعد وہ بڑی دیر تک اکھاڑے میں کھڑا رہا اور اپنے حریف کا انتظار کرنے لگا لیکن کوئی بھی سامنے نہ آیا۔

آخر مقابلے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا اور کمزور پہلو ان کو ہرات کا عظیم پہلو ان قرار دے دیا گیا۔

کمزور پہلو ان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے اور وہ آپ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ”حضرت! یہ جو کچھ بھی

مجھ کو حاصل ہوا ہے، آپ کی توجہ سے، میں آپ کا کس زبان سے شکر یہ ادا کروں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس میں شکر یہ کی کوئی بات نہیں، بس جا، اللہ کو یاد کر اور گھمنڈ سے کام نہ لیتا۔“

پورے ہرات میں ان مقابلوں کا بڑا چہ چاہا ہوا لیکن یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی کہ یہ سارا کیا دھرا عبید اللہ کا تھا۔

☆☆☆

مولانا کا شغری ہرات سے سمرقند چلے گئے اور عبید اللہ کو دعوت دے گئے کہ ہرات چھوڑ کر سمرقند کی سکونت اختیار کریں۔ آپ نے وعدہ کر لیا کہ میں ضرور آؤں گا۔

مولانا کا شغری نے کہا۔ ”وہاں میری زمینیں ہیں، ان پر ہم دونوں مل جل کر کاشت کریں گے اور اللہ نے چاہا تو کایا پلٹ کر رکھ دیں گے۔“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”میں سرفرد ضرور پہنچوں گا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لوں گا۔ مجھ کو سرفرد کی طرف سے بوئے یگانگت آتی محسوس ہو رہی ہے۔“

ان دنوں سرفرد میں مولانا نظام الدین خاموش روحانی کمال میں دوسروں سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک دن مراقبے میں کچھ دیکھا اور ایک دم چونک کر چیخ ماری اور کپکپی سی طاری ہو گئی۔ وہاں مولانا کا شغری بھی موجود تھے۔ انہوں نے مولانا نظام الدین خاموش سے پوچھا۔ ”حضرت! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“

مولانا نظام الدین نے جواب دیا۔ ”کا شغری! ابھی ابھی مراقبے میں، میں نے ایک جوان کو سرفرد کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ بس اس کو دیکھ کر میں کانپ گیا کیونکہ اس کی شاندار چال اور پر شکوہ چہرہ، دونوں ہی کچھ اعلان کر رہے ہیں۔“

مولانا کا شغری نے پوچھا۔ ”حضرت! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“

مولانا نظام الدین نے جواب دیا۔ ”مولانا کا شغری! میں نے اس پورب سے آنے والے کی پیشانی پر اس کا نام پڑھ لیا ہے عبید اللہ احرار، یہ شخص پورے عالم کو اپنے تحت کر لے گا۔“

مولانا کا شغری خاموش ہو گئے کیونکہ انہیں خوب معلوم تھا کہ عبید اللہ ان کی دعوت پر عنقریب آنے والے ہیں۔ کچھ دنوں بعد عبید اللہ سرفرد پہنچ گئے اور مولانا کا شغری اور مولانا نظام الدین خاموش کے مہمان ہوئے۔ مولانا نظام الدین ان کی صورت دیکھتے ہی احتراماً کھڑے ہو گئے اور کہا۔ ”خوش آمدید عبید اللہ۔ میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی خدمت میں درس کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔“

مولانا نظام الدین نے کہا۔ ”وہ اپنی جگہ لیکن اس سے تمہارا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا۔“

عبید اللہ کئی سال سرفرد میں مقیم رہے، اس کے بعد ہرات واپس گئے۔ ان دنوں ہرات میں مشہور زمانہ نقش بندی بزرگ یعقوب چرخنی بھی آئے ہوئے تھے۔ ان بزرگ کی شہرت نے سبھی کو متاثر اور مرعوب کر رکھا تھا۔ عبید اللہ کے دل میں بھی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ابھی تک عبید اللہ نے کسی کی مریدی اختیار نہیں کی تھی۔ اب وہ کسی کے مرید ہو جانا چاہتے تھے چنانچہ یعقوب چرخنی کی ذات اسی غرض سے انہیں اپنی طرف مہینچ رہی تھی۔

عبید اللہ ڈرتے ڈرتے یعقوب چرخنی کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟

عبید اللہ کو اپنی حاضری پر بڑا افسوس ہوا اور دل میں سوچا کہ میں نے ان کی خدمت میں ناحق حاضری دی۔ مجھ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ اسی تذبذب اور تاسف میں تھے کہ مولانا یعقوب چرخنی نے کہا۔ ”اے شخص! میں نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرا مرید ہونا چاہتا تھا لیکن اب میں تجھ کو مرید نہیں کروں گا، واپس جا اور کسی اور کا در دیکھ۔“

ابھی ان کی بات ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ عبید اللہ کی نظر یعقوب چرخنی کی پیشانی پر گئی۔ وہاں ایک سفید داغ نظر آیا۔ جس سے عبید اللہ کے دل میں کراہیت اور تنفر پیدا ہو گیا۔ ان کے دل میں یعقوب چرخنی کی طرف سے بیزاری پیدا ہو گئی۔

مولانا یعقوب چرخنی نے کہا۔ ”تو گویا میری پیشانی کا سفید داغ تجھ کو اور دور کر رہا ہے اور تو بیعت میں تامل سے کام لے رہا ہے۔“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! دل کا معاملہ براہ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ میری کیا مجال کہ میں آپ سے نفرت کروں یا بیعت میں تامل سے کام لوں۔“

مولانا یعقوب نے کہا۔ ”عبید اللہ! اپنی آنکھیں بند کر اور دیکھ کہ تجھ کو کیا نظر آ رہا ہے؟“

عبید اللہ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں بھی مولانا یعقوب چرخنی موجود تھے لیکن اب ان کی پیشانی پر کوئی سفید داغ نہیں تھا اور چہرے پر بلا کی نورانیت پائی جاتی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے مولانا یعقوب کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہاں بھی خلع لہس (تبدیلی لباس) ہو چکا تھا اور ان کے سامنے وہ پہلے جیسے مولانا یعقوب نہیں تھے جن کی پیشانی پر سفید داغ موجود تھا، اب ان کے سامنے جو ذات تھی، وہ بڑی حسین و جمیل اور پرکشش تھی۔
مولانا یعقوب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”عبید اللہ! کیا تجھ کو معلوم ہے کہ میری بابت حضرت بہاؤ الدین نقشبند نے کیا فرمایا تھا؟“

عبید اللہ نے جواب دیا۔ ”جو کچھ فرماتا ہے حضور ہی فرمادیں، میں کیا عرض کروں۔“
مولانا یعقوب نے کہا۔ ”بہاؤ الدین نقشبند نے فرمایا تھا کہ میرا ہاتھ یعقوب کا ہاتھ ہے اور جو شخص یعقوب کے ہاتھ پر بیعت کرے گا، گویا میرے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ اس لیے عبید اللہ میرے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت بہاؤ الدین نقشبند کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کر۔“

مولانا یعقوب خاموش ہوئے تو عبید اللہ نے بے اختیار ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور ان سے بیعت ہو گئے۔
اب عبید اللہ کی زندگی میں ایسا موڑ آچکا تھا جہاں سے انہیں دوسروں کی راہنمائی کا فرض ادا کرنا تھا۔ اب وہ عبید اللہ احرار ہو چکے تھے اور ان کا لقب ناصر الدین قرار پا چکا تھا۔

ایک دن مراقبے میں آپ کو القا ہوا کہ اسلام کو تقویت اور شریعت کو عروج بادشاہوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے چنانچہ آپ ہرات سے سمرقند تشریف لے گئے۔ ان دنوں سمرقند میں امیر تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رخ کا پوتا مرزا عبد اللہ حکومت کر رہا تھا۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر عام ہوئی تو لوگوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ ان میں مرزا عبد اللہ والی سمرقند کا ایک امیر بھی شامل تھا۔ آپ نے اس امیر سے کہا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”تو نے بڑی غلط بات کہی۔ تو سلطان کا امیر ہے اس لیے تجھ کو ملک کے معاملات سے باخبر رہنا چاہیے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”ہمیں بہت سی باتوں کی خبر رہتی ہے، براہ کرم یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ سمرقند کیوں تشریف لائے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو مراقبے میں القا ہوا ہے کہ اسلام کو تقویت اور شریعت کو عروج بادشاہوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے میں سمرقند میں تیرے حکمران مرزا عبد اللہ سے ملاقات کرنے آیا ہوں اور تو اس ملاقات کا اہتمام کرے گا۔“

امیر نے بے ادبی اور گستاخی سے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ ٹھہرے درویش۔ آپ کہاں بادشاہ سے ملیں گے اور پھر یہ کہ ہمارا مرزا عبد اللہ بڑا بے پروا جوان ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ آپ سے ملاقات کرنے پر رضامند ہو جائے۔“
آپ کو غصہ آ گیا، فرمایا۔ ”اے شخص! میں یہاں خود نہیں آیا لایا گیا ہوں۔ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں سلاطین سے ملاقات کروں اور انہیں بتاؤں کہ اس میں ان کے فرائض کیا ہیں؟ اگر تیرا مرزا بے پروا ہے اور پروا نہیں کرتا تو مجھے بھی اس کی کوئی پروا نہیں، میں اس کا نام فہرست سے نکال دوں گا اور اس کی جگہ کسی اور کو لے آیا جائے گا۔ ایک ایسا سلطان اس کی جگہ بٹھایا جائے گا جو پیر و انہیں ہوگا۔“

امیر نے منہ بنا کر کہا۔ ”سبحان اللہ! آپ بڑی بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں اور آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے گویا سلاطین کا عزل و نصب آپ ہی کے ذمے ہے۔ ایک درویش کو یوں اکڑ کر بات نہیں کرنا چاہیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو کس قسم کی جاہلانہ باتیں کر رہا ہے۔ ہمارے ذمے بھی انتظام و انصرام ہے جس طرح سلاطین کو ذمے داریاں سونپی گئی ہیں، اسی طرح مجھے بھی ذمے دار بنایا گیا ہے۔ میں نے تجھ کو بھی امارت کی فہرست سے خارج کیا۔“

امیر نے جاتے جاتے کہا۔ ”آپ کی یہ بات بھی دیکھ لیں گے، ہاتھ ننگن کو آرسی کیا۔“
امیر چلا گیا۔

امیر کے جاتے ہی آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور کونسل سے دیوار پر امیر کا نام لکھا اور مٹا دیا۔ اس کے بعد مرزا عبداللہ کا نام لکھا اور اس کو بھی مٹا دیا، فرمایا۔ ”اس بادشاہ اور اس کے امیروں سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔“

اس عمل کے بعد آپ نے سر قند چھوڑ دیا اور تاشقند کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپ کو سر قند چھوڑے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ امیر بیمار پڑ گیا۔ طبیبیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ امیر کو شبہ گزرا کہ یہ سب عبید اللہ احرار کی خفگی کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ایک آدمی آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور اس سے کہا۔ ”حضرت سے کہہ کہ میں شرمسار ہوں اور گستاخی پر نادم ہوں۔ خدا کے لیے مجھ کو معاف فرمادیں اور اپنی خدمت میں حاضری کی اجازت مرحمت فرمادیں۔“

خادم گیا اور ذرا دیر بعد یہ خبر لے کر واپس آ گیا کہ عبید اللہ احرار سر قند چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ امیر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ رونے لگا، ماپوسی سے کہا۔ ”خدا مجھ پر اور سلطان پر رحم کرے۔ اس وقت میں معلوم نہیں کس ترک میں تھا جو میں آپ سے بانداز گستاخی گفتگو کی۔“

چند دنوں بعد امیر کا انتقال ہو گیا۔ مرزا عبداللہ کو امیر کے انتقال سے افسوس ہوا۔ اس کو عبید اللہ احرار اور امیر کی گفتگو کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے نہایت افسوس سے کہا۔ ”یہ امیر بڑا سادہ دل شخص تھا۔ ایک فضول درویش کی باتوں سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اندر ہی اندر گھل کر چل بسا، اس کی جان اس کے وہم نے لے لی۔“

بادشاہ یہ کہہ کر اپنی محفل میں واپس آ گیا۔ ایک ماہ بعد بادشاہ کو یہ خبر ملی کہ اس کا چچا ابوسعید مرزا ترکستان سے سر قند کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ مرزا عبداللہ نے اپنے چچا کا مقابلہ کرنے کے لیے لشکر تیار کیا اور یہ طے کیا کہ ابوسعید مرزا کو سر قند سے دور ہی روک دیا جائے گا۔

ایک دوسرا امیر جو مرحوم امیر اور عبید اللہ کی بات چیت سے واقف تھا، اس نے بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بولا۔ ”حضور والا! یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، میں بہت ڈر رہا ہوں۔“

سلطان نے منہ نیڑھا کر کے پوچھا۔ ”آخر تو کیوں خوفزدہ ہے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضور والا! میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ جس طرح عالم ظاہر پر سلاطین حکومت کرتے ہیں، اسی طرح سلاطین اور عالم باطن پر درویشوں کی حکومت ہوتی ہے اور سلاطین عالم کا عزل و نصب انہی کے سپرد کیا گیا ہے۔ میں نے یہ سن رکھا ہے کہ عبید اللہ احرار نے سر قند چھوڑنے سے پہلے اپنی دیوار پر چند نام لکھ کر لعاب دہن سے مٹا دیے تھے۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ دیوار پر کس کس کے نام لکھے گئے تھے اور کس کس کے نام مٹا دیے گئے۔“

سلطان کا پارہ چڑھ گیا۔ ”آخر تو کہنا چاہتا ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”مجھ کو یہ بات تو معلوم ہو چکی ہے کہ آپ نے دیوار پر مرحوم کا نام لکھ کر مٹا دیا تھا اور سوائے اتفاق کہ ہم سب امیر کے حشر سے باخبر ہیں، بقیہ کے نام نہیں معلوم ہو سکے، ورنہ ان کا حشر بھی لوگوں کے علم میں آ جاتا۔“

سلطان نے امیر کو ڈانٹ دیا۔ ”بکو اس بند کر۔ شاید تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس درویش نے دیوار پر میرا نام بھی لکھ کر مٹا دیا تھا اور اس طرح مجھ کو بھی مٹ جانا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ میں جانتا ہوں۔ ایسا اس لیے نہیں ہوگا کہ یہ میں نہیں چاہتا اور یہ میں کہہ رہا ہوں۔“

امیر نے دلی زبان میں عرض کیا۔ ”حضور رکھہ غرور اپنی زبان سے نہ نکالیں، اللہ سے اپنے غرور کی معافی چاہیں۔ خدا آپ کی معافی قبول کر لے گا اور آپ پریشانیوں سے بچ جائیں گے۔“

سلطان نے امیر کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی، بولا۔ ”اگر وہ درویش اس وقت سر قند میں ہوتا تو میں اس کو ایسی سزا دیتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔“

امیر چلا گیا لیکن سلطان کے دل میں وہم ڈال گیا۔

انہی دنوں سلطان کو خبر ملی کہ ترکستان سے اس کا چچا ابوسعید بڑھا چلا آ رہا ہے۔ سلطان مرزا عبداللہ غصے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ اپنے چچا کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہ شک و شبہ میں پڑ گیا تھا۔ اس کو رہ کر عبید اللہ کی یہ بات یاد

☆☆☆

عالم پنچھ آگے بڑھا اور عرض کیا۔ ”نہ آں مردے کہ دنیا دوست دارد۔“

عالم نے درخواست کی۔ "حضرت! چونکہ میں دور دراز علاقے سے ملاقات کو حاضر ہوا ہوں اور خیال یہ تھا کہ چند دن آپ کی صحبت میں گزاروں گا لیکن افسوس کہ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا وہ درویشی اور فقر کے برعکس ہے اس لیے میں ایک رات یہاں گزار کر واپس چلا جاؤں گا۔ شب ب سری کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"

عالم کو وہیں ایک کمرار بنے کو دے دیا گیا۔

عام کو وہیں ایک سزا ہے کو دے دیا گیا۔
رات کو عالم بڑی دیر تک جاگتا رہا، آپ اس کی مزاج پرسی کو پہنچے اور پوچھا۔ ”بھائی! کوئی تکلیف تو نہیں؟“

عالم نے جواب دیا۔ "تکلیف کوئی نہیں، آپ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ۔"

آپ نے فرمایا۔ ”میں تجھ کو پریشان کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ تجھ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ سواب

مطمئن ہو گیا اور واپس چارہا ہوں، تو سو جا۔“

آپ وہاں سے چلے گئے تو عالم نے ایک بار پھر سو جانے کی کوشش کی، نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں لوگوں کو ایک طرف بھاگتے ہوئے دیکھا اور یہ لوگ اس طرح بھاگ رہے تھے کہ اس بھاگ دوڑ میں جو گرا وہیں گرا رہ گیا۔ یہ لوگ اک وسیع و عریض میدان میں جمع ہو گئے۔ اس ہجوم میں یہ عالم بھی شامل تھا۔ یہ اس ہجوم اور اس کی بھاگ دوڑ سے پریشان

تھا۔ اس نے کسی سے پوچھا۔ ”بھائی! یہ سب لوگ یہاں میدان میں کیوں جمع ہو رہے ہیں؟“

جواب ملا۔ ”یہاں لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں؟ ارے او شخص! تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون سی جگہ ہے، یہ عرصہ حشر ہے

تادان، یہاں حساب کتاب کیا جائے گا۔“

تادان، یہاں حساب کتاب لیا جائے گا۔
حساب کتاب، عرصہ حشر! عالم کا دماغ گھوم گیا۔ اتنے میں ایک گوشے سے ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس نے اس عالم کو بطور قرض ایک بڑی رقم دے رکھی تھی اور عالم میں اس کی ادائیگی کی استطاعت نہیں تھی۔ وہ عالم کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور ڈیٹ کر کہا: 'اے شخص! آج میں تجھ کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تو میرا قرضہ چکا دے ورنہ میں تیرا دامن پکڑتا ہوں'

اور تجھ کو لے جاتا ہوں جہنم کی طرف۔“

عالم گڑبڑانے لگا۔ ”بھائی، یہاں میرے پاس رقم کہاں سے آئے گی؟ خدا کے لیے مجھ کو معاف کر دے۔“

قرض خواہ نے سختی سے کہا۔ ”معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں تو وہی کروں گا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ چل جہنم

کی طرف۔ یہ معاملہ خالص حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ہمارے معاملے میں خدا بھی دخل نہیں دے گا۔“

عالم بے بس و مجبور ہو گیا۔ قرض خواہ نے اس کو کھینچنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ عالم کو تھوڑی سی دور لے گیا تھا کہ سامنے سے

عبد اللہ احرار آتے دکھائی دیے۔ عبید اللہ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ اے شخص! تو اس عالم کو کہاں لیے جا رہا ہے؟“

قرض خواہ نے جواب دیا۔ ”اس پر میرا قرض واجب الادا ہے۔ اب میں خدا سے کہوں گا کہ اس کو جہنم میں جھونک

دے کیونکہ میں اپنا قرض معاف نہیں کر سکتا۔“

عبید اللہ احرار نے کہا۔ ”جلدی نہ کر ابھی ذرا صبر سے کام لے۔ میں اس عالم کا قرض ابھی چکا تا ہوں۔“ اس کے بعد آپ نے عالم کے ذمے واجب الادا رقم اسی وقت ادا کر دی اور قرض خواہ نے عالم کا دامن چھوڑ دیا۔
عالم کی آنکھ دہشت سے کھل گئی اور وہ رات بھر پریشان رہا کیونکہ جس قرض خواہ کو اس نے خواب میں دیکھا تھا، عالم اس کا واقعی مقروض تھا۔

صبح رخصت ہونے کے ارادے سے عبید اللہ احرار کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”حضرت! بہت بہت شکریہ، رات مزے کی نیند آئی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”وہ مصرع ایک بار پھر تو دہرا۔“

عالم نے شرمندگی سے مصرع دہرا دیا۔ ”نہ آں مردے کہ دنیا دوست دارد۔“

خواجہ عبید اللہ نے فرمایا۔ ”اس میں دوسرے مصرعے کا اضافہ کر لے۔ اگر دارد برائے دوست دارد (یعنی خدمت خلق کے لیے دولت نفع بخش اور نعمت ہے)۔“

عالم بے حد شرمندہ تھا۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بٹھالیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”اس شخص کو کتنی رقم ادا کرنا ہے؟“

عالم نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”دس ہزار درہم۔“

آپ نے فرمایا۔ ”یہ رقم مجھ سے لے اور اس کو ادا کر دے۔“

عالم ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وہ بدگمانی سے اتنا شرمندہ تھا کہ آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔

آپ نے صوفیائے کرام کی طرح سیاحت بھی کی اور برصغیر بھی تشریف لائے۔ ان دنوں سندھ میں شیخ مبارک (ابوالفضل فیضی کے باپ) یہاں نہایت عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شیخ مبارک نے خواجہ عبید اللہ احرار سے ملاقات کی اور ان کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ شیخ نے اپنی عسرت کا ذکر کیا اور دعا چاہی۔ آپ نے دعا دی اور فرمایا۔ ”مبارک! مت پریشان ہو خدا تجھ کو دولت زر اور عزت و شہرت سے مالا مال کر دے گا جس سے تو دوسروں کا محسود ہو جائے گا۔“

آپ سمرقند پھر واپس تشریف لے گئے۔ اٹھاسی سال کے دسویں مہینے سے آپ کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کو بخار رہنے لگا تھا۔ اطباء نے علاج شروع کیا۔

جس دن پہلی بار بخار چڑھا، آپ نے اپنے بڑے بیٹے خواجہ محمد عبداللہ سے کہا۔ ”بیٹے! میں لو جوڑ تو کیا بنے گا؟“

صاحبزادے نے جواب دیا۔ ”نوا سی، یعنی ایک کم نوے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نوا سی دن بعد پورے نوا سی سال کا ہو جاؤں گا۔“

بیٹے نے پوچھا۔ ”باوا جان! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے (ایک دن کی تپ ایک سال کا کفارہ ہوتی ہے)

بیٹے! میں نوا سی دن بخار میں مبتلا رہ کر نوا سی سالہ زندگی کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ شاید خدا نے میرے حق میں یہی فیصلہ کر رکھا ہے۔“

چنانچہ محرم کی پہلی تاریخ (895ھ) سے بیماری کا آغاز ہوا اور یکم ربیع الاول 895ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا، آس پاس بہت سی شمعیں روشن تھیں۔ دفعتاً آپ کے دونوں ابروؤں کے درمیان سے روشنی نمودار ہوئی اور آٹا قاتنا یہ روشنی تمام شمعوں کی روشنی پر غالب آگئی اور آپ کا وصال ہو گیا۔ سمرقند میں آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ذکار اہرار، محمد غوثی شطاری، دربار اکبری، مولانا محمد حسین آزاد

انوار الصفا، محمد خصلت حسین صابری، صوفیائے نقشبند سید امین الدین

انوار الاصفیا، غلام علی ایڈل سنز، سکینہ الاولیا، داراشکوہ





پانی طبی شکار جمال دستی

گہات لگانے والے زمین اور خلا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ نہوس
اور مایع کے چکر میں الجھتے ہیں... وہ تو بس اپنی سوچ کو
عملی جامہ پہنانے کے دھنی ہوتے ہیں۔ پانی کی سرکش موجوں
نے اسے بھی یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ اپنا توازن برقرار رکھے
اور سیدھے انداز میں ٹیڑھی چال چل جائے۔



"سام اس قسم کے لوگوں میں سے ہے جو ہر وقت
بلاوجہ فکر مند رہتے ہیں، ہیں نا؟" میں نے کہا۔ "خاص طور
پر تمہاری طرف سے۔"
"اوہ، میں جانتی ہوں۔" اخیلا نے کہا۔ "پہلے تو
مجھے شدید غصہ آتا تھا لیکن اب چالیس سال گزرنے کے
بعد میں اس کی عادی ہو چکی ہوں۔"
"اخیلا اور میں اپنے علاقے کی جیل کے اطراف میں

اپنی تقریباً روزمرہ کی چہل قدمی کر رہے تھے۔ مجھے اخیلا کی
یہ گفتگو اس لیے یاد رہ گئی کہ وہ پہلا موقع تھا جب اخیلا نے
اپنے شوہر کے مزاح کے متعلق یکسر مختلف بات کہی تھی جو ایک
طرح سے تنقید بھی تھی۔
میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "لیکن تم جو کوئی کام
بھی کرتی ہو وہ اس کے بارے میں فکر مند رہتا ہے اور اس
وقت جب ہم ڈزنی ورلڈ گئے تھے تو کیا وہ بے فکر رہا تھا کہ تم

ڈزنی ورلڈ میں محفوظ ہو؟ ایک بار جب وہ آخر کار اس بات پر رضامند ہو گیا تھا کہ تم اسپیس ماؤنٹین پر چیئر لفٹ کی سیر کر سکتی ہو تو اس نے تمہیں اس طرح دبوچ رکھا تھا جیسے خوف زدہ ہو کہ تم نیچے نہ گر پڑو کیا وہ ہمیشہ اسی طرح کرتا ہے؟

”جب سے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی، وہ ہمیشہ یہی... کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ بھی یہی کرتا تھا اور ہر وقت اسی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود اسے اسٹروک ہو گیا تھا اور اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ وہ روزانہ اپنی ماں کو دیکھنے جانے کا عادی تھا اور اس کے استعمال کی روزمرہ کی دوائیں ایک لیبل لگے ہوئے چھوٹے سے بکس میں گن کر ڈال دیا کرتا تھا کہ کہیں وہ زیادہ خوراک نہ کھالے۔ اپنی ماں کے مرنے کے بعد کچھ عرصے کے لیے میرے ساتھ اس کا رویہ بدترین ہو گیا تھا لیکن پھر اس کے برتاؤ میں اعتدال آ گیا۔“ یہ کہہ کر اخیلا نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔

”وہ جوزف اور مجھ پر بھی ضرورت سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اتنی زیادہ نہیں جتنی تم پر دیتا ہے۔“

”بہر حال میں اسے تبدیل نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کتے کی دم کتے ہی عرصے ٹکلی میں رہے، میڑھی کی میڑھی ہی رہتی ہے۔“

پھر ہم دیگر چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور میں نے موضوع دوبارہ نہیں چھیڑا۔ گو میں نے جوزف سے کئی بار سام کے اس رویے کی شکایت بھی کی۔ جوزف نے حسب معمول میری سنی ان سنی کر دی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”خیلا اور میں اپنا بیشتر وقت اکٹھے ساحل اور مقامی سوئمنگ پول پر تیراکی کرنے اور لمبی سیر پر نکل جانے پر صرف کیا کرتے تھے۔ اس دوران ہم اپنی فیملیز ان کے کاموں، اپنے ماضی اور اپنے ان منصوبوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے کہ جب ہم بوڑھے اور تنہا ہو جائیں گے تو کیا کریں گے۔“

میرا اپنا یقین یہ تھا کہ میں اخیلا کو دیگر عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اور اچھی طرح سے جانتی ہوں۔

میرا جوزف فٹ بال کا دلدادہ تھا۔ موسم خزاں میں ہم نے اپنے لیے ایک اسپیشل ویک اینڈ منانے کا اہتمام کیا اور ہم بکس کا گیم دیکھنے کے لیے میپا چلے گئے۔ گیم دیکھنے کے بعد ہم نے دوستوں کے ساتھ ڈنر کیا۔ پھر قیام کے لیے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اگلے روز صبح میں تنہا شاپنگ

کرنے نکل کھڑی ہوئی جبکہ جوزف نے ہوٹل کے کمرے میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔

اپنی شاپنگ مکمل کرنے کے بعد میں لنچ کے لیے اس فرانسیسی ریسٹورانٹ پر رک گئی جہاں ایک بار جوزف اور میں نے ہماری شادی کی سالگرہ منائی تھی۔

جب میں نے ریسٹورانٹ میں قدم رکھا تو وہاں کی سفید میزوں پر موجود تازہ پھول اور ہر میز پر بیٹھے ہوئے جوڑوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ایک تنہا عورت کے طور پر میں خود کو غیر مطمئن محسوس کروں گی۔ سو میں واپسی کے ارادے سے تقریباً پلٹ گئی لیکن پھر میں نے سوچا۔ ”یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“

میں نے ویٹر سے اپنے لیے کسی پرسکون گوشے میں میز کے لیے کہا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ اس دوران میں اطراف کی میزوں پر موجود جوڑوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

تب ہی میری نگاہ اخیلا پر پڑی۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے علم نہیں تھا کہ سام اور اخیلا بھی میپا جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ ”چلو یہ اچھا ہوا۔ اب مجھے کمپنی مل جائے گی۔“

لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے اور وہ سام کے ہمراہ بھی نہیں ہے۔

وہ ایک بوتھ میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جو شخص موجود تھا اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور تب میں نے بروقت خود کو اس کے پاس جا کر ہیلو کہنے سے روک لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے کہ جب میں نے اخیلا کے چہرے کو غور سے دیکھا تو جس انداز سے وہ اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا خوبو شخص ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے تو میں سمجھ گئی کہ یہ کوئی معمول کا لنچ نہیں ہے۔ وہ ایک پیار کرنے والا جوڑا لگ رہا تھا۔

اس خوبو شخص کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔

میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ اگر میں ان دونوں کی نگاہ میں آئے بغیر وہاں سے لٹکنا چاہتی تو نکل سکتی تھی لیکن میں پلٹ کر وہاں سے دوبارہ گزرنا نہیں چاہتی تھی جدھر اخیلا اور اس کا عاشق بیٹھے ہوئے تھے۔

میں کونے میں اپنی میز پر سکر کر بیٹھ گئی اور جو کچھ میں نے دیکھا اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہمارے درمیان ایک علیحدہ پیدا ہو گئی ہے اور جیسے میں نہیں جانتی کہ اخیلا کون تھی۔ اس کی ایک خفیہ زندگی بھی تھی

اور اس خفیہ زندگی کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔
میں پریشان تھی کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے
بعد میں اس کا سامنا کس طرح کر سکوں گی۔

ان دونوں نے مجھے نہیں دیکھا اور نہ ہی میں انہیں
دیکھ سکی۔ اتنی ساری رقم خرچ کرنے کے باوجود مجھے کھانے
میں رتی بھر بھی ذائقہ محسوس نہیں ہوا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے
میں لکڑی کا برادہ کھا رہی ہوں۔ میں نے سوچا کاش میں
نے ادھر آنے کے بارے میں کبھی نہ سوچا ہوتا۔

میں جان بوجھ کر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا اپنے بیٹھنے
کو طول دیتی رہی پھر میں نے اپنا بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ
کے داخلی دروازے کی جانب چل پڑی۔ جب میں اس میز
کے سامنے سے گزری جہاں اخیلا اور اس کا عاشق بیٹھے
ہوئے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں جا چکے تھے۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

میں نے جوزف کو نہیں بتایا کہ میں نے اخیلا کو
یہاں دیکھا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے چہروں پر ایک
دوسرے کی چاہت کے جذبات اتنے عیاں تھے کہ میں
جان گئی۔ مجھ پر اخیلا کی خفیہ زندگی کا پہلو کھل کر سامنے آ گیا
ہے اور جیسے وہ میرے سامنے عریاں ہو چکی ہے۔

جوزف اور میں نے اخیلا اور سام کو اپنے میپا میں
ویک اینڈ گزارنے اور پھر کے روز اپنی شاپنگ کی مہم کے
بارے میں بتا دیا۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا میں نے
اس دوران اپنے چہرے کو سہاٹ رکھا۔ میں ایک اچھی دروغ
گو نہیں ہوں لیکن میں نے اپنے طور پر کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

موسم خزاں اور جاڑے کے سیزن میں مجھ سے جہاں
تک ممکن ہو سکتا تھا میں نے خود کو اخیلا سے پرے رکھا۔ ہم
نے اکٹھا سیر کرنا اور تیراکی کرنا تقریباً چھوڑ دی تھی لیکن بعض
اوقات وہ مجھے تنہا سونگ پول سے واپس آتی دکھائی دے
جاتی تھی۔ اس نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ میں اس سے
کھینچی کھینچی کیوں رہنے لگی ہوں۔ بعض اوقات میں سوچتی تھی
کہ وہ جانتی ہے کہ میں نے اسے فراسیسی ریسٹورنٹ میں کسی
کے ساتھ ملج کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟

یہ اگلے موسم بہار کی بات ہے جب ہم چاروں یعنی
جوزف، میں، اخیلا اور سام نے گہرے سمندر میں مچھلی کے
شکار کی مہم آزمانے کا فیصلہ کیا۔ سام کو اس مہم کے لیے راضی
کرانے میں ہمیں قدرے محنت کرنا پڑی اور اسے قائل کر لیا
کہ یہ کوئی خطرناک مہم نہیں ہے۔ ہم جیسے کئی لوگ ہمیشہ
گہرے سمندر میں مچھلی کے شکار کے لیے جاتے ہیں اور صحیح

سلامت محفوظ واپس آ جاتے ہیں۔ بالآخر وہ راضی ہو گیا۔
تب ہم نے کلیئر واٹر میں پورے دن کی مہم کی بکنگ
کرائی۔ جب ہم گہرے سمندر کے لیے روانہ ہوئے تو وہ
ایک نہایت خوشگوار دن تھا۔ مارچ میں فلوریڈا میں اتنی گرمی
نہیں پڑتی کہ تکلیف دہ ہو۔ بس ہلکی سی تمازت ہوتی تھی۔

کستی صبح نو بجے کے قریب اپنے سمندری سفر کے
لیے روانہ ہوئی۔ ہم نے اپنے لیے رینگ کے ساتھ کی
نشتوں کا انتخاب کیا۔ ہم نے اپنی مچھلی پکڑنے کی چھڑ اور
میکا کی چیزیاں مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ شکار کے لیے
ہمارے پاس زندہ چار استعمال کرنے یا اسے بہلا پھسلا کر
کانٹے تک لانے کی چوائس تھی۔

میں اور اخیلا دونوں نے چار استعمال کرنے سے
گریز کیا، کیونکہ ہم کانٹے میں بندھے زندہ چارے کی پانی
میں مل کھاتی لہراتی حرکت کو سنبھال نہیں سکتے تھے۔ جوزف
میرا مذاق اڑانے لگا اور اس نے میرے کانٹے میں چار الگا
دیا۔ اس نے کہا کہ مچھلی اسے محسوس نہیں کرے گی لیکن میرا
خیال تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

سام اخیلا کے برابر میں بیٹھ گیا، اس کے کانٹے میں
چار الگایا اور اسے بتایا کہ کانٹا کس طرح پانی میں پھینکتے
ہیں۔ ساتھ ہی یہ یقین بھی کرتا رہا کہ وہ کشتی کے پہلو پر بہت
زیادہ جھکنے نہ پائے اور لڑھک کر پانی میں نہ گر جائے۔

جوں ہی میں نے اپنی ڈور پانی میں پھینکی مجھے ایک
جھٹکا محسوس ہوا۔ جوزف ضرورت پڑنے پر میری مدد کے
لیے میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ مچھلی خاصی بڑی اور طاقتور لگ
رہی تھی اور ڈور کو کشتی سے پرے کھینچے جا رہی تھی اور جب
میں نے چرخی لپیٹنا شروع کی تو وہ اور زور لگانے لگی۔ میں
اس کے ساتھ ڈھیل دینے اور کھینچنے کا کھیل کھیلتی رہی۔ اس
کھیل میں یوں لگا جیسے گھنٹوں گزر رہے ہوں جبکہ حقیقت
میں شاید چند ہی منٹ گزرے تھے۔

پھر جب میرے بازو شل ہو گئے اور مجھے محسوس ہوا
کہ اب میں ڈور پر اپنی گرفت مزید قائم نہیں رکھ سکتی تو میں
نے اپنی چھڑ جوزف کو تھما دی۔ ہم دونوں نے مل کر مچھلی کو
کھینچ لیا اور پانی سے نکال کر کستی میں لے آئے۔

یہ لال رنگ کی ایک خوردنی مچھلی تھی۔ کشتی میں سوار
دیگر افراد نے میرے اس شکار پر تالیاں بجا کر مجھے داد
دی۔ کشتی کے کپتان نے کہا۔ ”بہت خوب!“ اپنی اس
کامیابی پر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کے باوجود
کہ میری شکار کردہ مچھلی کا وزن صرف بیس پونڈ تھا۔

بعد میں ہر ایک کے پاس چار ابھی کم رہ گیا اور مجھے جمائیاں آنے لگیں۔ میں سوچنے لگی کہ ہم بچ کے لیے کب رکیں گے۔ تب ہم نے اپنی اپنی ڈور کھینچ لی اور میرے شکار کا جشن منانے کے لیے تھوڑی سی واٹن پلی لی جو کہ اس روز کا سب سے بڑا شکار تھا۔

پھر جب سہ پہر ہونا شروع ہوئی تو دھوپ اور تمکین ہوا سے مجھے نیند آنے لگی۔ وہ بڑا شکار جو دو پہر سے پہلے بڑا سستی خیز لگا تھا اب دھیرے دھیرے بیزار کن ہو رہا تھا۔ میں نے ایک اچھتی نگاہ اٹھلا پر ڈالی۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں اپنی کرسی پر ڈھے چکی تھی۔ اس کی ڈور اور چھڑ جھول رہے تھے۔ اس نے انہیں تھامے رکھنے کا عارضی بندوبست یہ کیا ہوا تھا کہ انہیں اپنی کلائی سے ڈھیلا باندھ لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ پھسل کر نیچے پانی میں نہ گر جائیں۔ میں نے ایک بڑی سی جمائی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں تقریباً سوچ چکی تھی۔

تب مجھے اٹھلا کی چھڑ کی ڈور ہلنے کی آواز سنائی دی۔ چھڑ رینگ سے ٹکرا کر ٹن ٹن کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ ڈور بھی پوری طرح تن چکی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی بڑا شکار کانٹے میں لگ گیا ہے۔ کانٹے میں پھنسی پھنسی نے ایک غوطہ لگایا اور اس سے قبل کہ میں دیکھ پاتی، اٹھلا اپنی چھڑ سمیت کشتی پر سے پانی میں لڑھک گئی۔ پھنسی اٹھلا کو پانی میں نیچے تھکی جانب کھینچ رہی تھی۔

میں نے بے ساختہ ایک چیخ ماری۔ مجھے نہیں معلوم کہ سام اس وقت کہاں تھا، جب اٹھلا کشتی پر سے پانی میں گری تھی لیکن دوسرے لمحے میں نے سام کو کشتی پر سے پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ساتھ ہی وہ اٹھلا کو آوازیں دے رہا تھا۔

میں چیخنے لگی کہ کوئی بھاری سرے والا دستی ڈنڈا پانی میں پھینک دے۔ کشتی کے کپتان نے ایک ڈنڈا پانی میں پھینک دیا جس کے ساتھ ایک ڈور بھی بندھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی کپتان نے میٹ کو ان کے پیچھے جانے کا حکم دیا۔ اتنے میں سام پانی کی سطح پر ابھرا۔ جوزف نے چیخ کر سام سے کہا کہ وہ اپنے جوتے اتار پھینکے۔ مجھے یقین نہیں کہ سام نے اس کی بات سنی ہوگی۔ سام نے دوبارہ غوطہ لگایا۔ وہ اٹھلا کو ڈھونڈ رہا تھا۔

اس مرتبہ جب سام اوپر آیا تو اٹھلا کو اس نے اپنے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔ اٹھلا کسی نہ کسی طرح اپنی کلائی پر بندھی چھڑ سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب

پھنسی اسے نیچے پانی میں نہیں کھینچ رہی تھی لیکن وہ کھالس رہی تھی اور منہ سے پانی نکال رہی تھی۔ نیچے پانی میں غوطہ لگانے سے بہت سا پانی اس کے منہ میں چلا گیا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں اٹھلا نے سام کو جکڑ لیا تھا اور اسے نیچے دھکیل رہی تھی جبکہ سام اسے ایسی گرفت میں رکھنا چاہ رہا تھا کہ خود بھی تیر کر لائف پریزور تک پہنچ جائے۔

ان کی جانب دیگر لائف پریزور بھی اچھالے گئے لیکن اٹھلا سطح پر موجود رہنے کے لیے اتنی مضبوطی سے جدوجہد کر رہی تھی اور سام کو نیچے پانی میں دھکیل رہی تھی کہ سام ان لائف پریزور تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ میٹ بھی اس وقت تک پانی میں اتر چکا تھا۔ وہ ان کی جانب لائف پریزور کو کھینچتا ہوا لے گیا۔ ساتھ ہی وہ ان دونوں کی جدوجہد کو بھی دیکھ رہا تھا۔ سام اسے تھامے رکھنے اور پریزور کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ اٹھلا خود کو بچانے کے لیے اسے پانی میں نیچے دھکیل رہی تھی۔

میٹ تیرتا ہوا ان دونوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ تب اٹھلا ایک لائف پریزور تک پہنچنے اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ اسے واپس کشتی پر کھینچ لیا گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو تنہا تھی۔ سام غائب تھا۔ میٹ نے بار بار غوطہ لگایا لیکن سام کہیں نہیں ملا۔ وہ پانی میں گم ہو چکا تھا۔ بعد میں اس روز غوطہ خوروں کو سام کی تلاش میں بھیجا گیا لیکن پانی بہت زیادہ گہرا تھا۔

اگلے روز سام کی لاش سینٹ پیٹرز برگ کے قریب ایک ساحل پر پانی پر ابھرا آئی۔ اٹھلا کو کسی طور قرار نہیں آ رہا تھا۔ وہ خود کو سام کی موت کا ذمے دار قرار دے رہی تھی۔ گو میں ہمدردی جتانے اور اس کا خیال رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ تھی لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ سب اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔

سام کی موت کے چھ ماہ بعد اٹھلا نے اپنا مکان بیچ دیا اور شہر سے چلی گئی۔ آخری بار جب شہر چھوڑنے سے ذرا پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس وقت اس نے مجھے بتایا کہ وہ دوبارہ شادی کر رہی ہے اور کیلی فورنیا منتقل ہو رہی ہے۔ تب میں اچنبھے میں پڑ گئی اور مجھے سام کی موت پر حیرت ہونے لگی۔

اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ اٹھلا ایک بے حد توانا تیراک تھی اور سام کو پانی سے خوف آتا تھا۔





دوسری شکست

بابر نعیم

چاہے جیت ہو یا ہار... انسان مسائل کے انبار سے تو لڑ سکتا ہے لیکن دل کے محاذ پر لاکھ تدبیریں کر لے بنا منشیا کے کسی کا ساتھ حاصل نہیں کر پاتا... اسے بھی جب اپنی شکست کا کامل یقین ہو گیا تو ایک بھیانک فیصلہ کر ڈالا۔ اب اسے زندگی کی پروا نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تو بس ایک ہی خواب تھا اور یہی بات اس کے لیے اہم تھی۔ جس کی تکمیل میں ہی اس کی بقا تھی۔

بات سے بات جو کرنا اڑی یہ میں اترے والی ایک حینہ کی ڈانٹ

سیلی ٹیلر کو اس بیوٹی سیلون میں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اپنی محنت، لگن اور مہارت سے بہت جلد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی تھی، گو کہ یہ ملازمت اس کے شایانِ شان نہیں تھی لیکن فی الوقت گزائے کے لیے اسے اسی ملازمت پر انحصار کرنا تھا جب تک اس کا بوائے فرینڈ کمانے کے قابل نہ ہو جاتا۔ اس وقت بھی وہ اپنی نئی گاڑی اپنی بورڈن کا ہاتھ تھامے اس کے مانتوں پر پالش کر رہی تھی کہ اچانک اس کی

سسپنس ڈائجسٹ

وہ اس شال کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”لگتا تو نہیں کہ یہ تمہاری ہے۔“
”وہ کیسے؟“

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں پہلے کبھی شال میں نہیں دیکھا۔ اسے پہن کر تم اجنبی اجنبی سی لگ رہی ہو۔“

سلی نے دونوں ہاتھوں سے شال کو مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا لیکن کچھ بولی نہیں۔ مائیک اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم ایک عام لڑکی ہو اور تمہاری جیسی لڑکیوں پر اس طرح کی شال نہیں بچتی۔ یہ خاصی قیمتی معلوم ہوتی ہے اور ایسی شال صرف تمہارے پاس آنے والی عورتیں ہی پہن سکتی ہیں۔“

سلی اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ کیا اسے کوئی قیمتی چیز نہیں پہننی چاہیے۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ایک بیوٹیشن کوئی ایسا لباس نہیں پہن سکتی جو پارلر میں آنے والی عورتیں پہنتی ہیں؟“ یہ کہہ کر اس نے غصے کے عالم میں مارٹینی کا گلاس خالی کیا اور دوسرے کا آرڈر دے دیا۔

”تم میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ یہ شال تمہارے روزمرہ کے لباس سے مختلف ہے۔ چلو چھوڑو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔“

سلی کچھ لمحے تناؤ کی کیفیت میں رہی پھر اس نے اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سودہ کہاں تک پہنچا؟“

”تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور میری ایک پروڈیوسر سے بات بھی ہو گئی ہے۔ اس نے اس میں خاصی دلچسپی ظاہر کی ہے۔“

”یہ وہی شخص تو نہیں جس کے ساتھ تم گزشتہ چند روز سے ملاقاتیں کر رہے ہو؟“

”ہاں، اس سے میرا مسلسل رابطہ ہے۔ امید ہے کام بن جائے گا۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔“ سلی بولی لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ پہلے بھی ایسے سودے لکھے جاتے

رہے، پروڈیوسرز سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ اسی طرح

ملازمت کر کے گھر کا کرایہ اور بچن کی ضروریات پوری کرتی رہے گی اور اب اس میں شال کی قسط کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرا گلاس اٹھایا اور مشروب کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارنے لگی۔

وہ دونوں بار سے باہر آئے تو بری طرح لڑکھڑا رہے

تھے۔ مائیک نے اپنا ایک بازو سلی کے گرد جمائل کیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے کارٹک لے آیا۔

صبح کے چار بجے اچانک ہی اس کی آنکھ مائیک کے خراٹوں کی آواز سے کھل گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کندھے سرد ہو رہے ہیں۔ اس کے جسم پر شال نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر الماری کی طرف گئی جہاں وہ عموماً شال کو پوئیتھین کے بیگ میں لپیٹ کر رکھا کرتی تھی مگر الماری کا خالی خانہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی بونگ روم میں گئی اور تمام بتیاں روشن کر کے شال تلاش کرنے لگی۔

مائیک راہداری میں کھڑا آنکھیں مل رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ”تم کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“

”میری شال۔ وہ نہیں مل رہی۔ ضرور کہیں گر گئی ہوگی۔ کمال ہے مجھے پتا بھی نہ چلا اور تم نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔“

”ہم نے کافی زیادہ شراب پی لی تھی۔ شاید تم وہ شال اشارلائٹ کے بوتھ میں ہی چھوڑ آئی ہو صبح جا کر لے آنا۔ اب سو جاؤ۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ شال اب تک وہاں ہوگی۔ لوگ ایسی چیزیں کہاں چھوڑتے ہیں۔“

”کمال کرتی ہو تم بھی۔ بھلا کسی کو اس شال سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

”وہ کوئی معمولی شال نہیں۔ اس کی قیمت ایک ہزار ڈالر ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

مائیک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ بولا۔ ”تم۔ تم نے وہ شال ایک ہزار ڈالر میں خریدی تھی؟“

”ہاں۔“ وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”اوہ میرے خدا! اتنی مہنگی شال خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟“ مائیک بڑبڑاتا ہوا سونے کے لیے چلا گیا۔

دوسرے دن اس نے اشارلائٹ لاؤنج سے اس جگہ تک کے راستے کا اچھی طرح معائنہ کیا جہاں مائیک کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بار میں کام کرنے والے تمام

افراد سے پوچھا کہ ان میں سے کسی نے وہ شال تو نہیں دیکھی۔ سب نے نفی میں سر ہلادیا پھر اس نے قرب وجوار

میں واقع دکانوں کے مالکان سے بھی پوچھ کچھ کی لیکن کسی کو بھی اس شال کے بارے میں علم نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح

اپنی عزیز ترین شے کو تلاش کرتی رہی پھر مایوس ہو کر گھر

لوٹ آئی۔

چند روز بعد وہ اپنی بورڈن کے ناخنوں پر پالش لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اپنی نے جو شال اوڑھ رکھی ہے وہ ہو بہو اس کی گمشدہ شال جیسی ہے لیکن یہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ یہ اسی کی شال ہے پھر اسے اپنے کتے پوکسی کا خیال آیا۔ جس نے اپنے دانتوں سے اس شال میں دوسوراخ کر دیے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”کیا تمہارے گھر میں کوئی کتا ہے؟“

”نہیں۔“ اپنی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس کے بھورے بال شانوں سے اوپر تک کٹے ہوئے تھے۔ یہ اسٹائل عموماً درمیانہ عمر کی وہ خواتین اپناتی ہیں جو مطمئن زندگی گزار رہی ہوں یا حال ہی میں انہیں شوہروں سے نجات ملی ہو۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی اور چہرے پر بڑھتی عمر کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اپنی نے اپنے برابر میں بیٹھی عورت سے کہا۔ ”یہ گھر تمہارے لیے بہت مناسب رہے گا۔ بہت خوب صورت بنا ہوا ہے اور لیو مبی ہلز پر واقع ہے۔“

”کتنے کمرے ہیں؟“ اس عورت نے پوچھا۔

”چھ اور آٹھ باتھ روم ہیں۔ ان میں میک اپ روم شامل نہیں ہے۔“

”میرے لیے بہت بڑا ہے۔“ وہ عورت بولی۔ ”ویسے بھی آج کل ہر جگہ چھانٹی ہو رہی ہے۔ کیا پتا کل کیسے حالات ہوں اور ہم اس مکان کا کرایہ دے سکیں یا نہیں۔“ سلی ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس نے اپنی سے کہا۔ ”تمہاری شال میں دوسوراخ کیسے ہیں؟“

”واقعی!“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں اندر کی جانب دیکھو۔“ سلی نے کہا۔

اپنی نے بڑی احتیاط سے شال کو پلٹ کر دیکھا تو پارلر کی روشنی میں اسے وہ سوراخ نظر آ گئے۔ سلی کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہ اسی کی شال تھی۔ اپنی نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں نے ان پر غور نہیں کیا۔ دراصل کئی مہینوں بعد آج یہ شال لی ہے۔“

برابر میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا۔ ”مجھے تو یہ لیانا کی گئی ہے۔“

”میں نے کبھی ڈیزائنر یا برانڈ پر توجہ نہیں دی۔ مجھے جو چیز پسند آجائے وہ خرید لیتی ہوں۔“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ سلی نے کہا۔ دونوں

عورتیں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

سلی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر بیوٹی سیلون کا جائزہ لیا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ سیلون کا مالک فریڈرک ایک نوجوان ابھرتی ہوئی اداکارہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اگر وہ اشارہ ہوتی تو وہ اس سے اپنے پرائیویٹ روم میں ملتا۔ دوسری عورتیں سامنے لگے ہوئے آئینوں میں بڑے انہماک سے اپنے آپ کو سنورتا دیکھ رہی تھیں۔ ہال میں ہلکی ہلکی موسیقی گونج رہی تھی جس سے ماحول خوش گوار ہو گیا تھا۔ اگر سلی اس موقع پر اپنی شال کا مسئلہ اٹھاتی تو اس ماحول میں ایک ناگوار مٹی شامل ہو جاتی۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ فریڈرک بھی اپنی گاہک کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس گستاخی کے نتیجے میں سلی کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھوٹا پڑ جاتے پھر وہ اس شال کی فسطیں کیسے ادا کرتی۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ اپنی نے آخری بار آئینے پر نظر ڈالی اور شال کو اپنے بھاری کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”تم واقعی اپنے کام میں بہت ماہر ہو۔“

سلی کو یوں لگا جیسے اس تعریف میں بھی کوئی دھمکی پوشیدہ ہو۔ اپنی نے برابر میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بل ادا کرنے کے لیے استقبال کا ڈنڈہ کی جانب بڑھ گئی۔ سلی نے میز پر پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا جو وہ ٹپ کے طور پر اس کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ صرف تین ڈالرز۔ اس کا منہ بن گیا۔ اسے کم از کم دس ڈالرز کی توقع تھی۔ اس نے اپنی کو بل ادا کرتے دیکھا۔ کیا وہ اسے یونہی جانے دے، وہ اس سے کم از کم یہ تو پوچھ سکتی تھی کہ اس نے یہ شال کب اور کہاں سے خریدی تھی اور یہ کہ کیا وہ اسے خریداری کی رسید دکھا سکتی ہے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ عورت داویلا مچا دیتی اور سلی کے لیے مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ اس لیے وہ اسے سیلون سے باہر جاتا دیکھتی رہی۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنی سے اپنی چیز واپس نہیں لے سکی بلکہ اس لیے بھی کہ شال خرید کر اس نے کوئی عقل مندی نہیں کی تھی اور مائیک نے بھی اسے پسند نہیں کیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ اس شال کو اوڑھ کر بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن اسے زیادہ جرات کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اس نے وہ تین ڈالرز جیب میں ڈالے اور فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی شال واپس لے کر رہے گی۔

☆☆☆

اس نے سیلون سے استقبالیہ کاؤنٹر سے اپنی کا نمبر حاصل کیا اور فرضی نام سے اپنی کو فون کر کے کہا کہ وہ اس مکان کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتی ہے جو وہ فروخت کر رہی ہے۔ سلی کا خیال تھا کہ ایک بار اس کا اپنی سے سامنا ہو جائے تو پھر وہ کسی نہ کسی طرح اس سے اپنی شال واپس لے سکے گی۔

اس نے اپنی کروڑا عمارت سے ہٹ کر پارک کی۔ اس علاقے میں تمام مکان کم از کم چالیس لاکھ ڈالر مالیت کے تھے۔ وہ کچھ دیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اپنے حواس مجتمع کرتی رہی تاکہ پورے اعتماد اور جرات کے ساتھ اپنی کے سامنے جاسکے۔ وہ گاڑی سے باہر آئی اور مکان کی جانب چل دی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مکان کے دونوں بیرونی گیٹ کھلے ہوئے تھے اور باغ میں بھی گھاس اور پودے بے ترتیبی سے بڑھ رہے تھے جیسے کسی نے ان پر توجہ نہ دی ہو۔ مکان کی بیرونی دیواروں پر گرد کی گہری تہ جمی ہوئی تھی اور ان کی اچھی طرح دھلائی کی ضرورت تھی۔ سورج کی تیز روشنی میں اس نے دیکھا کہ چھت کے اوپر لگے ہوئے کچھ ٹائلز بھی غائب تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹ کی پالش اڑ چکی تھی۔ پورے مکان سے اداسی اور ویرانی فیلک رہی تھی۔

مکان کے بیرونی دروازے پر پہنچ کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اس کے گھٹنی بجانے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ اپنی بورڈن نے اس کا گرم جوش سے استقبال کیا۔ اس وقت بھی اس نے وہی شال اوڑھ رکھی تھی۔

”اندر آ جاؤ سلی۔“ یہ کہہ کر اس نے سلی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

سلی ایک بڑے سے لاؤنج میں حیران کھڑی تھی جہاں سے ایک چکر دار زینہ اوپری منزل کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر بھی جیل کی رینگ لگی ہوئی تھی لیکن پالش نہ ہونے کی وجہ سے خاصی بد نما نظر آ رہی تھی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ فون میں نے کیا تھا؟“

سلی الجھے ہوئے بے میں بولی۔

”کیونکہ یہ مکان برائے فروخت نہیں ہے اور تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس لیے میں سمجھ گئی کہ تم اپنی شال واپس لینے کے لیے مجھ سے ملنا چاہ رہی ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم اس بہانے ضرور یہاں آؤ گی۔“ پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اندر آ جاؤ میں تمہارے لیے کچھ پیسے کا انتظام کرتی ہوں۔“ اس کی ضرورت نہیں۔ تم میری شال واپس کر دو۔ مجھے جلدی جانا ہے۔“

”کیا تم یہ جاننا نہیں چاہو گی کہ یہ شال میرے پاس کیسے آئی؟ میں اپنے ناخن بنوانے کیوں تمہارے پاس گئی اور کیوں یہ ظاہر کیا کہ مکان فروخت کرنا چاہ رہی ہوں۔“

”میں کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی مسز بورڈن۔“

”خواہش نہ ہو تب بھی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس وقت تمہاری حالت سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ تم مجھے اپنی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔“

یہ کہہ کر وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ ڈرامائی انداز میں شال کا لٹکا ہوا پلو اپنے کندھے کے گرد لپیٹا اور بیونگ روم سے گزرتی ہوئی ایک چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد سلی کے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش ابھری کہ وہ فوراً یہاں سے چلی جائے۔ اس نے بڑی مشکل سے اس خواہش کو دبایا اور بنگ روم سے ہوتی ہوئی چھوٹے کمرے کی جانب چل دی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اپنی نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دو گلاسوں میں مشروب بنانے لگی۔

”میرے لیے کچھ نہ بنانا اپنی۔“ اس نے اتنی احتیاط سے اس کا نام لیا جیسے کوئی نئی زبان سیکھ رہی ہو۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ قریب ہی میز پر ایک لیپ روشن تھا اور آتش دان میں ہلکی آگ دھک رہی تھی۔ اسے کمرے کا ماحول پسند آیا اور وہ پرسکون انداز میں ٹائلز پھیلا کر بیٹھ گئی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم جن، پسند کرتی ہو۔ میں نے تمہیں اشار لائٹ لاؤنج میں مارٹینی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”تم اس وقت وہاں موجود تھیں جب میری شال گم ہوئی اور تم نے اسے اٹھالیا۔“ سلی غصے سے بولی۔

”ہاں، اس وقت وہاں اکیلی تھی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اکثر وہاں جاتی ہوں۔“ اس نے سلی کو مشروب پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں یہ شال دے سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔“

”کیوں؟“

”میں جانتی ہوں کہ بعض اوقات اچھے کام کا نتیجہ بھی غلط نکلتا ہے اور اب میں تقریباً یہی کرنے والی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور سر ہلانے لگی۔

سلی نے اپنا پرس کھولا اور بولی۔ ”میں اس کی رسید

بھی لے کر آئی ہوں۔“

”یہ تمہاری ملکیت کا نہیں بلکہ زندگی کا سوال ہے۔“

اپنی عجیب سے انداز میں بولی۔

سیلی کے اعصاب تن گئے اور وہ گھبراتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟“

”میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گی کیونکہ پہلے ہی ایک قتل کر چکی ہوں اور پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں کہ دوسرا قتل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

سیلی نے رسید دوبارہ پرس میں رکھ لی اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا واقعی تم نے کسی کو قتل کیا تھا؟“

”ہاں، اپنے شوہر کو۔“

سیلی کا خون رگوں میں جسنے لگا اور یہ سوچ کر ہی اسے جھر جھری آنے لگی کہ وہ اس پانگل عورت کے ساتھ اس کے کمر میں اکیلی تھی۔

”میں پانگل نہیں ہوں۔“ اپنی نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا۔ ”آپ کسی کو قتل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ شوہر کو سیز میوں سے دھکا دے کر میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی عقل کا کام کیا تھا۔ شاید میں کسی نفسیاتی کیفیت کے زیر اثر آ گئی تھی۔ اب مجھے اپنے جرم کا احساس ہوتا ہے۔“

”تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“ سیلی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے فرار کا ارادہ کر رہی ہو۔

اپنی نے ایک سرد آہ بھری اور مشروب کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی میری طرح ہو جاؤ۔“

”میں کبھی کسی کو قتل نہیں کر سکتی۔“

اپنی نے اپنا سر اٹھایا اور سیلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ مجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں تھی گوکہ میں نے بہت کوشش کی لیکن یہی حقیقت ہے۔“

”پھر تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟“

”ہماری ملاقات ہوئی اور دونوں ساتھ رہنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے عادی ہو چکے تھے۔ جب اس نے شادی کے لیے کہا تو میں انکار نہ کر سکی۔ شاید میں اتنی بہادر نہیں تھی اور نہ ہی مجھے یہ پتا تھا کہ حقیقت میں کیا چاہتی ہوں۔“

”میں شادی نہیں کر رہی۔“ سیلی نے اپنے دفاع میں کہا پھر بولی۔ ”کیا بہتر نہ ہوتا کہ تم اس سے طلاق لے لیتیں؟“

”بالکل لیکن میرے پاس اسے چھوڑنے کا کوئی جواز

نہ تھا۔ میں تمہیں گمراہ کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے جوش میں آ کر اسے قتل نہیں کیا بلکہ میں اس سے بور ہو چکی تھی۔ مثلاً کھانے سے پہلے وہ چاندی کے چمچوں، چمچوں اور کانٹوں کو نیکین سے صاف کیا کرتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے وہ اپنا چشمہ صاف کرنے لگ جاتا اور میں انتظار کرتی رہتی کہ کب وہ دوبارہ چشمہ ناک پر جما کر..... اپنا ادھورا جملہ پورا کرے گا۔ اس وقت بھی وہ اپنا چشمہ ہی صاف کر رہا تھا جب میں نے اسے سیز میوں سے دھکا دیا۔ میں بیڈروم سے باہر آئی تو دیکھا کہ وہ سب سے پہلی سیز می پر کھڑا کوئی تصوراتی دھبا صاف کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اس کے پیچھے آ کر زوردار دھکا دیا۔ اس کا سر سیز میوں سے ٹکرایا اور وہ لڑھکتا ہوا ماربل کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اس دوران بھی چشمہ اس کے ہاتھوں میں دبا رہا۔“

اپنی نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیا اور بولی۔ ”پولیس یہی سمجھی کہ وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے زینہ اتر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔“

سیلی کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیا تم اسے یاد کرتی ہو؟“

”نہیں لیکن وہ میری زندگی کا حصہ تھا جسے میں نے مار ڈالا۔“

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور سرد لہجے میں بولی۔ ”اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں بھی ایسا ہی دکھ پہنچاؤں۔“ سیلی کا سینہ جکڑنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بھاگی۔

”تمہارا بوائے فرینڈ مائیک کسی دوسری عورت سے تعلق استوار کیے ہوئے ہے۔“ اپنی نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنا گلاس دوبارہ بھرنے کے لیے میز کی جانب بڑھ گئی۔

سیلی اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئی پھر اس نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے اسے اس عورت کے ساتھ اشار لائٹ بار میں دیکھا تھا۔ وہ میرے برابر والی میز پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سنہری بالوں والوں لڑکی بڑے انہماک سے اس کی باتیں اور اس کے لطیفوں پر قہقہے لگا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اس کے اسکرپٹ کی تعریف کر رہی ہے جو وہ لکھ رہا ہے۔ ان دونوں کا جوڑ بہت مناسب لگ رہا تھا لیکن مائیک تم سے ہی شادی کرے گا کیونکہ تم برسر روزگار ہو اور اس کا خیال رکھ سکتی ہو اور تم اس سے اس لیے شادی کرو گی کیونکہ اس کی عادی ہو چکی ہو۔“

سیلی نے یہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے اور بھرائی ہوئی

صحت یاب

ایک دوست (دوسرے دوست سے) ”کل
تھانے میں مجھے ایک پولیس افسر نے مسکرا کر کہا۔ ”لو
بیٹے! آج اپنی زندگی کا آخری کھانا کھا لو۔“

دوسرا دوست۔ ”تو پھر تم زندہ کیسے بچ گئے؟“
پہلا دوست۔ ”تم پولیس افسر کا نقطہ نظر نہیں
پاسکے۔ اس نے مجھے جو کھانا کھلایا تھا ویسا کھانا زندگی
بھر نہیں مل سکتا۔“

دوسرا دوست۔ ”بہت ہی لذیذ کھانا تھا کیا؟“
پہلا دوست۔ ”بالکل نہیں پولیس افسر نے وہ
کھانا ایک ایسے حوالاتی سے پکویا تھا جو دراصل کسی
اسپتال کا باورچی تھا۔ پولیس افسر نے کہا تھا کہ یہ ایسا
عمدہ کھانا ہے کہ خطرناک حالت کے مریض بھی اس
سے بہت جلد ”صحت یاب“ ہو سکتے ہیں۔“
مرسلہ۔ عائشہ جنجوعہ، پنڈ دادنخان

تلاش میں گھر سے نکلی ہو۔ کئی نظریں اس کی جانب اٹھیں بلکہ
ایک لڑکے نے تو اسے اشاروں اشاروں میں دعوت بھی دی
تھی جسے اس نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

اسٹار لائن لاؤنج میں رش بڑھتا جا رہا تھا لیکن
مائیک ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا جبکہ وہ صبح ہی اسے بتا چکا
تھا کہ شام میں اس کی پروڈیوسر کے ساتھ ایک اور ملاقات
ہے۔ اپنی سے ملنے کے بعد سیکی ان ملاقاتوں کی حقیقت
جان چکی تھی اور اسے یقین تھا کہ مائیک اس لڑکی سے ملنے
یہاں ضرور آئے گا۔

اس نے وقت گزاری کے لیے ہال کا جائزہ لینا
شروع کیا تو اس کی نظر ایک خوب صورت سنہری بالوں
والی لڑکی پر گئی جو سفید وائن کے گھونٹ لیتے ہوئے بار بار
کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز
سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی کا انتظار کر رہی ہے یقیناً یہ وہی لڑکی
تھی جس کا ذکر اپنی نے کیا تھا۔

عین اسی لمحے بار کا دروازہ کھلا اور مائیک اندر آتا
دکھائی دیا۔ اس کے سیاہ بالوں کی لٹ ہمیشہ کی طرح ماتھے
پر جمبول رہی تھی۔ اس نے دروازے میں رک کر ہال کا
جائزہ لیا اور سیکی کے دل کی دھڑکن اس وقت تیز ہو گئی جب
مائیک نے اس لڑکی کی طرف جانے کے بجائے سیکی کی میز کا
رخ کیا اور اس کے قریب آ کر بولا۔ ”معاف کرنا۔ مجھے غلط

آواز میں بولی۔“ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پروڈیوسر سے
ملنے جاتا ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم سچ بول رہی ہو؟“
”مجھے تو اپنے شوہر کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا تھا
جب اس نے ایک دوسری عورت سے ملنا شروع کیا تھا۔
ایک اور بات۔ تم اس رات بار میں اپنی شال بھول کر نہیں
آئی تھیں۔ اس نے جان بوجھ کر تمہارے کندھے سے وہ
شال گھسیٹ لی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہوگا؟“

”وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس شال میں اچھی نہیں لگ
رہی اور ہمیشہ سے مختلف نظر آ رہی ہوں۔“

”ممکن ہے کہ اس نے تمہارے اندر کوئی تبدیلی
محسوس کی ہو اور اسے اپنی محتاط زندگی کے لیے کوئی خطرہ
محسوس ہوا ہو جیسا کہ مجھے ہوا تھا۔“

”میں اب مزید کچھ سننا نہیں چاہتی۔ مجھے میری شال
واپس کر دو۔“

اپنی نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور بولی۔
”نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”جسمیں اسے اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔
مجھے ایک سال تک اس کی قسطیں ادا کرنا ہوں گی۔“

اسے اپنے آپ پر ضبط نہ رہا اور اس نے اپنا پرس گھما
کر اپنی پردے مارا جو اس کے سر سے نیچے لگا، اپنی پیچھے کی
جانب لہرائی لیکن جلد ہی اس نے توازن قائم کر لیا اور اپنے
ہاتھ سے زخمی گال سہلانے لگی۔

سیکی کے آنسو بہنے لگے اور وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے
افسوس ہے لیکن تم بھی زیادتی کر رہی ہو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“
”تم اسے قتل کے بغیر اپنی زندگی سے نکال دو۔ پھر
جسمیں یہ شال واپس مل سکتی ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

سیکی نے سوچا کہ وہ اس عورت سے شال چھین لے جو
اس کی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں اتنی
ہمت نہیں تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنی کا شکر یہ ادا کیا اور
چھلکے چھلکے قدموں سے دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سیکی نے بار میں لگے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا
اور مسکرا دی۔ وہ اپنا حلیہ بدلنے میں مکمل طور پر کامیاب
ہو چکی تھی۔ اب اس کے سر پر سنہری بالوں والی وگ تھی جو
اس نے صبح ہی بیوٹی شاپ سے خریدی تھی۔ اس نے اپنی
آنکھوں کو لائسنز کی مدد سے بالکل سیاہ کر لیا تھا اور ہونٹوں
پر معمول سے ہٹ کر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی
تھی۔ وہ ایک ایسی عورت نظر آ رہی تھی جو دوست یا گاہک کی

منہی ہوئی۔ تم بالکل اس جیسی ہو جس سے میں ملنے آیا تھا۔“
 ”مائیک! وہ لڑکی اپنی جگہ سے ہاتھ لہراتے ہوئے
 بولی۔“ میں یہاں ہوں۔“

”اوہ خدا۔ مجھے سب سنہری بالوں والی لڑکیاں
 ایک جیسی لگتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی سے اس لڑکی کی
 جانب لپکا۔ وہ لڑکی اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس
 سے لپٹ گئی۔

سلی کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ اس کے
 پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے
 جہاز کے مانند محسوس کیا جو سمندری طوفان کی زد میں آکر
 ڈوب رہا ہو۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس نے
 رومال سے پسینا پونچھا اور بل ادا کر کے باہر آگئی۔ اب
 وہاں مزید رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی وہ پوکسی کی پیٹھ سہلا رہی
 تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی۔۔۔ وہی دکھ تھا جو وہ اپنی کی
 آنکھوں میں دیکھ چکی تھی جیسے پوکسی نے اس کے دکھ کو محسوس
 کر لیا ہو اور آنے والے طوفان سے خوفزدہ ہو۔ سلی کی
 نظریں بار بار دیوار گیر کھاک پر جاتیں، بالآخر ایک بجے اس
 نے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو فوراً ہی بستر سے اٹھ
 کھڑی ہوئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ آئینے
 کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا حلیہ درست کرنے لگی۔ اس نے
 وگ کو اچھی طرح سر پر جمایا اور چہرے کے میک اپ کا
 جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو گئی۔

مائیک گنگناٹا ہوا بیڈروم میں داخل ہوا لیکن اس پر
 نظر پڑتے ہی اس کے قدم دروازے پر رک گئے اور وہ
 حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”سلی!“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
 وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ مائیک ایک بار پھر اسے
 پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔

اس نے ناراض ہوتے ہوئے اپنے بال ماتھے پر سے
 ہٹائے اور آگے کی طرف جھک کر اس کے چہرے پر نظریں
 جمادیں جیسے تصدیق کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ واقعی سلی ہی ہے۔
 پھر وہ تہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو پریشان ہو گیا تھا۔
 مجھے لگا جیسے کوئی اجنبی عورت میرے کمرے میں آگئی ہے۔“
 ”کچھ مرد تو بن بلائی اجنبی عورت کو دیکھ کر خوش بھی
 ہو سکتے ہیں۔“

مائیک نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”تم تو بالکل
 پہچانی نہیں جا رہی ہو۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ اسی لمحے سلی نے اپنے
 آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط محسوس کیا۔ اب وہ مائیک
 کو اس کی اوقات یاد دلانا چاہ رہی تھی جو اس کے ساتھ دھوکا
 کر رہا تھا۔

”ان دنوں تم عجیب و غریب حرکتیں کر رہی ہو۔ پہلے
 تم نے وہ شال خریدی جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اب
 تم نے اپنے چہرے کا ستیاناس کر لیا ہے۔ اتنا گہرا میک اپ
 اور بالوں کو ڈاکی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نے بال ڈاکی نہیں کیے بلکہ وگ لگائی ہوئی
 ہے۔“ سلی نے وضاحت کی۔ ”اور یہ مت سمجھنا کہ میرا دماغ
 خراب ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔“
 وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ”پھر یہ سب کیا ہے؟ تم
 ایک آوارہ عورت کے مانند نظر آ رہی ہو۔“

سلی کی رگوں میں خون جننے لگا۔ اسے مائیک سے ان
 ریمارکس کی توقع نہ تھی۔ وہ سنپھٹتے ہوئے بولی۔

”کیا تمہاری پروڈیوسر آوارہ عورت جیسی نظر آتی
 ہے۔ اس کے بھی تو سنہری بال ہیں۔“

”کیا اسی لیے تم نے اس جیسا حلیہ اختیار کیا ہے جبکہ
 وہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“

”سب مرد رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر ایسا ہی
 کہتے ہیں۔“ سلی طنزیہ انداز میں بولی۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ۔۔۔۔۔۔“
 ”بلکہ کیا؟“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ اس کے
 بعد بھی تمہارے پاس کچھ کہنے کی گنجائش ہے؟“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔“
 ”میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کون ہے اور تمہارا اس
 سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں۔“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”بس یونہی۔۔۔۔۔۔ وہ
 تو۔۔۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔“

”میں چاہتی ہوں کہ کم از کم ایک بات مجھے سچ بتا
 دو۔ کیا اس رات تم نے میرے کندھے سے شال ہٹائی تھی؟“

”میں ایسا کیوں کروں گا؟“
 ”براہ کرم مجھے سچ بتا دو۔ میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس شال کی قیمت ایک ہزار
 ڈالر ہے۔“ وہ دوسری جانب منہ پھیرتے ہوئے بولا۔

☆ ☆ ☆
 اپنی بورڈن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سلی کو

افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہتے کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آئی۔ وہ اس سے پہلے ہی فون پر ملاقات کا وقت طے کر چکی تھی اور اپنی نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی شال لے جائے۔ سلی کو اس کے بدلے ہوئے روتے پر حیرت ہو رہی تھی۔ کیا اس طرح وہ اپنی کی دوست بن سکتی ہے؟ تب اسے یاد آیا کہ جو عورت اپنے شوہر کو قتل کر دے وہ کسی کی دوست نہیں ہو سکتی۔ کار سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ بیرونی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھل گیا اور سلی مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا اور لگتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس نے راہداری میں کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ ”اپنی!“

جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ آگے بڑھی اور لیونگ روم سے ہوتی ہوئی کچن تک آگئی۔ کافی کی میز پر جن کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا اور برابر میں ہی اس کی شال بڑی صفائی سے تکی ہوئی رکھی تھی اور اس کے بالکل اوپر ایک تحریر شدہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ سلی نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

”میری طرف سے یہ ڈرنک تمہارے لیے ہے۔ تمہاری ہمت دیکھ کر مجھے بھی ہمت ہوئی۔ اپنی شال اٹھاؤ اور اسے پہن لو۔“

سلی نے شال اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ وہ اس کی نرمی اور گرمی کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کمرے سے تمام فرنیچر ہٹا دیا گیا تھا۔ کیا اپنی نے سب کچھ بیچ دیا؟ کیا وہ اپنے آپ کو ہر بوجھ سے آزاد کر رہی تھی؟ راہداری میں آکر اس نے ایک بار پھر اپنی کا نام لے کر آواز دی لیکن یہ آواز گھر کے سنائے میں گونج کر رہ گئی۔ وہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس نے محل کی رینگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اوپر پہنچ کر وہ ایک کھلے ہوئے دروازے کے سامنے لمحے بھر کے لیے رکی پھر اندر داخل ہو گئی۔

اپنی بورڈن کمر کے بل بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی جگہ خالی پن نظر آ رہا تھا اس کی کینٹی پر گہرا سوراخ ہو چکا تھا۔ خون کے دھبے عقبی دیوار فرش اور بستر کی چادر پر پھیلے ہوئے تھے اور نیچے کے نیچے سے ایک تحریر شدہ کاغذ جھانک رہا تھا۔ سلی نے جلدی سے وہ کاغذ اٹھایا۔ اس پر لکھا تھا۔

”سلی! اگر تم یہ تحریر پڑھ رہی ہو تو تم میری سوچ سے کہیں زیادہ بہادر ہو۔ مجھے اس ہنگامے پر افسوس ہے لیکن میں نے تمہیں اس غیر محفوظ زندگی سے آزاد کرانے کی

کوشش کی تھی جسے تم اب تک محفوظ سمجھتی آرہی ہو لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مائیک کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس لیے تمہاری شال واپس کر رہی ہوں۔ اب تو تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ شال مجھ تک کس طرح پہنچی۔ میں اپنے شوہر سے ہاتھ دھو چکی ہوں لیکن دوسری بار شکست مجھے منظور نہیں۔ اس لیے تمہارے راستے سے ہٹ رہی ہوں۔“

سلی نے اس کی آنکھیں بند کیں اور شال کو اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔ وہ بیڈ روم سے باہر آئی اور سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتر آئی۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ شال اپنی تک کس طرح پہنچی۔ مائیک نے جان بوجھ کر اسے اس کے کندھوں سے ہٹا دیا تھا تاکہ بعد میں اپنی اسے اٹھا لے۔ اس نے سلی سے جھوٹ بولا تھا کہ اسے شال کی قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلی وہ شال پہن کر کوئی معزز عورت نظر آئے، اس کے خیال میں سلی اس قابل نہیں تھی۔ ایک معمولی بیوٹیشن کو اتنی قیمتی شال پہننے کا حق نہیں تھا۔

سلی اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ وہ شال کا تعاقب کرتے ہوئے اپنی کے گھر تک پہنچ گئی جہاں اپنی نے اسے مائیک سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی اور شال واپس کرنے کے لیے شرط رکھی کہ وہ مائیک کو اپنی زندگی سے نکال دے۔ سلی کو یہ سودا منظور نہ تھا۔ وہ شال سے دستبردار ہو سکتی تھی لیکن مائیک سے جدا ہونا اسے منظور نہ تھا۔ اس نے مائیک سے سچ اگوا لیا کہ اسی نے وہ شال اس کے کندھے سے ہٹائی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنی بھی مائیک کے پیچھے بڑی ہوئی ہے اور اسی لیے اس نے شال کے عوض مائیک کو سلی سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ناکام ہونے کے بعد اس نے خودکشی کر لی۔

اپنی کا پورا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنی کے بیڈ روم کی طرف دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے باہر آگئی۔ اپنی بد قسمت تھی کہ پہلے اس کے شوہر نے بے وفائی کی اور بعد میں اس نے جسے چاہا وہ اس کے دام الفت میں نہ آسکا۔ اس میں دوسرا قتل کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی دوسری بار شکست برداشت کرنے کا حوصلہ۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

سلی نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اپنے سل فون سے نائن ون ون ڈائل کیا پھر اس نے اپنا ماتھا اسٹیرنگ ویل پر ٹکایا اور پولیس کا انتظار کرنے لگی۔

سلسلہ مکافات

عظیم احمد

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہاوت مشہور ہے کہ ”تن پُتلا ہے خاک کا اسے دیکھ مت بھول... اک دن ایسا ہوگا ملے دھول میں دھول...“ اس حقیقت کو انسان کبھی نہ بھولے کہ ہر ایک کو ایک نہ ایک دن اپنے مالک حقیقی کی جانب لوٹنا ہے... خاک کا یہ پُتلا روتے ہوئے خاک پر پیدا ہوتا ہے اور طاقت کے گھمنڈ میں دھن دولت اکٹھی کرنے اور رشتوں کو ٹھکرانے کے باوجود خاک تلے ہی سو جاتا ہے لیکن... اس رونے اور سونے کے درمیان چاہے مکافات کا عمل مسلسل جاری رہے تب بھی وہ مکافات کی جزئیات کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور یہی غفلت اسے سرکشی پر مائل کر کے جذبات و احساسات سے کھیلنے پر اکساتی ہے... اور پھر وہ زندگی کی بساط پر ایسے دائو پیچ چلتا ہے کہ بازی مات ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے بھی یہی گمان تھا۔ فتح کے نشے میں چور اسے خیال تک نہ آیا کہ اگلی بساط پر یہی چالیں خود اس کی چال کو لڑکھڑا دیں گی... جب اپنا ہی سایہ دغا دے جائے تو چند لمحات کے لیے لازم ہے کہ انسان پلٹ کر پیچھے بھی دیکھ لے لیکن اس کے پاس نہ تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی قدرت کے پاس اتنی رعایت کہ بغیر کسی حجت کے زیست آسان ہو جائے لہذا مکافات کی چکی جب الٹی چلتی ہے تو ایک ایک لمحے کا حساب بے باق ہو جاتا ہے... دن رات کا شمار کرتے کرتے وہ بھی تھک چکی تھی، اس کے باوجود قدرت کی ستم ظریفی جاری تھی۔

بگس درگس ایک ہی چہرے کے ہزاروں روپے... اور ہر روپے کی ایک الگ داستان

اور ملک بھر کے قانون دانوں کی فہرست میں کچھ اور اضافہ کر دیتی ہے۔ ان میں سے کچھ دل میں سماج سدھار کے عزائم لے کر آتے ہیں۔ کچھ قانون کے نشتر سے معاشرے کے ناسوروں کا آپریشن کرنا چاہتے ہیں اور کچھ شعبے قانون سے وابستہ عزت و توقیر کے خواہاں ہوتے ہیں۔

پھر ہوتا کچھ یوں ہے کہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک ایوان ہائے عدالت میں دھکے کھانے، نکات و دلائل کی تلاش میں موٹی موٹی کتابیں کھنگالنے، رات دو دو بجے تک پیچیدہ مقدمات کے مطالعے اور تجزیے پر مغز ماری کرنے، قانون کے سخت دل اہلکاروں کو نرم کرنے اور۔ جوڈیشری کی اینڈ بینڈ سے ٹھوکریں کھا کھا کر ہو جاتا ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ خواب دیکھنا کسی اڑتے پرندے کو دیکھنے سے زیادہ آسان ہے لیکن اسے حقیقت کا روپ دینا

منصور نے تیسری مرتبہ نگاہیں دوڑا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا اور کسی قدر اضطراب کے عالم میں صوفے کا ہتھا انگلیوں سے کھٹکھٹانے لگا۔ پچھلے نصف گھنٹے سے وہ اسی طرح بیٹھا وقت ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انتظار کرنا ویسے بھی ایک مشکل کام ہے لیکن نوجوانوں کے لیے، بالخصوص منصور جیسے انسانوں کے لیے کسی حد تکلیف دہ بھی ہوتا ہے جنہیں کسی کام کی لگن بے چین رکھتی ہے۔ پھر یہ انتظار ساغر بھی نہ تھا کہ اختتام پر جسم و جاں کو کیف و انبساط کا جام میسر آئے بلکہ یہ ایک خاتون کا انتظار تھا جن کی عمر، منصور کے محتاط اندازے کے مطابق اس کی اپنی والدہ سے بھی کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی۔

منصور نو عمر وکلاء کی اس کھپ کا تازہ ترین نمونہ تھا جو ہر سال پاکستان کے لاء کالج سے ٹریجویشن کر کے نکلتی ہے



اس پرندے کے پر گنتے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ تب پتا چلتا ہے کہ جس پٹے میں وہ دولت کے ڈھیر لگانے کے لیے داخل ہوئے تھے، وہاں سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے سوداؤ کھیلنا پڑتے ہیں۔ انصاف کا ترازو اپنے حق میں جھکانے کے لیے پلڑے میں اپنا ضمیر، عزت نفس اور فخر ذات ڈالنا پڑتے ہیں۔ تب پتا چلتا ہے کہ انصاف و عدالت کی جس تلوار سے وہ جرم و گناہ کا سر قلم کرنا چاہتے تھے، اس کی دھار کو زنگ لگ چکا ہے۔ اکیلے چنے کے لیے بھاڑ جھونکنا شاید ممکن ہو لیکن اکیلے شخص کے لیے اس زنگ کو کھرچنا ناممکن ہے۔

لیکن منصور ابھی ان حقائق سے نا آشنا تھا۔ سنگینیوں نے ابھی اس کا در نہیں دیکھا تھا۔ اس کا جوش و ولولہ ابھی تازہ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایل ایل بی کیا تھا اور اوسط درجے کی ایک لاء فرم میں جونیئر ایسوسی ایٹ کی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق مڈل کلاس کے ایک ایسے گھرانے سے تھا جس میں دو تین کمانے والے موجود تھے۔ اس کا باپ سترھویں گریڈ کا سرکاری ملازم تھا۔ ایک بھائی پرائیویٹ فرم میں سلیز منیجر تھا اور دوسرا ایک تعمیراتی ادارے میں بطور ایئر کنڈیشنر کام کر رہا تھا۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے چنانچہ پوری تنخواہ گھر دیتے تھے۔ تین تنخواہیں ملا کر اتنا ہو جاتا تھا کہ آج کل کی گراں بازاری کے دور میں کھا بھی لیتے تھے اور کچھ بچا بھی لیتے تھے۔ یوں منصور سے انہوں نے کچھ زیادہ توقعات وابستہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی اور معاشی تفکرات سے آزاد منصور اب بھی پورے دھڑلے سے خواب دیکھ سکتا تھا۔

یہاں پر بھی وہ ایسی ہی نیت سے آیا تھا۔ کام کی نوعیت بہ ظاہر معمولی تھی لیکن منصور کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اپنے پیشہ ورانہ کیریئر کے آغاز کے بعد پہلی دفعہ اسے کسی موکل کو اپنے طور پر ہینڈل کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ یہاں آتے ہوئے وہ خاصا جوش اور ہیجان محسوس کر رہا تھا لیکن اب یہ جوش اور ہیجان آہستہ آہستہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ انتظار کرتے ہوئے اتنی دیر گزر چکی تھی اور ویننگ روم میں تنہا بیٹھے وہ سخت بور ہو رہا تھا۔

یہاں پر اس کی آمد بس اتفاق ہی کا نتیجہ تھی۔ دو روز پہلے سیکریٹری نے (جو اس کے علاوہ تین دیگر ایسوسی ایٹس کے امور کی دیکھ ریکھ بھی کرتی تھی) اسے ایک فون کال کے متعلق بتایا تھا کہ دارالضحفا نامی ایک ادارے سے کسی

خاتون نے فون کر کے فرم کے کسی وکیل سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اصولی طور پر تو کسی بھی موکل کا پہلا رابطہ فرم کے کسی سینئر سے ہونا چاہیے تھا، بعد میں وہ جسے چاہتا اس کی ذمہ داری تفویض کرتا لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ اس روز کوئی سینئر موجود نہ تھا۔ فرم کے دونوں پارٹنر کسی سیمینار میں شرکت کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ ایک سینئر ایسوسی ایٹ گزشتہ کچھ روز سے بیماری کی وجہ سے غیر حاضر تھا اور دوسرا سالانہ چھٹیوں پر منتہیالگی جا پہنچا تھا۔ لے دے کے منصور اور تین جونیئرز بچتے تھے اور چونکہ اطلاع سب سے پہلے منصور کو ملی تھی، اس لیے کال بھی اسی نے اٹینڈ کی۔

فون کرنے والی خاتون نے اپنا نام عقیلہ رحیم بتایا تھا۔ وہ دارالضحفا نامی اس ادارے کی انتظامیہ میں شامل تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ان کے ادارے میں مقیم ایک خاتون اپنی وصیت کی تیاری کے سلسلے میں ان کے ادارے کے کسی تجربہ کار وکیل سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ خاتون کا نام اس نے شاہانہ چغتائی بتایا تھا۔

چونکہ کوئی سینئر سر پر نہ تھا اس لیے منصور نے خود سینئر بننے کا فیصلہ کرتے ہوئے خاتون کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اگلے چند دن میں وقت نکال کر ان کے ادارے کا چکر لگالے گا۔ وقت نکالنے کی بات اس نے محض اس لیے جڑی تھی کہ۔۔۔ بے حد معروف ہونے کا تاثر دے کر عقیلہ نامی اس خاتون پر رعب ڈال سکے۔ تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے تو وہ یہ کہنے لگا تھا کہ ادارے کے کسی وکیل کے پاس وقت شاید نہ نکل سکے۔ اس لیے خواہش مند خاتون خود ہی ان کے دفتر کا چکر لگالے لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہا کہ اگر خاتون یہاں آگئی تو اپنے پہلے موکل کو ہینڈل کرنے کا یہ سنہری موقع یقیناً اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اب اس موقع سے مستفید ہونے کے لیے وہ انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا ادارے کا بروشر اٹھا لیا۔ بروشر میں ادارے کے قیام کی غرض و غایت اور یہاں میسر سہولتوں کا بیان تھا۔ مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ ادارہ 1913ء میں شوکت چغتائی نامی ایک صاحب نے ایسے بوڑھے اور ضعیف افراد کے لیے قائم کیا تھا جن کے آگے پیچھے کوئی سنبھالنے والا نہ ہو۔ چغتائی صاحب کیمبرج کے پڑھے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ رئیس زادے تھے۔ اس ادارے کو قائم کرنے کا آئیڈیا انہوں نے یورپ میں قائم اس نوعیت کے دوسرے

وکیل ہونے کی حیثیت سے اسے لفظی جادوگری کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس مرتبہ عقیلہ رحیم کے شروع ہونے سے پہلے ہی خود ہلا بول دے گا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عقیلہ رحیم جیسے پہلے ہوا کی طرح آئی اور گئی تھی، تھوڑی دیر بعد اسی طرح دروازہ کھول کر جھپاک سے اندر آ گئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ ایک ملازمہ بھی چائے کی ٹرے اٹھائے اس کے ساتھ تھی۔ ملازمہ ٹرے رکھ کر خاموشی سے واپس ہو گئی تو عقیلہ رحیم نے کہا۔ ”مجھے زیادہ دیر تو نہیں لگی؟“

”بالکل نہیں۔“ منصور نے کہا۔ ”مجھے تو یوں لگا کہ جیسے آپ ابھی گئی تھیں اور ابھی آ گئیں۔“

”کہیں میں آپ کے سر پر تو سوار نہیں ہو رہی؟“ عقیلہ نے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

منصور گڑبڑا گیا۔ اس کے بے ضرر سے جواب کو شاید عقیلہ نے طنزیہ تصور کر لیا تھا۔ ”کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کی وجہ سے تو میں بیٹھ گیا ہوں ورنہ کسی نئے کلاسٹ کا اتنی دیر انتظار کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا۔“

عقیلہ کچھ نہ بولی، خاموشی سے چائے بنانے لگی۔ منصور دہری کامیابی پر خوش ہوا۔ ایک طرف تو اس نے عقیلہ کو معقول جواب دیا تھا، دوسری جانب اپنی عدیم الفرستی کا تذکرہ کر کے اپنا شخصی تاثر بھی اجاگر کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بھر پور اور اہل وکیل ہونے کا تاثر ان لوگوں پر چھوڑے، بیگم چغتائی کے کام کو خوش اسلوبی سے ہینڈل کرے اور اپنے بڑوں کی نظروں میں سرخرو ہو کر دونوں فریقین سے داد بخورے۔ معاشی اور ذہنی لحاظ سے وہ زندگی کے اس حصے میں تھا جہاں انسان کے لیے روپے پیسے سے زیادہ ستائشی کلمات اہمیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے مادی مسائل کی اہمیت ان پر ذرا بعد میں کھلتی ہے۔

عقیلہ رحیم چائے بنا رہی تھی۔ اس کی توجہ بٹی ہوئی دیکھ کر منصور نے موقع غنیمت جانا اور بات آگے بڑھائی۔ ”کچھ دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ بیگم چغتائی کی بات آپ کی نگاہ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”وجہ بالکل سیدھی سی ہے۔“ عقیلہ نے کہا۔ ”چینی کتنی لیس گے آپ؟“

”جی..... ایک چمچ۔“

”ہاں، تو میں کہہ رہی تھی کہ وجہ بالکل سیدھی سی

ہے۔“ عقیلہ رحیم نے کپ میں چینی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ”یہ ادارہ ایک ٹرسٹ کے تحت چلایا جا رہا ہے اور وہ ٹرسٹ بیگم چغتائی کے والد نے قائم کیا تھا۔“

”اوہ!“ منصور کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اسے بروشر کے مندرجات یاد آ گئے تھے۔ ”تو شوکت چغتائی، شاہانہ چغتائی کے والد تھے۔“ اس نے سوچا۔ دونوں کا چغتائی ہونا تو اس نے پہلے بھی نوٹ کیا تھا لیکن اس طرف اس کا ذہن نہیں گیا تھا۔

عقیلہ رحیم کی بات جاری تھی۔ ”اپنی موت سے پہلے انہوں نے دو سال خود بھی یہیں گزارے تھے۔ ان کی وفات یہیں پر ہوئی تھی۔“

”لیکن ایسے امیر کبیر آدمی کو اپنا آخری وقت یہاں گزارنے کی کیا ضرورت تھی؟“ یہ سوال منصور کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ اسے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ عقیلہ رحیم نے کندھے اچکائے۔ ”یہ بات غالباً چالیس، پینتالیس سال پہلے کی ہے اور مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے محض چند سال ہوئے ہیں بلکہ یوں سمجھیے کہ میں نے اور بیگم چغتائی نے یہاں اکٹھے ہی قدم رکھا تھا۔ چھ سال پہلے کی بات ہے مجھے یہاں ملازمت ملی اور ایک ہفتے بعد بیگم چغتائی یہاں آ گئیں۔“

”آپ نے کبھی بیگم چغتائی سے پوچھا نہیں اس بارے میں؟“ منصور نے تجسس لہجے میں پوچھا۔

”کبھی خیال ہی نہیں آیا۔“ عقیلہ رحیم نے کہا۔ ”ہاں ایک دفعہ... یہ ضرور پوچھا تھا کہ بیٹے اور بہو کے ہوتے ہوئے انہیں یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ظاہر ہے یہ ادارہ تو ایسے افراد کے لیے ہے جو بے آسرا ہیں۔“

”پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟“ منصور نے دلچسپی سے پوچھا۔

”انہوں نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی زندگی میں بے جا طور پر دخل انداز نہیں ہونا چاہتیں۔“ عقیلہ رحیم نے بتایا۔ ”یہاں آنے سے ایک سال پہلے ان پر فالج کا ایک ہوا تھا اور اس کے بعد سے انہیں مستقل توجہ کی ضرورت رہنے لگی تھی۔ بیٹا کاروبار میں پھنسا رہتا تھا اور بہو کی کچھ سوشل مصروفیات تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ ان کے معمول کو اپ سٹ کر کے اپنا پابند بنانا زیادتی ہوگی، چنانچہ وہ یہاں آ گئیں۔ یہاں انہیں ہمہ وقت توجہ بھی میسر ہے اور ہم مردوں کا ساتھ بھی ملتا رہتا ہے۔“

”خاصی باہمت خاتون ہیں۔“ منصور نے ستائی انداز میں کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ عقیلہ نے تائید کی۔ ”شوہر کی اچانک وفات کے بعد جس قسم کے حالات سے وہ گزری ہیں، ان کا مقابلہ کرنا انہی کا جگر ہے۔“

منصور اس ان دیکھی ہستی سے متاثر ہونے لگا تھا۔ بیگم چغتائی کی شخصیت ابھی تک اس کے لیے بے چہرہ تھی لیکن اس کا تصور اس بے چہرہ شخصیت کے گرد ایک نورانی ہالہ پھیلا رہا تھا۔ جو لوگ خود کچھ کر دکھانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں، وہ ایسی شخصیات کو فوراً سے پیشتر اپنا رول ماڈل بنا لیتے ہیں۔ منصور کی کیفیت بھی اس وقت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔

”چائے لیجیے، منصور صاحب۔“ عقیلہ رحیم نے اس کے خیالات کا تسلسل ابتدا میں ہی توڑ دیا۔ منصور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عقیلہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”آپ نے اپنے لیے چائے نہیں بنائی؟“ منصور نے پوچھا۔

”نہیں شکریہ!“ عقیلہ رحیم نے کہا۔ ”میں آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی چائے پی چکی ہوں۔ ویسے بھی بیگم چغتائی آنے والی ہوں گی۔ وہ شاید آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہیں۔“

اور اسی وقت جیسے عقیلہ رحیم کے اندازے کی تصدیق میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا اور تھوڑی دیر پہلے چائے لانے والی خادمہ ایک ڈبل چیئر کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

منصور کو غائبانہ طور پر بیگم چغتائی کی ہستی سے متاثر ہوا تھا لیکن ان کی بے چہرہ شخصیت کو خود خال سے مزین کرنے کی اسے مہلت نہیں ملی تھی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ ایک متاثر کن شخصیت کے حوالے سے وہ ان کا جو بھی خاکہ بناتا، وہ یقیناً حسین رنگوں سے سجا ہوا ہوتا اور بیگم چغتائی کی بے رنگ شخصیت حسن سے یکسر خالی تھی۔ دلکش تصورات کے وہ محل جو منصور نے ابھی کھڑے بھی نہیں کیے تھے، بیگم چغتائی کی صورت دیکھ کر وجود میں آنے سے پہلے ہی عدم کو کل بھاگے۔

بیگم چغتائی کی عمر ویسے تو ستر سے متجاوز تھی لیکن وقت کی گھلت درخت نے اس عمارت کو کچھ زیادہ ہی بری طرح ڈھادیا تھا۔ جھریوں بھرا چہرہ، تنگ اور قد رے ابھرا

ہوا مانتا تھا، جس سے اوپر تھوڑی دیر پہلے کے غسل سے بھیگ کر خشک ہوتے ہوئے ڈھائی بالوں کا پلستر تھا۔ استخوانی جسم پر سفید ریشم کی ساڑھی یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے مردے کے جسم پر کفن۔ فوج کے زیر اثر دایاں بازو و پہلو سے چپک گیا تھا۔ دائیں آنکھ خفیف سی جھری کی صورت دانتی لیکن چپک اور نور سے محروم۔ پتھر ایا ہوا جڑا دائیں طرف سے قدرے میڑھا تھا جس سے بادی النظر چہرہ پچکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ منصور نے ایسی صورت دیکھی تھی جس نے ایک سینکڑ میں اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش میں کپ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بھاگتا تھا۔

خادمہ ڈبل چیئر کو چلاتے ہوئے آگے لائی اور منصور کے سامنے کھڑی کر کے انہی قدموں پر واپس ہو گئی۔ عقیلہ رحیم خاموشی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ بیگم چغتائی کا رخ آہستہ آہستہ اس کی طرف ہوا۔ ان کے ہونٹ دائیں طرف سے چپکے ہوئے تھے اور حرکت سے قاصر چنانچہ منہ کا بایاں گوشہ حرکت میں آیا، کھلا اور غرغراتی ہوئی تقریباً قائل فہم آواز برآمد ہوئی۔

عقیلہ رحیم نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ منصور کی سمجھ میں خاک نہیں آیا تھا کہ بیگم چغتائی نے اسے کیا ہدایت کی ہے۔ جب وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تو منصور کو پتا چلا کہ بیگم چغتائی نے اسے باہر جانے کو کہا تھا۔ وہ ابھی تک بیگم چغتائی کی دید کے دھچکے سے سنبھل نہیں سکا تھا۔ ساکت کھڑا عقیلہ رحیم کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اسے احساس ہوا کہ عقیلہ رحیم کے جانے کے بعد بیگم چغتائی کی اکلوتی متحرک آنکھ اس پر مرکوز ہو گئی ہے۔

ان کے نصف زندہ دہانے نے ایک دفعہ پھر حرکت کی۔ ان کے حلق کی گہرائی سے ایک آواز نکلی۔ منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں سر ڈبوئے، دور کے ڈھول سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اٹھلے پانی میں تیرتی ہوئی پھلی کو باہر کی آوازیں یقیناً کچھ اسی طرح سنائی دیتی ہوں گی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پایا، احمقوں کی طرح کھڑا بیگم چغتائی کی شکل دیکھتا رہا۔

بیگم چغتائی کے منہ کا بایاں گوشہ کھینچ سا گیا تھا۔ دہانے کے گرد گھٹی ہوئی لکیروں کا جال متلاطم ہوا اور ہولے ہولے تھر تھرانے لگا۔ وہ مسکرا رہی تھیں یا اپنے تئیں مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے منہ سے الفاظ تو خیر کیا، ان کا قیہ ایک دفعہ پھر برآمد ہوا اور رنہ رنہ سنبھلا ہوا، آپے میں آتا ہوا منصور کسی حد تک ان کی بات سمجھنے میں

کا سیاب ہو گیا۔ بیگم چٹائی اسے بیٹھنے کو کہہ رہی تھیں۔
خود پر قابو پا کر وہ بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں بیگم چٹائی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نظارہ کو خوشگوار نہ کسی مگر مسکراتے ہوئے والا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دیو مالائی کہانیوں کا کوئی کردار زندہ ہو کر اس کے سامنے آ بیٹھا ہو۔
آدھا پتھر، آدھا گوشت پوست، آدھا جیٹا جاگتا اور متحرک، آدھا جامد اور بے جان۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عملی زندگی کے پہلے موڑ پر ہی اس کا ساقبہ ایسی ہستی سے پڑے گا جسے دیکھ کر ایک لمحے کو بصارت پر سے اعتبار اٹھ جائے گا جو حقیقی ہوتے ہوئے بھی غیر حقیقی معلوم دے گی۔

پھر اچانک اسے یاد آ گیا کہ وہ یہاں بیگم چٹائی کو گھورنے نہیں بلکہ ایک پیشہ ورانہ فریضہ انجام دینے آیا تھا۔
یہ ایک وہ حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ بیگم چٹائی کی صورت و شخصیت جیسی بھی تھی، وہ اس کی ہونے والی سواکھ تھی۔ وہ ان کی زندگی کے ایک اہم کام کا بیڑا اٹھانے آیا تھا۔ اسے یوں کم مہم پا کر وہ اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گی۔ شخصی تاثر.....! اور وہ ہوش میں آ گیا۔

لکیروں کا جال اب بھی ہولے ہولے تر تر رہا تھا۔ بیگم چٹائی یقیناً اس کی کیفیت سے محفوظ ہو رہی تھیں۔ ان کا رد عمل اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصا انوکھا تھا۔ اکثر لوگ اپنی شکل و صورت کے متعلق دوسروں کے منہ کی بات کو دل پر لے لیتے ہیں۔ افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں یا زبان چلانے پر اتر آتے ہیں۔ بیگم چٹائی کا رد عمل مختلف اور مثبت تھا۔ اس کی دوسری وجوہات ہو سکتی تھیں۔ تجربات کی بھٹی میں پک کر ان کا شعور اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ایسی سٹیلی اور کسی حد تک ناگزیر باتوں پر انہیں رنج نہیں ہوتا تھا یا گزشتہ سات سال سے اپنی صورت پر دوسروں کا رد عمل دیکھ دیکھ کر انہیں اس کی عادت ہو گئی تھی۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ بہر حال مثبت ہی نکلا تھا۔

”مٹانی چاہتا ہوں بیگم صاحب! دراصل.....“ منصور نے مٹانی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن بیگم چٹائی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات کاٹ دی۔

”خواتن! وہ پریشان مت ہو، مسٹر منصور۔“ انہوں نے حسب سابق الفاظ کا قیہ کیا۔ ”میں ایسی باتوں کا برا نہیں مناتی۔“

منصور نے سر ہلایا۔ ”انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“
”لیکن انسان ایسا ہوتا نہیں۔“ بیگم چٹائی نے کہا۔
”آپ خود ہی بتائیے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے، آپ کی

صورت کسی ناگہانی حادثے میں بے صورت ہو جاتی تو کیا آپ تقدیر کی یہ زیادتی خوش دلی سے قبول کر لیتے؟“ وہ مسلسل بات نہیں کر سکتی تھیں۔ چہرے کے عضلات کو حرکت میں لانا یقیناً ان کے لیے ایک تکلیف دہ عمل رہا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بات رک رک کر ادا کرتی تھیں۔ منصور کی سماعت ان کے لہجے سے تیزی سے ہم آہنگی حاصل کر رہی تھی اور اب وہ ان کی بات پہلے سے کہیں بہتر انداز میں سمجھ رہا تھا۔

”قول کرنا ہی پڑتا ہے۔“ اس نے محتاط انداز میں کہا۔
”یہی ساری بات ہے۔“ بیگم چٹائی نے کہا۔ ”جبر اور اختیار کا مسئلہ..... اگر تقدیر کوئی جبر کرتی ہے تو یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ اسے رد کر قبول کر لیں یا نہیں کر۔ میں نہیں تو نہیں سکتی لیکن اتنا ہے کہ رد تو بھی نہیں۔“ منصور کچھ اور متاثر ہوا، بیگم چٹائی کی بات جاری تھی۔

”نیاری اور تندرستی ایسے عوامل ہیں جن پر ہمارا اختیار بہت کم ہوتا ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے کڑھنے اور عم زدہ ہونے سے میرے مفلوج بدن میں جان نہیں پڑے گی۔ میں اپنی جسمانی حالت کا ذمے دار کسی کو نہیں ٹھہرا سکتی۔“

منصور یہ جواب سن کر تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔
بیگم چٹائی کی جسمانی حالت نے بے شک اسے 440 دولت کا جھٹکا دیا تھا لیکن ان کی باتوں نے جسکے کا اثر بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔

”ماشاء اللہ بڑی اعلیٰ سوچ رکھتی ہیں آپ۔“ اس نے آخر کار کہا۔

بیگم چٹائی کا سر ایک دفعہ جھکا پھر اوپر کو گیا۔ وہ منصور کے ستائشی کلمے کو قبول کر رہی تھیں پھر انہوں نے کہا۔ ”آپ کی بات اپنی جگہ درست لیکن بہر حال میں ایک انسان ہوں۔ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر رنج اور تکلیف محسوس کرنا اور اس کا بدلہ چکانے کی خواہش رکھنا یہ حیثیت انسان میری فطرت ہے۔ تقدیر سے تو میں نہیں لو سکتی لیکن اگر کسی انسان کی طرف سے مجھ پر کوئی ظلم اور زیادتی ہو تو اس کا حساب بے باق کرنے کی کوشش تو کر سکتی ہوں۔ آپ کو یہاں میں نے اسی لیے بلوایا ہے۔“

منصور کے چہرے پر ابھرنے لگا ہوا۔ ”میرے علم کے مطابق آپ شاید اپنی وصیت تیار کروانا چاہتی ہیں۔“
”آپ کو یہاں بلوانے کا بنیادی مقصد تو یہی ہے۔“ بیگم چٹائی نے کہا۔ ”لیکن ایک بات اور بھی ہے

جس کا تذکرہ فون پر قطعی مناسب نہ رہتا۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سے آنے سانسے تفصیلی گفتگو ہو جائے تاکہ میں معاملے کی اچھی طرح وضاحت کر سکوں۔“

”جی، میں سن رہا ہوں۔“

”بات شاید آپ کے لیے کچھ غیر متوقع ہو۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”یوں سمجھ لیجئے کہ میں کسی سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔“

منصور کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ ایک لمحے کو وہ بھول گیا کہ اسے یہاں کیا کہہ کر بلوایا گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہنگامہ خیز ناول کا کردار بن گیا ہے۔ وہیل چیئر کی قیدی بڑھیا، بد طینت ولن، سچائی کا علمبردار نوجوان یعنی وہ خود۔

اس کے ہونٹ خود بخود ہلے۔ ”کس سے بدلہ لینا چاہتی ہیں آپ؟“

”ان لوگوں سے جن کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچی ہوں۔“

”کون لوگ ہیں وہ؟“

”میرا بیٹا اور میری بہو۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔

منصور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بات واقعی اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ ”آپ کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟“

”تفصیل بہت عام سی ہے۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔

”آپ نے ایسے واقعات سنے ہوں گے اور شاید دیکھے بھی ہوں۔ میری بہو کو اور اس کی نسبت سے میرے بیٹے کو گھر میں میرا وجود ناگوار گزارتا تھا اس لیے میری بیماری کا بہانہ بنا کر مجھے یہاں پہنچا دیا گیا۔“

”آئی سی۔“ منصور نے کہا۔ ”آپ ان کے خلاف کیس کرنا چاہتی ہیں؟“

”نہیں، میں اس ملک میں قانونی عمل کی رفتار سے واقف ہوں۔ ایسے کسی کیس کی شنوائی ہونے کی نوبت آنے تک عین ممکن ہے میں اگلے جہان پہنچی چکی ہوں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”اور کیس کرنے کی ضرورت بھی، میرے خیال میں پیش نہیں آئے گی۔“

”تو پھر؟“

بیگم چغتائی نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولیں۔ ”آگے بڑھنے سے پیشتر میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔“

”فرمائیے؟“

بیگم چغتائی کی اکلوتی متحرک آنکھ کمرے کے

درو دیوار پر گھوم گئی۔ ”مجھے اس جگہ آئے چھ سال ہو چکے ہیں۔ پہلا ایک سال میں نے امید و بیم کی کشمکش میں گزارا کہ شاید میرے بیٹے کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے شاید وہ اس..... اس تکلیف کا ازالہ کر دے جو اس کے ہاتھوں مجھے پہنچی ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بیٹے کی مرضی یہی ہے کہ میں ان دیواروں میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کی خواہشات کا لقمہ تر نہیں بنوں گی۔ شوہر کی وفات کے بعد ساری پر اپنی اور کاروبار میرے نام منتقل ہو گیا تھا۔ آج بھی ہر چیز میرے نام ہے۔ میرے بیٹے نے میری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے ایک جنرل پاور آف اٹارنی پر انگوٹھا لگوایا اور ہر چیز کا مختار بن بیٹھا لیکن اس پاور آف اٹارنی کو منسوخ کرنے کا اختیار میرے پاس آج بھی ہے۔ اس مقصد کے لیے مجھے قانونی مدد کی ضرورت تھی اور یہ مدد حاصل کرنے کی کوشش میں، میں نے پچھلے پانچ سال میں آٹھ وکیلوں سے رابطے قائم کیے۔ آپ سے پہلے آٹھ وکیل یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں۔ آپ یہاں آنے والے نوں وکیل ہیں۔“

منصور کی بھویں سکڑ گئیں۔ ”اور وہ آٹھ وکیل کہاں گئے؟“

لکیروں کا جال ایک بار پھر متلاطم ہوا۔ بیگم چغتائی مسکرا رہی تھیں لیکن اس مرتبہ اس ادھوری مسکراہٹ میں کئی کا مکمل تاثر تھا۔

”ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہیں آیا۔“ انہوں نے کہا۔

”جی.....“ منصور نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔ ”کوئی ایک بھی واپس نہیں آیا؟“

”جی ہاں، ایک بھی نہیں۔“ بیگم چغتائی نے تصدیق کی۔

”لیکن اس کی وجہ؟“

”میں نہیں جانتی۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”اور میرے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ میں نے ان سے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔ ایک نے مصروفیت کا بہانہ بنایا۔ چار نے اپنی سگریٹرز کے ذریعے ٹال دیا اور تین ایسے تھے جنہوں نے کوئی وجہ بتائے بغیر سیدھا سیدھا انکار کر دیا۔“

”لیکن کیوں؟ آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔“ منصور کی حیرت اور بڑھ گئی۔

”میں نے کہا نا، اگر کوئی وجہ تھی بھی تو مجھے اس کا علم

نہیں۔" بیگم چغتائی نے کہا۔ "اگر میری براہ راست ان سے بات ہوئی ہوتی تو شاید کچھ پتا چل سکتا لیکن اس حالت میں....."

"آپ نے خود رابطہ نہیں کیا تھا ان سے؟"

لکیریں پھر تھر تھرا گئیں۔ "جب سامنے بیٹھ کر بھی آپ کو میری بات سمجھنے میں اتنی مشقت کرنا پڑ رہی ہے تو فون پر کسی کے کچھ سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا بات کرنا بالکل لا حاصل تھا۔"

"اوہ معافی چاہتا ہوں۔" منصور نے جلدی سے کہا۔ "پھر آپ کی جگہ رابطہ کون کیا کرتا تھا؟"

"جس نے آپ سے رابطہ کیا تھا۔" بیگم چغتائی نے کہا۔ "عقیلہ!"

"مس عقیلہ کی یہاں کیا پوزیشن ہے؟" منصور نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"مسز عقیلہ!" بیگم چغتائی نے تصحیح کی۔ "عقیلہ یہاں ڈے ٹائم سپروائزر ہے۔ ہم دونوں نے آگے پیچھے ہی اس جگہ قدم رکھا تھا۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے اسے میرے لیے ہی یہاں بھیجا تھا۔ سپروائزر ہونے کی حیثیت سے حالانکہ اس کے سر پر بہت سی ذمے داریاں ہیں لیکن وہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس کی مستعدی اور تندہی دیکھ کر مجھے وہ دور یاد آ جاتا ہے، جب میں گھر اور کاروبار کی ذمے داریاں ایک ساتھ سنبھالنے ہوئے تھی۔ پھر وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتی ہے اور میرے معاملات میں کبھی بے جا دخل اندازی نہیں کرتی۔ اس کی کم گوئی مجھے بہت پسند ہے۔"

عقیلہ رحیم اور کم گو..... منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گدی پر کسی نے چھکی دی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا تھا۔

بیگم چغتائی کی بات جاری تھی۔ "بے چاری بہت مجبور ہے۔ شوہر دل کا مریض ہے، زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی گریجویشن کر رہے ہیں اور چھوٹا بیٹا پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ میں ہے۔ اوپر سے آج کے دور کی مہنگائی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ یہ پوجہ کیسے اٹھاتی ہوگی۔ میں اپنے ماہانہ الاؤنس سے کچھ رقم دے دیا کرتی ہوں حالانکہ وہ خاصی جھجک کا مظاہرہ کرتی ہے ہر بار۔"

بیگم چغتائی کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عقیلہ رحیم کو بہت پسند کرتی ہیں لیکن منصور کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ بات دوسری طرف نکلتی دیکھ کر اس کی سمجھ میں

کچھ اور نہ آیا تو اس نے یونہی بیگم چغتائی کی بات اچک لی۔ "آپ کو ماہانہ الاؤنس ملتا ہے؟"

افرا تفری میں چلایا ہوا تیر نشانے پر بیٹھا۔ بیگم چغتائی کا بھٹکتا ہوا ذہن کھٹ سے راہ راست پر آ گیا۔ ایک لمحے کو وہ چپ رہیں جیسے غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جانے والی اس حقیقت کا دانستہ اظہار ان کے لیے تکلیف دہ ہو۔ منصور اس تکلیف کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب دینے کے عادی لوگوں کو کسی سے کچھ لینا پڑے تو انہیں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ بیگم چغتائی گفتگو کی رو میں بہہ کر یہ بات بتا تو بیٹھی تھیں لیکن اس پر مزید لب کشائی کے لیے انہیں اپنی ہمت مجتمع کرنا پڑ رہی تھی۔

"جی ہاں، ماہانہ الاؤنس۔" بالآخر انہوں نے کہا۔ "میرے فرمانبردار، خدمت گزار بیٹے نے میرے آرام و آسائش کی خاطر دس ہزار روپے ماہانہ الاؤنس یعنی وظیفہ مقرر کر رکھا ہے۔ جب میں چغتائی انٹر پرائز کی ورکنگ فینجنگ ڈائریکٹر تھی تو اپنے جنرل منیجر کے اسٹنٹ کو اس سے زیادہ تنخواہ دیا کرتی تھی۔"

منصور دولت مندی کے اس اظہار سے متاثر ہوا لیکن یہ نوٹس نہ کر سکا کہ یہ جملے ادا کرتے ہوئے بیگم چغتائی کے لہجے میں کیسی تیز دھار اتر آئی تھی۔

قدرے توقف کے بعد بیگم چغتائی نے کہا۔ "مجھے اپنے بیٹے سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔ آخر میرے بعد یہ سب اسی کا تو ہے۔ اگر وہ میری زندگی میں ہی اپنا حق طلب کرتا تو شاید میں انکار بھی نہ کرتی۔ مجھے افسوس ہے اور غصہ ہے تو صرف اس بات کا کہ میرے بیٹے نے یہ سب کچھ اپنی مرضی کے تحت نہیں بلکہ اپنی بیوی کے اشاروں پر ناپتے ہوئے کیا۔"

تھوڑی دیر پہلے بیگم چغتائی کو دیکھ کر منصور یہ سمجھا تھا کہ اس سے زیادہ بد صورت چہرہ اس نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جب غصے نے اس جزوی مسخ چہرے کے خدو خال میں اتر کر اسے کلی مسخ کرنا شروع کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ جیسے حسن کی کوئی انتہا نہیں، ویسے بد صورتی بھی لا انتہا ہے۔

بیگم چغتائی کے ہونٹ سختی سے بھنج گئے تھے، غصے سے ان کا بدن ہولے ہولے جھٹکے کھارہا تھا۔ سانس برقی آری کی طرح چلنے لگی تھی اور ضبط کرنے کی کوشش میں گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ اپنی بہو کے لیے ان کے دل میں جو نفرت تھی، منصور اس کی زہرناکی کا تھوڑا بہت اندازہ کر سکتا تھا۔ بیگم چغتائی کی متغیر حالت دیکھ کر اسے تشویش

لاحق ہونے لگی۔ اس نے تیزی سے کہا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا، بیگم صاحبہ؟“

بیگم چغتائی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی اور وہیل چیئر کے ہتھے پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ پائے کے ساتھ جڑا ہوا بزر چیتا تو پہلی بار منصور کی نگاہ اس پر پڑی اور اسے ہتا چلا کہ وہیل چیئر کے پائے کے ساتھ ایک بیٹری پاورڈ بزر لگا ہوا ہے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور عقیلہ رحیم اندر آ گئی۔ بیگم چغتائی کی حالت دیکھ کر وہ ایک لفظ کہے بغیر اپنے قدموں باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا جس پر ڈھکی پرچ پر زرد رنگ کی ایک گولی نظر آرہی تھی۔ منصور گولی کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کے والد بھی اپنے بلڈ پریشر کو اعتدال پر لانے کے لیے یہ گولیاں کھایا کرتے تھے۔

عقیلہ رحیم نے گولی بیگم چغتائی کے منہ میں ڈال کر گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورے جسم سے ان پر جھکی ہوئی تھی اور دھیمے سروں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ منصور یہ تو نہ سن پایا کہ عقیلہ رحیم کیا کہہ رہی ہے لیکن بیگم چغتائی کی حالت بہتر ہوتے دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ عقیلہ رحیم کے الفاظ انہیں بر سکون کرنے کا سبب بنے ہیں۔ ہتا چلتا تھا کہ عقیلہ رحیم، بیگم چغتائی کے مزاج سے بہت اچھی طرح آشنا ہے اور یہ بھی کہ بیگم چغتائی اسے خود سے بہت قریب تصور کرتی ہیں۔

وہ خاموش بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم چغتائی کے بدن کی لرزشیں ٹھہریں تو عقیلہ پھر باہر نکل گئی اور بیگم چغتائی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”آئی ایم سوری۔“

”انس آل رائٹ۔“ منصور نے فوراً انگلستانی آداب کا تقاضا پورا کیا۔

”جب بھی اس عورت کا خیال آتا ہے، میرے تن بدن میں آگ کی سی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”میرے بیٹے کو اپنے جال میں پھنسا کر اس حرافہ نے ایسا باندھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف مل بھی نہیں سکتا۔ میں نے فاران کو منع بھی کیا تھا..... مجھے اسی روز سے اس کے تیور پسند نہیں آئے تھے جب فاران اسے پہلی بار مجھ سے ملانے کے لیے لایا تھا۔ اس کے چہرے سے خراش پن نکلتا تھا، وہ عمر میں بھی فاران سے بڑی تھی۔ تھوڑا بہت نہیں پورے پانچ سال کا فرق ہے۔“

میں سمجھتی رہی کہ کچی عمر کا نشہ ہے چند دن میں فاران کے سر سے یہ بھوت اتر جائے گا لیکن وہ بھی جانتی تھی کہ میں نے اسے ناپسند کر دیا ہے اور میں اپنے گھر میں اس کا داخلہ کبھی برداشت نہیں کروں گی اسی لیے اس نے ایسا چکر چلایا کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور فاران کورٹ میرج کر کے اسے گھر لے آیا۔ خاندان کی عزت کے خیال سے مجھے خاموش رہنا پڑا۔“

منصور خاموشی سے سن رہا تھا۔ بیگم چغتائی کو یا خود سے کہہ رہی تھیں۔ ”میں پھر بھی اسے برداشت کر لیتی لیکن پہلے روز سے ہی وہ میری جگہ لینے کے خواب دیکھنے لگی۔ خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھی اس لیے فاران کو آگے کرنا چاہا۔ فاران میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ براہ راست مجھ سے ایسی بات کہہ سکتا کہ ماں بہت ہو چکی، اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علیحدہ ہو جائیں..... لیکن میں بھی سمجھ رہی تھی۔ اس کی باتوں کے پوشیدہ معنی، اس کے ڈھکے چھپے اشارے کہ اب مجھے آرام کرنا چاہیے، اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور ڈھلتی صحت کو پیش نظر رکھ کر خود پر بوجھ کم کر لینا چاہیے۔ میں سب سمجھ رہی تھی..... میرا بیٹا، میرا خون مجھے مشورے دے رہا تھا کہ میں نے جس کا رو باری سلطنت کو اپنا خون پلا کر پروان چڑھایا ہے، اسے چھوڑ کر ایک گوشے میں بیٹھ جاؤں تاکہ وہ اور اس کی شیطان بیوی من مانیاں کر سکیں۔ فاران کی عمر صرف دو سال تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ انیس برس تک میں نے اپنے گھر اور اپنے شوہر کے بزنس کو سنبھالنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کی۔ کوئی اس وقت کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو فاران کے جوان ہونے تک مجھ پر گزرا۔ دفتر جاتی تو دل گھر میں اٹکا رہتا تھا کہ میرا بچہ نوکروں کے رحم و کرم پر گھر میں اکیلا ہے اور گھر آتی تو دفتر کی پریشانی لگی رہتی تھی۔ گھر اور باہر کی دنیا کو ملائے رکھنے کے لیے جس پل صراط پر میں چلتی رہی ہوں، جن کٹھنائیوں سے میں گزرتی رہی ہوں، کوئی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

منصور کا دل گھبرا رہا تھا۔ نیم خام ذہن کے اس نوجوان نے زندگی کا یہ روپ بھی نہ دیکھا تھا۔ پہلی بار ایسی کچی سے پالا پڑنے پر اس کے ہاتھ ہر پھول رہے تھے۔ ابھی وہ نہیں جانتا تھا کہ دنیا کیسی بے ڈھب جگہ ہے اور یہاں سنبھل کر نہ چلنے والا کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ ابھی وہ ان حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار تو کیا آمادہ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیگم چغتائی کی موضوع سے ہٹی ہوئی گفتگو

اسے بے طرح گھبرائے دے رہی تھی۔

نے فیصلہ کر لیا کہ ایسی وصیت تیار کر کے جاؤں گی کہ میرے مرنے کے بعد وہ بھی اس گھر میں نہ رہ سکے جہاں سے مجھے اس کی وجہ سے نکال دیا گیا۔“

”آپ نے پہلے کوئی وصیت تیار نہیں کی تھی؟“ منصور نے سوال کیا۔

”جب تک صحت مند تھی کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”پھر فاج کا ایک ہوا، اس کے بعد میں یہاں آ گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ مجھ سے مل کر جانے والا کوئی وکیل لوٹ کر واپس نہیں آیا۔“

”آپ کی بات میرے لیے خاصی حیران کن ہے۔“ منصور نے کہا۔ ”وکیل پر ویشٹل لوگ ہوتے ہیں، ان کی طرف سے ایسی کوئی حرکت نا قابل فہم ہی قرار دی جاسکتی ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“ بیگم چغتائی نے بے بسی کا اظہار کیا۔ ”نہ میری دوبارہ ان سے ملاقات ہوئی اور نہ مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ملا۔“

منصور نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”خیر چھوڑیے اس بات کو، آپ مجھے یہ بتائیے کہ اب آپ کی خواہش کیا ہے؟“

”میں اپنی وصیت لکھوانا چاہتی ہوں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔

”وصیت کے مندرجات کیا ہوں گے؟“ منصور نے استفسار کیا۔ ”آپ کے ذہن میں کوئی خاکہ ہے؟“

”ہاں۔“ بیگم چغتائی نے بزرگ کاٹن دباتے ہوئے کہا۔ ”میں نے وصیت کا متن عقیلہ کوڈ کٹیٹ کروایا تھا۔ آپ وہ دیکھ لیجیے۔“

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے عقیلہ اندر آ گئی تھی۔ بیگم چغتائی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”عقیلہ، ذرا میرے کمرے سے وصیت کے متن والے کاغذات لے آؤ۔“

”جی بہتر۔“ عقیلہ مختصر سا جواب دے کر پھر باہر نکل گئی۔ منصور کو اس کے انداز پر حیرت ہو رہی تھی۔ بیگم چغتائی کی آمد سے پہلے کے مختصر سے وقفے میں یہ خاتون اس کا آدھا مغز چاٹ گئی تھی اور اب یوں آ جا رہی تھی جیسے اس جیسی چپ چاپ، کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون دنیا میں کوئی اور نہ ہو۔ اس کے رویے کی یہ تبدیلی منصور کے لیے حیران کن تھی لیکن آج کا دن

بیگم چغتائی بولتی رہیں۔ ان کی توجہ منصور سے یکسر ہٹی ہوئی، خلا میں کسی نقطے پر مرکوز تھی۔ ”جب تک میرا بس چلا..... جب تک میں کسی قابل رہی، میں نے اس عورت کو قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ اس کی ہر حرکت پر کڑی نگرانی رکھی۔ اس کے پھصلوں کو ان کی حد سے باہر نہیں نکلنے دیا لیکن جانے پھر کیوں قسمت نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ فاج کے ایک نے مجھے بے دست و پا کر کے اس وہیل چیئر کا قیدی بنا دیا۔ چھ ماہ تک بستر سے اٹھنا تو کیا ہلنا بھی نصیب نہ ہوا۔ اس حالت میں فاران کے نام پاور آف اٹارنی کی دستاویز پر انگوٹھا لگانا پڑا تا کہ میری عدم موجودگی میں وہ بزنس کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس وقت سے لے کر آج تک مجھے دفتر کی شکل دیکھنے کو نہیں ملی۔ ایک سال تک مجھے گھر پر ہی رکھا گیا پھر میری بہو نے فاران کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس نے مجھے گھر سے نکال کر یہاں لا ڈالا۔ میں مرتے دم تک وہ زہر بھری فاتحانہ مسکراہٹ نہیں بھول سکوں گی جو میں نے اپنی بہو کے ہونٹوں پر اس وقت دیکھی تھی جب مجھے یہاں منتقل کرنے کے لیے گاڑی میں لا دیا جا رہا تھا۔“ بیگم چغتائی کے نیم مفلوج منہ سے بہو کا لفظ کسی غلیظ گالی کی طرح نکلتا تھا۔ ”وہ دن اور آج کا دن، میں نے اس عمارت کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ تمام احباب اور ملنے جلنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوں۔ فاران کبھی کبھی مجھے یہاں آ کر مل جاتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں مطمئن ہوں۔ وہ نہیں جانتا کہ اگر مجھے اس کی رسوائی کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس حالت میں بھی اتنا شور مچاتی کہ پورا زمانہ میری آواز سننا۔ اس کی عزت کے خیال سے چپ ہوں، گھر کی بات کو باہر نہیں نکلنے دیا۔ ویسے بھی اس مفلوج جسم کے ساتھ میں زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوں۔ میری عمر اب رہ ہی کتنی گئی ہے۔ شاید وہ بھی چپ چاپ کاٹ جاتی لیکن..... جب بھی مجھے اس عورت کے ہونٹوں پر کھیلی مسکراہٹ نظر آتی ہے، فوج کا احساس یاد آتا ہے جو اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا تو میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں۔ فاران کی خاطر میں یہ قید، یہ توہین گوارا کر لیتی لیکن میں اس عورت کو اس گھر میں کبھی برداشت نہیں کروں گی..... کبھی نہیں۔“ بیگم چغتائی کا زندہ ہاتھ اس سختی سے وہیل چیئر کے ہتھے کو گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان کی پوروں سے سفیدی پھیلنے لگی تھی۔ ”اس لیے میں

ہی جانے کس رنگ میں چڑھا تھا کہ قدم قدم پر حیرتوں سے سامنا ہو رہا تھا۔

عقیدہ حسب سابق تھوڑی ہی دیر میں واپس آگئی۔ سرخ رنگ کی ایک آفس فائل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے فائل بیگم چغتائی کی طرف بڑھائی۔

”یہ منصور صاحب کو دے دو۔“ بیگم چغتائی نے اشارہ کیا۔

فائل منصور کے حوالے کر کے عقیدہ رحیم ایک بار پھر باہر نکل گئی۔ منصور فائل کھول کر اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ پہلے صفحے پر ایک ابطال نامے کی تحریر تھی جس کے ذریعے بیگم چغتائی نے اس جنرل پاور آف اٹارنی کو منسوخ کر دیا تھا جس کے بل پر ان کا بیٹا فاران چغتائی ان کے کاروبار اور اثاثہ جات کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کے بعد وصیت نامے کا متن شروع ہوتا تھا جس کی رو سے فاران چغتائی اپنے قانونی حق وراثت کے تحت بیگم چغتائی کی وفات کے بعد ان کے جملہ اثاثہ جات کا مالک ٹھہرتا تھا۔ ساتھ میں تمام چیزوں کی ایک اجمالی تفصیل تھی جو بیگم چغتائی کی موت کے بعد فاران کے حصے میں آتی تھیں۔ جملہ دستاویزات فل اسکیپ سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھی۔ منصور اچھی طرح عالم میں وصیت شروع سے آخر تک پڑھتا چلا گیا۔ کہیں بھی کسی قسم کی کوئی شرط، کوئی ابہام، کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔ منصور چکرا کر رہ گیا۔ آخر بیگم چغتائی کا مقصد کیا تھا؟

وصیت کے بعد آخری صفحے کی باری آئی اور یہ صفحہ منصور کی گڑبڑا ہٹ میں مزید اضافہ کرنے کا موجب بنا۔ چند سطروں کی مختصر سی تحریر تھی۔ اس تحریر کی رو سے بیگم شاہانہ چغتائی نے اپنے بیٹے منصور چغتائی کو بوجہ نافرمانی و سرکشی اپنی تمام جائیداد سے عاق کر دیا تھا اور اس کے کسی بھی آئندہ قول و فعل سے لا تعلقی کا اعلان کیا تھا۔

بات صاف ہونے کے بجائے مزید الجھ گئی۔ ایک طرف تو بیگم چغتائی اپنا تمام تر منقولہ و غیر منقولہ مال و اسباب اپنے بیٹے کے نام چھوڑے جارہی تھیں اور دوسری طرف انہوں نے اپنے ہر دنیاوی اثاثے سے اس کا تعلق منقطع کر دیا تھا۔ آخر بیگم چغتائی کا مقصد کیا تھا؟

فائل بند کرتے ہوئے اس نے اچھی ہوئی نگاہوں سے بیگم چغتائی کی طرف دیکھا۔ ان کے نیم بگڑے چہرے پر اطمینان تھا۔ منصور کو اپنی طرف متوجہ پا کر ان کی آنکھیں چمکیں اور لکڑیوں کا جال ہولے سے ٹھہرا دیا۔ منصور کی

حیرت یقیناً انہیں محفوظ کرنے کا باعث بنی تھی۔

منصور کے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے کہا۔ ”آپ کچھ الجھ گئے شاید؟“

منصور نے کچھ کہنے کے بجائے محض فائل سے اشارہ کرنے پر اکتفا کیا۔

”آپ کا رد عمل میرے لیے نیا نہیں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”ویسے آپ کا خیال کیا ہے؟“

”کس معاملے میں؟“ منصور نے کہا۔

”ان دستاویزات کے معاملے میں جو ابھی ابھی آپ کی نظر سے گزریں؟“ بیگم چغتائی نے فائل کی طرف اشارہ کیا۔

”ابطال نامہ تو ایک ضروری دستاویز ہے، اس کی غرض و غایت سمجھ میں آتی ہے۔“ منصور نے کہا۔ ”لیکن جہاں تک آپ کی وصیت اور اس عاق نامے کا سوال ہے، سچی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے متعلق ایک ہی فرد کی طرف سے، بیک وقت ان کا اجرا میرے سر سے گزر گیا ہے۔ یہ دونوں ایک اعتبار سے ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔ بیک وقت اپنے بیٹے کے نام تمام ترکہ چھوڑ کر جانے اور اسے اپنی تمام جائیداد سے عاق کر دینے کی کوئی تک، اگر ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”میں آپ کی ذہنی کیفیت بخوبی سمجھ رہی ہوں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”دراصل غلطی میری ہی ہے۔ گفتگو کی رو میں میرے منہ سے نکل گیا کہ میں اپنے بیٹے سے بھی انتقام لینا چاہتی ہوں۔ شاید لاشعوری طور پر میں اپنے مقصد کو زیادہ ڈرامائی بنا کر پیش کرنا چاہتی تھی۔ انصاف کی نظر سے، یا شاید ایک ماں کی نظر سے دیکھا جائے تو قصور وار میرا بیٹا نہیں، میری بہو ہے۔ میں اپنی بہو کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتی ہوں جو اس نے میرے ساتھ کیا۔“

”دوسرے لفظوں میں آپ چاہتی ہیں کہ جس گھر سے اس کی وجہ سے آپ کو نکال دیا گیا، وہ بھی اس گھر میں نہ رہ پائے۔“ منصور نے بیگم چغتائی کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

”درست کہا آپ نے۔“

”اس کے باوجود.....“ منصور نے ایک دفعہ پھر فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اس وصیت اور عاق نامے کی ایک جگہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”میں اس کی وضاحت کرتی ہوں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں اپنے بیٹے کی تمام

تر خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود آج بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میری وجہ سے وہ ہر اس چیز سے محروم ہو جائے جو اس کا قانونی اور بنیادی حق ہے۔ اگر میرے بیٹے کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی تو مجھے مرنے کے بعد بھی چین نہیں ملے گا۔ اگر اس کے ہاتھوں میرے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی بھی تو اس میں کچھ قصور میرا بھی ہے۔ اگر میں اس کی پسند پر سمجھوتا کر لیتی تو شاید حالات یہ صورت اختیار نہ کرتے۔ میرے سخت رویے کی وجہ سے میرا بیٹا مجھ سے متنفر ہوتا گیا اور رہی سہی کسر اس عورت کی ریشہ دوانیوں نے پوری کر دی۔ میرا حقیقی مجرم میرا بیٹا نہیں، اس کی بیوی ہے۔ جب وہ اس کا پیچھا پھوڑ دے گی تو مجھے بھی سکون مل جائے گا۔“

”لیکن ان دستاویزات کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“ منصور نے اپنی آواز کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ بیگم چغتائی کی باتوں نے بے چینی کا جو احساس پیدا کیا تھا وہ اب آہستہ آہستہ جھلپٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

”ان کا تعلق میرے بیٹے سے ہے۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”جب آپ ان دونوں دستاویزات کو تیار کروا کر میرے پاس لائیں گے تو ان پر دستخط کرنے سے پہلے میں اپنے بیٹے کو ان پر ایک نظر ڈالنے کا موقع دوں گی۔ فیصلے کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اگر وہ میری بات تسلیم کر لیتا ہے تو میں وصیت نامے پر دستخط کر کے عاق نامے کی دستاویزات ضائع کر دوں گی۔ بصورت دیگر اگلے روز کے اخبار میں یہ عاق نامہ شائع ہو جائے گا۔“

”آپ کا مطالبہ کیا ہوگا؟“

”یہی کہ مجھے گھر واپس لے جائے اور میری آنکھوں کے سامنے اس عورت کو طلاق دے کر گھر سے نکال دے۔“ بیگم چغتائی کا مسخ شدہ لہجہ بھی اتنا عام سا تھا کہ منصور کے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ بیگم چغتائی نے کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”اور اگر آپ کے بیٹے کا رد عمل آپ کی توقع کے برعکس نکلا؟“

”کیروں کا جال پھر تلاطم آٹا ہونے لگا۔“ میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں منصور صاحب۔ اگر وہ دل کا اتنا مضبوط ہوتا تو نوبت یہاں تک کبھی نہ پہنچتی۔ وہ اس آرام و آسائش کی زندگی سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کی طرف سے پاور آف اٹارنی کی منسوخی کا نوٹس ملتے ہی وہ میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔ ممکن ہے

میری طرف.... آنے سے پہلے وہ آپ سے ملاقات کرنا پسند کرے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ایسے کسی سرپرست و زٹ کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں گے۔“

منصور نے ہاتھ جھٹکا جیسے ایسے وزٹس سے نمٹنا اس کے معمول کا حصہ رہا ہو۔ ”آپ اس کی پروا مت کیجیے۔“ اس نے کہا۔ ”ان دستاویزات کی تکمیل کے لیے ہمیں دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ آپ کے پاس ایسے افراد موجود ہیں۔“

”مل جائیں گے۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”اس ادارے کے اسٹاف سے ہی مل جائیں گے۔“

منصور نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور چونک گیا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ بیگم چغتائی سے باتوں میں کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اس نے اپنا چرمی ونڈ بیگ کھول کر اس میں سے وکالت نامہ نکالا۔ ”آپ اس پر دستخط کر دیجیے۔“ اس نے بیگم چغتائی سے کہا اور جیب سے قلم نکالنے لگا لیکن بیگم چغتائی نے اسے روک دیا۔

”اسے رہنے دیجیے۔ اگر انک پیڈ ہو تو وہ دیجیے۔ میں دستخط نہیں کر سکتی۔ انگوٹھا لگانا پڑے گا، وہ بھی بایاں۔“

ہر نئے موکل سے ملنے کے لیے جاتے وقت ایسے لوازمات ساتھ لے کر جانا وکلا کا دستور ہوتا ہے۔ منصور نے خاموشی سے انک پیڈ نکال کر کھولا اور وکالت نامے سمیت بیگم چغتائی کے سامنے رکھ دیا۔ بیگم چغتائی قدرے وقت کے بعد انگوٹھا لگانے میں کامیاب ہوئیں۔ ان کے صحت مند ہاتھ پر بھی ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔

انگوٹھا لگوا کر منصور نے دونوں چیزیں وصیت نامے اور عاق نامے کی دستاویزات پر مبنی فائل سمیت بیگم میں ڈالیں اور اسے بند کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی۔ ایک دو دن میں، میں آپ کے بیٹے کو پاور آف اٹارنی کی منسوخی کا نوٹس بھجوا دوں گا اور وصیت نامے اور عاق نامے کی دستاویزات بھی آپ کے ملاحظے کے لیے لے آؤں گا۔ تب تک کے لیے اجازت۔“

”ایک بات کا خیال رکھیے گا مسٹر منصور۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”اس فائل کے مندرجات میں میرے بیٹے کے گھر اور آفس دونوں کا پتا موجود ہے۔ منسوخی کا نوٹس اس کے آفس کے پتے پر بھجوا دیے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ نوٹس میرے بیٹے سے پہلے اس کی بیوی کے ہاتھ میں پہنچ جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ پہلا جھٹکا براہ راست میرے بیٹے کو پہنچے

اور اس کے اثرات اس کی ہیوی تک منتقل ہوں۔“

منصور کی بد مزگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنے تئیں یہاں قانون اور انصاف کی سر بلندی کے لیے اپنے پہلے موکل کو ڈیل کرنے کے لیے آیا تھا۔ کسی خاندانی سازش میں فریق بننے نہیں۔ بیگم چغتائی اپنے ذاتی مقصد کے حصول کے لیے اسے مہرے کی طرح استعمال کر رہی تھیں۔ منصور کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ پہلے وہ بیگم چغتائی کی شخصیت اور باتوں سے متاثر ہوا تھا لیکن اب یہ مثبت تاثر آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا۔ بہر حال بد مزگی کا گھونٹ بھر کر وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ”بہت بہتر!“

”مخاطبہ رہے گا مسٹر منصور۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”یاد رکھیے گا کہ آپ سے پہلے آٹھ وکیل یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ دوبارہ واپس کیوں نہیں آئے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ انہیں روکنے والی وجہ یا شخصیت اب آپ کی راہ میں بھی رکاوٹ بننے کی کوشش کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ اس لیے مخاطبہ رہے گا۔“

☆☆☆

منصور دار الضعفا کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ ایک عجیب سا انجمن لال اس کے وجود کو دھیرے دھیرے گھیرے میں لے رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ادارے کے وسیع دھریض بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ سفید بورڈ پر جلی حروف میں ادارے کے نام تلے درج تھا۔ ”ان کے لیے جو خود کو بے آسرا سمجھتے ہیں۔“ منصور نے تاسف آمیز انداز میں سر ہلایا۔ بے آسرا ہونے اور خود کو بے آسرا سمجھنے میں کتنا فرق تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام کے علمبردار اس ملک میں کتنے گھرانے ایسے ہوں گے جہاں بوڑھوں کو فاضل بوجھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ کبھی چھوٹی چھوٹی کشتی باتوں سے انہیں ان کی بے مائیلی کا احساس دلایا جاتا ہے۔ کبھی مختلف حیلے بہانوں سے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ خود ہی کسی اور سمت کو منہ کر جائیں اور کبھی سیدھا سیدھا اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ پناہ تو آخر سب کو مل ہی جاتی ہے، زمین کے اوپر یا نیچے لیکن ایسا کرنے والے جانے کیوں بھول جاتے ہیں کہ کل کو انہیں بھی عمر کے اس دور میں داخل ہونا ہے اور ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ مکافات کا فلسفہ اتنا عجیبہ تو نہیں کہ سمجھ میں نہ آ سکے۔

لیکن کیا کیا جائے، انسان کی بصارت پہلے ہی کوتاہ ہے اور جب آنکھوں پر خود غرضانہ مفادات کی پٹی بندھ جائے تو پھر دور تو کیا پاس کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔

سماعت پر نقل پڑ جاتے ہیں اور آنے والے وقت کی چاپ دب کر رہ جاتی ہے۔

اسے بیگم چغتائی سے ہمدردی ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ان کی کہانی کے حوالے سے کئی شبہات کا شکار ہو رہا تھا۔ عملی وکالت میں آئے گو اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن بنیادی امور سے تو واقفیت رکھتا تھا۔ بیگم چغتائی کی باتوں میں بعض پہلو تشنہ طلب تھے اور انہیں سن کر ذہن میں کئی سوالات سر اٹھانے لگتے تھے۔

منصور کو ان سوالات کو زبان دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گفتگو کا زیادہ تر حصہ بیگم چغتائی کی باتوں کو سننے، سمجھنے اور ان سے معقول مفہوم اخذ کرنے میں گزر گیا تھا۔ دوسرے اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ بیگم چغتائی کا کام مکمل ہونے تک ان سے ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ ان باتوں کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے۔ دیر بھی کافی ہو چکی تھی، جب وہ دفتر سے نکلا تھا تو اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس ایک معاملے کو نمٹانے میں اتنا وقت لگ جائے گا۔ اس نے اپنے سینئرز کو ایسے مسائل چٹکیوں میں اڑاتے دیکھا تھا اور خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ سینئرز کی طرح وہ بھی بس جائے گا اور فارغ ہو کر آجائے گا لیکن اس کے سینئرز کا واسطہ بیگم چغتائی جیسی موکلہ سے کب پڑا ہوگا؟

آخری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ بیگم چغتائی سے گفتگو کرتے ہوئے اس کا ذہن ان باتوں کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ وہ ان کی گفتگو کے تانے بانے میں کچھ اس طرح الجھا تھا کہ باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔

سورج کو مغرب کا رخ کیے کچھ دیر گزر چکی تھی۔ شام کی بجلا نہیں آہستہ آہستہ گہری ہوئی جا رہی تھیں۔ روڈ لائٹس اور دکانوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ شام کے ٹریفک کا تیز دھارا دوریہ سڑک کے دونوں اطراف رواں دواں تھا۔ منصور جو تھوڑی دیر کو سوچوں کے بھنور میں غوطہ کھانے کو ٹھہر گیا تھا، سر جھٹک کر تیز قدموں سے اس طرف بڑھنے لگا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔

موٹر سائیکل کے برابر ایک سوزوکی ایف ایکس کھڑی تھی۔ ملکیجے سے سفید رنگ کی کار جو شام کے دھند لکوں میں کچھ اور بھی میلی نظر آرہی تھی۔ اس کی پینچر سائڈ کا شیشہ اتر ا ہوا تھا۔ منصور موٹر سائیکل کے قریب پہنچا تو کار کی اندرونی لائٹ روشن ہو گئی اور ایک شخص نے آگے ہو کر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ایکسکووزی، ذرا میری بات سنئے گا۔“

منصور رک گیا اور محتاط نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسے وقت میں اسے کسی کا پوں روک لینا عجیب سی بات تھی۔ شاید یہ شخص اس سے کوئی پتا پوچھنا چاہتا تھا لیکن پتا پوچھنے کے پس پردہ جو دوسرے کھیل کھیلے جاتے ہیں، منصور ان سے ناواقف نہیں تھا۔ اندرونی لائٹ کی روشنی میں کار بادی النظر خالی نظر آرہی تھی لیکن کیا پتا؟

”جی فرمائیے۔“ اس نے محتاط انداز میں کہا۔

”ایسے تو میں کچھ نہیں فرما سکوں گا۔“ اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ”اگر آپ کچھ وقت دے سکتے ہوں تو گاڑی میں بیٹھ جائیے۔“

منصور بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آخر یہ شخص کون تھا اور اس سے کیا چاہتا تھا؟ اس کے دل میں سر اٹھانے والے خدشات تقویت پکڑتے جا رہے تھے۔

اسے بدکتا دیکھ کر وہ شخص دھیرے سے مسکرایا اور اپنی سائڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کے بھلے کی بات کرنے کو ہی بھاگا بھاگا یہاں پہنچا ہوں۔ ویسے بھی بالمشافہ کسی غائبانہ طور پر تو آپ مجھ سے متعارف ہو ہی چکے ہوں گے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ بیگم چغتائی سے مل کر آرہے ہیں؟“

”آپ کون ہیں؟“ منصور نے کسی قدر الجھ کر کہا۔

”میرا نام فاران چغتائی ہے۔“ اس شخص نے نرم لہجے میں کہا۔ ایک گہری سانس جیسے خود بخود اس کے حلق سے نکل گئی۔ ”بیگم شاہانہ چغتائی میری والدہ ہیں۔“

منصور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دم رخصت بیگم چغتائی کے کہے ہوئے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ ”محتاط رہیے گا مسٹر منصور۔“ اسے امید تو تھی کہ آئندہ چند دنوں میں اس کی ملاقات بیگم چغتائی کے بیٹے سے ہوگی لیکن اس کے سامان گمان میں بھی نہیں تھا کہ فاران یوں باہر اس کے استقبال کو منتظر کھڑا ہوگا۔

”آج بھی جائیے وکیل صاحب۔“ اسے ساکت کھڑا پا کر فاران نے کہا۔ ”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ منصور کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فاران مجھ سے کیا چاہتا ہے اور میرا رد عمل کیا ہونا چاہیے؟ اگر میرا سینئر یہاں ہوتا تو اس کا جواب کیا ہوتا؟ فاران میری مؤکلہ کا مخالف فریق ہے اور کیا مخالف فریق سے بات کرنا سودمند ہوگا؟ سوالات کا ایک طوفان تھا اور کسی جواب کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

اسے گونگو کا شکار دیکھ کر فاران نے کہا۔ ”پریشان مت ہوں وکیل صاحب۔ اگر میری گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آپ کو ہچکچاہٹ ہو رہی ہے تو آئیے کسی ریسٹوران میں چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت ہو جائے گی۔ اور آپ آف ٹی۔“

”آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟“ منصور نے بالآخر خود کو سنبھال کر کہا۔

”میں آپ کا بھلا چاہتا ہوں۔“ فاران نے کہا۔ ”آپ کو تھوڑی سی شرمندگی اور بہت سی پریشانی سے بچانا چاہتا ہوں۔ یقین کیجیے، آپ کی خیر خواہی کے سوا میرے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔“

”میں آپ کی بات ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔“ منصور نے تنک آ کر کہا۔ اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔

”ایسے کھڑے کھڑے تو میں آپ کو کچھ سمجھا پاؤں گا نہ آپ سمجھ پائیں گے۔ بات ذرا اطمینان سے کہنے سننے والی ہے۔ اگر آپ میری گاڑی میں بیٹھنے پر خود کو آمادہ نہیں کر پارہے تو اپنی موٹر سائیکل پر مجھے فالو کیجیے۔ یہاں قریب ہی ایک چھوٹا ریسٹورنٹ ہے، جہاں بہت عمدہ چائے ملتی ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ؟“

منصور تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا بالآخر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ فاران کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، آپ گاڑی میں بیٹھیں، میں آپ کو فالو کرتا ہوں۔“

”عنایت کا شکریہ۔“ فاران نے گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ منصور سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کا لہجہ طنزیہ تھا یا تشکرانہ۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ ویٹر چائے کا آرڈر لے کر جا چکا تھا۔ فاران نے منصور کا نام پوچھنے کے علاوہ ابھی تک کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ اس کی نگاہ میز پر جمی ہوئی تھی اور وہ خاموش تھا جیسے بات شروع کرنے کے لیے کسی شبہ گھڑی کی آمد کا انتظار کر رہا ہو۔ منصور اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ فاران کی عمر پینتیس چھتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ مناسب قد و قامت، نرم و نازک خدو خال۔ بدن پر میانہ سے کپڑے کا ٹوپیس سوٹ جس کے نیچے نظر آنے والی شرٹ کسی قدر شکن آلود ہو رہی تھی۔ غالباً فاران اسے ایک دو روز سے پہنے ہوئے تھا۔

چند میزوں کے علاوہ باقی ریسٹوران خالی پڑا تھا۔ میزوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے لگائی گئی تھی کہ عام لہجے

میں بات کرنے والوں کی آواز ایک سے دوسری میز تک... یہ مشکل ہی پہنچتی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ رش کم ہونے کے سبب ریسٹوران کی فضا معمول سے کچھ زیادہ خاموش تھی۔ اعصابی کشیدگی کے باعث منصور کو یہ خاموشی کچھ زیادہ گہری اور ذہنی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ فاران خود ہی بات کا آغاز کرے لیکن فاران یوں چپ بیٹھا تھا جیسے کسی گہرے نکتے پر غور و فکر کر رہا ہو اور منصور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فضا کا تناؤ ہرگز رتے لمحے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہو۔ اس کی برداشت کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو گیا اور وہ بول پڑا۔

”آپ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے؟“

فاران مسکرایا جیسے منصور کے اضطراب نے اسے محفوظ کیا ہو۔ ”میں یہی سوچ رہا تھا کہ بات کا آغاز کیسے کیا جائے۔“

”میں اس سلسلے میں کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہوں۔“ منصور نے کہا۔ ”کیونکہ مجھے تو یہی علم نہیں کہ آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”چلیے، اصل بات کی طرف آنے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال پوچھ لیتا ہوں۔“ فاران نے کہا۔ ”کیا میں جان سکتا ہوں کہ میری والدہ سے آپ کی ملاقات کا مقصد کیا تھا؟“

منصور کے اعصابی تناؤ میں یکدم اضافہ ہو گیا۔ فاران کا سوال غیر متوقع نہ سہی لیکن بے حد اچانک تھا۔ ”آپ کو یہ جاننے کا کوئی حق نہیں۔“ اس نے کشیدہ لہجے میں کہا۔ ”وکیل اور موکل کے معاملات کا نقیض نفل ہوتے ہیں اور ان کی حفاظت کرنا ایک وکیل کا فرض ہے۔“

”آپ کا جواب آپ کے پروفیشنل ازم کی دلیل ہے۔“ فاران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”بہر حال، اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کے اور میری والدہ کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں۔ میری والدہ نے کسی کے ذریعے فون کروا کر آپ سے ملاقات کا وقت لیا، آپ ان کے پاس پہنچے، آپ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ آپ کو ابتدائی طور پر یہ بتایا گیا کہ میری والدہ کو اپنی وصیت لکھوانے کے لیے آپ کی مشاورت اور معاونت کی ضرورت ہے لیکن جب آپ یہاں پہنچے تو آپ کو بتایا گیا کہ وصیت کی تحریر وغیرہ تو محض ضمنی معاملات ہیں اصل میں میری والدہ آپ کی مدد سے اپنے بیٹے اور بہو سے انتقام لینا چاہتی ہیں۔“

”اب یہاں صورت حال دہری شکل اختیار کر جاتی

ہے۔ اگر آپ کے ذریعے وہ اپنے بیٹے سے یعنی مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہیں تو انہوں نے آپ کو ایک عدد عاق نامہ تیار کرنے کے لیے دیا ہوگا اور اگر صرف بہو سے انتقام لینا ہے تو عاق نامے کے ساتھ ساتھ ایک وصیت نامہ بھی آپ کے حوالے کیا گیا ہوگا اور آپ کو بتایا گیا ہوگا کہ جب آپ دونوں چیزیں تیار کر کے لے آئیں گے تو ان میں سے ایک پر عمل درآمد سے پہلے میری والدہ مجھ سے ایک ملاقات کریں گی اور دونوں چیزیں میرے سامنے رکھ دیں گی۔ فیصلے کا اختیار مجھے دیا جائے گا کہ دونوں میں سے کسی ایک کو چن لوں، وصیت نامے کی رو سے میں اپنی والدہ کے ترکے کا حق دار ٹھہروں گا لیکن میری والدہ اس کی توثیق صرف اسی صورت میں کریں گی جب میں اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا اور غالباً یہ کام ان کی نگاہوں کے سامنے انجام پائے تو انہیں زیادہ خوشی ہوگی۔“

”اگر میں ان کا حکم ماننے پر کسی طرح کی ہچکچاہٹ یا تامل کا مظاہرہ کرتا ہوں تو میری والدہ وصیت نامے کے بجائے عاق نامے کی توثیق کر دیں گی اور مجھے اس تمام مال و اسباب اور کاروبار سے محروم کر دیا جائے گا جو اس وقت میرے تصرف میں ہے اور جس پر فوری قبضہ کرنے کے لیے میں نے اس وقت جب وہ فوج کے زیر اثر بستر پر پڑی تھیں، ایک جنرل پاؤر آف اٹارنی پر ان کا انگوٹھا لگوالیا، بایاں انگوٹھا۔“

”اب کیسے وکیل صاحب! کوئی بات رہ تو نہیں گئی؟ شاید آپ کوئی ایسی بات جانتے ہوں جو میرے علم میں نہیں۔“

منصور ایک دفعہ پھر فیصلہ نہ کر سکا کہ فاران کا لہجہ طنزیہ تھا یا استغہامیہ!

اور اسے فیصلہ کرنے کا ہوش بھی کہاں تھا۔ فاران نے جو کچھ بتایا تھا، وہ کم وبیش وہی تھا جو کچھ دیر پہلے اس نے بیگم چغتائی کے منہ سے سنا تھا۔ یہی باتیں اب مخالف فریق کے منہ سے سن کر اس پر حیرت کا جو بھی پہاڑ ٹوٹ جاتا وہ کم تھا۔ ایک سناٹے کے عالم میں بیٹھا وہ فاران کو گھور رہا تھا۔

اس کی کیفیت دیکھ کر فاران کھل کر مسکرایا اور منصور نوٹس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ماں بیٹے میں کم از کم یہ عادت تو مشترک تھی کہ دوسروں کو چونکا کر محفوظ ہوتے تھے۔

”میں آپ کی کیفیت بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔“ فاران نے کہا۔ ”جب پہلی دفعہ میں نے یہ کہانی سنی تھی تو میری بھی

”کہانی۔“ منصور کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں، کہانی۔“ فاران نے تائید کی۔

”آپ.....!“ منصور نے پہلو بدل کر کہا۔ ”آپ کھل کر بات کریں۔“

”میں کھل کر بات کرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔“ فاران نے کہا۔ ”آپ ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ میں جو بات بھی کروں گا، ٹھوس بنیاد اور ثبوت کے ساتھ کروں گا۔ آپ اپنی تسلی کے لیے جو شہادت بھی طلب کریں، میں فراہم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وکیل ہونے کی حیثیت سے آپ ثبوت اور شہادت کی عدالتی اہمیت سے بخوبی واقف ہوں گے۔“

اچانک منصور اس آنکھ پھولی سے جھک آگیا۔ اس نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ ”کیسا ثبوت اور کیسی شہادت؟ میں ابھی تک اس انتظار میں ہوں کہ آپ اس ملاقات کا کوئی مقصد بیان کریں تو میرے پلے بھی کچھ پڑے۔ مان لیا کہ آپ کو میرے اور اپنی والدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم ہے لیکن اس سے معاملات کی نوعیت تو نہیں بدل جاتی۔ اتنا تو میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کسی نہ کسی طرح اس قانونی کارروائی سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے جو میں آپ کی والدہ کی ہدایات کے تحت عمل میں لانے والا ہوں لیکن اتنا ذہن میں رکھیے گا کہ.....“

”میں آپ کو کسی چیز سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“ فاران نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کی بات کاٹنے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن منصور صاحب! کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی کہ یہ تمام باتیں میرے علم میں کیسے آئیں؟“

منصور کو پھر خاموش ہو جانا پڑا۔ حیرت تو اسے واقعی ہوئی تھی لیکن فاران کے علم میں یہ سب باتیں کس طرح آئیں، اس کے بارے میں وہ کوئی قیاس آرائی کرنے سے قاصر تھا۔

فاران تھوڑی دیر اس کی شکل دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”میری والدہ کی باتیں سن کر آپ یقیناً مجھے نہایت ناہنجار اور بد خصلت سمجھنے لگے ہوں گے۔ اس وقت آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں لیکن بات کو ذرا دوسرے رخ سے دیکھیے۔ میری والدہ آپ کی مڑکھ سہی لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ انہوں نے آپ کو سب کچھ درست بتایا ہے؟

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گہرے پلے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سپینس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

بالتاخذگی ہے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

اسرائیل، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ اک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 - کمپنیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

کیا آپ کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ جو کچھ آپ میری والدہ کے منہ سے سن کر آئے ہیں، وہ غلط بھی ہو سکتا ہے؟“

”کیا آپ وہ سب غلط ثابت کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟“ منصور نے ایک لمحہ توقف کے بعد جارحانہ لہجے میں کہا۔ فاران نے جس انداز میں اس پر چڑھائی کر دی تھی، اس کا مقابلہ اسی انداز میں کیا جاسکتا تھا۔

”مجھے کسی بات کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ فاران نے اس کے انداز کا کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ ”میں صرف چند حقائق آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں اور مجھے پوری امید ہے کہ اس کے بعد صحیح اور غلط خود بخود آپ پر کھل جائے گا۔ بات آگے بڑھانے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ آپ ان کاغذات پر ایک نگاہ ڈال لیں۔“ اس نے ایک خاکی لفافہ میز پر رکھ کر منصور کی طرف سرکا دیا۔ یہ لفافہ وہ گاڑی سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

”اگر آپ ڈاکٹر دلجیت رحمانی کے نام سے واقف ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ ملک کے ممتاز اور مہنگے ترین ماہرین نفسیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ رپورٹ انہی کی تصدیق شدہ ہے۔“

منصور نے اسے ایک الجھی ہوئی نگاہ سے نوازا پھر کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اس رپورٹ کا خلاصہ مجھے اپنے الفاظ میں سنا دیں؟“

”شاید آپ کے لیے میری بات قابل یقین نہ ہو۔“ فاران نے کہا۔

”اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“ منصور نے کہا۔

”چلیے، ٹھیک ہے۔“ فاران نے کہا۔ ”اگر آپ کو میرے بیان کا کوئی حصہ مشکوک محسوس ہو تو آپ بلا جھجک اظہار کر سکتے ہیں۔ میں بالکل برا نہیں مناؤں گا۔“

”آپ کا برا منانا یا نہ منانا میرا مسئلہ نہیں۔“ منصور نے کہا پھر اسے احساس ہوا کہ وقتی ابال کے زیر اثر وہ نامناسب الفاظ استعمال کر گیا ہے۔ وہ تلافی کے لیے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ فاران نے کہا۔

”آپ کی سوچ اپنی جگہ درست ہے۔ آپ کا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ میری والدہ سے ایک ملاقات کرنے کے بعد آپ فرض کر چکے ہیں کہ آپ ان کے اور میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ آپ ان کے یا میرے متعلق حقیقی معنوں میں کچھ نہیں جانتے۔ سب سے پہلے آپ ان کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کی رائے سن لیں۔ اس کا کہنا ہے کہ بڑھتی عمر اور فالج کے حملے نے میری والدہ

کی ذہنی کیفیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ان کے اعصاب اس حد تک کمزور ہو چکے ہیں کہ کسی بھی وقت جواب دے سکتے ہیں۔ ان کے دماغ کی کمزوریاں میں یوں سمجھیے کہ بس ایک تنکے کی کسر باقی ہے۔ حالات نے ان کے اعصاب پر اس قدر دباؤ ڈالا ہے کہ اب وہ ہلکی سی سختی برداشت کرنے کی بھی اہل نہیں ہیں۔“

”کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اپنی والدہ کو اس حالت تک پہنچانے کے ذمے دار آپ خود ہیں؟“ منصور نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

فاران پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ ”میں ایک دفعہ پھر کہوں گا کہ آپ کی موجودہ معلومات کے پیش نظر آپ کی سوچ اپنی جگہ درست ہے۔ بہر حال، ڈاکٹر دلجیت رحمانی کی اس رپورٹ کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے خاندانی پس منظر اور پرورش کے حالات کی بدولت اپنی بات منوانا اور خود کو سب سے برتر سمجھنا میری والدہ کی فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ خیال کبھی ان کے ذہن سے گزرا ہی نہیں کہ حالات کے مطابق ایڈجسٹ ہو جائے بلکہ آج تک وہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ایڈجسٹ کرنے کی کوشش ہی کرتی رہیں۔ ایک حد تک تو یہ ممکن ہوا لیکن بعد میں انہیں پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے ناکامی انہیں میرے والد کے سلسلے میں ہوئی پھر ان کی وفات کے بعد وہ ان کے کاروبار اور اپنے والد کے ورثے کو سنبھالنے میں ناکام رہیں۔ میں نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کر کے انہیں ایک اور زک سے دو چار کر دیا۔ ان کے ذہن پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔ انہیں وہم ہو گیا کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے اور انہیں نیچا دکھانے پر کمر بستہ۔ علم نفسیات کی اصطلاح میں اسے ہیرانویا (Paranoia) کہتے ہیں۔“

”اور یہ ہیرانویا ان کے ذہن میں کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے؟“

”اس کی تفصیل ذرا لمبی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ہی بار میں آپ کو سب کچھ بتا دیا جائے۔ اس سے پہلے اگر آپ کے ذہن میں کوئی اور بات ہے تو آپ پوچھ سکتے ہیں؟“

ویرا اسی اثنا میں چائے رکھ گیا۔ فاران نے چائے بنانا شروع کر دی۔ منصور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ فاران کی باتوں سے جھلکتے اعتماد نے اسے کم از کم اس حد تک متاثر کر لیا تھا کہ وہ اب فحشہ ذہن سے اس کی

بات سننے پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ دل میں جانے کیا کیا توقعات باندھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فاران اسے دھمکائے گا، لالچ دے گا یا کسی قسم کی سودے بازی کرنے کی کوشش کرے گا لیکن بات ایک دفعہ پھر اس کی توقع کے برعکس نکلی تھی۔ فاران نے محض چند منٹوں کی گفتگو میں معاملات کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔

لیکن نوعیت بدل جانے کے باوجود بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ منصور مخالف فریق کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ فاران نے اپنی والدہ کی کہانی کو جھوٹ قرار دیا تھا اور منصور جاننا چاہتا تھا کہ یہ دعویٰ وہ کس بنیاد پر کر رہا ہے۔ اس کے ذہن میں چند سوالات بھی ابھر رہے تھے۔

منصور شاید اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا چنانچہ اس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”جی منصور صاحب! میں آپ کے سوالات کا منتظر ہوں۔“

”پوچھنے کو باتیں تو بہت سی ہیں فاران صاحب۔“ منصور نے اپنی کپٹی مسلتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کون سا سوال پہلے پوچھا جائے۔“

”جو آپ کے خیال میں سب سے زیادہ اہم ہو۔“ فاران نے مشورہ دیا۔

”تو پھر میرا سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے آپ کی والدہ دارالضعفا میں کیوں رہ رہی ہیں؟ یہ ادارہ بے آسرا اور بے گھر لوگوں کے لیے ہے۔ آخر ادارے کی انتظامیہ نے انہیں کس حیثیت سے وہاں جگہ دے رکھی ہے؟ کیا وہ لوگ آپ سے واقف نہیں؟“

”واقف ہیں، اچھی طرح واقف ہیں۔“ فاران نے کہا۔ ”آپ کو شاید معلوم ہو کہ اس ادارے کو چلانے والا ٹرسٹ میرے نانا نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ خود بھی یہیں گزارا تھا۔ انہی کی طرح میری والدہ بھی.....“

”بزرگوں کو یہاں بھجوادینا آپ کے خاندان کی روایت ہے کیا؟“ منصور کے منہ سے نکل گیا۔ فاران کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ نادانستگی میں وہ کتنی گہری چوٹ کر گیا ہے۔

”اپنے نانا کے متعلق تو میں کچھ نہیں جانتا۔“ فاران نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”اپنی والدہ کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ گھر چھوڑ کر یہاں منتقل ہونے کا فیصلہ ان کا اپنا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ادارہ ان کے والد کا قائم کردہ ہے اور وہ

یہاں اس گھر کے مقابلے میں زیادہ سکون اور اطمینان محسوس کریں گی جہاں میری بیوی کی حکومت ہے۔ ٹرسٹ کی انتظامیہ نے ان کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ ان کی بات مان لی جائے۔“

”آپ کی والدہ کی ادویات اور دیکھ بھال کا خرچہ کون اٹھاتا ہے؟“ منصور نے ایک غیر متعلقہ سوال کر دیا۔ ”میں اس مد میں ٹرسٹ کی انتظامیہ کو ہر ماہ کچھ رقم دے دیا کرتا ہوں۔“

”اور اپنی والدہ کو؟“

”انہیں میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی تک پینا گوارا نہیں۔“

”گویا آپ انہیں کچھ نہیں دیتے؟“

”جب وہ لینے پر آمادہ ہی نہ ہوں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ انتظامیہ کو دی جانے والی رقم کا انہیں علم نہیں ہے ورنہ شاید وہ اس سے بھی انکار کر دیتیں۔“

بیگم چغتائی نے بتایا تھا کہ فاران کی طرف سے انہیں ہر ماہ دس ہزار روپے ملتے ہیں جبکہ فاران اس کی تردید کر رہا تھا۔ بیگم چغتائی اگر چاہتیں تو سچ بول کر فاران کی پوزیشن مزید خراب کر سکتی تھیں اور فاران اگر چاہتا تو ایسی کوئی بات کر کے اپنی پوزیشن صاف کر سکتا تھا۔ بیگم چغتائی کی کہی ہوئی ایک بات غلط نکلی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کی بتائی ہوئی دوسری باتیں بھی غلط ثابت ہو سکتی تھیں۔ شک کی گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔

پھر منصور نے کہا۔ ”اس پاور آف اٹارنی کے متعلق کیا خیال ہے جس کی رو سے.....“

”آپ اسی پاور آف اٹارنی کی بات کر رہے ہیں جس کے لیے میری والدہ نے ابطال نامہ تیار کروایا ہے؟“

فاران نے اس کی بات کاٹ دی۔

”جی ہاں۔“ منصور نے کہا۔ ”وہی۔“

”ایسی کسی دستاویز کا کوئی وجود نہیں ہے۔“ فاران نے کہا۔ ”جس جائیداد کا اس میں ذکر ہے، وہ مجھے ملی ہی نہیں اور جس کا روبرو ذکر ہے، اس کا دو الیا نکلنے کا کلیم میری والدہ نے دارالضعفا میں آنے سے پہلے خود داخل کرایا تھا۔ آپ چاہیں تو عدالتی ریکارڈ چیک کر سکتے ہیں۔ اب میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے، خدا کا شکر ہے کہ وہ میرا اپنا ہے۔“

”تصدیق تو خیر میں کر ہی لوں گا لیکن اس سے پہلے ایک اور بات۔“ منصور نے کہا۔ ”جب آپ کو میرے اور

اپنی والدہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو کا علم ہے تو یہ بھی علم ہوگا کہ آپ کی والدہ نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ سے پہلے آٹھ وکیل یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں، کیا یہ سچ ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کیا ان وکیلوں سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟“

”جی بالکل۔“

”اور اس کے بعد انہوں نے آپ کی والدہ سے

دوسری ملاقات نہیں کی؟“

”انہیں ملاقات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”آخر کیوں؟“

”اس سوال کے جواب کا تعلق بھی ان کے پیرانویا

سے ہے۔“

”چلیے اسے چھوڑ دیجیے۔“ منصور نے کہا۔ ”آپ

کا کہنا یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا وہ

غلط ہے۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ نکلا کہ وہ وکیلوں سے

رابطہ بلا مقصد کرتی ہیں، ان کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور

آپ بھی ذہنی پریشانی اور شرمندگی سے دوچار ہوتے ہیں۔

آپ انہیں روکنے کے لیے کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتے؟“

”کاش ایسا کرنا میرے بس میں ہوتا۔“ فاران نے

ایک گہری سانس کھینچ کر کہا۔ ”سب کچھ جاننے کے باوجود

میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“

”اس کی وجہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ ان کے

اعصاب کوئی دباؤ برداشت کرنے کے اہل نہیں رہے۔

میرے خلاف کارروائی کے لیے وکیلوں سے رابطہ کر کے وہ

دراصل اپنا غبار نکالتی ہیں۔ اگر انہیں اس آؤٹ لیٹ

(Outlet) سے بھی محروم کر دیا گیا تو خدشہ ہے کہ وہ اپنا

ذہنی توازن بالکل ہی کھو بیٹھیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میری

والدہ اپنی زندگی کے آخری دن پاگل خانے میں بسر کریں۔“

بیگم چغتائی کی باتوں نے منصور کو متاثر کیا تھا لیکن

فاران کی باتیں بھی بے وزن نہیں تھیں۔ اپنی اپنی جگہ

دونوں سچے معلوم ہوتے تھے۔ بیگم چغتائی کی کہانی وہ سن

چکا تھا اور اس کے متعلق کئی شکوک و شبہات کا شکار بھی ہوا

تھا۔ فاران کی باتوں نے اس کے چند شبہات کی تصدیق

بھی کر دی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ فاران کی کہانی سچ ہے یا

بیگم چغتائی کی طرح اس نے بھی جھوٹ سے کام لیا ہے۔

”آپ پوری تفصیل بتائیے فاران صاحب۔“

منصور نے کہا۔ ”شروع سے۔“

فاران نے ایک ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی رگڑی، کچھ

دیر بھاپ اگلتی چائے کو گھورتا رہا پھر ایک گہری سانس لے

کر گویا کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے بولا۔ ”گزشتہ چند سالوں

میں مجھے یہ داستان کئی دفعہ سنانا پڑی ہے لیکن آج تک میں

یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ کسی کو سناتے وقت اس کا آغاز کہاں

سے کروں۔ اپنے بچپن سے جو باپ کی شفقت سے محروم

اور ماں کے تحکم اور تسلط تلے دبا ہوا گزرا۔ اس وقت سے

جب میں نے پہلی دفعہ اپنی ماں کے دباؤ سے آزاد ہو کر اپنی

مرضی کے تحت کوئی فیصلہ کیا۔ اس وقت سے جب میرے نانا

اور میرے والد کی عمر بھر کی محنت میری والدہ کی ہٹ

دھرمیوں کا شکار ہو گئی۔ اس وقت سے جب میری والدہ

فالج کا شکار ہوئیں یا اس وقت سے جب میرا باپ میری

ماں کا شکار ہو گیا۔“

منصور نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھنے کی پوری کوشش کی

تھی لیکن فاران کے کھوئے کھوئے لہجے میں کچھ ایسی

لاچارگی تھی، ایسی شکستگی تھی کہ اس کی آنکھوں کے گوشے

خود بخود دھمکتے گئے۔ اس کے منہ سے کوئی بات نکل جاتی لیکن

اس نے زبان روک لی۔ اس وقت کچھ کہنا قطعاً مناسب

نہیں تھا۔

فاران کی آنکھیں خلا میں گھورنے لگی تھیں۔ اس کی

آنکھوں میں سائے اتر رہے تھے۔ ماضی کے سائے۔

چائے کا کپ منصور کی طرف سرکاتے ہوئے اس نے ایک

اور گہری سانس لے کر شاید اپنی ہمت مجتمع کی اور بولنا

شروع کر دیا۔

☆☆☆

میری والدہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔

ان کی والدہ یعنی میری نانی انہیں جنم دینے کے کچھ ہی دیر

بعد چل بسی تھیں۔ میرے نانا اپنی بیوی سے بہت محبت

کرتے تھے۔ ان کی موت کے بعد وہ دنیا سے بالکل بیگانہ

ہو گئے۔ عزیزوں، رشتے داروں سے ملنا، کہیں آنا جانا،

اٹھنا بیٹھنا سب ترک کر دیا اور کسی کا تو خیر ذکر ہی کیا،

انہوں نے کسی کی روک ٹوک نہ دیکھی۔ نوکروں کو اپنے آقا

کی بیٹی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ جو جی میں آئے

کرتیں، کوئی پوچھنے والا، جواب طلبی کرنے والا نہ تھا۔ نتیجتاً

ان کے مزاج میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ساری

دنیا ان کی حکومت کے لیے بنی ہے اور ان کے ارد گرد موجود

سارے لوگ ان کے غلام ہیں۔ ان کا صرف نام ہی نہیں،

مزاج بھی شاہانہ تھا۔ منہ زور بادشاہوں جیسا شاہانہ۔

کر لی۔

آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ میری والدہ نے کبھی اسکول یا کالج کا منہ نہیں دیکھا۔ اس خستہ حالت میں بھی ان کی گفتگو سننے والا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے شستہ اور مہذبانہ لہجے میں ایسی نئی تلی گفتگو کرنے والی خاتون رواجی تعلیم سے یکسر محروم ہے۔ ان کا رکھ رکھاؤ، انداز گفتگو اور اطوار سب میرے والد کی عطا ہیں۔ میری بات سن کر شاید آپ یہ سمجھیں کہ میرے والد نے انہیں خود پڑھایا لکھایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری والدہ نے جو کچھ پڑھا اور جو کچھ سیکھا، وہ میرے والد کی ضد میں سیکھا۔ میرے والد نے فنانس میں ماسٹر کیا تھا۔ میری والدہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ محض تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر ان کا شوہر ان سے اونچا مقام پالے چنانچہ جانے کن جتنوں سے انہوں نے خود کو انجو کیٹ کیا، اپنے مطالعے میں وسعت پیدا کی، بولنے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب سیکھے تاکہ سوسائٹی میں اپنے شوہر کے ساتھ سر تان کر کھڑی ہو سکیں۔ اس اعتبار سے میری والدہ کی تعلیم و تہذیب میرے والد کی ہی بدولت تھی۔

میرے والد اور والدہ ویسے تو ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے خاندان ایک نہ تھے۔ میرے والد بنیادی طور پر لوئر ورکنگ کلاس کے ان سپوتوں میں سے تھے جنہیں محنت اور قسمت کے بل بوتے پر کسی قدر نمایاں ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اس قدر اعلیٰ تعلیم کن مشکلات سے گزر کر حاصل کی۔ مجھے تو ان کی صورت بھی تصاویر میں ہی دیکھنے کو ملی لیکن ان کے پرانے شناساؤں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ساری عمر دن کو دن اور رات کو رات نہیں سبھا۔ شاید اس لیے وہ اتنی جلد اتنا تھک گئے کہ قیامت تک کے لیے سو گئے۔

شادی سے پہلے میرے والد ایک اکنامک ایڈوائزر کے اسٹنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ایک ریسرچ پروجیکٹ کے سلسلے میں وہ میری والدہ کے شہر میں آئے۔ میرے نانا اس وقت تک اپنے برائے نام وجود سمیت اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ان کی جائداد کی وارث ہونے کی حیثیت سے میری والدہ اس چھوٹے شہر میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی سلسلے میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میں نہیں جانتا کہ پہلی نظر میں انہوں نے ایک دوسرے میں کیا دیکھا بہر حال چند ماہ بعد دونوں نے شادی

میری والدہ نے ان سے شادی یقیناً اس لیے کی تھی کہ انہیں توقع تھی کہ مالی حیثیت اور مرتبے میں کمتر ہونے کی وجہ سے وہ ساری عمر ان سے دب کر رہیں گے اور اسی طرح ان کے اشاروں پر چلتے رہیں گے جیسے وہ آج تک سب کو چلاتی آئی تھیں۔ لیکن شاید زندگی میں پہلی بار میری والدہ کی بچھائی ہوئی بازی ان کے خلاف الٹ گئی۔

میرے والد نے میرے نانا کی جائداد پر بینک سے روپیہ حاصل کر کے کاروبار شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر اسے عروج کی طرف گامزن کر دیا۔ میری والدہ کی توقعات دھری کی دھری رہ گئیں۔ بجائے اس کے کہ میرے والد اپنی بیوی کے محتاج ہوتے، انہوں نے ایسا کام کیا کہ آہستہ آہستہ بیوی ان کی دست نگر ہونے لگی۔ میری والدہ ہزیمت کا شکار ہو گئیں اور انہوں نے میرے والد سے اس کا انتقام لینا شروع کر دیا۔ ان کے انتقام لینے کا انداز اتنا گھٹیا تھا کہ اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

ایک نمایاں کاروباری فرد ہونے کی حیثیت سے میرے والد کو ہائی سوسائٹی میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ انہیں اکثر اپنی بیگم سمیت سماجی تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔ ایسی تقریبات میں سب لوگوں کے سامنے میری والدہ ان سے ایسا برتاؤ کرتیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں بھی جھک جاتیں۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ خاندانی لوگ اپنے ملازموں سے تنہائی میں بھی ایسا برتاؤ نہیں کرتے جیسا میری والدہ اپنے شوہر کے ساتھ برسر عام کیا کرتی تھیں۔ وہ ہر جگہ، ہر وقت انہیں احساس دلائی رہتی تھیں کہ تمہاری یہ دولت، یہ مرجہ میرا ہی مرہون منت ہے اور اگر میں تم سے شادی نہ کرتی اور تمہیں کاروبار کے لیے اپنی جائداد پر روپیہ حاصل کرنے کی سہولت نہ دیتی تو تم اسی گندی نالی میں ریٹھتے رہتے، جہاں سے میں تمہیں اٹھا کر لائی ہوں۔

میرے والد یا تو بہت اعلیٰ ظرف تھے یا بہت سرد مہر۔ وہ ان باتوں کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ میری والدہ نے یہ حربہ بے اثر ہوتا دیکھا تو مزید اوچھے جھکنڈوں پر اتر آئیں۔ محض اپنے شوہر کو جلانے اور اذیت دینے کے لیے انہوں نے دوسرے مردوں سے فلرٹ کرنا شروع کر دیا۔ وہ خوب صورت تھیں، جوان تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دولت مند تھیں۔ ان کے گرد پروانے

طواف کرنے لگے جو ان کے ایک اشارے پر دنیا ان کے قدموں میں بچھانے کو تیار تھے۔ یہی احساس ان کی نفسیاتی ضرورت تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب میرے والد کی طرف سے ان کی توقع پوری نہ ہو سکی تو انہوں نے اس نفسی کو مٹانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کر لیا۔ تمام عمر ان کی یہی خواہش رہی ہے کہ ان کی شخصیت کی آب و تاب کے سامنے باقی سب ماند پڑ جائیں اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتی ہیں۔

آپ میری والدہ سے مل چکے ہیں۔ ان کی عمر کا تھوڑا بہت اندازہ آپ نے لگا ہی لیا ہوگا۔ وہ تہتر برس کی ہیں اور میری عمر چھتیس برس ہے یعنی جب میں نے جنم لیا تو میری والدہ کی عمر سینتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہے جب عورت اپنی زرخیزی کے آخری دور سے گزر رہی ہوتی ہے۔ تیس سال کا ہندسہ عبور کرنے کے بعد عورت کے ماں بننے کے امکانات گھٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر تیس سے تیس سال کی عمر کو ماں بننے کے لیے بہترین قرار دیتے ہیں۔ میری پیدائش میں اتنی تاخیر اس لیے ہوئی کہ میری والدہ نے ماں بننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ آپریشن کروا کر اپنی کوکھ کو خود بخود کر دیتیں لیکن ان کی اور میری، دونوں کی بد قسمتی کہ اس وقت پاکستان میں ایسے آپریشنز کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے وہ تمام تدابیر اختیار کیں جن کے ذریعے وہ اس شخص کی اولاد کو جنم دینے سے بچ سکیں جس نے انہیں زندگی میں پہلی دفعہ شکست کا تلخ ذائقہ چکھنے پر مجبور کیا تھا۔ بہر حال ہونی ہو کر رہی اور میں اس دنیا میں آ گیا۔

میری صورت میں میری والدہ کو اپنے شوہر سے نفرت کرنے کی ایک اور وجہ مل گئی۔ ان کے مزاج کی کٹنگی اور برتاؤ کی زہرناکی میں اور اضافہ ہو گیا۔ میرے والد کی ہمت بھی آہستہ آہستہ جواب دیتی جا رہی تھی۔ ایک روز دفتر میں کام کرتے کرتے انہوں نے میز پر ایسا سر رکھا کہ دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیالیس سال تھی۔ کام کی زیادتی شاید ان کا کچھ نہ بگاڑ پاتی لیکن گھریلو سکون و اطمینان کی عدم موجودگی نے انہیں چکنا چور کر دیا۔ میری والدہ نے ان کی جان لے لی۔

لیکن میری والدہ کو چین پھر بھی نصیب نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے؟ جس شخص سے وہ انتقام لے رہی تھیں وہ تو اب ان کی دسترس سے دور جا چکا تھا۔ وہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں

سر پٹختے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ شوہر کی موت پر انہیں دکھ تو نہیں البتہ اس بات کا افسوس ضرور ہوا ہوگا کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے سامنے جھکا نہ سکیں۔ مرتے دم تک وہ شخص ان کی گرفت میں نہ آیا۔

اور پھر میں ان کی نگاہ میں آ گیا۔ آخر کو میں اسی شخص کا خون تھا جو تمام عمر ان کی نفرتوں کا مرکز رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ باپ تو میری ڈوری سے نہ بندھ سکا، اب وہ کس اس کے بیٹے پر پوری کی جائے اور یوں انہوں نے میری زندگی کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میرے ساتھ میری والدہ کا جو سلوک رہا، دیکھنے والے اسے ماں کا جنون کی حد تک پہنچا ہوا پیار سمجھتے رہے۔ بعض نے ان کے رویے کی یہ وجہ بھی نکالی کہ چونکہ میرے والد کی وفات کے بعد، ان کی زندگی میں میرے علاوہ کچھ نہیں بچا اور ویسے بھی والد مرحوم کی زندگی میں انہوں نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا، اس لیے اب مجھ پر نچھاور ہو کر وہ اپنی گزشتہ زیادتیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کے رویے کے پس پردہ محرکات سے صرف میں واقف ہوں اور مجھے بھی یہ واقفیت ایک دن میں حاصل نہیں ہوئی۔ اسے پانے کے لیے میں نے ساری عمر ان کے رویوں کو سہا ہے، ان کی گزشتہ زندگی کے متعلق معلومات اکٹھی کر کے کڑیوں سے کڑیاں ملائی ہیں۔ تب جا کر میں انہیں اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کامیاب ہو پایا ہوں۔

میری والدہ کی ابتدائی زندگی کے متعلق تو آپ جان ہی چکے ہیں اور ان کے منہ سے شاید یہ بھی سن آئے ہوں کہ انہوں نے میرے والد کی وفات کے بعد کاروبار اور گھر کو ایک ساتھ کیسے سنبھالا لیکن ان دونوں چیزوں کو انہوں نے کس طرح سنبھالا، اس کی تفصیل کے متعلق شاید آپ کی معلومات کی قدر ناقص ہوں۔

مجھے میری والدہ نے ایسے سنبھالا کہ میری زندگی کے ایک ایک حصے پر ان کے تسلط کی مہر لگ گئی۔ مجھے کیا کھانا ہے اور کب کھانا ہے، کپڑے کیسے اور کس رنگ کے پہننے ہیں، کب سونا ہے، کب اٹھنا ہے، میرا دوست کون ہوگا اور کون نہیں، کیا پڑھنا ہے اور کیا نہیں پڑھنا، کون سے کھیل کھیلنے ہیں اور کن مشاغل میں دلچسپی لگنی ہے، خوشبو کون سی لگانی ہے اور بال کس انداز میں کٹوانے ہیں حتیٰ کہ دانت صاف کرنے کے برش اور پیسٹ سے لے کر نہانے کے صابن تک ہر چیز میری والدہ کی مرضی کے

مطابق ہوتی تھی۔

کسی بچے کے معاملات کا اس کے والدین کی مرضی کے تابع ہونا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن والدین اگر بچے سے کوئی بات منواتے ہیں تو پھر اس کی کوئی بات ماننے بھی ہیں۔ مجھے یہ آسائش کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے بھی اپنی والدہ سے کوئی فرمائش کرنے اور کوئی بات منوانے کا حق نہ ملا۔ ان کی بات میرے لیے حرفِ آخر ہوتی تھی۔ میں چاہتا بھی تو حکم اور جبر کے اس حصار سے باہر نہیں نکل سکتا تھا جو انہوں نے میرے گرد گھنچ رکھا تھا۔

میرے والد کی شبانہ روز محنت سے ترقی پانے والے کاروبار کو انہوں نے کیسے سنبھالا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ تفصیل میں جاؤں تو شاید ہم گھنٹوں یہیں بیٹھے رہیں۔ جس انداز میں انہوں نے اس کاروبار کا انتظام کیا، ایک چڑیا بھی اپنے گھونسلے کی دیکھ بھال اس سے بہتر طریق پر کرتی ہوگی۔ میرے والد نے اپنی زندگی میں ہی ایماندار، محنتی اور وفادار کارکنوں کی ایک مختصر ٹیم بنادی تھی جس کی بدولت اتنا تو ہوا کہ کاروبار جوں کا توں چلتا رہا لیکن چونکہ مرضی میری والدہ کی چلتی تھی، اس لیے کاروبار کی وسعت اور حجم میں آہستہ آہستہ کمی آتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب میں ایم بی اے کر کے کاروبار سنبھالنے کے لیے تیار ہوا تو اس کا صرف نام باقی رہ گیا تھا، باقی سب کچھ میری والدہ کی من مانیوں کی بحیثیت چڑھ چکا تھا۔ زیادہ تر جائیداد بک چکی تھی اور بچی مچی گردی پڑی تھی۔ کاروبار قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ میری والدہ نے اپنے عاقبت نا اندیشانہ فیصلوں اور کسی کے مشورے پر کان نہ دھرنے کی عادت کے ہاتھوں میرے والد کی زندگی بھر کی محنت غرق کر دی۔ شاید یہ بھی ان کے انتقام کا ایک حصہ ہو جس کی آگ میرے والد کی موت کے بعد بھی سرد نہیں پڑی تھی۔ وہ میرے والد کو نہ جھکا سکیں لیکن ان کے کاروبار کو انہوں نے گھنٹوں بٹھا دیا۔

میں نے بائٹم لیول سے آغاز کیا اور کاروبار کو ازسرنو زندہ کرنے کے لیے اپنے والد کے مانند دن رات محنت کرنا شروع کر دی لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایم ڈی کی نام نہاد کرسی پر اب بھی میری والدہ کا قبضہ تھا۔ انہیں اب بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ میرے ہر فیصلے کو بیک جنبشِ قلم رد کر سکیں۔ انہوں نے میری راہ میں ایسے روڑے اٹکائے کہ کوئی اور ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ جس قسم کے ماحول میں، میں نے تربیت پائی تھی، اس کے پیش نظر اگر میں

ہتھیار ڈال بھی دیتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ میری والدہ نے میری شخصیت کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا لیکن شاید میرے والد کے خون کا اثر تھا کہ میں ڈنارہا اور کسی نہ کسی طرح کام چلاتا رہا۔ میری خوش قسمتی کہ اس دوران میری ملاقات نسیم سے ہوئی۔

نسیم میری بیوی کا نام ہے۔ جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ ایک فرم میں پی آر او کی حیثیت سے کام کر رہی تھی اور مجھے بزنس کی دنیا میں آئے چار ساڑھے چار سال گزر چکے تھے۔ مجھے اس کی شخصیت پسند آئی اور شاید پہلی نظر میں، میں بھی اسے اچھا لگا۔ ہم بہت تیزی سے قریب آ گئے۔ میں پہلی دفعہ سنجیدگی سے اپنے متعلق سوچنے لگا۔ اس سے پہلے میری سوچ کے ہر محور میں میری والدہ کی ذات بھی شامل ہوا کرتی تھی۔

میری والدہ نے مجھ سے ماؤں والے لہجے میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ ان کا رویہ ہمیشہ کسی سخت مزاج گورنس کا سا ہوا کرتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ حکم دیا کرتی تھیں، مجھ سے کوئی بات پوچھتی نہیں تھیں۔ میں اب عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکا تھا جب مائیں بیٹوں پر شادی کے لیے زور ڈالنا شروع کر دیتی ہیں لیکن زور ڈالنا ایک طرف، میری والدہ نے کبھی مجھ سے اس سلسلے میں گفتگو نہ کی تھی اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر میری ملاقات نسیم سے نہ ہوتی اور میں اپنی والدہ سے اس سلسلے میں بات نہ کرتا تو شاید اب تک کنوارہ بیٹھا ہوتا یا والدہ کی پسند کی کوئی لڑکی میرے پلے باندھی جا چکی ہوتی۔

نسیم کے متعلق اپنی والدہ سے بات کرنے میں مجھے بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام عمر بھی ان سے اس طرح بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ میرے ذاتی معاملات کے متعلق پوچھنے کی زحمت کبھی انہوں نے گوارا کی نہ مجھے کبھی اتنا حوصلہ ہوا۔

کئی روز تک میں ہمت مجتمع کرتا رہا۔ اس دوران نسیم نے کئی دفعہ میری والدہ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا لیکن میں ہر دفعہ ٹال گیا۔ میری والدہ اور نسیم میری زندگی کے مثبت اور منفی قطبین کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ کبھی ایک مجھے اپنی طرف کھینچ لیتا اور کبھی دوسرا۔ دونوں کے سامنے میری کیفیت مختلف ہوتی تھی۔ نسیم کے ساتھ ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش باش، خود اعتماد اور مضبوط انسان اور کوئی نہیں ہے اور اپنی والدہ کے سامنے ہوتا تو مجھے اپنے آپ پر ایک تناد

درخت کے سائے میں اگے کمزور سے پودے کا سا احساس ہوتا جس کے حصے کی روشنی اور نمی اس کا طاقت ور ہمسایہ چھین لے جاتا ہے اور جس کی قسمت میں گھٹ کر مرجانا لکھا ہوتا ہے۔

آخر ایک روز ہمت کر کے میں نے والدہ کے سامنے یہ کہہ ہی دیا کہ میں تنسیم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی طرف سے مخالفت کی توقع تو تھی لیکن یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ اس طرح حیران ہو جائیں گی۔ انہوں نے یہ سوچا ہی نہ ہوگا کہ کبھی میں بھی ان کے اشارہ کیے بغیر زبان ہلا سکتا ہوں پھر جانے کیا سوچ کر انہوں نے تنسیم سے ملاقات کرنے کی ہائی بھری اور پہلی ہی ملاقات میں اسے ستر کر دیا۔

تنسیم میری عمر میں مجھ سے بڑی ہے۔ میری عمر اس وقت ستائیس سال تھی اور تنسیم کی بتیس سال۔ میری والدہ کا موقف یہ تھا کہ اتنے عرصے تک غیر شادی شدہ رہنے والی لڑکی پاک دامن ہو ہی نہیں سکتی جبکہ حقیقت حال یہ تھی کہ کم عمری میں والد کے سائے سے محروم ہو جانے کے بعد بڑی بیٹی کی حیثیت سے تنسیم نے گھر کا بوجھ سنبھال لیا تھا اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا مستقبل بناتے بناتے اپنی نوجوانی کا دور گزار بیٹھی۔ جب میری اور اس کی ملاقات ہوئی تو اس وقت تک وہ اپنی ذمہ داریوں سے تقریباً عہدہ برآں ہو چکی تھی۔

میری والدہ کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تنسیم کا خاندان حیثیت اور مرتبے میں ہم سے کمتر ہے۔ حیثیت..... مرتبہ..... میری والدہ کو شاید احساس نہ تھا کہ ہماری اپنی حیثیت اور مرتبے کا گراف کتنا نیچے آچکا تھا۔ بہر حال انہوں نے دو ٹوک انداز میں بتا دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی اور حکم دیا کہ میں تنسیم کا خیال اپنے دل سے نکال دوں۔ وہ حکم دے کر اس معاملے کو بھول بھال گئیں اور اپنے طور پر فرض کر لیا کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میں ماتھے پر ہاتھ لائے بغیر تعمیل کروں گا لیکن تنسیم کو بھولنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے میری ذات کے خالی خانے پُر کیے تھے، اپنی قوت سے میری کمزوریوں کو دور کیا تھا، میری ناہمواریوں کو ہموار کیا تھا۔ میری تکمیل کی تھی۔ میں بھلا اسے کیسے دل سے نکال سکتا تھا۔

اس لیے میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنے متعلق فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا اور تنسیم سے کورٹ میرج کر لی۔ میری والدہ آج تک تنسیم کو اس کا ذمہ دار قرار

دیتی ہیں حالانکہ یہ فیصلہ سراسر میرا ذاتی تھا۔

جب میں نے تنسیم کو بہو کے روپ میں اپنی والدہ کے سامنے لا کھڑا کیا تو پہلے تو وہ بہت چینی چلائیں، مجھے گھر سے نکالنے اور خودکشی کر لینے کی دھمکیاں تک دیں لیکن میں بھی دل سنبھال کر ان کے سامنے آیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی ہر کوشش کے باوجود میں اس سے مس نہیں ہوا تو تھک ہار کر انہوں نے کم از کم اس معاملے میں خاموشی اختیار کی لیکن یہ مت سمجھیے کہ انہوں نے اپنے اختیار کو چیلنج کیے جانے کا غصہ دل سے اتار دیا۔ انہوں نے اس غصے کو دوسرے راستے سے نکالنا شروع کر دیا۔ جتنا عرصہ وہ ہمارے ساتھ رہیں، ہمارا قافیہ تنگ کیے رکھا۔ شادی کے بعد تنسیم نے میرے ساتھ دفتر میں کام کرنے کی کوشش کی لیکن میری والدہ نے پہلی فرصت میں اس کی کوششوں کا سد باب کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ گھر میں رہے، دفتر آنے کے متعلق سوچے بھی نہیں۔

تنسیم نے ان کی یہ خواہش بے چون و چرا پوری کی۔ اگرچہ اس کی زندگی کا رو باری دنیا میں گزری تھی لیکن میری والدہ کو خوش رکھنے کی خاطر وہ گھر میں بیٹھ گئی اور خانہ داری کے فرائض سنبھال لیے لیکن جناب خوش اسے رکھا جاسکتا ہے جو خوش رہنا چاہتا ہو اور میری والدہ کا مقصد اسے تنگ کر کے گھر سے نکالنا تھا۔ بہو بنا کر پاس رکھنا نہیں۔ انہوں نے کم و بیش وہی طریقہ کار اپنایا جو میرے والد کے معاملے میں اختیار کیا تھا۔ تنسیم کے کام پر جا بہ جاتا تنقید کرنا ان کا معمول تھا اور گھر آئے مہمانوں کے سامنے اس کی بے عزتی کر دینا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے ہوتے ہوئے تنسیم کی فیملی کے کسی فرد کو ہمارے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ روپے پیسے کا انتظام والدہ کے ہاتھ میں رہتا تھا اور وہ تنسیم کو چھوٹی چھوٹی ضروریات کے حوالے سے بھی تنگ رکھتی تھیں۔ تنسیم کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ یہ سب برداشت کر گئی، اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو خودکشی کر لیتی یا میری والدہ کو مار دیتی۔

اگر یہ سلسلہ آج تک جاری ہوتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کم از کم میری ذہنی حالت کیا ہوتی۔ میری بات شاید آپ کو کچھ سنگدلانہ محسوس ہو لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ میری والدہ پر گرنے والا فالج قدرت کی طرف سے میرے صبر کا انعام تھا۔ اگر یہ خدائی مدد نہ ہوتی تو آج میری زندگی جانے کتنے کلڑوں میں تقسیم ہو چکی ہوتی۔ میری والدہ جیسے ڈکٹیٹر کا تختہ الٹنے کا کام صرف وہی ذات کر سکتی تھی، یہ کسی انسان کے بس میں نہیں تھا۔

میری والدہ کی بیماری کے نتائج ایک طرف اگر مثبت نکلے تو دوسری طرف منفی بھی تھے۔ ان کے علاج کے اخراجات اٹھانے کے لیے مجھے قرض پر قرض لینا پڑا۔ کاروبار کی حالت پہلے ہی تلی تھی، اس پر فاضل اخراجات کا بوجھ..... نتیجتاً اس کا دو الیا نکل گیا۔ میری ذہنی حالت ایسی ابتر ہوئی کہ میں غروس بریک ڈاؤن کے دہانے تک پہنچ گیا۔ ایسے میں تسنیم نے میری مدد کی۔ اس نے میری والدہ کی خدمت میں نہ صرف دن رات ایک کر دیے بلکہ گھر کے اخراجات چلانے کے لیے دوبارہ نوکری شروع کر دی۔ جب میری ذہنی حالت معمول پر آئی تو اس نے اپنے زیورات، جو اسے اس کے والدین کی طرف سے ملے تھے، بیچ کر اتنی رقم کا بندوبست کیا کہ میں اپنے طور پر کاروبار شروع کرنے کے قابل ہو سکا۔

والدہ کی بدعلاجی کی بدولت ہمارے اپنے خاندان کے افراد تو کب سے ہماری دہلیز کا رخ کرنا چھوڑ چکے تھے۔ ان کی بیماری کا سن کر بھی ان میں سے کوئی نہ آیا۔ تسنیم کی فیملی کے افراد جنہیں میری والدہ کے صحت مند ہوتے ہوئے ہمارے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ تھی، انہوں نے کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ کر خود ہی مختلف ذمے داریاں سنبھال لیں۔ ان لوگوں کی مدد اور تعاون سے ہی میں اس قابل ہوا کہ ہر فکر ذہن سے اتار کر اپنے کاروبار پر توجہ دے سکوں۔

مجھے توقع تھی کہ اس عذاب سے گزر کر میری والدہ کے خیالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آجائے گی۔ خیالات تو نہیں البتہ ان کی ذہنی حالت ضرور بدل گئی۔ شروع کے چھ ماہ تو وہ بول بھی نہیں سکیں اور چھ ماہ کے بعد ان کے منہ سے پہلی بات یہ نکلی کہ انہوں نے تسنیم کو اپنے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔

والدہ کی ذہنی ابتری کی علامات اسی وقت نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی انہیں سمجھ نہ پایا اور سمجھ بھی نہ پاتا اگر وہ کہانی سامنے نہ آتی جو آپ کو یہاں تک لانے کا سبب بنی ہے۔ پہلے وکیل کی طرف سے نوٹس موصول ہونے کے بعد میں تو چکر اساکر گیا تھا۔ سمجھ ہی نہ آیا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اگر نوٹس پر واضح الفاظ میں میرا نام مع ولدیت اور پتے کے نہ لکھا ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ ڈاکیا کسی اور کا نوٹس غلطی سے مجھے تھا گیا ہے۔

میں وکیل سے جا کر ملا اور یوں یہ کہانی میرے علم میں آئی۔ میں نے اس وکیل کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے

کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے وہ میری بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے راضی کیا کہ وہ کم از کم ایک دفعہ میرے ساتھ چل کر میری والدہ سے ایک ملاقات کر لے۔ اسے ساتھ لے کر میں والدہ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں ان کا جواب کیا تھا؟ انہوں نے اس وکیل کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ وہ جھنجھلا کر دکالت نامہ وغیرہ بطور ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا لیکن قصہ کسی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا چنانچہ میں نے دست بستہ معافی مانگ کر اسے رخصت کر دیا۔

بات یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ چھ ماہ بعد مجھے ایسا ہی ایک نوٹس اور موصول ہوا۔ اس مرتبہ وکیل کے پاس جانے سے پہلے میں اپنی والدہ کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کے ریفرنس سے ڈاکٹر دلجیت رحمانی سے ملا اور انہیں ساری صورت حال بتا کر مشورہ طلب کیا۔ میری والدہ کا مکمل ذہنی و نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد انہوں نے جو رائے دی، وہ اس رپورٹ کی صورت آپ کے سامنے پڑی ہے۔ آپ چاہیں تو ڈاکٹر رحمانی سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

ان کی ذہنی خرابی کے عمل کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا تھا۔ میرے والد سے شادی کے بعد اپنی قطری خواہشات کے برعکس انہوں نے ناکامیاں ہی ناکامیاں دیکھی تھیں اس لیے یہ خیال ان کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا کہ ان کے خلاف کائناتی پیمانے پر سازش کی گئی ہے اور پوری دنیا اس سازش میں شریک اور ان کی دشمن ہے۔

تسنیم کو انہوں نے اپنا دشمن نمبر ایک ٹھہراتے ہوئے اس پر حملے شروع کر دیے لیکن اس سے پہلے کہ ان حملوں کا کوئی منطقی نتیجہ برآمد ہو پاتا، ان پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ ان کا پیرا نو یا مزید شدید ہو گیا۔ اب دنیا ہی نہیں، قدرت بھی انہیں اپنی دشمن نظر آنے لگی۔ رہی سہی کسر اس احساس.... بے بسی نے پوری کر دی جس سے انہیں بیماری کی حالت میں دو چار ہونا پڑا۔ تمام عمر انہوں نے خود کو دوسروں پر حکمران سمجھا تھا اور آج ایک شیر خوار بچے کی طرح لاچار تھیں۔ خود اپنا کوئی کام کرنا تو درکنار، وہ مافی الضمیر بیان کرنے سے بھی قاصر ہو گئی تھیں۔

آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ تسنیم ان کی دشمن نمبر ایک تھی اور مجھے بھی وہ کسی نہ کسی حد تک قصور وار سمجھتی تھیں۔ ہم سے بدلہ چکانے یا یوں سمجھیے کہ ہمیں پریشان کرنے کے لیے انہوں نے یہ کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر دلجیت رحمانی کی آخری رائے کے مطابق ان

کا اس کیفیت سے لکنا ممکن نہیں کیونکہ وہ کبھی اپنے معالج سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گی اور ایسے نفسیاتی مسائل سے نجات کے لیے مریض کا تعاون ہر چیز سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

گزشتہ چھ سال سے میں اس عذاب سے گزر رہا ہوں۔ ہر سال چھ ماہ بعد مجھے کسی نہ کسی کے سامنے اپنے دکھوں کی گھڑی کھولنا پڑتی ہے، اپنے گھر کی باتیں بتانا پڑتی ہیں اور شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ میں یہ ذلت کب تک سہتا رہوں گا۔

☆☆☆

چائے بھاپ اگل اگل کر سرد پڑ چکی تھی اور منصور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اندر بھی کچھ سرد پڑ گیا ہو۔ بیجان، اضطراب اور تجسس کی وہ آگ جس کی آغوش وہ یہاں آنے سے پہلے محسوس کر رہا تھا، ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انسان کی توقع یوں بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔

ایک طویل توقف کے بعد فاران نے کہا۔ ”میری کہانی آپ نے سن لی منصور صاحب۔ اب آپ جیسے اور جہاں سے چاہیں اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو میرے ساتھ چل کر میرے گھر اور دفتر کی حالت دیکھ کر خود فیصلہ کر لیں کہ اپنی والدہ کے بقول میں کروڑ پتی ہوں یا درمیانے درجے کا ایک معمولی سا کاروباری۔ آپ سے قبل میری والدہ سے ملنے والے تمام وکیلوں کے نام اور پتے میرے پاس موجود ہیں، آپ چاہیں تو ان سے بات کر کے اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ مزید کسی ثبوت کی ضرورت ہو یا آپ کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہو تو میں آپ کے سامنے ہوں، جو جی چاہے پوچھ لیں۔“

منصور کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ ابھی فاران کو ٹال دے اور بعد میں اپنے سینئرز سے بات کر کے کوئی فیصلہ کرے لیکن پھر اس نے خود ہی اس سوچ کو رد کر دیا۔ فاران نے اتنی بڑی پیشکش اسے بلاوجہ نہیں کی تھی۔ یقیناً وہ اپنی کہانی کو سچ ثابت کر سکتا تھا۔ بعد میں یہی ہوتا کہ اس کے ہم عصر اس کا مذاق اڑاتے اور سینئرز کی نگاہ میں اس کی پوزیشن خراب ہوتی۔ وہ یہ خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا کہ ہر طرف سے شرمندگی اٹھانے سے بہتر ہے کہ فاران کے سامنے غلط فہمی کا اعتراف کر کے چھوٹی سی شرمندگی اٹھالی جائے۔

ابو کی طرح

لڑکا حجام سے۔ ”انکل میرے بال بالکل میرے ابو کی طرح کا نہیں۔“

حجام۔ ”وہ کیسے؟“

لڑکا۔ ”بھئی درمیان سے بالکل صاف اور کناروں سے جھاریں۔“

مرسلہ۔ عاصم خان، کراچی

کم سن

باپ بیٹے سے۔ ”سنا ہے تم بہت نالائق ہوتے جا رہے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ، کم سن کسے کہتے ہیں؟“

بیٹا۔ ”ابو! یہ بھی کوئی مشکل سوال ہے۔ کم سن اسے کہتے ہیں جو کم سنا ہو۔“

انتخاب۔ عاصمہ علی، سکھر

”آپ کی بات پر یقین نہ کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے فاران صاحب۔“ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”آپ اتنا بڑا دعویٰ ایسے ہی تو نہیں کر رہے ہوں گے۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ کو میری بات کا یقین آ گیا۔“ فاران نے کہا۔ ”میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ نے مجھے جھوٹا سمجھ لیا تو معاملہ مزید طول کھینچ جائے گا اور آپ کا اور میرا وقت خراب ہوگا۔ اب کیا خیال ہے، چائے گرم کروالی جائے؟“ اس نے بھی ابھی تک اپنے کپ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

”نہیں، وقت بہت ہو گیا۔“ منصور نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جس کی سوئیاں آٹھ سے اوپر کا وقت بتا رہی تھیں۔ ”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔“

”آپ کا جو وقت ضائع ہوا، اس کے لیے میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔“ فاران نے کہا۔ ”اگر آپ اپنے قیمتی وقت کا کوئی معاوضہ وصول کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔“

”مجھے شرمندہ مت کیجیے فاران صاحب۔“ منصور

نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”چلیے۔“

دونوں آٹھ کر ریسٹوران سے باہر نکل آئے۔ فاران نے ایک دفعہ پھر اس سے معذرت کی اور اپنی گاڑی میں

بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر رحمانی کی رپورٹ والے کاغذات وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ منصور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس طرف بڑھا جہاں اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

موٹر سائیکل پر سوار ہونے سے پہلے اس نے بیگ کھول کر بیگم چغتائی کے ابطال نامے اور عاق نامے کی تحریر کے کاغذوں والا لفافہ نکالا اور کھول کر دیکھے بغیر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

☆☆☆

نئے ماڈل کی لینڈ کروزر ہلکا سا دھچکا لیے بغیر کونٹھی کے پورچ میں رک گئی۔ باوردی شوفر نے جلدی سے اتر کر عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور فاران نیچے اتر آیا۔

اس کے بدن پر وہی کپڑے تھے جو وہ منصور سے ملاقات کے وقت پہنے ہوئے تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ اندرونی حصے کے صدر دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مرکزی ڈرائنگ ہال خالی پڑا تھا البتہ ایک ملازمہ بالائی زینے طے کرتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔

”بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟“ فاران نے پوچھا۔

”اوپر بیڈروم میں ہیں جی۔“ ملازمہ نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ فاران تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی اور کسی اندرونی احساس کے زیر اثر چہرہ جگمگا رہا تھا۔ کامل سچ عموماً بہت زیادہ تلخ ہوتا ہے اور کامل جھوٹ بہت زیادہ شیریں۔ اسی لیے اکثر لوگ انہیں ہضم نہیں کر پاتے۔ فاران اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس نے اپنی کہانی میں دونوں اجزا کا توازن بڑا مناسب رکھا تھا اور منصور نے یہ پکوان بڑی آسانی سے ہضم کر لیا تھا۔

اس نے منصور کے سامنے بہت سے سچ بولے تھے مثلاً اس کی والدہ کا تھکنا اور تسلط پسند مزاج، اپنے شوہر سے رنجش، والد کی اچانک موت اور اس کے بعد والدہ کے زیر سایہ ایک کھٹی کھٹی، نا آسودہ پرورش۔ وہ اپنی ماں پر گرنے والے فالج کو خدا کی رحمت ہی سمجھتا تھا۔ اسی کی بدولت اسے کھل کر سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تھا لیکن اس نے منصور کے سامنے چند جھوٹ بھی بولے تھے۔

بیڈروم کے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ ایک لمبے کورکا، ہلکی سی دستک دی پھر اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمر اوال لائٹ کی زرد روشنی میں تنہا ہوا تھا۔ کنگ

سائز بیڈ کے پشتے کے سہارے نیم دراز اس کی بیوی، تسنیم چغتائی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ فاران کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کتاب بند کر کے سائنڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ ”کیا رہا؟“ اس نے بلا تمہید پوچھا۔

”کامیابی۔“ فاران نے ویسا ہی مختصر جواب دیا اور آگے بڑھ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ”زیادہ محنت تو نہیں کرنا پڑی؟“

”اتنی تیاری اور مشق کے بعد زیادہ محنت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ فاران نے کہا۔ ”اور یہ وکیل تو ویسے بھی جیسے موم کا بنا ہوا تھا، بڑی آسانی سے پگھل گیا۔“ ”بعض وکیل بہت زیادہ نوزی ہوتے ہیں۔“

”ہوں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ چند ہرے نوٹوں کی خوشبو ہر کھلی ناک کو بند کر سکتی ہے۔ بہر حال اس معاملے میں یہ نوبت نہیں آئی۔“

”عقیلہ نے تمہیں اطلاع کب دی تھی؟“

”وکیل سے ملاقات کا وقت لینے کے بعد اس نے مجھے بتا دیا تھا۔“ فاران نے جواب دیا۔ ”اور آج جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے فوراً مجھے فون کر دیا۔“

”اس مرتبہ کس کی گاڑی مانگی تھی؟“ تسنیم نے مسکرا کر پوچھا۔

”چیف اکاؤنٹ کی۔“ فاران نے بتایا۔ ”ابھی واپس کر کے سیدھا ادھر ہی آرہا ہوں۔ بے چارہ حیران ہو رہا تھا کہ چھ گاڑیاں رکھ کر بھی مجھے اس کی گھٹیا سی گاڑی کی کیا ضرورت آن پڑی۔“

”گھٹیا چیزیں بعض اوقات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔“ تسنیم نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”جیسے یہ کپڑے..... اور جیسے عقیلہ۔“

”میں اس عورت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں۔“ فاران نے کہا۔ ”کتنی عمدگی سے ڈبل رول کھیل رہی ہے۔ امی جیسی زیرک اور باریک بین خاتون کو بھی کبھی اس پر شک نہیں ہوا۔ ان سے الگ پیسے بھرتی ہے اور ہم سے الگ رقم وصول کرتی ہے۔“

”کیا کرے بیچاری، اتنی ضرورت مند جو ہوئی۔“ تسنیم نے ایسے انداز میں کہا تو فاران قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس ایک قہقہے میں گزرنے والے پورے دن کا اعصابی تناؤ اور اضطراب چھپا ہوا تھا۔ تسنیم بھی مسکرانے لگی۔

پھر فاران کا چہرہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اس نے سر تسنیم کی گود میں رکھ دیا۔ تسنیم ہولے ہولے

”میں سوچوں گا۔“ فاران نے آنکھیں موندتے ہوئے دوبارہ سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ”ابھی میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

تسним کی انگلیاں پھر چلنے لگیں۔ فاران کے تپتے ہوئے اعصاب پر سکون ہوتے گئے۔ وقت لگی بندھی رفتار سے اپنا سفر طے کرتا رہا۔

☆☆☆

وقت کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کائنات کے اس کونے سے اس کونے تک۔ ازل سے جاری، ابد تک مسلسل۔ آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ وقت اور مقام بدل جانے سے اشیاء کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن اندر کا موسم بدل جائے تو وقت کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے لیے وقت پر لگا کر اڑتا ہے اور بعض لوگوں کے لیے سک سک کر رینگتا ہے۔

بیگم چغتائی بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھیں۔

اس وہیل چیئر پر بیٹھے یا اس بستر پر دراز، ان کے لیے وقت کا ایک ایک لمحہ مرض الموت میں گرفتار کی سانس کی طرح ایک ایک کر گزرتا تھا۔ بیداری کی طویل گھڑیوں میں وہ جانے کتنی دفعہ جوئے شیر کھود کھود کر پانتی تھیں۔

جسم مفلوج ہو تو ذہن اور زیادہ متحرک ہو جاتا ہے۔

جسم کی سرگرمی میں جو چھوٹی چھوٹی باتیں نگاہ میں آنے سے رہ جاتی ہیں، سکوت کی حالت میں چشم تصور انہیں بڑا کر کے دکھاتی ہے۔ گزشتہ زندگی کی ساعتیں اور آئندہ زندگی کا تصور سب ایسی صراحت سے نکھر کر سامنے آتے ہیں کہ دیکھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔

بیگم چغتائی کو زندگی سے بہت کچھ ملا تھا لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں سب کچھ گنوا دیا تھا۔ انہیں اس کا اعتراف تھا اور اب احساس ہوتا تھا کہ ان کا ماضی نا کامیوں اور تلخیوں سے عبارت ہے اور ان کا مستقبل ایک اتھاہ، بے کنار، مہیب خلا۔ ماضی کی طرف لوٹیں تو پچھتاؤں کے بچھو ڈنک مار س، مستقبل کی طرف جائیں تو بے یقینی کا اثر دھامنے بھاڑے، نکل جانے کو لپکے۔ زندگی گیسوں اور گھن کی طرح چکی کے دوپاٹوں کے درمیان پستی رہے۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھیں۔ ادارے کی ملازما تھیں تھوڑی دیر پہلے انہیں کھانا اور دوا کھلا کر اور بستر پر لٹا کر گئی تھیں۔ وہ سوچوں کے سمندر میں غرق تھیں کہ دروازہ کھلا اور عقیلہ اندر آئی۔

”تم ابھی تک یہیں ہو عقیلہ؟“ بیگم چغتائی نے اسے

اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ فاران کی ساری عمر ماں کی زیر نگرانی گزری تھی۔ وہ اس نگرانی کا عادی بلکہ نشئی ہو گیا تھا۔ اس میں اتنا اعتماد کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ ماں کی انگلی چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں اپنا راستہ خود تلاش کر سکے۔ شاید اسے تسنیم بھی اسی لیے پسند تھی کہ وہ اس کا خیال تو شفقت کے ساتھ رکھتی تھی مگر سخت نہ تھی۔

تسним کی انگلیاں اس کے سر کو سہلا رہی تھیں، اس کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ اس کے اعصاب سے کشیدگی کے اثرات دھلتے جا رہے تھے۔ وہ پرسکون ہو رہا تھا لیکن ایک ہلکی سی غلش ہمیشہ باقی رہتی تھی۔ اس غلش نے اسے کبھی پوری طرح چین نہیں لینے دیا تھا۔

اس نے ہولے سے کہا۔ ”آخر ایسے کب تک چلتا رہے گا؟ میں تنگ آتا جا رہا ہوں۔“

”اس کا ایک حل ہے۔“ تسنیم نے کہا۔

”وہ کیا؟“

”قاری..... تمہاری امی کے کھانے پینے اور دوائیوں وغیرہ کا سارا انتظام عقیلہ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔“

”ہاں۔“

”اور وہ ضرورت مند بھی ہے؟“

”ہاں۔“

”تو پھر کبھی اسے اشارہ دو کہ اگر وہ اپنے فرائض سے تھوڑی سی غفلت برت لے تو اس کی ضرورت مندی ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہے۔“

فاران نے سر اٹھا کر تسنیم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں، فاران کو اپنے جسم میں برقی لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”کیا یہ ضروری ہے؟“

”تمہاری مرضی ہے۔“ تسنیم نے کہا۔ ”لیکن اتنا ذہن میں رکھنا کہ تمہاری امی اپنی زندگی جی چکی ہیں۔ چند دن کم زیادہ ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ تمہیں بہت فرق پڑے گا۔“

فاران خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ ”اور عقیلہ گھبرا گئی تو؟“

تسним مسکرائی۔ ”اسے بتا دینا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اسے پورا تحفظ دیں گے۔ ظاہر ہے ہماری اپنی سلامتی اس کی سلامتی سے مشروط ہوگی اور جب تک ہم مت نہیں کھولیں گے، اس کی طرف کون انگلی اٹھائے گا۔“

دیکھ کر کہا۔

”ادارے کے حسابات کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اسی لیے آج زیادہ دیر رکنا پڑا۔“ عقیلہ نے کہا۔ ”میں نے سوچا جانے سے پہلے پوچھ لوں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

”شکریہ عقیلہ۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”اس وقت تو کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن صبح بچن والوں سے میری طرف سے کہہ دینا کہ کبھی کبھی ناشتے کا مینیو تبدیل بھی کر لیا کریں۔ اس کے علاوہ لائڈری والوں سے کہہ دینا کہ اگر میری کسی نئی ساڑی کو صرف لگایا تو کھڑے کھڑے سارا نقصان بھر والوں کی۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔“ عقیلہ نے کہا۔ ”اور کچھ؟“

”نہیں۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔

”تو پھر میں چلتی ہوں۔“ عقیلہ جانے کے لیے مڑی اسی لمحے بیگم چغتائی نے کہا۔

”یہ وکیل بھی واپس نہیں آئے گا۔“

”جی۔“ عقیلہ حیرت کے عالم میں مڑی۔

”میں جانتی ہوں۔“ بیگم چغتائی نے پھر کہا۔ ”اس کے باہر نکلتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا، یہ بھی واپس نہیں آئے گا۔“

عقیلہ نے کچھ کہنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ وہ جانتی تھی بیگم چغتائی اس وقت اپنی کہنے کے موڈ میں ہیں۔

”میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے جب بھی کسی سے کوئی توقع باندھی ہے، وہ پوری نہیں ہوئی۔ میرے باپ نے، میرے شوہر نے، میرے بیٹے نے، سب نے مجھے مایوس کیا ہے پھر جب میری طرف سے کوئی رد عمل ہوتا ہے تو دنیا بھی مجھے ہی برا کہتی ہے۔ سب میرے دشمن ہیں۔“

عقیلہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ سوچ کر پھر خاموش رہی۔

”قدرت بھی میرے ساتھ نا انصافی کرتی ہے۔ میرا یہاں اب تک ہونا نا انصافی نہیں تو اور کیا ہے عقیلہ؟ کیا میں نے کسی کے ساتھ نا انصافی کی ہے؟ میں نے تو صرف حساب برابر کرنے کی کوشش کی ہے آج تک۔ اگر میں نے اپنے باپ کو زندگی کا آخری حصہ یہاں گزارنے پر مجبور کیا تو صرف اس لیے کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا اور میرے گھر میں اس کا وجود خواہ مخواہ کی پریشانیوں کو جنم دے رہا تھا۔ اگر میری اپنے شوہر سے نہیں بن سکی تو اس لیے کہ اس نے کبھی

مجھے بیوی سمجھا ہی نہیں۔ اس نے مجھے صرف اپنی ترقی کے لیے سہارے کے طور پر استعمال کیا۔ میرا بیٹا کہتا ہے کہ میں اس پر زیادتیاں کرتی رہی ہوں لیکن اس کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ میں نے جو کچھ کیا، اس کے بھلے، اس کی حفاظت کے لیے کیا۔ کیا میرا رویہ غیر منصفانہ تھا؟“

”آپ اس بارے میں بہتر طور پر جانتی ہیں بیگم صاحبہ۔“ عقیلہ نے بالآخر کہا۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔“ بیگم چغتائی نے کہا۔ ”جب میں نے اپنے باپ کو یہاں بھجوا یا تھا تو صرف دو سال کے بعد اسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ میں چھ سال سے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدرت مجھے سزا دے رہی ہے لیکن اگر میں نے جرم کیا تھا تو اس کی سزا بھگت چکی ہوں۔ اب مجھے رہائی مل جانی چاہیے۔ جانے میری نجات کا لمحہ کب آئے گا؟“

عقیلہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ ضبط کی کوشش میں اس کے ہونٹ تھر تھرا کر رہ گئے اور وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

”میری دعا ہے بیگم صاحبہ کہ..... کہ..... خدا آپ کی مشکل آسان کر دے۔“

وہ تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئی۔ دروازہ چرچراتا ہوا چوکھٹ سے ٹکرایا اور خود کار نفل کھناک سے بند ہو گیا۔ بیگم چغتائی نے ایک آہ بھر کر اپنی اکلوتی آنکھ موند لی۔ وہ پھر تنہا رہ گئی تھیں۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن ماضی سے ابھرنے والی سرگوشیوں کی بازگشت ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان کے والد نے اپنے والدین سے لڑ کر اپنا حصہ وصول کیا تھا اور انہیں تنہا چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسانے کی سوچی تھی۔ انہیں خود ساری عمر اپنے باپ کی توجہ نہ ملی اور آخر میں جب بگڑے ذہنی توازن نے باپ کو ان پر بوجھ بنانا شروع کیا تو انہوں نے اسے یہاں بھجوا کر نجات حاصل کر لی۔ آج وہ خود یہاں بیٹھی اپنی رہائی کا، موت کا انتظار کر رہی تھیں۔ مکافات کی جواز نجیر انہوں نے خود اپنے گلے میں ڈالی تھی، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

”جانے میرے عذاب کی گھڑیاں کب تمام ہوں گی۔“ بیگم چغتائی نے بڑے کرب سے سوچا اور ان کی اکلوتی آنکھ سے نکلنے والا اکلوتا آنسو ان کے رخسار سے ہوتا ہوا سینے پر ٹپکنے لگا۔

